ebooks.i360.pk

[illegible]

مذہبی داستانیں اور ان کی حقیقت

حصہ اول

قرآن، حدیث، تاریخ اور فن رجال کی روشنی میں

تالیف

علامہ حبیب الرحمٰن صدیقی کاندھلوی

شائع کردہ

الرحمٰن پبلشنگ ٹرسٹ (رجسٹرڈ)

مکان نمبر ۳-۷-۱ اے - بلاک نمبر ۱ ناظم آباد کراچی (۷۴۶۰۰) فون: ۶۶۰۱۴۴۹

نام کتاب ———— مذہبی داستانیں اور ان کی حقیقت (حصہ اول)
نام مؤلف ———— علامہ حبیب الرحمٰن صدیقی کاندھلویؒ
تعداد صفحات ———— ۴۶۴
قیمت کتاب مجلد ———— پچاسی روپیہ صرف (۸۵/=)
طباعت ———— روحانی ڈائجسٹ پریس، ناظم آباد

—— ناشر ——
الرحمٰن پبلشنگ ٹرسٹ (رجسٹرڈ)
مکان نمبر ۳-۷-۱ے۔ بلاک نمبر ۱۔ ناظم آباد، کراچی ۷۴۶۰۰
فون: ۶۶۰۱۴۴۹

ebooks.i360.pk

مختصر حالات

قاری حافظ حبیب الرحمٰن صدیقی کاندھلوی

تحریر

محمد عظیم الدین محبت ایم اے (عثمانیہ)

ڈی ۴/۶ پلاٹ ۱۴/۱ پیر الٰہی بخش کالونی کراچی ۵

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ط

پاکستان میں بسنے والی مذہبی شخصیتوں میں عالم و فاضل بہت سے ہیں۔ عابد و زاہد بے شمار ہیں۔ محدث اور فقیہہ بھی کثرت سے ملتے ہیں۔ مفسر قرآن بھی موجود ہیں، حافظ بھی ہیں قاری بھی ہیں اور ایسی ہستیاں بھی جن میں یہ سب خوبیاں موجود ہوں ڈھونڈنے سے مل جائیں گی، لیکن ایسے خاصان خدا جو مذکورہ بالا ساری صفات کے حامل ہوتے ہوئے خدامست بھی ہوں تو ایسی فہرست میں جناب علامہ حبیب الرحمٰن صاحب قدیقی کا ... نمایاں طور پر نظر آئے گا۔ کاندھلہ کی سرزمین ناز کرتی ہوگی کہ اس نے ایسی جید شخصیت کو جنم دے کر پاکستان کے حوالے کیا آپ کی پہلو دار شخصیت ایک ایسا جگمگاتا ہوا ہیرا ہے جس میں متعدد صحابہ کرام کی شاندار پرچھائیاں جگ مگ جگ مگ کرتی ہوئی دکھائی دیتی ہیں۔

جناب علامہ حبیب الرحمان کاندھلوی نے خود کو کلام الٰہی و حدیث نبوی کی نشر و اشاعت کے لئے وقف کر رکھا ہے آپ کی پوری زندگی اسی سے عبارت ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ علم فقہ و حدیث کا احیاء آپ کا مقصد حیات ہے۔ آپ کی زندگی کا نصب العین ہے آپ نے اپنا تن من دھن سب کچھ اسی کام کے لئے تج دیا ہے، یہ کام یہ مشقت یہ سعادت ایک مجدد کے ہی نصیب میں آسکتی ہے۔ یہ اس کی دین ہے جسے پروردگار دے۔

حلقہ درس میں حاضرین کے استفسارات و سوالات کے جوابات دیتے وقت آپ پہلے تو قرآنی آیات کا حوالہ دیتے ہیں پھر تائید میں احادیث نبوی پیش کرتے ہیں اس کے بعد تاریخ اسلام کے واقعات بتاتے ہیں۔ جہاں کہیں اشتباہ کی صورت پیدا ہو جاتی ہے اور واضح دلیل بھی دکھائی نہیں دیتی تو اس وقت آپ اپنے حواس معنوی سے مدد لے کر نور یقین کی روشنی میں کتاب دل کے اوراق الٹتے ہیں اور پھر خداداد قابلیت کی بدولت علم لدنی کے خزانے اس طرح لٹاتے ہیں جس طرح کہ چشمے سے پانی ابلتا ہو۔

آپ کا حلقہ درس ایک علمی مکتب ہے، ایک مذہبی درس گاہ ہے،

ایک دانش کدہ ہے جہاں علم و فضل کی بارش ہوتی ہے، عقل و دانش کا مینہ برستا ہے۔ جنہوں نے آپ کی ساحرانہ خطابت کے زمزموں سے آب زلال پیا ہے وہ پھر کبھی اور چشمے کی طرف مشکل ہی سے رُخ کرتے ہیں آپ کے چشمۂ فیض سے جاری ہونے والے آب مصفا کے چھینٹوں سے دلوں کو تازگی اور رُوح کو بالیدگی حاصل ہوتی ہے۔

آپ کی سحر العلوم شخصیت کا نکھار اس وقت دیکھنے کے قابل ہوتا ہے جب کہ آپ قرآن کی تفسیر بیان کر رہے ہوتے ہیں۔ معارف قرآن آپ کچھ اس طرح بیان کرتے ہیں کہ بسا اوقات ایک ہی سطر کی تفسیر میں ایک گھنٹہ صرف ہو جاتا ہے۔ مجھے یوں محسوس ہوتا ہے کہ دَوران تفسیر آپ پر شرح صدر کی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے اور آپ کی زبان کی بجائے آپ کا دل بولنے لگتا ہے۔

احادیث میں آپ یحیٰی ابن معین۔ نسائی اور ابن جوزی سے زیادہ متاثر ہیں اور خاص طور پر ابن جوزی کے حافظے سے۔

فقہ قرآن اور فقہ حدیث میں ابن تیمیہؒ ان کے شاگرد ابن قیمؒ اُن کے ہمعصر ذہبی سے بہت زیادہ متاثر ہیں۔ عصرِ حاضر کے تین علماء سے آپ نے علمی و فکری دولت حاصل کی اور کلی طور پر ان سے متاثر ہوئے ان میں سب سے زیادہ آپ اپنے والد جناب مفتی اشفاق الرحمٰن صاحب کاندھلوی سے اس کے بعد علامہ شبیر احمد عثمانی سے پھر سید سلیمان صاحب ندوی سے۔

پیدائش اور حسب نسب، حضرت حافظ حبیب الرحمٰن صدیقی صاحب آخر دسمبر ۱۹۲۳ء میں محلہ دلی دروازہ دلی میں پیدا ہوئے۔ آپ کی پیدائش کا دن آپ کے خاندان کے لئے بہت ہی مبارک و منور ثابت ہوا۔ آپ کے والد حضرت مفتی اشفاق الرحمٰن صاحب کاندھلوی جنہیں مدرسہ اشرفیہ کی ملازمت سے علیحدہ کر کے ان کا ذاتی کتب خانہ بھی ضبط کر لیا گیا تھا۔ عین ولادت کے دن ہی والد صاحب کو نہ صرف ملازمت پر بحال کر دیا گیا بلکہ کتب خانہ بھی واپس دے دیا گیا۔

قرآن کا حفظ مولوی حبیب الرحمٰن صاحب نے علم دین خاندانی ورثہ کے طور پر حاصل کیا تھا۔ علم دین ان کے خاندان کا اعزاز اور طرۂ امتیاز تھا۔ یہ کسی ملازمت کی خاطر نہ تھا۔ ان کے قصبے میں نوّے (۹۰) فی صد کے قریب مرد حافظ تھے۔ ان کے خاندان کا کوئی فرد مردوں میں ایسا نہ تھا جو حافظ نہ ہو۔ ان کے تمام بھائی حافظ ہیں۔ عورتوں میں بھی کافی حافظات موجود تھیں گھریلو ماحول دینی تھا۔ ہمہ وقت تلاوت قرآن اور درس و تدریس اور کتب بینی۔ چنانچہ بچپن میں جب حفظ قرآن کر لیا تھا اس وقت

ان کی عمر ۹ سال تھی۔ آپ دن میں ایک قرآن ختم کرلیا کرتے تھے۔ اور بسا اوقات رمضان میں اس میں اضافہ ہوجاتا تھا۔ ایک دفعہ آپ نے رمضان میں ۲۷ قرآن ختم کئے تھے۔

آپ کے بڑے پھوپھی زاد بھائی حکیم محمد عمر صاحب جو نابینا ہو چکے ہیں اور سیالکوٹ میں مقیم ہیں ان کا تمام زندگی کا معمول روزانہ ایک قرآن ختم کرتا رہا ہے۔ مولوی صاحب کی دادی مرحومہ دن میں بیس (۲۰) پارے تلاوت کرتیں اور دس پارے تہجد میں تلاوت کرتیں یہ تھا وہ ماحول جس میں موصوف صاحب نے تربیت اور پرورش پائی۔

چند کھیل جو لازمۂ حیات تھے

ایسے ماحول میں کھیل کود کی طرف توجہ ایک لایعنی سی بات تھی۔ اگرچہ بعض اوقات بچوں کے ساتھ کھیل کود میں مشغول ہو جاتے تھے جس میں گلی ڈنڈا، باغوں کی سیر، تیراکی اور چند کھیل جو اس وقت لازمۂ حیات تھے جس میں لاٹھی، ڈنڈا، تلوار، نیزہ بازی اور شہ سواری میں حصہ لیتے۔ سالہا سال تک چاندنی راتوں میں بنوٹ کی مشقیں ہوتیں۔ آپ کو زیادہ سے زیادہ ہتھیار جمع کرنے کا شوق تھا۔ ہندوؤں کے مقابلے کے لئے جو تعداد میں ۹۵ فیصد تھے یہ ہر وقت مستعد اور تیار رہتے تھے اور ان پر ہمیشہ بھاری رہے۔

عربی و فارسی کی تعلیم

قرآن مجید کی فراغت کے بعد دلی آ گئے اور وہاں اردو اور فارسی کی ابتدا کی۔ اکثر و بیشتر کتابیں والدؒ سے پڑھیں اور بعض کتابیں مولوی ممتاز کاندھلوی سے بھی پڑھیں جو مغل خاندان سے تعلق رکھتے تھے اور مہربان اساتذہ میں سے تھے لیکن تعلیم کے معاملے میں بڑے سخت تھے۔ اس کے بعد والدؒ نے عربی تعلیم شروع کرادی صرف و نحو، منطق اور ادب کی اکثر کتابیں والدؒ سے پڑھیں مثلاً مرقات، تہذیب وغیرہ۔ اس کے بعد مدرسہ فتحپوری دہلی میں داخل ہوئے۔ یہاں پانچویں جماعت تک باقاعدہ تعلیم حاصل کی۔ اسی دوران والد صاحب سے مختصر المعانی پڑھی۔ علم بیان یعنی تشبیہات، استعارات، کنایات، فصاحت، بلاغت بہ سلسلہ قرآن پڑھیں اور بہت سے مضامین ان کے آج تک ذہن میں محفوظ ہیں۔ ادب میں والد صاحب سے سبعہ معلقہ پڑھا۔

بیمار بہن کی تیمارداری اور تعلیم میں عارضی رکاوٹ

اتفاق سے اسی دوران آپ کی بڑی بہن جو عرصہ دراز سے بیمار تھیں ان کی بیماری میں اضافہ ہوگیا۔ ڈاکٹروں اور حکماء نے جواب دے دیا تھا۔ کے نتیجے میں ان کی تیمارداری کیلئے انھیں گھر پر چھوڑ

دیا گیا اور تقریباً ایک سال تعلیم رک گئی۔ اس وقت آپ کی عمر ۱۲، ۱۳ سال تھی، اسی بیماری میں بہن کا انتقال ہو گیا۔

مدرسہ صدیقیہ میں داخلہ

تعلیم میں ایک سال کے نقصان کے بعد مدرسہ صدیقیہ پھاٹک حبش خان میں ساتویں جماعت میں داخلہ لیا۔ اسی دوران چھٹی جماعت کی کتابیں اوقات مدرسہ کے علاوہ والد صاحب اور مولوی ممتاز صاحب سے پڑھیں۔ اور امتحان میں ۸۰ فیصد نمبر حاصل کئے۔

نذیریہ لائبریری ناول اور علامہ شبلی کی سیرت النبی

مدرسہ صدیقیہ کے داخلے اور تعلیم کے دوران ایک خاص صورت یہ پیش آئی کہ مدرسہ کے عین سامنے نذیریہ لائبریری واقع تھی جو مولانا نذیر حسین محدث دہلوی کی جانب منسوب تھی اور اس میں عربی فارسی اور اردو کی کتابوں کا قابل قدر ذخیرہ موجود تھا۔ آپ خالی گھنٹوں میں وہاں جاکر ابتدا میں تو ناول پڑھتے رہے لیکن عام طور پر تاریخی ناول مثلاً عبدالحلیم شرر کے ناول، صادق حسین کے ناول وغیرہ، جس سے تاریخ کی طرف لگاؤ پیدا ہوا اور تاریخی کتابوں کا مطالعہ شروع کر دیا جس میں سب سے پہلے شبلی کی سیرت النبی شامل ہے اس وقت تک صرف چار جلدیں شائع ہوئی تھیں۔ شبلی کی تاریخ سے جو تاثر پیدا ہوا اس نے آپ کو عربی کی کتابوں کا مطالعہ کرنے پر مجبور کیا۔ یہ شوق اتنا بڑھا کہ لائبریری کی کوئی تاریخی کتاب ایسی نہ تھی جو نہ پڑھی ہو۔ جہاں تاریخ کا شوق تھا وہاں حدیث، تفسیر اور فقہ سے بھی لگاؤ تھا اور ان مضامین کی اکثر کتابیں مطالعہ میں رہیں۔ لیکن دو فنون سے قلبی تعلق نہ تھا اگرچہ پڑھا ضرور تھا یعنی فلسفہ اور منطق۔

دورۂ حدیث

ایک سال آپ نے مدرسہ صدیقیہ میں گزارا لیکن دورۂ حدیث مدرسہ عبدالرب دلی سے کیا جو دلی کا بہت قدیم مشہور مدرسہ ہے۔ وہاں صحیح بخاری، صحیح مسلم، ترمذی، ابوداؤد، نسائی، ابن ماجہ سبقاً سبقاً پڑھیں اور ان تمام کتابوں کی عبارت آپ کو ہی پڑھنے کا شرف حاصل ہوا کیونکہ دیگر طلباء کی صرف و نحو کمزور تھی اور وہ عبارت صحیح طور سے پڑھ نہ سکتے تھے۔ نتیجہ میں کوئی استاد آپ کے علاوہ کسی اور کو عبارت پڑھنے نہ دیتا تھا۔

علامہ شبیر احمد عثمانی کی رائے

ان کتابوں کے علاوہ گھر پر والد صاحب سے مؤطا امام مالک

مولانا امام محمد طحاوی اور مولانا ممتاز صاحب سے ملن (؟) ... والد صاحب
کی طرف سے پابندی تھی کہ جو اسباق صبح کو پڑھتے ہیں ان کا مطالعہ رات کو کیا جائے اور شروحات حدیث میں جو کتب ہیں ان کا مطالعہ کرکے مجھے یہ بتاؤ کہ تم کیا سمجھے اور تشریحات سے نقطۂ نگاہ سے کون سا مسلک صحیح اور کونسے میں کیا سقم ہے اس کے نتیجے میں مولوی حبیب الرحمٰن صاحب بخاری کی شروحات میں سے فتح الباری، قسطلانی، کرمانی، عینی، فیض الباری اور دیگر شروحات کا مطالعہ کرتے اور بعض اوقات رات مطالعے میں سارے گذر جاتے اور جب صبح ہو جاتی، جانے بنانے پڑتے، مدرسہ مطالعہ کرتے جب مدرسہ والد صاحب کے ساتھ جاتے تو راستے میں آتے جاتے والد صاحب قرآن سنتے جاتے تھے۔ سالانہ امتحان میں ہر کتاب میں پچاس میں سے پچاس نمبر حاصل کیے صرف ابوداؤد میں ایک نمبر کم تھا۔

امتحان کے بعد علامہ شبیر احمد عثمانی نے تقریری امتحان لیا اور اس میں مولانا مرحوم نے فرمایا کہ میں نے اپنی زندگی میں حدیث میں اتنا ہوشیار بچہ دوسرا نہیں دیکھا۔

مولانا الیاس کے تبلیغی دستوں میں شرکت آپ نے ۱۳۴۳ھ میں مدرسہ سے فراغت پائی۔ طالب علمی کے زمانے میں تعلیم کے ساتھ ساتھ تبلیغی مشاغل بھی جاری تھے مولانا الیاس صاحب مرحوم کے ساتھ تبلیغی دستوں میں میوات کا کئی بار گشت کیا، ریاست الور، ریاست بھرت پور، ریاست بھرت پور اور گڑگاؤں میں بھی جانے کا کئی کئی بار اتفاق ہوا۔ دلی کے بڑے بڑے علماء کے پاس بھی والد صاحب کے ساتھ آنا جانا رہا۔ مثلاً مفتی کفایت اللہ مرحوم، مولانا احمد سعید مرحوم اور مولانا رشید احمد گنگوہی کے خلفاء میں سے مولانا عاشق الٰہی میرٹھی مولانا اشرف علی تھانوی اور دیگر بڑے علماء کے پاس اٹھنے بیٹھنے کے بارہا مواقع ملے۔

پہلی ملازمت تعلیم سے فراغت کے چند دن ہی بعد ایک اہل حدیث کے مدرسہ میں جو دلی کی جامع مسجد کے عین سامنے واقع تھا، عربی ادب پڑھانے پر ملازم ہوئے اس وقت آپ کی عمر صرف ۱۹ سال تھی۔ یہ ملازمت زیادہ دن نہ چل سکی۔ کیونکہ مسلک کے اختلاف کے باعث ملازمت سے دل اچاٹ ہو گیا۔ ملازمت بمشکل ۵، ۶ ماہ رہی۔

مدرسہ محمودیہ چونڈہ میں ملازمت مدرسہ اہل حدیث سے علیحدگی اختیار کرنے کے بعد آپ نے

ؔ مولانا کے معنی ہیں ہمارے مولیٰ یا اے ہمارے مالک۔ ... اس کا استعمال ...

مدرسہ محمودیہ چونڈہ ضلع سیالکوٹ میں تعلیم حفظ قرآن پر ملازمت اختیار کرلی۔ دونوں جگہ مشاہرہ چالیس روپے ماہانہ تھا جب کہ کھانے کا خرچ کل دس روپے بنتا تھا۔ مدرسہ محمودیہ میں تقریباً دو سو طالب علم تھے۔ ان طالبعلموں کی اکثریت ان طلباء کی تھی جو دوسری جنگ عظیم کے دوران بنگال سے نقل مقام کرکے آتے تھے۔ چونڈہ میں آپ نے ۱½ سال تک تعلیم دی۔ دیہاتی زندگی سے طبیعت اُکتا جانے کے باعث اُسے بھی خیرباد کہہ دیا۔

سیالکوٹ میں آمد خطابت کی ابتداء

چونڈہ چھوڑنے کے بعد آپ سیالکوٹ آگئے یہ ۱۹۴۵ء کی بات ہے۔ یہاں لال کرتی بازار چھاؤنی میں ایک مسجد کی امامت پر مقرر ہوگئے اور اسی مسجد کے منبر سے آپ کی تقریر کی ابتداء ہوئی۔ ایک ماہ بعد ہی اسلامیہ ہائی سکول گوجرانوالہ کے صدر مدرس جن کا نام جمال الدین صاحب تھا انھوں نے اپنے پاس بُلا لیا۔

ایک خواب جس کی تعبیر فوراً ہی مل گئی

مولوی جمال الدین صاحب کا گوجرانوالہ میں بلوالینا ایک ایسا عجیب اتفاق تھا جس کا کوئی سبب اور ذریعہ بظاہر موجود نہ تھا۔ اس واقعہ سے چند دن قبل ہی آپ نے خواب دیکھا کہ ایک صاحب انھیں لینے آئے ہیں اور ایک نئی جگہ لے گئے ہیں جہاں آپ بازاروں میں گھوم رہے ہیں اور وہیں ملازمت بھی کرلی ہے۔ یہ رمضان کا مہینہ تھا دو تین دن بعد جمعہ واقعہ ہوا۔ جمعہ کی نماز سے قبل جب آپ خطبہ دے رہے تھے تو آپ نے ان صاحب کو خواب میں دیکھا تھا وہ دروازے سے مسجد میں داخل ہو رہے تھے۔ نماز ختم ہونے پر انھوں نے اپنا مدعا بیان کیا۔ آپ راضی ہوگئے اور گوجرانوالہ کا رُخ کیا۔ جو گلیاں اور سڑکیں آپ نے خواب میں دیکھی تھیں وہی وہاں موجود تھیں۔ یہاں اسلامیہ ہائی اسکول میں آپ کا تقرر عربی کے معلم کی حیثیت سے عمل میں آیا۔ ابتداء میں ۴۵ روپے مشاہرہ مقرر ہوا اور بورڈنگ میں رہائش کے لئے کمرہ دیا گیا۔

درس قرآن کی ابتداء

بورڈنگ کے ساتھ ایک بڑی مسجد تھی اس میں نماز فجر کے بعد درس قرآن کی ابتداء کی۔ یہ ۱۹۴۴ء کی بات ہے۔ ۱۹۴۷ء تک آپ نے درس قرآن کا سلسلہ جاری رکھا۔ اسکول میں عربی تعلیم کے ساتھ ساتھ ۱۹۴۶ء میں جمال الدین صاحب نے فارسی بھی ذمہ کردی۔ چند اساتذہ وہاں کے منشی فاضل کا امتحان دینا

چاہتے تھے۔ ان کو تعلیم دینے کے دوران آپ کو خیال پیدا ہوا کہ خود بھی منشی فاضل کے امتحان میں بیٹھ جائیں۔ خیال کو عملی جامہ پہنایا اور آپ منشی فاضل ہو گئے۔ اس کے بعد مولوی فاضل کا امتحان دیا۔

۱۹۴۷ء کے سیاسی ہنگامے گرفتاری اور سزائے قید،

امتحان کے بعد ہندوستان میں ۴۷ء کے سیاسی ہنگامے شروع ہو گئے مسلم لیگ کی طرف سے خضر وزارت کے خلاف احتجاج میں حصہ لیتے ہوئے گرفتار ہو کر گوجرانوالہ میں داخل زنداں ہوئے پھر وہاں سے لاہور جیل میں منتقل کر دیئے گئے جیل میں چودھری دین محمد سابق گورنر سندھ، صلاح الدین ایم۔ ذیل رائے، میاں ممتاز دولتانہ اور فیروز نون سے اچھے تعلقات پیدا ہو گئے۔ مدت اسیری ۲۱ دن رہی۔ جیل سے رہا ہوتے تو اسکول کی چھٹیاں ہو گئیں کیونکہ ہندو مسلم فسادات شروع ہو چکے تھے۔ یہ فروری ۴۷ء کا زمانہ تھا۔ اکثر کرفیو لگا رہتا تھا۔ آپ اپنے ساتھیوں کے ساتھ تمام تمام رات علاقوں کی حفاظت کرتے رہتے تھے۔

ہندو مسلم فسادات میں مجاہدانہ سرگرمیاں

آپ کی نگرانی میں سیالکوٹی دروازہ اور محلہ شیخاں تھا۔ آپ تمام تمام رات گشت کرتے اور پہرے دیتے۔ ہندو مسلم فسادات کے خطرے کے باعث آپ نے سیٹھ عبداللہ سے جن کا المونیم کا کارخانہ تھا بم اور خنجر تیار کروائے۔ تیل اور پٹرول کا ذخیرہ جمع کیا انگریز کی نیت مشتبہ تھی۔ ہندوؤں پر بھروسہ نہیں تھا۔ حالات انتہائی نازک اور خطرناک تھے۔ آپ نے آنے والے خطرے کو بھانپ لیا اور مخالف گروہ سے پہل ہونے سے چند منٹ قبل ہی کرفیو کے دوران نانک پورہ اور دال بازار کو پھونک دیا۔ انگریز فوج چاروں طرف گشت پر لگی ہوئی تھی جس کے نتیجے میں ہندوؤں اور سکھوں سے پورا گوجرانوالہ خالی ہو گیا۔ گوجرانوالہ خالی کرانے کے بعد آپ تقریباً پانچ سو آدمیوں کے ساتھ کامونکی منڈی پہنچے اور اُسے بھی سکھوں سے خالی کروا لیا۔ اس کے بعد سیالکوٹ شہر گئے اور وہاں کے مسلمانوں کی مدد کی جو انتہائی خطرات میں پھنسے ہوئے تھے۔

بھوپال میں آمد اور مولانا سلیمان ندوی کی مجلسوں میں شرکت

اس کام سے فراغت کے بعد اپریل کی ابتداء میں اپنے وطن آ گئے اور تقسیم ہند تک وطن

ہی میں رہے۔ ۱۴ اگست کے بعد پنجاب اور یو پی میں فسادات کی ابتدا ہوگئی تو آپ والدہ اور بھائیوں کو لے کر کاندھلہ سے بھوپال چلے گئے جہاں آپ کے والد صاحب ۴۵ء سے مفتیٔ اعظم بھوپال کے عہدے پر فائز تھے اور علامہ سید سلیمان ندوی قاضی القضاۃ تھے۔ چند ماہ بھوپال میں قیام رہا۔ شام کا وقت علامہ سلیمان ندوی کی خدمت میں گزارتے رہے اور اکتساب فیض کرتے رہے۔ جب تک بھوپال میں قیام رہا وقت گزارنے کے لئے مقامی ہائی اسکول میں بلامعاوضہ عربی کی تعلیم دیتے رہے۔

پاکستان کو ہجرت

اگرچہ بھوپال کا ماحول دیندارانہ تھا لیکن تقسیم ہند کے بعد ریاست بھوپال کا انڈین یونین سے الحاق کا سوال پیدا ہوچکا تھا۔ اس لئے آپ کو طبعاً یہ گوارا نہ ہوا کہ ایک کافر ملک سے وابستہ ہونے والی ریاست میں رہیں، والد صاحب نے اجازت نہ دی تھی، لیکن ان کی اجازت کے بغیر ہجرت کر کے پاکستان آگئے آخر دسمبر ۴۷ء میں۔

بھوپال سے آپ آگرہ آئے اور خیال یہ تھا کہ پنجاب ہوتے ہوئے پاکستان جائیں۔ لیکن جب آگرہ سنٹرل پر گاڑی پہنچی تو وہ مسلمانوں سے بالکل خالی ہوچکی تھی اور ایک قلی نے اشارے سے آپ کو اُتر جانے کو کہا۔ آپ نے گاڑی سے سامان اُتار لیا۔ اس قلی سے معلوم ہوا کہ متھرا پر گاڑی لٹ چکی ہے لہٰذا آپ نے بمبئی جانے کا ارادہ کر لیا۔ ریلوں کی کمی کے باعث فیصلہ کیا گیا کہ براستہ بمبئی سفر کیا جائے۔ پاکستان ہجرت کرنے والے چند اور مسلمانوں کو ملا کر آپ نے سیکنڈ کلاس کے ایک ڈبے پر قبضہ کر لیا اور سپیشل ٹرین میں بمبئی کے لئے روانہ ہوئے۔

اتفاق سے ایک ہندو جنگجو آگرہ سے ڈبے میں سوار ہوا اور اس کی جو شامت آئی تو وہ مسافروں سے ٹکٹ پوچھ بیٹھا۔ آپ نے اُسے پکڑ کر باندھ لیا اور بیت الخلاء میں بند کر دیا۔ مختصر یہ کہ یہی نہ کسی جتن سے اس خطرے سے گلو خلاصی حاصل کرنے میں کامیابی ہوگئی۔ دوران سفر آپ نے اپنی دونوں پنڈلیوں میں دو خنجر باندھ رکھے تھے اور آپ کے سامنے دو ہی راستے تھے۔ پاکستان پہنچنا یا بہادری کی موت

اپنے مختصر سے قافلے کے ساتھ بحفاظت تمام [illegible] شہر [illegible] گئے بحری جہاز کے لئے معلومات حاصل کیں تو پتہ چلا کہ سرکاری ملازمین کے تبادلہ کے باعث کسی غیر ملازم کو ٹکٹ نہیں ملتے۔ لہٰذا رات کو فرنٹیر میل سے سفر کرتے ہوئے پونہ ہوتے ہوئے احمد آباد پہنچ گئے۔ احمد آباد۔

نے بی بی اینڈ سی آئی آر کے سرونٹ ڈبہ پر قبضہ کیا۔ ساتھ ہی جو فرسٹ کلاس لگا ہوا تھا۔ اس میں پاکستان کا انگریز افسر کار معتلیس نتاجس کی حفاظت کے لئے بلوچ رجمنٹ کے دو سپاہی متعین تھے اس صورتحال سے آپ نے بہت اچھا فائدہ اٹھایا۔ جب کوئی ٹی ٹی آتا تو آپ فرسٹ کلاس کے ڈبے کی طرف اشارہ کر دیتے اور وہاں اس کا سنگینوں سے استقبال ہوتا تھا۔

میرپور خاص میں آمد راستے میں آپ کی گاڑی مارواڑ اور بیکانیر پہ دو دو دن پڑی رہی۔ اسٹیشن پہ کوئی مسلمان نظر نہ آتا تھا اور آپ احتیاطاً ہندو کے ہاتھ کی کوئی چیز نہ کھاتے تھے نہ پیتے تھے۔ بمبئی سے چلتے وقت اسٹیشن سے کیلے خرید لئے تھے صرف وہی ان کی غذا کا کام دیتے تھے جو چند دن چلے۔ آٹھویں دن میرپور خاص پہنچے جب کہ چار دن رات بھوک پیاس سے گذار چکے تھے۔ میرپور خاص پہنچنے پر کھانے اور چائے اور مختلف چیزوں کا انتظام سندھیوں نے کر رکھا تھا۔ انھوں نے آپ کی ہر چیز کا خیال رکھا اور اس طرح سے خدمت کی جیسے کوئی سگا بھائی کرتا ہے۔ پھر آپ میرپور خاص سے کراچی وارد ہو گئے۔

کراچی سے گوجرانوالہ روانگی کراچی میں کچھ دن قیام کے بعد کوئی روزگار میسر نہ آیا تو فیصلہ کیا گیا کہ اپنی اصلی ملازمت پر گوجرانوالہ چلے جائیں۔ اس خیال کے آتے ہی کراچی سے لاہور عازم سفر ہو گئے۔ یہ سفر ۷ دن میں طے ہوا۔ لاہور سے گجرانوالہ ۴۴ میل دور ہے اور بڑا اسٹیشن ہے، لیکن عملہ کی کمی کے باعث خبر ملی کہ اس زمانے میں ریل رکنا بند کر دیا گیا تھا۔ لہٰذا فیصلہ کیا گیا کہ لاہور سے بس کے ذریعے سفر کیا جائے۔ ریلوں کے بند ہونے کی وجہ سے بسوں پر اس قدر بھیڑ تھی کہ ایک ہفتے پہلے سیٹ بک کرانی پڑتی تھی۔ اتفاق سے آپ وہاں پہنچے تو بس کا اعلان ہو رہا تھا۔ ایک شخص عبداللہ نامی نے گجرانوالہ سے اپنی سیٹ بک کرائی تھی۔ لیکن وہ حاضر نہ تھا۔ اس سیٹ کو حاصل کرنے کی کوشش کی اور جیسے تیسے اس کو حاصل کرنے میں کامیاب ہوئے دوران فسادات گجرانوالہ میں لوگوں نے آپ کو نہ پایا تو وہ یہ یقین کر بیٹھے تھے کہ آپ شہید ہو چکے ہیں۔ کیونکہ آپ بلا اطلاع وطن چلے گئے تھے۔ آپ کی آمد پر اسکول کے اساتذہ نے اور گوجرانوالہ کے دیگر باشندوں نے

خوب خوشیاں منائیں اور آپ اپنی اصلی ملازمت پر فائز ہو گئے۔

والدین کی ہجرت

اواخر ۱۹۵۱ء میں والدین بھی ہجرت کر کے پاکستان آ گئے۔ آپ کے والد ماجد جناب مولوی اشفاق الرحمن صاحب کو نواب صاحب بہاولپور نے مدرسہ عالیہ کے شیخ الحدیث کے عہدہ پر فائز کر دیا جہاں شیخ التفسیر کے عہدے پر مولوی حبیب الرحمن صاحب کے ماموں پہلے ہی سے فائز تھے۔ خاندان کی یکجائی کی خاطر آپ بھی گجرانوالہ سے بہاولپور آ گئے۔ یہاں ایک بات یہ پیدا ہو گئی کہ مولانا احتشام الحق تھانوی صاحب بہاولپور پہنچ گئے اور مولانا اشفاق الرحمن صاحب کو ٹنڈو الہ یار کی ملازمت کے لیے اصرار کیا۔ اگرچہ آپ کی اور والدہ صاحبہ کی رائے اس ملازمت کی نہ تھی۔ لیکن والد صاحب نے مولانا احتشام الحق صاحب کے اصرار پر نواب صاحب سے معذرت کر کے کہ دین کے لیے ایک مدرسہ کا قیام اگر ان کے ہاتھوں سے ہو جائے تو آخرت کے لیے یہ بہت بڑا ذخیرہ ہو گا۔ انہوں نے ۲۵۰ روپے کی ملازمت کو قبول کر لیا۔

اس مدرسہ میں ان پر کیا گزری یہ ایک طویل داستان ہے۔ ۱۹۵۸ء میں والد صاحب پر فالج کا دورہ پڑا۔ اگرچہ پہلے بھی فالج کے اثرات ہو چکے تھے لیکن اس سے سنبھل گئے تھے۔ بالآخر ماہ رجب ۱۳۷۵ھ کو والد صاحب نے انتقال فرمایا اور مدرسہ کے حدود میں دفن ہوئے جو ان کے لیے خاص طور پر اجازت دی گئی تھی۔ بعد میں والدہ صاحبہ بھی وہیں ۱۹۸۰ء میں دفن ہوئیں۔

والد مرحوم کی والہانہ محبت

مولوی اشفاق الرحمن صاحب اپنے صاحبزادے مولوی حبیب الرحمن صاحب پر بچپن سے بہت مہربان تھے اور بڑی محبت فرماتے تھے کہ آپ کی موجودگی میں کبھی ان کے بغیر کھانا نہیں کھاتے تھے اور صاحبزادے نے بھی ان کی زندگی میں سوائے ہجرت کے اور کوئی نافرمانی ان کی نہیں کی۔

ٹنڈو جام میں امامت اور تراجم کا آغاز

گجرانوالہ سے آپ نے بہاولپور پھر والد صاحب کے ساتھ ٹنڈو الہ یار آنے کے بعد چند دن وہاں قیام کیا پھر کراچی آ کر ابتداءً ٹیوشن پڑھاتے رہے۔ اس مرتبہ ۱۹۶۰ء میں ٹنڈو جام کے اندر ایک مسجد میں امامت کی۔ وہاں کی امامت کے دوران تراجم کا سلسلہ شروع ہوا۔ قرآن محل کے مالک مولوی محمد سعید کے لڑکے خواجہ عبدالوحید نے آپ سے نسائی، ابن ماجہ، موضوعات ملا علی قاری کا ترجمہ کروایا۔ اسی

دوران سب سے پہلی کتاب "اہمیت تبلیغ" تصنیف کی۔

شادی آپ کی شادی سن ۱۹۶۰ء میں ہوئی۔ شادی کی تاخیر کی وجہ یہ ہوئی کہ والدہ صاحب ابتداء ہی سے یہ چاہتی تھیں کہ آپ کی شادی ننھیال میں ہو جس کے لیے آپ تیار نہ تھے۔ چونکہ ننھیال سے طبیعت میل نہ کھاتی تھی۔ اس لیے آپ کی شادی غیر خاندان میں مولانا حامد بدالیرتی کی چچازاد بہن سے ہوئی جو مسلک کے لحاظ سے بالکل عین ضد تھے۔

کراچی میں تصانیف اور تراجم کا سلسلہ شادی کے بعد آپ کراچی آگئے اور سب سے پہلے تاج کمپنی میں قرآن کی تصحیح پر ملازمت کی۔ ڈیڑھ سال وہاں کام انجام دیا۔ اسی دوران آپ بیمار پڑ گئے، وہاں کی ملازمت چھوڑ کر پیر الٰہی بخش کالونی میں مسجد باتمیہ کی امامت کرلی۔ تقریباً دو سال وہاں گزارے اور اسی دوران میں "اصول فقہ" اور "اصول حدیث" تصنیف کیں۔ امامت چھوڑنے کے بعد مباحث اسلامی کے ادارے میں کام کرتے رہے اور اُن کی جانب سے جصاص رازی کی "احکام القرآن" کی تین جلدوں کا ترجمہ کیا اور اس پر حواشی لکھے۔ یہ تینوں جلدیں بڑی باریک ٹائپ کے بارہ سو صفحات پر مشتمل ہیں۔

اس کے بعد کلام کمپنی کے جانب سے کتاب "الاذکار" کا ترجمہ کیا۔ "حصن حصین" کی شرح لکھی۔ قرآن محل والوں کی جانب سے "گلستان" و "بوستان" کا ترجمہ کیا اور متعدد کتابوں پر مقدمے لکھے۔

ایچ ایم سعید کمپنی پاکستان چوک کی جانب سے "احسن المسائل" کی اردو تبدیل کی "طحاوی" کا عربی میں مقدمہ لکھا۔ "تفسیر بیضاوی" کا عربی میں مقدمہ لکھا اور پوری کتاب پر حاشیے چڑھائے۔

"الفوز الکبیر فی اصول التفسیر" کا ترجمہ کیا جو قرآن محل کراچی نے شائع کیا ہے۔ تاج کمپنی سے وابستگی کے زمانے میں آپ نے ۱۹۶۲ء میں "شرح اسماء الحسنیٰ" لکھی تھی۔ دوسری کتاب "الادعیۃ الماثورۃ" (حضورؐ کی دعائیں) لکھی تھی۔

عتیق پریس میکلوڈ روڈ کراچی کی جانب سے ناصر الدین البانی کی کتاب "الحج" کا ترجمہ کیا جو بغیر نام کے شائع ہوا۔ آپ نے "زیارۃ القبور" کا بھی ترجمہ کیا جو ابھی شائع نہیں ہوا۔ پردے سے متعلق بھی ایک کتاب لکھی جو ... کی خواہش پر لکھی گئی تھی مگر شائع نہیں ہوئی۔ "غنیۃ الطالبین" کا مسودہ رکھا ہوا ...

[illegible]

نہیں کیا جا سکا۔ اس میں ۱۲۵ کتابوں کے حوالہ جات ہیں۔ صحیح مسلم پر عربی میں حاشیہ چڑھایا تھا۔ اس کا مسودہ کلام کمپنی کراچی کے پاس محفوظ تھا۔ مشکوٰۃ الانوار[۲۲] ایس۔ ایم واحد تاجر کتب جوڑیا بازار کراچی کی جانب سے شائع ہوئی ہے۔ نفیس اکیڈمی کراچی نے بھی آپ کی ایک کتاب شائع کی ہے اور وہ ہے تاریخ طبری جلد چہارم۔

شفیق پریس کی جانب سے ناصر الدین البانی کی متعدد عربی کتابوں کے تراجم کئے۔ مذکورہ بالا کتب کی تصنیف و تالیف کے دوران آپ پر یہ تلخ حقیقت واضح ہوئی کہ تجارتی ادارے اور ناشرین کتب صرف وہی کتابیں شائع کرتے ہیں جو ان کے مفاد اور تجارت کے لیے منفعت بخش ہوں۔ اس کام سے دل برداشتہ ہو کر آپ نے تجارت شروع کر دی اور گرین ٹاؤن میں ایک چھوٹی سی دوکان کھول لی

ان تمام امور کے ساتھ ساتھ درس قرآن اور رد شرک و بدعت کا سلسلہ بھی جاری رہا ہے۔ اور جو تا حنوز قائدین کالونی میں تسلسل کے ساتھ جاری ہے۔ آج کل علامہ صاحب اردو میں موضوعات جمع فرما رہے ہیں۔ اس موضوع پر اردو میں تا حال کوئی کتاب نہیں لکھی گئی۔ اللہ کرے وہ جلد پایۂ تکمیل کو پہنچ کر قارئین کے سامنے آجائے۔

یہ انہی کی ذات ہے جو انھوں نے اتنے اہم موضوعات پر قلم اٹھایا ہے ورنہ آج کل تو اہل علم بھی اندھی تقلید میں مبتلا نظر آتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ انھیں جزائے خیر عطا فرمائے۔ آمین۔

مزید حالاتِ زندگی

آبائی وطن: آپ کا آبائی قصبہ کاندھلہ ضلع مظفر نگر یو پی ہے۔ یہاں کے علماء خاندان سے آپ کا تعلق ہے آپ کے خاندان نے ہر دور میں بیش بہا خدمات انجام دی ہیں۔ آپ کی ننھیال مفتی الٰہی بخش صاحب مرحوم کی اولاد میں سے ہے۔ جنہوں نے مثنوی مولانا روم کا آخری دفتر مکمل کیا۔ اور جن کی اولاد میں سے مولانا محمد الیاس اور مولانا محمد زکریا صاحب ہیں۔ مولانا محمد ادریس صاحب کاندھلوی فقیر کے سگے ماموں تھے۔ مولانا محمد مالک صاحب مولوی محمد نعمان صاحب اور مولوی محمد صاحب علامہ کے ماموں زاد بھائی ہیں جو مختلف عہدوں پر سرفراز ہیں۔

آپ کے والد مشہور عالم دین مفتی اشفاق الرحمان کاندھلوی ہیں جو ابتداء میں مدرسہ فتحپوری دہلی کے مفتی رہے پھر مولانا سلطان محمود صاحب کے شیخ الحدیث مقرر ہوئے اس کے بعد ریاست بھوپال میں مفتی اعظم کی خدمات انجام دیتے رہے۔ بعد ازاں علامہ شبیر احمد عثمانی صاحب مرحوم کی طلبی پر عازم پاکستان ہوئے لیکن اتفاق سے کراچی اس وقت پہنچے جب علامہ کی وفات کو چند روز ہو چکے تھے۔ دو ایک دن علامہ مرحوم کی جائے قیام پر ٹھہرنے کے بعد بھاولپور مولنا محمد ادریس صاحب کے پاس تشریف لے گئے۔ بعد ازاں مولانا احتشام الحق صاحب (مرحوم) بھاولپور تشریف لائے۔ ان کی طلبی پر دار العلوم الاسلامیہ ٹنڈو الہیار تشریف لائے اور یہاں دار العلوم کے مفتی متعین ہوئے۔

کچھ عرصہ بعد دار العلوم کی کمیٹی میں اختلاف ہوا اور متعدد علماء نے دار العلوم کو خیرآباد کہا جن میں مولانا سعید الرحمٰن صاحب بنوری اور مولانا محمد یوسف بنوری بھی تھے۔ آپ مولوی عبد الرحمٰن صاحب کی جگہ شیخ الحدیث متعین ہوئے لیکن اس عہدے پر دو تین ہی سال گذرے تھے کہ آپ پر فالج کا حملہ ہوا۔ اگرچہ پہلے حملے کے بعد آپ کچھ سنبھل گئے۔ لیکن دوسرے حملے کے بعد مدرسہ آنا جانا ختم ہو گیا اور آپ کی جگہ علامہ ظفر احمد صاحب عثمانی کا تقرر ہوا اور کچھ عرصہ بعد والد صاحب رحلت فرما گئے۔

اشفاق الرحمٰن صاحبؒ نے ترمذی کی عربی میں شرح تحریر کی لیکن صرف اس کا پہلا حصہ کتبخانہ رحیمیہ والوں نے شائع کیا نسائی کا عربی حاشیہ لکھا اور وہ بھی کتبخانہ رحیمیہ نے شائع کرایا۔ کتبہ [illegible] مفتی محمد کفایت اللہ صاحب مرحوم [illegible] کفایت تھا۔

اس کے علاوہ اردو میں اور چھوٹے موٹے رسائل تحریر کیے جو اکثر ہندوستان میں رہ گئے۔ عربی نسائی کے بعض نسخے دستیاب ہوتے ہیں۔ پاکستان آنے کے بعد موطا امام مالک کی عربی شرح کشف المغطا کے نام سے تحریر کی جو کتب خانہ نور محمد کراچی نے شائع کی اور آج تک شائع ہو رہی ہے۔

تاریخ وفات: علامہ ممدوح بروز پیر بتاریخ ۲۲ رمضان المبارک ۱۴۱۱ھ مطابق ۸ راپریل ۱۹۹۱ء انتقال فرما گئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون ــــ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ مرحوم کو ان کی دینی خدمات عالیہ کے طفیل جنت میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے۔ آمین ثم آمین۔ (ادارہ)

محمد عظیم الدین محبت
ایم اے (عثمانیہ)

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

گذارشِ احوالِ واقعی

عقائد کی خرابی عمل کے بگاڑ کا باعث ہوتی ہے، اس سے ہر مسلمان واقف ہے، لیکن اس کے باوجود وہ بداعتقادیوں کا بری طرح شکار ہو جاتا ہے، جس کی اہم وجہ یہ ہے کہ وہ خود علم دین سے واقف نہیں ہوتا اور دوسروں کے علم پر بھروسہ کرنے پر مجبور ہوتا ہے لیکن دوسرے بھی بہت سی باتوں سے خصوصاً مذہبی داستانوں اور قصوں کی حقیقت سے ناواقف اور بداعتقادی کا شکار ہوتے ہیں۔ نتیجتاً دین کے نام سے غلط سلط جو بات اس تک پہنچتی ہے وہ اس پر ایمان لے آتا ہے اور غلط عقیدہ قائم کر کے غلط راہ پر چل پڑتا ہے۔ یہ صورت حال عام اور کثرت سے نمایاں ہے۔

پیش کردہ تحقیقی مواد میں قرآن، احادیث اور تاریخ کی روشنی میں ان مذہبی داستانوں اور حکایتوں کا جائزہ لیتے ہوئے ان فریب کاریوں کا پردہ چاک کیا گیا ہے اور حقیقت بیان کی گئی ہے، جو کہ ہمارے عوام اور خواص میں مقبول ہیں اور ہمارے اعتقاد کا حصہ بن گئی ہیں، لیکن خلافِ عقل و نقل ہیں۔ ان غلط و فرضی داستانوں کو عوام کے ذہنوں پر مسلط کرنے کے لئے ملک کے اخبار، رسائل، جرائد، مضمون نگار و مقرر حضرات ملک گیر پیمانے پر سرگرم عمل نظر آتے ہیں اور بداعتقادیوں کو تقویت پہونچاتے رہتے ہیں۔ ریڈیو اور ٹیلی ویژن کے حکومتی ادارے بھی ان کی تشہیر میں خاصا کردار ادا کر رہے ہیں۔ مختصراً یہ کہ ملک کے تمام ذرائع ابلاغ حکومتی ہوں یا غیر حکومتی سب ہی اس قسم کی غلط بیانیوں میں ہمہ تن مصروف ہیں اور اگر کسی سمت سے کبھی تنقید کی جاتی ہے تو کوئی اثر نہیں لیا جاتا اور غلطیوں کا پروپیگنڈہ بدستور جاری رکھا جاتا ہے اور کسی کے نقصان کی پرواہ نہیں کی جاتی۔ چنانچہ اسی صورت حال کے تدارک کے لئے کتاب ہذا وجود میں لائی گئی ہے تاکہ خصوصیت کے ساتھ سنی حضرات جو ان فرضی و خود ساختہ داستانوں کی سحر آفرینیوں کا شکار ہو چکے ہیں اگر نجات حاصل کرنا چاہیں اور عقائد کی درستگی کے خواہاں

ہوں تو مستفید ہوسکیں اور آئندہ آنے والی نسلوں کو بھی عقائد کی تباہی سے محفوظ کرسکیں، جوکہ عقلمندی کے تقاضوں کے عین مطابق ہوگا۔

اس کتاب میں ایسی ہی مذہبی داستانوں سے متعلق بحث کی گئی ہے اور ان کو اغیار کا خود ساختہ و مفسدانہ کارنامہ ہونا ثابت کیا گیا ہے، جوکہ اہل سنت حضرات کے عقائد خراب کرنے کے لئے وضع کی گئی ہیں اور جن کو صحیح تسلیم کر لینے سے اکثر اوقات قرآن و احادیث صحیحہ کا انکار لازم آ جاتا ہے جوکہ شدید گناہ کا باعث بن سکتا ہے۔ ان اور ان جیسی اور دوسری داستانوں کو اتنی شہرت دے دی گئی ہے کہ ہند و پاک کے مسلمانوں کا کوئی طبقہ ان کے اثر بد سے بچ نہیں سکا۔ یہ دوسری بات ہے کہ کوئی کم متاثر ہوا ہے اور کوئی حد سے زیادہ۔ اور جو بھی متاثر ہوا ہے وہ بداعتقادی کا شکار ضرور ہوا ہے اور اس بداعتقادی کا دور کرنا از بس ضروری ہے۔ قرآن حکیم نے مسلمانوں کو حکم دیا ہے کہ جب کوئی فاسق خبر لائے تو اس کی تحقیق کر لی جایا کرے، یعنی بلا تحقیق ہر بات کو آگے بڑھا دینا درست نہیں ہوتا اس میں نقصان ہی کا اندیشہ ہے، جیسا کہ آج کل کے غیر محتاط حضرات اپنی تحریروں اور تقریروں کے ذریعہ نقصان پہنچا رہے ہیں۔ یہ تحریری کاوش اسی غرض سے پیش خدمت کی جارہی ہے کہ آپ حضرات مروجہ مذہبی داستانوں کی حقیقت سے واقف ہو جائیں اور کتاب میں بتلائے ہوئے اصولوں کے ذریعہ خود بھی کسی روایت کی صداقت یا عدم صداقت کا پتہ چلا سکیں۔ توقع ہے کہ قارئین اس سے ضرور فائدہ اٹھائیں گے۔

یہ بات انجمن کے علم میں ہے کہ اس کتاب کے مختصر پیمانے پر اجراء سے وہ بڑے پیمانے پر اعتقادات کی تبدیلی نہ لا سکے گی۔ چنانچہ اس جدوجہد کو کامیاب بنانے کے سلسلہ میں وہ قارئین سے تعاون کی استدعا کرتی ہے کہ اگر وہ اس تحقیق کو صحیح اور ناقابل تردید پائیں تو وہ اپنے حلقہ اثر میں اس تحقیق کو عام کریں تاکہ دوسرے بھی اس سے مستفید ہوں اور بات آگے بڑھتی چلی جائے ویسے تو سب ہی مسلمانوں کو اغیار کی خود ساختہ فرضی داستانوں کی نقصان رسانیوں سے محفوظ رکھنے کی ضرورت ہے، لیکن موجودہ جوان نسل اور آنے والی نسلوں کو تحفظ فراہم کرنا اس سے بھی زیادہ ضروری ہے کیونکہ انہی نسلوں کے افراد آئندہ ان فرضی داستانوں کے فروغ یا عدم فروغ کا ذریعہ بننے والے ہیں۔

اگر انکو بداعتقادی کا درس شروع ہی سے نہ دیا جائے اور حقیقت سے روشناس کیا جاتا رہے تو اُمید کیجا سکتی ہے کہ کسی نہ کسی وقت اس قسم کی بداعتقادیوں پر قابو پا لیا جائیگا۔ اس کیلئے ہم سب ہی کو ایک تحریک کیطور پر جدوجہد کرنی ہوگی اور اپنی اسلامی حکومت کو بھی مجبور کرنا پڑیگا ہر سطح کی تعلیمی نصاب کی کتابوں سے ان فرضی داستانوں کو مکمل طور پر خارج کر دیا جائے۔ نیز ریڈیو اور ٹی۔وی کے ذریعہ انکو صحیح کیطور پر پیش کرنیکا سلسلہ منقطع کیا جائے تاکہ مسلمانوں کے عقائد غلط طور پر متاثر نہ ہوتے رہیں اور بداعتقادی کو سہارا نہ ملتا رہے۔ جھوٹ کی تشہیر ویسے بھی جائز نہیں ہوتی۔ اُمید کیجاتی ہے کہ مقتدر حضرات بالخصوص ان علماء کرام سے جنکو ہماری اس تحقیق سے اتفاق ہو، التماس ہے کہ اس گلو خلاصی کی جدوجہد میں تعاون فرمائیں اور اغیار کی ان تراشیدہ فرضی داستانوں کی، جنکے ذریعہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ گرامی، صحابہ کرام، ازواجِ مطہرات، تابعین و دیگر قابلِ قدر ہستیوں کے متعلق جھوٹ بولا گیا ہو یا جنکے ذریعہ کسی کے اعزاز، کردار یا ناموس پر آنچ آتی ہو، جانچ پڑتال کر کے انکو تاریخ اور دینی کتب سے خارج کرنیکی تگ و دو فرمائیں تاکہ غلطیوں سے پاک قرار دیجا سکے اور کسی کو انگشت نمائی کا موقعہ نہ ملے۔

آخر میں انجمن ہذا اُن تمام کرم فرماؤں کا پیشگی شکریہ ادا کرنا چاہتی ہے جو کسی بھی ممکنہ طریقہ سے کتاب ہذا کے مندرجات کو آگے بڑھاتے ہوئے دوسروں سے روشناس کروائینگے نیز ایسے حضرات کی بھی بیحد ممنون ہوگی، جو ہماری اس تحقیقی کاوش میں ہماری کسی غلطی کی نشاندہی فرمائینگے یا معقول اعتراض وارد کرینگے تاکہ معقول اعتراضات کو خندہ پیشانی سے قبول کرتے ہوئے کتاب کی آئندہ متوقعہ اشاعت میں حسبِ تصحیح کیجا سکے۔ یہاں اس امر کا اظہار بھی نہایت ضروری ہے کہ اس تحقیقی مواد کے پیش کرنے سے کسی فرقے کی دل آزاری یا خیالات و اعتقادات کی تردید مطلوب نہیں ہے، بلکہ صرف اہلسنت حضرات کو عقائد باطلہ اور ان سے مضر اثرات سے نجات دلانا مقصود ہے جو کہ دیگر مسلمانوں کی بھی دینی ذمہ داری قرار پا سکتی ہے۔

اللہ تعالیٰ سے دل کی گہرائیوں کیساتھ دُعا کیجاتی ہے کہ ہم سبوں کو حق و باطل میں تمیز کرنیکی صلاحیت اُجاگر فرمائے، حق تسلیم کرنے اور باطل سے کنارہ کشی کی جرأت و توفیق سے نوازے۔ اس لئے کہ اسی میں ہم سبوں کی بھلائی ہے اور یہی ہمارا مقصدِ اصلی ہے۔ آمین ثم آمین۔ وما علینا الا البلاغ۔

معتمد عمومی۔

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ۝

حکومتِ اسلامیہ پاکستان کی خدمت میں

عرض ہے کہ انجمن اسوۂ حسنہ پاکستان کسی مخصوص مکتبہ فکر کی اسیر نہیں ہے بلکہ قرآن حکیم و سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم و عمل صحابہ کو سندِ دین تسلیم کرتی ہے اور صرف انہیں احادیث و روایات کو حق تصور کرتی ہے جو کہ خلافِ عقل بھی نہ ہوں اور تحقیق کی کسوٹی پر پوری اترتی ہوں۔ کتاب ہذا اسی جانچ پڑتال اور عقل کی کسوٹی پر پرکھنے کے بعد وجود میں لائی گئی ہے اور ایسے اہم موضوع سے تعلق رکھتی ہے جس پر آج تک کسی نے غور کرنے اور قلم اٹھانے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔ اس میں متعدد تاریخی مذہبی روایات سے متعلق جو مشہور عام ہو گئی ہیں اور جن کا پرچار تقاریر، مضامین اور ٹی وی و ریڈیو جیسے حکومتی ذرائع ابلاغ کے ذریعہ کیا جاتا ہے کلام کیا گیا ہے اور ان کا جھوٹا اور فرضی ہونا ثابت کیا گیا ہے تاکہ ہم عجمی مسلمانوں کو یہ احساس دلایا جا سکے کہ ہم کس خطرے میں گھر چکے ہیں اور اس سے کیونکر گلو خلاصی کی جا سکتی ہے۔ ان فرضی مذہبی داستانوں سے اہل سنت والجماعت کے اعتقادات تباہ ہو کر رہ گئے ہیں جس کے باعث وہ متعدد مواقع پر نادانستہ طور پر قرآن و احادیث کے منکر بن جاتے ہیں جو کہ بہت بڑا خسارہ ہے۔ چنانچہ دینی اعتبار سے یہ صورت حال افسوس ناک بھی ہے اور انتہائی تشویشناک بھی اور لائق اصلاح ہے۔

انجمن کی جانب سے کتاب کے قارئین کو دعوت دی گئی ہے کہ اگر پیش کردہ تحقیقی امور پر معقول اعتراض وارد ہو سکتا ہو تو اس سے ضرور مطلع فرمائیں تاکہ اس کو قبول کرتے ہوئے حسب ضرورت تبدیلی لائی جا سکے۔ اسی طرح حکومتِ اسلامیہ پاکستان سے بھی پُرزور مطالبہ کرتی ہے کہ اگر تحقیق مولہ معقول مانی جائے اور ناقابل تردید ہو تو حکومتی ذرائع ابلاغ کے ذریعہ قرآن و احادیث صحیحہ سے

متصادم اور تاریخی اعتبار سے غلط اور ایمان میں بگاڑ پیدا کرنے والی داستانوں کی کلی و جزوی نشر و اشاعت کو قطع کر دیا جائے۔ نیز مذکورہ بالا قسم کے جو بھی غلط واقعات تعلیمی نصاب کی کتابوں میں موجود ہوں اور جن سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی، صحابہ کرام یا ازواج مطہرات وغیرہ پر کسی طور پر جھوٹ بولا گیا ہو ان کو نصابی کتب سے خارج کر دیا جائے، تاکہ موجودہ نئی اور آنے والی نسلیں بداعتقادی کا شکار ہونے سے بچ جائیں۔ تحقیق ہٰذا کے ذریعہ حکومت پر یہ حقیقت واضح کر دی گئی ہے کہ کیا سچ ہے اور کیا جھوٹ، اور اب یہ اس کی ذمہ داری بن گئی ہے کہ حق کی اشاعت کے مواقع فراہم کرے اور باطل کے پروپیگنڈے سے اجتناب کرے اور مسلمانوں کے ذہنوں کو مزید مسموم نہ ہونے دے۔ اسی میں تمام مسلمانوں کی بھلائی پوشیدہ ہے۔ اس قسم کے اقدام اس لئے بھی ضروری ہوں گے کہ موجودہ حکومت اسلام پسند ہے اور مکمل نظام اسلام نافذ کرنے اور معاشرے کو اسلامی بنانے کا عزم و وعدہ کر چکی ہے اور اسلامی نظام و اسلامی معاشرے میں منافی پروپیگنڈے اور دروغ بیانی کے فروغ کی کوئی گنجائش نہیں۔ بلکہ برائی کو جبر ختم کرنے کا حکم موجود ہے اور حکومت جبر استعمال کرنے پر قدرت بھی رکھتی ہے۔

امید کی جاتی ہے کہ اس بدنما صورت حال کے خاتمے کے لئے ہماری اسلامی حکومت مناسب و ضروری اقدام کرے گی جو کہ مسلمانوں پر ایک احسان عظیم ہوگا اور اس اسلامی ریاست کا بہت ہی اہم کارنامہ بھی۔ وما علینا الا البلاغ۔

"ادارہ"

مُقدمہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ط

نحمدہٗ ونصلی علیٰ رسولہ الکریم

اس کتاب میں ہم وہ روایات اور کہانیاں پیش کرنا چاہتے ہیں، جو مختلف مجوسی مؤرخوں اور داستان سراؤں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام وغیرہ کے سلسلہ میں وضع کیں، اور بعد کے غیر محتاط متاخرین علماء نے بغیر سوچے سمجھے انہیں اپنی کتابوں میں جگہ دی۔ جب کہ دوسری اور تیسری صدی کی اکثر کتابوں میں ان کا وجود تک نظر نہیں آتا۔

یہی وہ روایات ہیں جو میلاد ناموں کا ماخذ ہیں۔ ان ہی داستانوں پر محافل میلاد کی ہماہمی اور گرما گرمی موقوف ہے۔ اگر یہ داستانیں نہ ہوتیں تو محافل میلاد بھی وجود میں نہ آتیں۔ ان داستانوں کے نتیجہ میں یہ ضرور ہوا کہ عوام الناس ان داستانوں میں محو ہو کر رہ گئے اور مسائل کو پس پشت ڈال دیا گیا بلکہ اس طبقہ نے ان دیومالائی داستانوں کو اصل اسلام تصور کر لیا ہے، اور اسلام کی اصل روح سے دور ہٹتے چلے گئے حتیٰ کہ ان داستانوں کی لذت میں قرآن کو بھی ترک کر بیٹھے ہیں۔

ان داستانوں کو اسلام دشمن عناصر نے وضع کر کے دنیا میں اس طرح پھیلایا کہ آج ہر خاص و عام کے ذہنوں پر اس طرح مسلط ہیں کہ اصل حقیقت داستانوں میں گم ہو کر رہ گئی ہے۔ ان داستانوں کو وضع کرنے والے مختلف قسم کے لوگ تھے۔ جنہوں نے اپنے اپنے ذہنوں کے مطابق یہ کہانیاں وضع کیں۔ ان میں چند گروہ تو خاص طور پر پیش پیش نظر آتے ہیں۔

۱۔ یہودی، جنہوں نے اسلام دشمنی میں داستانیں وضع کر کے انہیں اسلام کا لبادہ پہنایا۔ ہماری تفسیری روایات کا بیشتر حصہ انہی داستانوں پر مشتمل ہے۔

۲۔ قصہ گو واعظ اور خطیب جن کا علم سے دور کا بھی واسطہ نہ تھا۔ ان لوگوں نے عوام کو اپنا معتقد بنانے اور پھر اس ذریعے سے دنیا بٹورنے کے لئے اپنے اپنے ذہن کے مطابق روایات کو عوام میں پھیلایا۔ ان میں کچھ خبیث ایسے بھی تھے جو کہ احادیث بھی وضع کرتے، اور انہیں مسلمہ آئمہ کی جانب منسوب کرکے مشہور کرتے۔ محدثین انہیں قُصّاص (قصہ گو) کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔

۳۔ تیسرا طبقہ نیک اور صوفیاء حضرات کا تھا۔ یہ وہ حضرات ہیں جنہوں نے اپنے زہد وعبادت میں انہماک کے باعث حصول علم کے لئے کوئی کوشش نہیں کی۔ جسکا نتیجہ یہ برآمد ہوا کہ جس کسی نے بھی ان کے سامنے حضورؐ یا صحابہؓ کی جانب منسوب کرکے کوئی روایت بیان کی، انہوں نے بلا تحقیق بیان کرنی شروع کر دی۔ جیسا کہ آجکل ہمارے عوام الناس کی عادت ہے۔ اس طرح ان لوگوں کی زبان پر جھوٹ چڑھ گیا۔ اور انہیں اس کی خبر تک نہ ہوئی۔

ان میں سے ایک طبقہ ایسا بھی تھا جو احادیث وضع کرنے کو کارِ خیر تصور کرتا تھا۔ بعض صوفیاء نے اس کا اقرار بھی کیا کہ ہم نے مختلف سورتوں کے فضائل میں روایات وضع کی ہیں۔ کتب تفاسیر میں اس قسم کی جتنی روایات پائی جاتی ہیں کہ فلاں سورت کی فضیلت یہ ہے اور فلاں سورت پڑھنے سے یہ کام انجام پائے گا۔ اور فلاں عمل کے لئے فلاں سورت اور فلاں آیت تلاوت کی جائے، یہ روایات سب اسی طبقہ کی وضع کردہ ہیں۔ اسی طرح نفلی نمازوں کے فضائل میں بیشتر حصہ اسی طبقہ کے ذہنوں کی پیداوار ہے۔

۴۔ ایرانیوں اور مجوسیوں کا وہ طبقہ جو اپنی سلطنت اور شان وشوکت برباد ہونے کے باعث عربوں اور اسلام کے نام لیواؤں سے عداوت رکھتا تھا اور خاص طور پر ان حضرات سے تو انہیں انتہائی بغض تھا جنہوں نے سقوطِ ایران میں کسی قسم کا حصہ لیا تھا۔ اس نے جہاں ان حضرات کو بدنام کیا ہو وہاں ان کے آباؤ اجداد، اور ان کے خاندانوں تک کو بدنام کیا۔ اور اس سلسلہ میں لاکھوں روایات وضع کی گئیں۔ اور جو صحابہ کرام جنگ ایران میں شریک نہ تھے۔ انہیں بظاہر اپنا ہیرو بنا کر اُن کے فضائل میں روایات وضع کیں۔ تاکہ امت دو حصوں پر منقسم ہو جائے۔

اتفاق سے عباسیوں اور علویوں نے بنو اُمیہ کی خلافت کا تختہ اُلٹنے کے لئے اسی طبقہ کا تعاون حاصل

کیا۔ چنانچہ خلافت عباسیہ انہی مجوسیوں اور خراسانیوں کے بل بوتے پر قائم ہوئی جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ خلافت عباسیہ کے تمام کلیدی عہدے ان ایرانیوں کے پاس رہے۔ ان کی عورتوں نے عباسیوں کے حرم میں داخل ہو کر وہ فتنے کھیلے کہ الاماں والحفیظ۔

یہ وہ انتقامی جذبہ تھا جو عربوں کے خلاف بروئے کار لایا گیا۔ ان کے مؤرخین نے سب سے زیادہ ہدف صحابۂ کرام کی ذات کو بنایا۔ جس کا مقصود اصلی یہ تھا کہ جب صحابۂ کرام دنیا پرست اور خطارکار ثابت ہو جائیں گے۔ تو دین اسلام کی بنیادیں خود بخود کھوکھلی ہو جائیں گی۔ اس لئے کہ نہ تو وہ اسلام کا نمونہ باقی رہیں گے۔ اور نہ ان کے پیش کردہ دین کا کوئی اعتبار باقی رہے گا۔ یعنی نہ بانس رہے گا نہ بانسری بجے گی۔ افسوس تو یہ ہے کہ اہل سنت والجماعت اس چال کو سمجھ نہ سکے اور سازش کا شکار ہو گئے۔ بلکہ پاکستان میں اہل سنت والجماعت کے ایک مشہور عالم نے کتاب "خلافت وملوکیت" لکھ کر ان کی ہم نوائی کا حق ادا کیا اور اس سازش کو پروان چڑھایا۔ جس کے نتیجہ میں جہاں عوام الناس گمراہی میں مبتلا ہوئے، وہاں مودودی صاحب کے معتقدین نے ان خرافات کو اپنے دین وایمان کا جزو بنالیا۔ کاش ہمارے علما صحابہ کرام کو تاریخ کے بجائے قرآن کی نظر سے دیکھتے تو انہیں صاف نظر آجاتا کہ یہ گنگا تو الٹی اوپر کو بہہ رہی ہے

غالباً یہی وجہ ہے کہ ہمارے یہاں تصوف زدہ طبقہ قرآن فہمی سے دور بھاگتا ہے۔ بلکہ عوام کو یہ درس دیا جاتا ہے کہ قرآن کو اہل دل کے علاوہ کوئی سمجھ نہیں سکتا۔ کچھ لوگ تو یہاں تک کہتے ہیں کہ کسی پیر کا دامن تھام لو قرآن سے کیا ملے گا۔

یہ وہ انداز فکر ہے جو ان دیو مالائی داستانوں کے ذریعہ ہم میں پیدا کیا گیا ہے۔ اگر قرآن وسنت کو پھیلانے والے ہر دور میں پیدا نہ ہوتے، اور حقائق پر سے پردہ نہ ہٹاتے رہتے تو حضورؐ کی ذات بھی ایک دیو مالائی حیثیت اختیار کر لیتی، بلکہ آپؐ کے مقام کو پہچاننا بھی دشوار ہو جاتا۔ یہ اسی کا اثر ہے کہ مقام نبوت کو مقام الوہیت کے دوش بدوش کھڑا کر دیا گیا ہے۔ بلکہ مقام ولایت کے ذریعہ مقام صحابیت کو فنا کے گھاٹ اتار دیا گیا۔

اس تخریب کاری کا نتیجہ یہ ظاہر ہوا کہ آج روئے زمین پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم یا آپ کے صحابہ کی

سیرت سے متعلق ایسی کوئی کتاب موجود نہیں جس پر یقین واعتماد کیا جاسکے کہ یہ سو فی صد درست ہوگی۔ حتی کہ سید سلیمان ندوی مرحوم نے اپنی سیرت النبی میں اس کا اقرار بھی فرمایا۔ اسی لئے انہوں نے متعدد واقعات پر تنقید فرمائی۔ بلکہ سید صاحب سے صدیوں قبل حافظ عراقی نے جو حافظ ابن حجر کے استاد تھے اپنی سیرت منظوم میں فرمایا تھا۔

وليعلم الطالب ان السيرا　　　تجمع ما قد صح وما قد انكرا

طالب علم کو یہ جان لینا چاہیئے کہ سیرت کی کتابوں میں صحیح اور منکر ہر قسم کی روایات جمع کی جاتی ہیں،

اس کی وجہ صاف ظاہر ہے کہ تاریخ اور سیرت رسول پر ابتدائی طور پر قلم اٹھانے والے مجوسی النسل اور سبائی ذہن رکھنے والے لوگ تھے۔ ان کا دل ہرگز بھی اس وقت تک ٹھنڈا نہیں ہو سکتا تھا جب تک وہ اپنی تخریب کاری کا کوئی جوہر نہ دکھائیں۔ اور اتفاق یہ ہے کہ بعد کے آنے والے علماء ان مجوسیوں کی کتابوں پر اعتماد کرتے ہوئے سیرت و تاریخ میں ان ہی باتوں کو من وعن نقل کرتے چلے گئے حتیٰ کہ ان داستانوں نے اب ایک مذہبی حیثیت اختیار کر لی ہے۔

سب سے پہلا مورخ جس نے غزوات النبی پر کتاب لکھی وہ محمد بن اسحٰق بن یسار ہے یونس بن عقبہ نے بھی ایک کتاب لکھی تھی، لیکن وہ تو ابتدا ہی میں ناپید ہوگئی تھی۔ اگرچہ کتاب تو ابن اسحٰق کی بھی ناپید ہے۔[1] لیکن ابن ہشام نے اسی کی کتاب کو نئی ترتیب و تزئین کے ساتھ پیش کیا ہے۔ نام تو اس کا بے شک سیرت ابن ہشام ہے لیکن دراصل وہ مغازی محمد بن اسحٰق ہے۔

محمد بن اسحٰق مجوسی النسل تھا۔ یہودیوں سے روایات لیتا، شاعروں سے اشعار لکھوا کر صحابہ کی جانب منسوب کرتا تھا۔ تقدیر کا منکر اور شیعہ تھا۔ ہشام بن عروہ اور امام مالک وغیرہ اسے کذاب کہتے ہیں۔ اس سے اس کی کتاب کو نقل کرنے والے دو شخص ہیں سلمۃ الابرش اور زیاد بکائی اور دونوں مجوسی اور دونوں کذاب ہیں۔ ابن ہشام نے ابن اسحٰق کی کتاب زیاد البکائی سے نقل کی ہے۔

سلمۃ الابرش رازی سے اس کتاب کو نقل کرنے والا حمید الرازی ہے۔ اسی سے طبری نے روایات لی ہیں۔ یہ سب مجوسی ہیں اور سب سبائی ذہن کے مالک تھے۔

[1] ڈاکٹر حمید اللہ (پیرس) نے اطلاع دی تھی کہ ابن اسحاق کا نسخہ مل گیا ہے جناب محمد طفیل نے اپنے رسالہ نقوش لاہور کے رسول نمبر کی

دوسرا مشہور مورخ واقدی ہے جو محدثین کے نزدیک کذاب زمانہ ہے۔ اور کٹر رافضی ہے۔ یہی حال ابو مخنف لوط بن یحییٰ، سدی، کلبی، اسمٰعیل بن موسیٰ الفزاری اور سری بن اسمعیل کا ہے۔ یہ سب خالص سبائی ہیں۔

ان کے بعد آنے والے جتنے مورخین ہیں خواہ وہ سنی ہوں یا سبائی، سب کا دارومدار ان ہی مذکورہ افراد کی کتابوں یا روایتوں پر موقوف ہے۔ مثلاً ابن سعد اگرچہ سنی ہیں لیکن ان کی کتاب میں ستر فی صدر روایات تو واقدی سے مروی ہیں۔ ابن ہشام اگرچہ سنی ہیں لیکن ان کی کتاب دراصل ابن اسحٰق کی کتاب ہے۔ بلاذری کی کتابیں ان سب کی روایات کا مجموعہ ہیں۔

ان سبائی اور مجوسی مورخین نے جو بہرزہ سرائیاں کی تھیں انہیں ابن جریر طبری مجوسی نے اپنی کتاب میں نہ صرف جمع کیا بلکہ مزید اضافات بھی کئے۔ اور مسعودی تو ان سب سے ایک قدم آگے ہے۔

بعد کے سنی علماء کی اگر کتابوں کو اٹھا کر دیکھا جائے تو وہ ان کتابوں کا چربہ نظر آتی ہیں۔ ابن خلدون نے مقدمہ میں تاریخ کو پرکھنے کے لئے کچھ اصول وضع کئے اور کچھ خلاف عقل روایات کو خیرباد بھی کہا۔ لیکن طبری، واقدی اور ابن اسحاق سے باہر نہ جاسکے۔

اگر ان تمام امور کو نظرانداز بھی کر دیا جائے تو حدیث اور تاریخ میں تب بھی اصولی طور پر زبردست تضاد ہے۔ جس کے سبب تاریخ کی کوئی حیثیت باقی نہیں رہتی۔ محدثین نے روایت حدیث کے سلسلہ میں راوی کے لئے جو شرائط رکھی ہیں ان میں سے ہم چند قارئین کی خدمت میں پیش کئے دیتے ہیں۔

۱۔ راوی مسلم ہو، عاقل ہو، بالغ ہو۔

۲۔ راوی معروف و مشہور شخص ہو، مجہول راوی نہ ہو۔

۳۔ اس کا حافظہ قوی ہو، بھول کا مادہ نہ ہو۔

۴۔ عادل ہو، یعنی گناہ کبیرہ کا مرتکب نہ ہو۔

۵۔ صادق ہو۔ یعنی جھوٹا نہ ہو، حتیٰ کہ دنیاوی معاملات میں بھی اس سے جھوٹ بولنا ثابت نہ ہو۔

۶۔ مصنف کتاب سے حضورتک روایت کا تسلسل برقرار رہے۔ درمیان سے کوئی راوی ساقط نہ ہو۔

۷۔ایک راوی کا دوسرے راوی سے روایت سننا یا ملاقات کرنا ثابت ہو۔

۸۔راوی ایسی روایات بیان نہ کرتا ہو جو دیگر راوی بیان نہیں کرتے۔

اس کے برعکس مورخین کا اصل الاصول یہ ہے کہ روایت ملنی چاہیے۔خواہ راوی مسلم ہو یا کافر، سچا ہو یا جھوٹا۔بالغ ہو یا نابالغ، عاقل ہو یا مخبوط الحواس۔تسلسل برقرار رہے یا نہ رہے۔خواہ درمیان سے کئی راوی چھوٹ جائیں۔راوی کو کوئی جانتا ہو یا نہ جانتا ہو، راوی کا دوسرے راوی سے سننا ثابت ہو یا نہ ہو۔صرف روایت کا وجود ہونا چاہیئے۔

محدثین نے راوی کے لئے وہی شرائط رکھی ہیں جو شریعت نے شاہد کے لئے رکھی ہیں اور ہر واقعہ اور ہر خبر ان کے نزدیک شہادت ہے اور جب گواہ ناقابل قبول ہوگا تو کسی واقعہ کو کیسے تسلیم کر لیا جائے گا۔

ان شاہدین کا حال معلوم کرنے کے لئے محدثین نے سینکڑوں اور ہزاروں میل کے سفر کئے اور ایک ایک راوی کا ظاہر و باطن معلوم کیا۔حتیٰ کہ ان کا مذہب کیا تھا۔زندگی میں کس کس سے استفادہ کیا۔کہاں کہاں کا سفر کیا۔کون کون سی روایت بیان کی۔اس سے نقل کرنے والے کون کون افراد تھے۔ الغرض اس طرح ایک ایسا فن ایجاد کیا جو آج تک روئے زمین پر کوئی دوسری قوم ایجاد نہ کر سکی۔اور کئی لاکھ راویوں کے حالات جمع کر ڈالے۔بلکہ اس فن کے باعث مزید فنون ایجاد ہوئے۔مثلاً فن علل، فن جرح و تعدیل۔علم الروایہ۔علم الدرایہ، علم الاسماء والصفات، علم المشتبہ، علم الکنی، علم الضعفاء، علم الثقات، اور پھر ان میں سے ہر فن پر بیسیوں کتابیں تحریر میں لائی گئیں۔

اب ایسی صورت میں تاریخ کے ذریعہ حدیث کے معاملہ میں فیصلہ دینا ایسی ہی حیثیت رکھتا ہے جیسا کہ کسی کذاب زمانہ کو کسی سچے انسان کے خلاف فیصلہ دینے کے لئے جج متعین کر دیا جائے۔

تاریخ کی یہ صورت حال سمجھنے کے بعد اُن لوگوں کے ذہن کا قارئین خود اندازہ کر سکتے ہیں جو حدیث کے خلاف زہر اگلتے پھرتے ہیں۔دراصل انہیں اس امر کا خوف ہے کہ کہیں

استعمال کر کے ان کے جھوٹ کی پول نہ کھول دے۔کیونکہ یہ عمارت بغیر بنیاد کے قائم ہے۔اس کیلئے

تو معمولی سا جھٹکا بھی کافی ہوگا۔ دشمنان اسلام اور سبائیوں کو تو یہی فکر لاحق ہے۔ لیکن مودودی صاحب کو اپنی سیادت کی فکر لاحق ہوئی۔ اور اس کے لئے انہوں نے آئندہ کا سدباب کرنے کے لئے یہ اصول بھی پیش کر دیا کہ اگر تاریخ میں ان معروف و مسلمہ اصولوں سے کام لیا گیا اور راویوں پر جرح و تنقید کی گئی تو ہمارے پاس کیا بچے گا۔ ملاحظہ ہو کتنے حسین الفاظ میں کئی سو سال کے علماء کی کوششوں پر پانی پھیر اگیا ہے۔ اور کس طرح سبائیوں کی پشت پناہی کی گئی۔

لیکن قربان جائیے محمود احمد عباسی کے انھوں نے "خلافت معاویہ و یزید" لکھ کر بہت سوں کو ننگا ہونے پر مجبور کر دیا۔ لیکن یہ لوگ اپنے موقف میں اتنے آگے بڑھ گئے ہیں کہ ان خمینی کی امامت کے گیت گانے لگے ہیں۔ جو اپنی "ولایت فقیہ" میں تمام انبیاء کو ناکام اور صحابۂ کرام کو غاصب اور ظالم قرار دیتے ہیں۔

یہ نظریہ تو مودودی صاحب کا ہے۔ لیکن علامہ شبلی مرحوم نے سیرت النبی کی جلد اول میں متعدد مقامات پر اصول حدیث سے کام لیا۔ اور ان کے بعد ان کے شاگرد رشید سید سلیمان ندوی مرحوم نے اس فن کو کافی اجاگر کرنے کی کوشش کی۔ ہماری اس کتاب کا مقصود بھی یہی ہے کہ ان مجوسیوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابۂ کرام وغیرہ کی جانب جو غلط باتیں منسوب کی ہیں۔ ان کا پردہ فاش کیا جائے اور حقیقت سے روشناس کرایا جائے۔

ہماری اس تحریر کا مقصد ہرگز یہ نہیں کہ ہر تاریخی روایت کا رد کر دیا جائے بلکہ وہ تاریخی روایات جو دور اول میں تواتر کے ساتھ ثابت تھیں اُن پر کوئی اعتراض واقع نہ ہوگا۔ اعتراض تو صرف اُن کہانیوں پر ہے۔ جنہیں ایک شخص کے علاوہ کوئی دوسرا روایت نہیں کرتا۔ اور وہ شخص سبائی یا مجوسی ہو۔ ایسی صورت میں اس کی روایت ہرگز قابل قبول نہ ہوگی۔ محدثین جب تاریخ کا حوالہ دیتے ہیں تو اُن کی مراد واقعات نہیں ہوتے۔ بلکہ وہ تاریخ سے صرف اتنا کام لیتے ہیں کہ فلاں شخص کب پیدا ہوا اور فلاں شخص کی موت کب واقع ہوئی تاکہ یہ معلوم کیا جاسکے کہ ان دونوں کی ملاقات ممکن بھی ہے یا نہیں۔ اگر وہ ملاقات ہی ممکن

نہیں تو واقعہ کا وجود سرے سے باطل ہو جاتے گا۔ مثلاً طبری کا یہ دعویٰ کہ مجھے سری بن اسمٰعیل نے فلاں واقعہ لکھ کر بھیجا۔ سری کا انتقال ۱۸۲ھ میں ہے۔ جب کہ مؤرخ طبری ۲۲۴ھ میں پیدا ہوا۔ تاریخ کا یہ حصہ اسماء الرجال کا ایک اہم جزو ہے۔ صرف اسی بات سے مودودی صاحب کے اس دعویٰ کی حقیقت کھل جاتی ہے کہ طبری ایک محقق مؤرخ ہے اور اس نے چھان پھٹک کے بغیر کوئی روایت نقل نہ کی ہوگی۔ اس سے بڑھ کر اندھی وکالت اور کیا ہوگی۔ قربان جائے اس سادگی کے۔

ہمارے علماء چونکہ ان تحقیقی فنون کو اب بالائے طاق رکھ چکے ہیں۔ اسی لئے وہ مجبور ہو کر یہ کہتے ہیں کہ فلاں روایت بخاری و مسلم میں پائی جاتی ہے۔ لہٰذا اس پر ایمان لانا ضروری ہے۔ کیونکہ بخاری و مسلم نے صحت کا اہتمام کیا ہے۔ اور صرف ثقہ راویوں سے روایت لی ہے۔ حالانکہ ہم دیکھتے ہیں کہ بخاری و مسلم میں بعض روایات باہم متضاد ہوتی ہیں۔ ظاہر ہے کہ ایسی صورت میں صرف ایک ہی روایت کو صحیح تسلیم کیا جائے گا۔

رہا یہ دعویٰ کہ ہر وہ راوی ثقہ ہوگا جس سے بخاری و مسلم روایت کریں۔ تو بے شک وہ ان حضرات کے نزدیک ثقہ ہے لیکن اس سے ہرگز یہ لازم نہیں آتا کہ دیگر ائمہ کے نزدیک بھی وہ راوی ثقہ ہو۔ مثلاً عکرمہ مولیٰ ابن عباس، بخاری نے اس سے روایت لی ہے۔ لیکن امام سعید بن المسیب، امام محمد بن سیرین، ابن عون، حماد بن زید، علی بن عبداللہ بن عباس اور امام مالک فرماتے ہیں وہ کذاب ہے۔ یا مثلاً شریک بن عبداللہ المدنی سے مالک اور بخاری وغیرہ نے روایت لی ہے۔ لیکن مسلم کا دعویٰ ہے کہ اس کا حافظہ خراب تھا۔ وہ روایت میں کبھی کمی کرتا ہے، کبھی زیادتی، کبھی واقعہ کو آگے کرتا ہے اور کبھی پیچھے۔ اس سے یہ حقیقت کھل کر سامنے آگئی کہ بڑے سا بڑا محدث بھی اگر کسی سے روایت کرتا ہے تو اُس سے یہ لازم نہیں آتا کہ وہ تمام ماہرین فن کے نزدیک بھی ثقہ ہو۔ اسی لئے یہ احتمال باقی رہتا ہے کہ نہ معلوم کس جگہ روایت میں غلطی واقع ہوئی ہو۔ اور بعض اوقات غلطی کا احساس بھی ہوتا ہے لیکن یہ معلوم کرنا دشوار ہوتا ہے کہ یہ غلطی کس سے واقع ہو رہی ہے۔

انہی وجوہات کو پیش نظر رکھتے ہوئے محدثین نے جہاں اصولِ روایت وضع کئے۔ وہاں اصولِ

درایت بھی وضع کئے۔ یعنی عقل سے کام لیتے ہوئے کن اصولوں کے ذریعہ روایت کو پرکھا جائے گا۔ ہم ذیل میں قارئین کے سامنے وہ اصول پیش کر رہے ہیں۔

موضوع حدیث کی معرفت کے اصول

شاہ عبدالعزیز دہلوی المتوفی ۱۲۳۹ھ نے اپنے رسالہ "عجالۂ نافعہ" کے آخر میں وضع حدیث اور اس کے اسباب پر ایک مختصر سا مضمون قلم بند کیا ہے۔ جس کا ترجمہ ہم قارئین کی خدمت میں پیش کئے دیتے ہیں۔ تاکہ قارئین کرام یہ معلوم کرلیں کہ محدثین کرام نے حدیث کی حیثیت معلوم کرنے کے لئے کیا کیا اصول وضع کئے۔ جن کو پیش نظر رکھتے ہوئے ہر روایت اور ہر کہانی پر غور کرکے اس کی حقیقت معلوم کی جاسکتی ہے۔ شاہ صاحب فرماتے ہیں :-

واضح رہے کہ حدیث کے موضوع اور راوی کے جھوٹے ہونے کی چند علامات ہیں۔

۱۔ راوی تاریخ مشہورہ کے خلاف روایت کرے۔ مثلاً ایسی روایت جس سے یہ معلوم ہوتا ہو کہ حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ بن مسعود جنگ صفین میں شریک ہوئے۔ حالانکہ حضرت عبداللہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے عہد خلافت میں انتقال فرما چکے تھے۔ یہ شعر بھی اسی نوعیت کا ہے ؎

در جمل چوں معاویہؓ بگریخت　　　خون خلقے بسے بہ بیہدہ ریخت

یعنی جنگ جمل میں جب معاویہ نے فرار اختیار کیا تو بہت سی مخلوق کا خون بے کار بہا۔ (حالانکہ جنگ جمل میں امیر معاویہؓ یا ان کا کوئی ساتھی شریک نہ تھا) اس قسم کی من گھڑت روایتیں معمولی غور و فکر اور ذرا سی تاریخی جستجو سے پہچانی جاسکتی ہیں۔

۲۔ اگر راوی رافضی ہو، اور وہ صحابہ پر طعن کے متعلق حدیث روایت کرے، یا ناصبی ہو (یعنی دشمن علیؓ) اور وہ اہل بیت کے طعن کے سلسلہ میں حدیث روایت کرے۔ (ایسی روایت موضوع ہوگی)

۳۔ راوی ایسی حدیث روایت کرے، جس کا جاننا اور اس پر عمل کرنا ہر مسلمان پر فرض ہو۔ لیکن اس کے باوجود اس راوی کے علاوہ کوئی دوسرا روایت نہ کرتا ہو۔ تو یہ حدیث کے موضوع ہونے اور

راوی کے جھوٹے ہونے کا قرینہ ہوگا۔

۴۔ وقت اور حالت ہی راوی کے جھوٹے ہونے کی دلیل ہو، جیسے غیاث بن میمون کا واقعہ کہ وہ خلیفہ مہدی عباسی کی مجلس میں حاضر ہوا، اور مہدی اس وقت کبوتر اڑا رہا تھا۔ غیاث نے یہ صورت دیکھ کر یہ حدیث بیان کی۔

لا سبق الا فی خف او نصل او حافر او جناح — گھڑ دوڑ، تیر اندازی، اونٹ دوڑانے اور پرندے اڑانے میں کوئی گناہ نہیں۔

اس غیاث بن میمون نے خلیفہ مہدی کو خوش کرنے کے لئے او جناح کا لفظ اپنی جانب سے بڑھا دیا۔ ورنہ حدیث رسول میں پرندوں کا کوئی ذکر نہ تھا۔

۵۔ روایت عقل و شریعت کے مقتضیٰ کے خلاف ہو۔ اور قواعد شرعیہ اس کی تکذیب کرتے ہوں۔ جیسے قضائے عمری یا اسی قسم کی اور باتیں، یا جیسے یہ روایت

لا تأکلوا البطیخ حتی تذبحوھا — تربوز ذبح کئے بغیر نہ کھاؤ۔

۶۔ ایسا حسی واقعہ ہو کہ اگر فی الواقع وہ پیش آتا تو سینکڑوں اور ہزاروں انسان اسے دیکھتے اور نقل کرتے۔ اس کے باوجود اس واقعہ کا تنہا صرف ایک راوی ہو، اور کوئی اسے روایت کرنے والا نہ ہو۔ مثال کے طور پر ایک شخص یہ روایت کرے کہ آج بروز جمعہ خطیب مسجد کو برسر منبر قتل کرکے اس کی کھال اتار لی گئی۔ اور یہ وقوعہ تمام نمازیوں کے سامنے پیش آیا۔ لیکن ایک شخص کے علاوہ کوئی شخص اسے بیان نہ کرتا ہو۔

دیا جیسے حضرت علیؓ کے لئے سورج لوٹ آیا۔ یہ ایسا واقعہ ہے جسے ہزاروں کو نقل کرنا چاہئے تھا۔ لیکن اسماءؓ بنت عمیس کے علاوہ کوئی نقل نہیں کرتا۔

۷۔ روایت کے الفاظ اور معنی رکیک ہوں۔ مثلاً ایسے الفاظ سے روایت کرے جو بلحاظ قواعد عربیہ درست نہ ہوں (صوفیا کی بیان کردہ اکثر روایات کا یہی حال ہے کہ اُن کی عربی تک درست نہیں ہوتی) جو اس بات کی دلیل ہوتی ہے کہ یہ روایت کسی عجمی نے وضع کی ہے۔ جیسے یہ مشہور روایت

لولاک لما خلقت الافلاک اس کی عربیت تک درست نہیں)

۸۔ صغیرہ گناہ سے ڈرانے کے لئے حد سے زیادہ مبالغہ کیا گیا ہو۔ یا معمولی سے عمل پر حد سے زیادہ ثواب کا مستحق قرار دیا جائے۔ مثلاً

من صلی رکعتین فلہ سبعون الف	جو دو رکعتیں پڑھے گا۔ اس کیلئے ستر ہزار گھر
دار و فی کل دار سبعون الف بیت و	ہر گھر میں ستر ہزار کمرے، ہر کمرے میں ستر ہزار
فی کل بیت سبعون الف سریر و علی	تخت اور ہر تخت پر ستر ہزار لونڈیاں ہوں گی۔
کل سریر سبعون الف جاریۃ۔	

اس قسم کی حدیثیں خواہ ثواب کے متعلق ہوں یا عذاب کے، انہیں جعلی اور موضوع سمجھنا چاہیئے۔

(اس قسم کی روایات "غنیۃ الطالبین" اور "احیاء العلوم" میں کافی تعداد میں دستیاب ہیں۔)

۹۔ معمولی سے عمل پر حج وعمرہ وغیرہ کے ثواب کی امید دلانا۔

۱۰۔ نیک کام کرنے والوں کو یہ خوشخبری سُنانا۔ اور اُن سے یہ وعدہ کرنا کہ انہیں فلاں کار خیر پر انبیاء علیہم السلام جیسا ثواب دیا جائے گا۔ یا ستر انبیاء کا ثواب ملے گا۔ یا اسی قسم کی اور بہت سی باتیں بیان کرنا۔

۱۱۔ راوی نے احادیث وضع کرنے کا خود اقرار کیا ہو۔ جس طرح صوفی نوح بن ابی عصمہ المتوفی ۱۷۳ھ نے اقرار کیا۔ کہ اس نے قرآن کی ہر سورت کی فضیلت میں احادیث وضع کیں۔ اور انہیں رواج اور شہرت دی۔ جیسا کہ "تفسیر بیضاوی" میں ہر سورت کے آخر میں اس کے فضائل کو بیان کیا ہے۔

جب نوح بن ابی عصمہ کو پکڑا گیا اور اس سے سند کے سلسلہ میں پوچھ گچھ کی گئی تو اس نے اعتراف کیا کہ ان حدیثوں کے وضع کرنے سے میرا مقصود نیک تھا۔ کیونکہ جب میں نے یہ دیکھا کہ لوگ قرآن کو چھوڑ کر ابو حنیفہ کی فقہ اور محمد بن اسحاق کی تاریخ میں مشغول ہیں، تو لوگوں کو ترغیب دینے کی غرض سے میں نے یہ روایات وضع کیں، تاکہ لوگ قرآن کی طرف متوجہ ہوں۔ اور ان فرضی ثوابوں کی تمنا میں تلاوت قرآن اور اس کے درس میں مشغول ہوں۔ حالانکہ اس کا یہ بہانہ "عذر گناہ بدتر از گناہ" کے مترادف تھا۔ کیونکہ فضائل قرآن کے سلسلہ میں جو صحیح احادیث پائی جاتی ہیں۔ ترغیب کے لئے وہی بہت کافی تھیں۔

اسی طرح تمباکو، حقہ نوشی اور قہوہ کی ممانعت میں بہت سی روایات گھڑ لی گئیں جن کے الفاظ اور معانی کی رکاکت ظاہر و آشکارا ہے (حالانکہ یہ چیزیں حضور کے صدیوں بعد وجود میں آئیں)

واضعین حدیث کچھ کم نہیں گزرے جس طرح واضعین کثرت ہیں، اسی طرح وضع حدیث سے ان کی اغراض بھی مختلف ہیں۔ مثلاً فرقۂ زنادقہ۔ ان کے پیش نظر شریعت کو باطل کرنا اور دین کا مذاق اڑانا تھا۔ چنانچہ ابن الراوندی (جو ایک یہودی کی اولاد تھا، اور اللہ کا منکر تھا) اس نے اسلام کے رد میں متعدد کتابیں تصنیف کیں۔ جیسے بعد میں صوفیاء نے تصوف کا لبادہ پہنا دیا۔ اور اس کی کتابیں تصوف و معرفت کی کتابیں بن گئیں) اس نے یہ حدیث بھی وضع کی تھی۔

الباذنجان لما اکل لہ — بینگن ہر مرض کی شفا کے لئے کھایا جائے۔

اس روایت سے اس کی غرض شریعت کا مذاق اڑانا، اور اس حدیث

القرآن لما قری لہ — قرآن جس کام کے لئے پڑھا جائے

اور

ماء زمزم لما شرب لہ — آب زمزم جس کام کے لئے پیا جائے۔

کا مذاق اڑانا تھا۔

علماء کا قول ہے کہ زنادقہ کی وضع کردہ چودہ ہزار احادیث مشہور ہو چکی ہیں۔ یہ خواہشات کے بندے محض اپنے مذہب کی اعانت اور مخالف کے مذہب پر طعن کرنے کے لئے اس فعل کے مرتکب ہوتے ہیں۔ رافضی، صوفیاء، اور کرامیہ تو اس عمل میں سب پر سبقت لے گئے۔ خارجی، زیدی اور معتزلہ تو پھر بھی اس امر قبیح کے اس قدر مرتکب نہیں ہوئے۔

اہل علم کی ایک جماعت جو علم حدیث سے مس نہ رکھتی تھی۔ اس نے جب یہ دیکھا کہ محدثین کو نہایت قدر و احترام کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے اور ان کی بڑی عزت کی جاتی ہے۔ تو اُن کے دل میں محدث بننے کی خواہش پیدا ہوئی۔ اس لئے انہوں نے احادیث وضع کرنی شروع کیں۔ تاکہ نہ ہلدی لگے نہ پھٹکڑی، اور رنگ چوکھا آئے۔ جیسے ابو البختری وہب بن القاص، سلیمان بن عمرو حسین بن

علوان اور اسحاق بن نجیح وغیرہ۔ اس جماعت کے بیشتر علماء وعظ ونصیحت میں مشغول رہے اور حالات زمانہ کے مطابق اپنے اپنے دماغوں کی جیبوں میں احادیث ڈھالتے رہے۔ اور اتفاق سے یہ سب زاہد ومتقی اور شب بیدار لوگ تھے۔ آج کل کے علماء کی اکثریت اسی صف میں داخل ہے)

ایک اور فرقہ جو زہد وعبادت اور دیانت میں مشہور تھا۔ انہوں نے خواب میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یا آئمہ کرام سے کوئی بات سنی۔ تو انہوں نے اپنے خواب پر یقین کرتے ہوئے اس بات کو مبہم روایت کر دیا اور خواب کا ذکر ترک کر دیا۔ لوگوں نے سمجھا کہ واقعتاً یہ حدیث ظاہر سند کے ذریعہ ان تک پہنچی ہے۔ چنانچہ صوفی ابوعبدالرحمان سلمی (جو صوفیاء میں بہت بڑے مصنف مانے جاتے ہیں) اور دوسرے صوفیاء کو جو حدیث کا ذوق نہ رکھتے تھے۔ اسی عیب سے متہم کیا گیا ہے۔ اور ان کی روایت کو ناقابل اعتبار قرار دیا گیا ہے۔

دوسرا فرقہ خلفاء وسلاطین اور امراء کے ان مصاحبین کا ہے۔ جنہوں نے محض ان کی دلجوئی کے لئے حدیثیں وضع کیں۔ اور دین کو دنیا کے بدلے بیچا (جیسا کہ موجودہ دور کے علماء سیاست کہ ہر نا جائز کو جائز بناتے جا رہے ہیں)

ایک گروہ نے بلا ارادہ بھی احادیث وضع کیں جس کی صورت یہ ہوئی کہ انہوں نے کسی تجربہ کار شخص یا کسی صوفی، یا حکماء سابقین میں سے کسی کا کوئی کلام سنا۔ اور پھر اپنی غفلت اور بھول سے اسے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب منسوب کر دیا۔ یہ سوچتے ہوئے کہ ایسی حکمت کی بات سوائے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اور کوئی نہیں کہہ سکتا۔ اس فرقہ کی کوئی حد ونہایت نہیں ہے۔ بیشتر عوام اسی مرض میں مبتلا ہیں۔

اس رسالہ میں جو کچھ ذکر ہوا ہے وہ بطور نمونہ کافی ہے۔ ورنہ ان مطالب کی تفصیل کے لئے ایک دفتر درکار ہے۔ اس علم کی ضروریات ہر طرف اور ہر جگہ پائی جاتی ہیں لیکن صحیح وضعیف میں تمیز، ذہن کی استقامت، طبیعت کی سلامتی اور خطا کی طرف مائل نہ ہونا۔ اور ادنیٰ سی تنبیہ سے راہ صواب اختیار کرنا ایک بڑی نعمت ہے۔ حق تعالیٰ ہم کو ان امور سے بہرہ مند فرمائے۔ ورنہ علم اور مواد علم تو بہت ہے۔

لیکن جو چیزیں کمیاب ہیں وہ یہی امور ہیں۔

یہ تو شاہ عبدالعزیزؒ کا بیان ہے جو ہم نے بعینہٖ نقل کر دیا ہے۔ شاہ صاحب نے موضوع حدیث کو پہچاننے کے لئے صرف گیارہ اصول بیان فرمائے ہیں۔ لیکن امام ابن الجوزی، حافظ ابن القیمؒ، حافظ سخاوی اور جزری وغیرہ نے اور بہت سے اصول تحریر کئے ہیں۔ جن کو ملا علی قاری نے اپنی موضوعات میں نقل کیا ہے۔ ہم وہ ایک فہرست کی شکل میں قارئین کے سامنے پیش کرتے ہیں۔

۱۔ جس روایت میں اس قسم کے مضامین ہوں جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی شان سے بعید ہوں۔ مثلاً ستر ہزار حوریں، ستر ہزار خادم اور ستر ہزار دار وغیرہ یا اسی قسم کی مہمل تعداد کا ذکر ہو۔ (جیسا کہ "غنیہ" اور "احیاء العلوم" میں پایا جاتا ہے۔

۲۔ روایت حس اور تجربہ کے خلاف ہو۔ مثلاً بینگن ہر بیماری کی شفا ہے (حالانکہ اگر گرمی کے بخار میں کھایا جائے تو مالیخولیا ہو جائے گا۔ ویسے بھی از راہ حکمت نہایت ردی غذا ہے)،

۳۔ لوگوں کو اپنی جانب مائل کرنے کے لئے کوئی محال بات بیان کی جائے۔ مثلاً "چاول اگر انسان ہوتا تو نہایت بردبار ہوتا"۔

۴۔ معمولی سے عمل پر بہت بڑے اجر کا وعدہ ہو۔ جیسے صلاۃ الرغائب (یا شب برات کی تجلیاں)

۵۔ چھوٹے سے گناہ پر بڑے عذاب کی وعید ہو۔

۶۔ تیبوں کی فضیلت کا بیان ہو۔

۷۔ مختلف پھولوں کی فضیلت ہو۔ مثلاً گلاب حضور کے پسینہ سے پیدا ہوا۔ (حالانکہ گلاب کا وجود حضور سے قبل بھی تھا)

۸۔ کبوتر یا مرغیاں پالنے کی فضیلت ہو۔

۹۔ بیری کے درخت کے سلسلہ میں جتنی روایات ہیں سب موضوع ہیں۔

۱۰۔ مہندی کی فضیلت کا ذکر ہو۔

۱۱۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے حمام میں نہانے یا نورہ لگانے کا ذکر ہو۔

۱۲۔ روایت صریح سنت کے خلاف ہو۔ مثلاً جس کا نام محمد یا احمد ہوگا۔ وہ جہنم میں نہ جائیگا۔

۱۳۔ روایت صریح قرآن کے خلاف ہو۔ مثلاً اُمّ ہانی کے گھر سے معراج۔

۱۴۔ عقل صریح کے خلاف ہو۔

۱۵۔ جس حدیث میں حضرت عائشہؓ کو حمیرا کے لقب سے مخاطب کیا گیا ہو۔

۱۶۔ جس حدیث میں یا علیؓ کے لفظ سے خاص حضرت علیؓ کو مخاطب کیا گیا ہو۔ بجز ایک حدیث یا علی انت منی بمنزلۃ ھارون من موسٰی۔ اے علیؓ تو میری جگہ ہے جیسے ہارونؑ موسٰیؑ کی جگہ تھے۔

۱۷۔ ایسا کلام ہو جو انبیاء کرام کے کلام سے مشابہ نہ ہو۔

۱۸۔ ایسا واقعہ ہو جسے ہزاروں کو بیان کرنا چاہیئے تھا۔ لیکن ایک شخص کے علاوہ کوئی روایت نہ کرے جیسے حضرت علیؓ کے لئے سورج کا لوٹنا۔

۱۹۔ ایسی حدیث ہو جس سے کسی شے کی فرضیت یا اہمیت ثابت ہوتی ہو۔ لیکن ایک شخص کے علاوہ کوئی روایت نہ کرتا ہو۔

۲۰۔ آئندہ پیش آنے والے واقعات کے لئے کسی سنہ یا تاریخ معینہ کا ذکر ہو۔

۲۱۔ مکہ و مدینہ کے علاوہ کسی اور شہر کی فضیلت ہو۔ مثلاً۔ قزوین، عسقلان اور قیروان وغیرہ اس قسم کی موضوعات ابن ماجہ میں پائی جاتی ہیں۔

۲۲۔ مسجد حرام، مسجد نبوی، مسجد اقصٰی اور مسجد قبا کے علاوہ کسی اور مسجد کی فضیلت کا ذکر ہو مثلاً مسجد ابراہیمی۔ مسجد طور، یا مسجد قبلتین وغیرہ۔

۲۳۔ کسی زیارت گاہ یا مقبرہ کا بیان ہو۔

۲۴۔ حدیث میں حکمت کا کوئی اصول بیان کیا گیا ہو۔

۲۵۔ خضر و الیاس کی حیات یا اُن سے کسی کی ملاقات کا ذکر ہو۔

۲۶۔ ہر ہر روز کی نوافل کا ذکر ہو (یہ نوافل "احیاء العلوم" "غنیۃ الطالبین" اور "بہار شریعت" وغیرہ

ہیں ملاحظہ فرمالیں۔

۲۷۔ رجب یا اس کے روزوں کی فضیلت ہو۔ جیسے لکھی روزہ۔

۲۸۔ رجب میں مخصوص نمازوں کا ذکر ہو۔ جیسے صلوۃ الرغائب۔

۲۹۔ شب برارت کی مخصوص نمازوں کا بیان ہو۔

۳۰۔ الفاظ رکیک اور عربیت سے گرے ہوئے ہوں۔

۳۱۔ حبشہ، سودان یا ترکوں کی مذمت ہو۔

۳۲۔ قیامت کے بارے میں کسی معینہ صدی کا ذکر ہو (جیسے چودھویں یا پندرھویں صدی)

۳۳۔ دنوں کی نحوست کا ذکر ہو (مثلاً منگل یا بدھ منحوس ہیں)

۳۴۔ خصیوں کی مذمت ہو۔

۳۵۔ حضور کے مقبرہ یا اس کی زیارت کی فضیلت ہو۔

۳۶۔ دیگر قرائن سے روایت کا جھوٹا ہونا ثابت ہوتا ہو۔

۳۷۔ اولاد کی پرورش کی مذمت ہو۔

۳۸۔ عقیق یا کسی اور پتھر کی فضیلت یا اس کے اثرات کا بیان ہو۔

۳۹۔ جنات سے جنگ کا بیان ہو۔ جیسا کہ حضرت علیؓ کا بدر کے کنویں میں جنات سے جنگ کرنا۔

۴۰۔ حضور کی پیدائش کا حال ہو۔

۴۱۔ ہر ہر سورت کی فضیلت کا جداگانہ ذکر ہو۔

۴۲۔ چاروں آئمہ میں سے نام بنام کسی کی فضیلت یا کسی کی مذمت ہو۔

۴۳۔ صحابہ کرام یا اُن میں سے کسی کی مذمت ہو۔

۴۴۔ کنوارپن کی تعریف ہو۔

۴۵۔ ولد حرام کی مذمت ہو۔ (حالانکہ اُس بے چارے کا کیا قصور)

۴۶۔ خرقہ پوشی کا ذکر ہو۔

۴۷۔ حضرت علیؓ کے علم باطن کا ذکر ہو۔

۴۸۔ راوی خارجی یا ناصبی ہو اور حضرت علیؓ اوران کی اولاد کی مذمت کا ذکر کر رہا ہو۔

۴۹۔ راوی رافضی ہو اور حضرت علیؓ اوران کی اولاد کی فضیلت میں روایت بیان کر رہا ہو۔
یا ایسی روایت ہو جس میں کسی صحابی یا متعدد صحابہ کی مذمت ہو۔

۵۰۔ بدعتی ہو، اوراپنی بدعت کی تائید میں حدیث روایت کر رہا ہو۔

۵۱۔ راوی قصہ گو واعظ ہو۔

۵۲۔ جس تاریخ کا واقعہ بیان کر رہا ہے۔ اوراس واقعہ میں جس شخص کی موجودگی کو بیان کر رہا ہے۔ وہ اس وقوعہ کے پیش آنے سے قبل مرچکا ہو۔

۵۳۔ راوی کذاب یا متہم بالکذب ہو۔

۵۴۔ راوی زندیق، بے دین یا فاسق ہو۔

۵۵۔ راوی منکر روایات بیان کرتا ہو۔

۵۶۔ راوی کی عام روایات ثقہ راویوں کے خلاف ہوں۔

۵۷۔ قیامت کے روز سادات یا کسی خاندان کی بخشش کا ذکر ہو۔

۵۸۔ قیامت کے روز ماؤں کی جانب منسوب ہونے کا بیان ہو۔

۵۹۔ غلہ یا کسی دال کی تعریف ہو۔ (مثلاً مسور کی دال)

۶۰۔ بنو عباسؓ کی خلافت کا بیان ہو۔

۶۱۔ بنو امیہ کی مذمت ہو۔

۶۲۔ امیر معاویہؓ کی مذمت ہو۔

۶۳۔ بنو عباس کے جنتی ہونے کا بیان ہو۔

۶۴۔ واقعہ تاریخ مشہورہ کے خلاف ہو۔

۶۵۔ کوئی ایسا قرینہ پایا جاتا ہو جس سے روایت کا جھوٹا ہونا معلوم ہوتا ہو۔

٦٦۔ بقول علامہ ... عوج بن عنق کے طویل قد و قامت کا بیان ہو۔

٦٧۔ پہاڑوں کی تعریف ہو۔ جیسے طورِ سینا وغیرہ (غنیہ میں پہاڑوں کی فضیلت میں پورا ایک باب ہے)

٦٨۔ حضور کے والدین کے دوبارہ زندہ ہونے یا جنتی ہونے کا ذکر ہو۔

٦٩۔ حضور کے والدین یا ابوطالب کے ایمان لانے کا ذکر ہو۔

٧٠۔ حُسن کی تعریف ہو۔

٧١۔ جس روایت میں ظلم و فساد اور باطل کی تعریف اور حق گوئی کی مذمت کا ذکر ہو۔

٧٢۔ صلوٰۃ الاوابین کی فضیلت ہو۔

٧٣۔ عمامہ باندھ کر نماز پڑھنے کی فضیلت ہو۔

حافظ ابن القیم اور دیگر محدثین نے مختلف مقامات پر کچھ اور بھی اصول بیان کئے ہیں جو پیش خدمت ہیں۔

١۔ حضرت اسحاقؑ کے ذبیح اللہ ہونے کا ذکر ہو۔

٢۔ ابدال و اقطاب اور اولیاء کا بیان ہو۔

٣۔ دعا بالوسیلہ کا ذکر ہو۔

٤۔ حضرت علیؓ کی خلافت و امامت یا ولایت کا ذکر ہو۔

٥۔ اختلاف صحابہ کے وقت حضرت علیؓ کے حق پر ہونے کا ذکر ہو۔

٦۔ ازواجِ مطہرات میں سے کسی کی مذمت ہو۔ مثلاً حضرت عائشہؓ کے بارے میں حوآب کے کتوں کا ذکر۔

٧۔ حضرت حسینؓ کی شہادت کا ذکر ہو۔

٨۔ آمین بالجہر کی تمام روایات موضوع یا منکر ہیں۔

٩۔ بسم اللہ بالجہر کی کوئی روایت صحیح نہیں۔

١٠۔ حوضِ کوثر پر کسی صحابی یا کسی ولی کے ساقی ہونے کا ذکر ہو۔

۱۱۔ قیامت کے دن کسی شخص کے سایہ کا ذکر ہو۔

۱۲۔ اسم اعظم کے ذریعہ حصول دنیا کا ذکر ہو۔

۱۳۔ آصف بن برخیا کا ذکر ہو۔

۱۴۔ شداد کی جنت کا بیان ہو۔

۱۵۔ زین العابدین باقر اور جعفر کی فضیلت ہو۔

۱۶۔ واقعہ روایت مشہورہ یا متواترہ کے خلاف ہو۔

۱۷۔ ایسی روایت ہو جس پر صحابہ، تابعین اور تبع تابعین کا عمل نہ رہا ہو خواہ اسکے راوی ثقہ ہوں۔

۱۸۔ تصوف کا ذکر ہو۔

۱۹۔ کالی کملی کا ذکر ہو۔

۲۰۔ فقر وفاقہ کی فضیلت ہو۔

۲۱۔ حضرت علیؓ کے باب العلم ہونے کا ذکر۔

۲۲۔ حضرت علیؓ کے لئے خلافت کی وصیت کا ذکر ہو۔

۲۳۔ سب سے پہلے عقل کو پیدا کرنے کی جتنی روایات ہیں سب موضوع ہیں۔

۲۴۔ سب سے پہلے حضور کے پیدا کرنے کی جتنی روایات ہیں سب موضوع ہیں۔

۲۵۔ نور الٰہی سے کسی انسان کی تخلیق کا ذکر ہو۔ یقیناً وہ روایت موضوع ہے۔

۲۶۔ پنج تن سے متعلقہ جتنی روایات ہیں سب موضوع ہیں۔

یہ سنہائیسے اصول ہیں جو ہم نے قارئین کی خدمت میں اس لئے پیش کئے ہیں تاکہ ان اصولوں کے ذریعہ سنی سنائی کہانیوں کا فیصلہ خود بخود کر لیا کریں۔ اس طرح انہیں بہت سی الجھنوں سے نجات مل جائے گی۔

حبیب الرحمان کاندھلوی

سرخیاں

صفحہ نمبر

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ؕ

ولادت رسول کے قصے

شام کے محلات کا نظر آنا

روایت ہے کہ جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پیدا ہوئے تو حضرت عبدالرحمانؓ بن عوف کی والدہ شفاؓ بنت اوس ولادت کے وقت آمنہ کے پاس موجود تھیں، وہ کہتی ہیں، کہ جب آپ پیدا ہوئے تو پہلے غیب سے ایک آواز آئی۔ پھر مشرق ومغرب کی ساری زمین میرے سامنے روشن ہوگئی یہاں تک کہ شام کے محل مجھ کو نظر آنے لگے۔ میں نے آپ کو کپڑا پہنا کر لٹایا ہی تھا کہ اندھیرا چھا گیا۔ اور میں ڈر کر کانپنے لگی۔ پھر داہنی طرف سے کچھ روشنی نکلی تو یہ آواز سننے میں آئی، کہ کہاں لے گئے تھے۔ جواب ملا کہ مغرب کی سمت، ابھی کچھ ہی دیر ہوئی تھی کہ پھر وہی کیفیت پیدا ہوئی۔ میں ڈر کر کانپی۔ پھر آواز آئی کہ کہاں لے گئے تھے۔ جواب ملا کہ مشرق کی سمت۔

سید سلیمان ندوی لکھتے ہیں۔ یہ حکایت ابونعیم میں ہے۔ اس کا بیچ کا راوی احمد بن محمد بن عبدالعزیز الزہری نامعتبر ہے۔ اور اس کے بقیہ روایت مجہول الحال ہیں۔ سیرت النبی ج ۳ ص ۴۲۳"

اس روایت میں ایک عجیب لطیفہ یہ ہے کہ شفاؓ جو حضرت عبدالرحمانؓ بن عوف کی والدہ تھیں، اُن کے والد یعنی حضرت عبدالرحمانؓ کے نانا کا نام اوس نہیں تھا۔ بلکہ عبداللہ تھا۔ جو اس امر کا ثبوت ہے کہ یہ کہانی وضع کرنے والا اول درجہ کا جاہل ہے۔

پھر بھی یہ سوچنے کی ضرورت ہے کہ واقعتاً حضرت عبدالرحمانؓ کی والدہ شفاؓ کی اتنی عمر بھی تھی یا نہیں۔ کیونکہ حضرت عبدالرحمانؓ جس وقت اسلام لائے اُس وقت ان کی عمر سترہ سال تھی۔ گویا جب حضور کی عمر تیئیس سال تھی تب عبدالرحمانؓ پیدا ہوئے۔ اب عبدالرحمانؓ کی پیدائش سے تیئیس سال قبل شفاؓ

کی کیا عمر ہوگی ؟ جب ہم سوچتے ہیں تو ہمارا تجربہ یہ ثابت کرتا ہے کہ زچگی کے وقت کوئی کنواری لڑکی موجود نہیں ہوتی۔ ظاہر ہے کہ حضور سے انہیں کم ازکم بیس سال قبل پیدا ہونا چاہیئے اور عبدالرحمانؓ کی پیدائش کے وقت ان کی عمر تینتالیس سال ہونی چاہیئے۔ اس طرح یہ حضور سے عمر میں کم ازکم بیس سال بڑی ہوں گی۔ جب کہ تمام مؤرخین اس پر متفق ہیں کہ صحابیات میں کوئی عورت ایسی نہیں جو حضور سے عمر میں بڑی ہو۔ اور چونکہ یہ شفا صحابیہ ہیں۔ لہٰذا وہ بھی لازماً حضور سے چھوٹی ہوئیں۔ اس لحاظ سے اس واقعہ کا ان کی جانب منسوب کرنا جہاں کھلا جھوٹ ہے وہاں ان راویوں کی جہالت کی بھی دلیل ہے۔

یہ بھی دنیا جانتی ہے کہ زچگی کے وقت عورت کو کھلے میدان میں نہیں ڈالا جاتا۔ بلکہ مکان کا ایسا گوشہ اختیار کیا جاتا ہے جہاں ہوا کا کم ازکم گزر ہو، تاکہ زچہ و بچہ کو ہوا نہ لگ جائے۔ ورنہ زچہ کے جسم پر ورم آجاتا ہے۔ اور بسا اوقات بخار پیدا ہوجاتا ہے جو انتہائی خطرناک ہوتا ہے۔ اب ایسی صورت میں کمرہ، یا کوٹھڑی کے اندر مشرق و مغرب اور شام کے محلات کا نظر آنا۔ کیوں کر ممکن ہے۔ اور زچگی کے وقت میں گھر میں اندھیرا نہیں رکھا جاتا، تو اندھیرا چھا جانے کا کیا مطلب ہے۔ کیونکہ اگر عارضی روشنی ختم بھی ہوجائے گی تو گھر کے چراغ کی روشنی تو قائم رہے گی۔ اور اگر ایسا واقعہ کوئی پیش آتا تو ہونا تو یہ چاہیئے تھا کہ شفاؓ اس واقعہ کو پیش نظر رکھتے ہوئے ابتدا ہی میں اسلام لے آئیں۔ حالانکہ وہ کافی تاخیر سے اسلام لائیں۔ اور اپنے بیٹے کو اسلام لانے پر اذیتیں دیتی رہیں۔

ان داستان گوؤں کو یہ بھی معلوم نہیں کہ نومولود بچے کو کپڑے پہنائے نہیں جاتے۔ بلکہ اسے کپڑے میں لپیٹا جاتا ہے کیا حضور کی والدہ آمنہ یا حضرت عبدالرحمانؓ کی والدہ شفاؓ اتنا بھی نہ جانتی تھیں۔ اس کا تجربہ تو ہر صاحب اولاد کو ہوتا ہے خواہ وہ مرد ہو یا عورت۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ اس داستان کا واضع بیوی اور بچوں کی نعمت ہی سے محروم رہا ہو۔ ورنہ ہم یہ سوچنے پر مجبور ہوں گے کہ ایسی داستان بیان کرکے حضرت عبدالرحمانؓ بن عوف اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی والداؤں کا مذاق اڑانا چاہتا ہے۔

گلے میں تعویز ڈلنے کا قصہ

روایت ہے کہ آمنہ نے خواب میں دیکھا کہ کوئی اُن سے کہہ رہا ہے، اے آمنہ تیرا بچہ تمام جہاں کا سردار ہوگا۔ جب بچہ پیدا ہو تو اس کا نام محمدؐ اور احمدؐ رکھنا۔ اور یہ تعویذ گلے میں ڈال دینا جب وہ بیدار ہوئیں تو سونے کے ایک پتر پر کچھ اشعار لکھے ملے۔

سید صاحب فرماتے ہیں یہ قصہ ابونعیم میں ہے۔ اس کا راوی ابوغزیہ محمد بن موسیٰ الانصاری ہے جس کی روایتوں کو امام بخاری منکر کہتے ہیں۔ ابن حبان کا بیان ہے کہ یہ دوسروں کی حدیثیں چرایا کرتا تھا۔ اور روایات وضع کر کے ثقہ راویوں کی جانب منسوب کرتا۔ متاخرین میں حافظ عراقی نے اس روایت کو بے اصل اور شامی نے انتہائی ضعیف کہا ہے۔ ابن اسحاق نے بھی اس کو روایت کیا ہے۔ لیکن کوئی سند بیان نہیں کی۔ ابن سعد میں یہ روایت واقدی کے حوالہ سے مذکور ہے۔ جس کی دروغ کوئی محتاج بیان نہیں۔ سیرت النبی ۷۴۳ ج ۳

محمد بن اسحاق اور واقدی پر ہم انشاءاللہ آئندہ صفحات میں تفصیلی تبصرہ کریں گے۔

ہاں یہ ذہن نشین ضرور رہنا چاہیئے کہ آپ کا نام محمدؐ آپ کے دادا عبدالمطلب نے رکھا تھا۔ رہا احمدؐ آپ کا یہ نام انجیل میں مذکور تھا۔ اسی لئے قرآن نے اس نام کو حضرت عیسیٰؑ کی جانب منسوب کیا ہے۔ ارشادِ الٰہی ہے۔

مُبَشِّرًا بِرَسُوْلٍ يَّاْتِىْ مِنْۢ بَعْدِى اسْمُهٗۤ اَحْمَدُ۔	ایک رسول کی بشارت دینے والا جو عیسیٰ کے بعد آئے گا جس کا نام احمد ہوگا۔

ایسا محسوس ہوتا ہے کہ یہ روایت صرف اس لئے وضع کی گئی ہے کہ تا کہ گلے میں تعویذ ڈالنے کا تعلق حضورؐ سے پیدا کر کے اس کا جواز ثابت کیا جائے۔ حالانکہ اس وقت خواہ کسی قسم کے اشعار ہوں یقیناً وہ کسی زمانۂ جاہلیت کے شاعر کے ہوں گے۔ اگر ایسا نہیں تو محمد بن اسحاق نے کسی شاعر سے تیار

کراتے ہوں گے۔ کیونکہ محدثین کہتے ہیں کہ محمد بن اسحٰق جب کوئی واقعہ لکھتا تو کسی شاعر کے پاس سے جاتا اور اس سے کہتا کہ اس واقعہ کے مطابق شعر لکھ دو۔ جب شاعر وہ اشعار لکھ دیتا تو محمد بن اسحاق انہیں کسی صحابی کی جانب منسوب کر دیتا۔

ہمارا خیال یہ ہے کہ کوئی بھی شاعر ہو وہ ایک دو دفعہ تو ایسا کر سکتا ہے۔ اور پھر کوئی شاعر یہ گوارا نہیں کرتا کہ اس کا کلام کسی اور کی جانب منسوب ہو، لہٰذا شعراء سے کوئی کاروباری معاملہ طے پایا ہو گا۔

پھر یہ راوی یہ بھی نہیں بتاتے کہ یہ تعویذ کتنی عمر تک آپ کے گلے میں پڑا رہا۔ حالانکہ انبیاء کرام کے بارے میں امت کا عقیدہ یہ ہے کہ وہ بعثت سے قبل بھی گناہوں سے محفوظ رکھے جاتے ہیں۔ اور حضور نے گلے میں تعویذ ڈالنے کو شرک فرمایا ہے۔ ارشاد رسول ہے۔

التمائم شرك تعویذات شرک ہیں۔

اس طرح یہ خبیث راوی اور یہ شیطان مؤرخین اس کہانی کی رو سے یہ ظاہر کرنا چاہتے ہیں کہ حضور نبوت سے قبل شرک میں مبتلا رہے۔ اور جب حضور کو اس طرح مشرک مان لیا جائے گا تو نبوت کا مسئلہ ہی ختم ہو جائے گا۔ یہ ہے اس کہانی کا تمام پس منظر۔

زمین پر ستاروں کا جھک آنا

ایک روایت یہ بیان کی جاتی ہے کہ حضرت عثمانؓ بن ابی العاص صحابی کی والدہ، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت کے وقت موجود تھیں۔ وہ کہتی ہیں کہ جب آمنہ کو درد زہ پیدا ہوا تو یہ معلوم ہوتا تھا کہ تمام ستارے زمین پر جھکے آتے ہیں۔ یہاں تک کہ میں ڈری کہ کہیں زمین پر نہ گر پڑیں۔ اور جب آپ پیدا ہوئے تو جدھر نظر جاتی تھی۔ تمام گھر روشنی سے معمور تھا۔

یہ قصہ ابونعیم، طبرانی اور بیہقی میں مذکور ہے۔ اس کی روایت میں یعقوب بن محمد زہری پایۂ

اعتبار سے ساقط ہے۔ اور عبدالعزیز بن عمر بن عبدالرحمان بن عوف محض ایک داستان گو اور جھوٹا انسان تھا۔ سیرت النبی ج ۳ ص۴۲۲

ایک بلند مقام پر ستارے نیچے جھکتے کیسے نظر آگئے۔ پھر یہ بھی حیرت ناک امر ہے کہ اس موضوع پر جتنی داستانیں وضع ہوئیں ان روایات میں اتنا زبردست تضاد ہے کہ اس کا رفع کرنا ممکن نہیں۔ بلکہ ان روایات میں ایسی ایک بات بھی نہیں پائی جاتی جس کے بارے میں یہ دعوی کیا جاسکے کہ فلاں بات ایسی ہے جو ان تمام روایات میں مشترکہ طور پر پائی جاتی ہو۔

ہم اپنے قارئین کی معلومات کیلئے یہ بتادینا ضروری سمجھتے ہیں کہ حضرت عثمانؓ بن ابی العاص کا تعلق مکہ سے نہیں ہے۔ یہ طائف کے باشندہ تھے، اور قبیلہ بنی ثقیف سے تعلق رکھتے تھے۔ قبیلہ بنی ثقیف رجب ۹ھ کے بعد اسلام لایا۔ رجب ۹ھ سے قبل اس خاندان کے دو افراد ایمان لائے۔ ایک حضرت مغیرۃ بن شعبہؓ جو صلح حدیبیہ سے قبل ایمان لائے اور ایک عروۃؓ بن مسعود ثقفی جو ۹ھ کے آخر میں ایمان لائے اور اسی جرم میں اہل طائف نے انہیں شہید کر دیا۔ اس قبیلے کے تمام افراد حضور کے بدترین دشمن تھے۔ جن میں عثمانؓ بن ابی العاص اور ان کی والدہ بھی شریک تھیں۔ اگر عثمانؓ کی والدہ حضور کی ولادت کے واقعات کو دیکھے ہوتیں تو وہ بہت پہلے اسلام لاچکی ہوتیں۔ حالانکہ اُن کا تو صحابی ہونا بھی مشکوک ہے۔ اس لئے کہ اسلام کی خاطر اہل ثقیف نے ایک وفد بھیجا تھا جو پانچ افراد پر مشتمل تھا جن میں عثمانؓ بن ابی العاص بھی تھے۔ اور یہ سب سے کم سن تھے۔ حضور نے انہیں طائف کا امیر متعین کیا۔ بقیہ اہل طائف نوان کے ہاتھ پر ایمان لائے۔

ایک امکان یہ ہے کہ حجۃ الوداع کے موقع پر اہل طائف بھی شریک ہوئے ہوں گے۔ لیکن ان میں سے کسی کے لئے فرداً فرداً یہ ثابت کرنا ہرگز ممکن نہیں کہ نام بنام شرکائے حجۃ الوداع کا ذکر موجود ہو۔ اور پھر یہ ثابت کرنا کہ عثمان بن رضؓ ابی العاص کی والدہ بھی موجود تھیں۔ ایک دشوار عمل ہے۔

ایسی صورت میں عثمانؓ بن ابی العاص کی والدہ کا حضور کی ولادت کے وقت موجود ہونا یہ فن داستان گوئی کا کمال ہے۔ شاید اسی فن داستان گوئی نے موجودہ زمانے کے ناولوں، ڈراموں، افسانوں اور فلموں کو جنم دیا

ہے۔" (جس طرح ناول یا ڈرامے وغیرہ میں حقیقت نہیں ہوتی بلکہ تخیلاتی تصور ہے اسی طرح ان داستانوں کا حال ہے۔

حالت حمل میں حمل کا محسوس نہ ہونا

آمنہ کہتی ہیں کہ مجھے ایام حمل میں حمل کی کوئی علامت پیدا نہیں ہوئی۔ اور عورتوں کو ان ایام میں جو گرانی اور تکلیف محسوس ہوتی ہے وہ بھی نہیں ہوئی۔ بجز اس کے کہ معمول میں کچھ فرق آگیا تھا۔

سید صاحب لکھتے ہیں کہ قسطلانی نے مواہب لدنیہ میں اس قصہ کو محمد بن اسحاق اور ابو نعیم کے حوالہ سے بیان کیا ہے۔ لیکن ابن اسحاق کی کتاب جو آج کل ابن ہشام کے نام سے مشہور اور چھپی ہوئی ہے۔ اور نیز دلائل ابی نعیم کے مطبوعہ نسخہ میں اس قسم کا کوئی واقعہ مذکور نہیں۔ قسطلانی کی پیروی میں دوسرے بے احتیاط متاخرین مثلاً سیرت حلبیہ اور مصنف خمیس نے بھی ابن اسحاق اور ابو نعیم ہی کی طرف اس کی نسبت کی ہے۔

لیکن ابن سید الناس نے عیون الاثر میں بجا طور سے اس روایت کے لئے واقدی کا حوالہ دیا ہے۔ دراصل یہ قصہ ابن سعد نے نقل کیا ہے۔ اور اس روایت کے دو سلسلے لکھے ہیں۔ مگر ان میں سے ہر ایک کا سر سلسلہ واقدی ہے۔ اور اس کی نسبت محدثین کی رائے پوشیدہ نہیں۔ علاوہ ازیں ان میں سے کوئی سلسلہ بھی مرفوع نہیں۔ پہلا سلسلہ عبداللہ بن وہب پر ختم ہوتا ہے۔ جو اپنی پھوپھی سے روایت کرتے ہیں، وہ کہتی ہیں ہم سنا کرتے تھے۔ دوسرے سلسلے کو واقدی زہری پر جا کر ختم کر دیتا ہے۔ سیرت النبی ص۲۲، ج ۳

زہری ۵۰ھ میں پیدا ہوئے۔ اور حضور کی عمر ہجرت کے وقت ترپن سال تھی۔ اس لحاظ سے کم از کم درمیان میں سوا سو سال کے راوی درکار ہیں۔ رہا عبداللہ بن وہب وہ تو زہری کے بعد پیدا ہوئے۔ ان کی پھوپھی کون تھی اس کا کچھ حال معلوم نہیں۔ اور پھر وہ کس سے سنا کرتی تھیں۔ یہ تو اسی قسم کا معاملہ ہے جیسے ہم نے اپنے بچپن میں بوڑھیوں سے سنا تھا کہ چاند میں ایک بڑھیا بیٹھی چرخا کات رہی ہے۔ اور چاند میں جو چھائیاں نظر آتی ہیں دراصل یہ اس کی زلف کی پرچھائیاں ہیں۔

اس قسم کی داستانوں میں ایک نقص یہ بھی ہے کہ کوئی صحابی ایسا نہیں ہے جو حضور سے عمر میں [illegible]

ہو جو اس قسم کے واقعات کو محفوظ رکھ سکے۔ اور پھر وہ حضور کی وفات کے بعد ایک عرصہ تک حیات بھی رہا ہو، اور علی الخصوص اس کا تعلق بنی ہاشم سے ہو۔ ہم جب رجال، تاریخ، علم الانساب اور احادیث کا مطالعہ کرتے ہیں تو ہمیں صرف پانچ افراد ایسے نظر آتے ہیں جو حضور سے عمر میں بڑے تھے اور اسلام سے فیضیاب ہوئے۔ ان میں ایک ابو بکر صدیقؓ حضرت ابو بکرؓ کے والد ہیں۔ لیکن وہ خاندان بنی ہاشم سے تعلق نہیں رکھتے اور ان سے کوئی روایت مروی نہیں۔ دوسرے حکیمؓ بن حزام ہیں جو حضور سے عمر میں چار سال بڑے تھے۔ فتح مکہ کے وقت ایمان لائے۔ یہ حضور کے بچپن کے دوست اور ام المومنین حضرت خدیجہؓ کے بھتیجے تھے۔ ان کا انتقال امیر معاویہؓ کے زمانہ میں ہوا۔ لیکن ولادت کے سلسلے میں ان سے کوئی روایت مروی نہیں۔ تیسرے قباثؓ بن ہاشم یہ حضور سے صرف چھ ماہ بڑے تھے۔ ان سے بھی اس سلسلے میں کوئی روایت موجود نہیں۔ چوتھے حضور کے چچا حضرت حمزہؓ یہ صرف چھ ماہ بڑے تھے۔ اور یہ حضور ہی کی حیات میں جنگ احد میں شہید ہو گئے۔ پانچویں حضرت عباسؓ یہ حضور کے چچا تھے۔ لیکن یہ بھی حضور سے صرف سال ڈیڑھ سال بڑے تھے۔ بعض روایات ان سے منسوب کی جاتی ہیں۔ لیکن سال ڈیڑھ سال کی عمر میں ان واقعات کو دیکھنا اور انہیں یاد رکھنا یہ صرف سبائیوں اور مجوسیوں کا کمال ہے۔ ورنہ بقیہ دنیا میں تو اس کا کوئی امکان نہیں پایا جاتا۔

رہا حمل کی علامات کا ظاہر نہ ہونا یہ بھی ایک خلاف عقل بات ہے۔ ہاں یہ ضرور ہوتا ہے کہ بعض عورتوں کو دوران حمل گرانی زیادہ محسوس ہوتی ہے اور بعض عورتوں کو کم۔ اس حد تک تو بات قابل برداشت ہو سکتی ہے۔ لیکن حمل کی کسی علامت کا ظاہر نہ ہونا یہ ایک ناممکن امر ہے۔ اور اگر یہ ممکن بھی ہوتا تو نبوت سے قبل تو آپ ایک عام انسان تھے۔ نہ ان امور کی جانب کسی نے توجہ دی ہوگی اور نہ کسی نے بیان کیا ہوگا۔ بلکہ صحیح یہ ہے کہ یہ تمام تصورات ان لوگوں نے پیدا کئے جو یا تو سبائی ذہن رکھتے تھے۔ یا ان کا مقصود داستان سرائی کر کے اپنے مدح سرا پیدا کرنا تھا۔

کیا آمنہ کے کئی بچے ہوئے؟

ایک روایت اس کے بالکل برعکس ہے جو ابن سعد میں ہے کہ آمنہ کہا کرتی تھیں کہ میرے پیٹ

بچے ہوتے رہے۔ لیکن اس بچہ سے زیادہ بھاری اور گراں مجھے کوئی محسوس نہیں ہوا۔

سید سلیمان ندوی مرحوم تحریر فرماتے ہیں

اول تو یہ روایت معروف اور مسلم واقعہ کے خلاف ہے، آمنہ کے ایک بچے کے سوا اور کوئی بچہ نہیں ہوا اور یہ تمام روایات ... دوسرے یہ کہ اس روایت کا سلسلہ ناتمام ہے۔ اسی معنی کی ایک اور روایت شداد بن اوس صحابی کی زبانی منقول ہے کہ آپ نے ارشاد فرمایا۔ میں اپنے والدین کا پہلوٹا ہوں جب میں شکم مادر میں تھا تو میری ماں عام عورتوں سے زیادہ گرانی محسوس کرتی تھی۔ (کنز العمال، کتاب الضعفاء)

معافی بن زکریا القاضی نے اس روایت پر ابن جریج کی سے کہ یہ منقطع ہے یعنی شداد بن اوس اور ان کے بعد کے راوی محول میں ملاقات نہیں۔ اس لئے بیچ میں سے ایک راوی کم ہے۔ حالانکہ اس سے بڑھ کر یہ ہے کہ اس کا پہلا راوی عمر بن صبح کذاب۔ وضاع اور متروک تھا۔ سیرت النبی ص۲۲۵ ج ۲

عمر بن صبح : اس کی کنیت ابو نعیم ہے۔ یہ خراسان کا باشندہ تھا۔ ذہبی کہتے ہیں یہ ثقہ اور امین نہ تھا۔ ابن حبان کہتے ہیں یہ احادیث وضع کرتا تھا۔ دارقطنی وغیرہ کہتے ہیں متروک ہے۔ امام ازدی فرماتے ہیں کذاب ہے۔ احمد بن علی السلیمانی کا قول ہے کہ اس نے ایک خطبہ وضع کیا تھا جس کے بارے میں اس کا دعویٰ یہ تھا کہ یہ حضور کی زندگی کا آخری خطبہ ہے۔ اس نے ایک منتر بھی وضع کر کے حضور کی جانب منسوب کیا ہے کہ اسے پڑھ کر سونے سے انسان احتلام سے محفوظ رہتا ہے۔ میزان الاعتدال ج ۲

یہ بھی سوچنے کی ضرورت ہے کہ اس معاملہ کا تعلق احکامات الٰہیہ سے نہیں ہے جو اس سلسلہ میں وحی کا نزول ہوتا۔ اور آپ کو بذریعۂ وحی مطلع کیا جاتا۔ اور جب آمنہ کا انتقال ہوا تو حضور کم سن بچہ تھے۔ اور یہ بات ماں کے علاوہ کوئی دوسرا بتا نہیں سکتا۔ پھر اس روایت اور سابقہ روایت میں تضاد بھی ہے۔ حالانکہ دونوں روایات ابن سعد کی ہیں۔ دراصل یہ عجمی مورخین اپنے اپنے گھر بیٹھ کر داستانیں وضع کرتے رہے۔ اور اسے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام کی جانب منسوب کرتے رہے۔ علی الخصوص کوفہ تو ان کذابین کا مرکز تھا۔ بقول امام مالک رحمہ اللہ کوفہ میں تو ٹکسالیں قائم ہیں جہاں شب و روز احادیث وضع ہو کر بازار میں سکے کی طرح چلتی رہتی ہیں۔ مدینہ میں ایسی کوئی ٹکسال نہیں۔

انہی داستانوں سے قارئین اندازہ فرمائیں کہ ہمارے نام نہاد مؤرخین نے تاریخ اور سیرت رسول کے نام سے کیا کیا رطب ویابس بھرا ہے۔ حالانکہ ابن سعد کا شمار اہل سنت علماء میں ہوتا ہے۔ اور وہ مؤرخ ہونے کے علاوہ محدث بھی ہیں۔ اور رجال پر بھی نظر رکھتے ہیں جب اپنوں کا یہ حال ہے تو اغیار سے کیا شکوہ ؟ یہ ہے ہماری وہ تاریخ جس کے باعث عیسائی دنیا اور مستشرقین اسلام کا مذاق اڑاتے، اور حضور کی ذات اقدس پر کیچڑ اچھالتے ہیں۔ لیکن ہم ان لغویات اور خرافات پر فخر کرتے ہیں۔ حتیٰ کہ موجودہ دور کے فرضی محققین ان خرافات پر تاریخی حقائق کا لیبل لگا کر حضرت عثمانؓ، حضرت امیر معاویہؓ، حضرت عمروؓ بن العاص، حضرت مغیرہؓ بن شعبہ، حضرت ولیدؓ بن عقبہ، حضرت عبداللہؓ بن ابی سرح، حضرت عبداللہؓ بن ابی عامر اور بنو امیہ کے افراد کو بدنام کرتے اور ان پر مختلف الزامات لگاتے ہیں اور وہ طبقہ جو سبائیت سے متنفر ہے۔ وہی طریقہ کار خاندان بنی ہاشم سے متعلق صحابہ کرام کے ساتھ اختیار کرتا ہے۔ وہ بھی انہیں تاریخی حقائق قرار دیتا ہے۔ اتفاق سے دونوں قسم کی خرافات ہماری تاریخ میں موجود ہیں۔

اسی لئے محدثین کرام اور ماہر رجال نے علی الخصوص متقدمین نے جہاں ان روایات پر موضوعات اور رجال کی کتابوں میں بحث کی۔ وہاں ان مؤرخین کی حقیقت کی خوب پول بھی کھولی ہے۔ جس میں ہم جستہ جستہ کچھ حضرات کی پول اپنے قارئین کے سامنے پیش کریں گے۔

حضور کے سال پیدائش میں روئے زمین پر کسی لڑکی کا پیدا نہ ہونا

بیان کیا جاتا ہے کہ جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت کا وقت آیا۔ تو اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کو حکم دیا کہ آسمانوں اور جنتوں کے دروازے کھول دیئے جائیں۔ فرشتے باہم بشارت دیتے پھرتے تھے۔ سورج نے نور کا نیا جوڑا پہنا۔ اس سال دنیا کی تمام عورتوں کو یہ رعایت ملی کہ سب فرزند نرینہ جنیں۔ درختوں میں پھل آ گئے۔ (جو پہلے کبھی بھی نہ آتے تھے) آسمان میں زبرجد و یاقوت کے ستون کھڑے کئے گئے۔ نہر کوثر کے کنارے مشک خالص کے درخت اُگائے گئے۔ مکہ کے بت اوندھے ہو گئے۔ وغیرہ وغیرہ۔

یہ داستان مواہب لدنیہ اور خصائص کبریٰ میں ابو نعیم کے حوالے سے نقل کی گئی ہے۔ لیکن ابو نعیم کی ذاتی

النبوت کے مطبوعہ نسخہ میں جہاں اس کا موقع ہو سکتا تھا۔ وہاں یہ روایت مجھ کو نہیں مل سکی ہے۔ ابو نعیم نے اپنی کسی اور کتاب میں یہ روایت لکھی ہو یا یہ مطبوعہ نسخہ مکمل ہو۔ بہرحال اس روایت کی بنیاد صرف اس قدر ہے کہ ابو نعیم جو چوتھی صدی کے ایک راوی عمرو بن قتیبہ سے نقل کرتے ہیں کہ ان کے والد قتیبہ جو بڑے فاضل تھے بیان کرتے تھے قسطلانی نے مواہب میں اس روایت کو نقل کرکے لکھا ہے کہ عمرو بن قتیبہ مطعون ہے۔ حافظ سیوطی نے خصائص میں اس روایت کو منکر کہا ہے۔ اور واقعہ یہ ہے کہ یہ تمام تر بے سند اور موضوع ہے۔ سیرت النبی ص ۱۵۲، ج ۳

اگر یہ عمرو بن قتیبہ اور ان کے مجہول ابا جان معتبر بھی ہوتے تب بھی یہ روایت مردود ہوتی۔ اس لئے کہ یہ تو چوتھی صدی کے راوی تھے۔ بقیہ ساڑھے تین سو سال کے راوی کہاں ہیں جب تک تمام رواۃ موجود نہ ہوں، اور سب کا ثقہ ہونا اور ایک دوسرے سے روایت کا سننا ثابت نہ ہو جائے۔ اس وقت تک کسی روایت پر غور و فکر بھی جائز نہیں۔

ہاں ہم ان فضول سے فاضل قتیبہ اور ان کے صاحبزادے سے یہ ضرور عرض کریں گے۔ کہ کم از کم ہمیں وہ یہ تو بتا دیتے کہ انہوں نے سن کو کس مہینے سے شروع کیا ہے۔ اس لئے کہ محرم سے سن کی ابتداء حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانہ سے ہوئی۔ تو ہم علم الانساب، علم الرجال اور تاریخ کے ذریعہ یہ ضرور معلوم کرتے کہ اس سال مکہ میں کتنی لڑکیاں پیدا ہوئیں۔ رہا پوری دنیا کا مسئلہ تو اس کا حال معلوم ہونا ہی ممکن نہ تھا۔ جو ان قتیبہ صاحب کی کذب کی تردید کرتا۔ لہٰذا جو منہ میں آیا بک دیا۔ اور یہ بھی نہ سوچا کہ مشک خاص درختوں سے پیدا نہیں ہوتا۔ مشک ہرن کے نافہ سے حاصل کیا جاتا ہے۔ غالباً ان عقل کے دشمنوں کو اس کی بھی خبر نہ تھی۔ لیکن حیرت تو اس پر ہے کہ ہمارے مولوی میلاد کی مجلسوں میں اسے گا گا کر پڑھتے ہیں۔ اور سامعین صلِ علیٰ محمد کے نعرے لگاتے ہیں اور تبرک کی مد دو کا کورس پورا کیا جاتا ہے۔

ان فضول سے فاضل قتیبہ صاحب نے ایک نیا شگوفہ بیان کیا ہے کہ درختوں میں پھل آ گئے گویا اس سے قبل ماضی میں درختوں پر کبھی پھل نہ آئے تھے۔ تو لوگوں نے انہیں کیسے پہچانا ہوگا کہ یہ پھل ہیں۔ کیونکہ وہ پھلوں سے ابتدا سے متعارف ہی نہ تھے۔ اور پھر پھلوں کی مختلف اقسام کی معرفت کیسے ممکن ہوگی۔ غالباً قتیبہ صاحب نے اپنی پیدائش سے چار سو سال قبل اہل مکہ کو روحانی طور پر اس کی تعلیم دی ہوگی۔ اور اگر مکہ کے بت اوندھے ہو جاتے

تو پورے مکہ میں ایک تہلکہ مچ جاتا۔ اور ہزارہا اس کے دیکھنے اور بیان کرنے والے ہوتے۔ اور جب انہیں یہ معلوم ہوتا کہ یہ سب کچھ حضور کی ولادت کے سبب ہوا ہے تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے بعد کوئی فرد بشر ایسا نہ بچتا جو آپ پر ایمان نہ لاتا۔ اور خاص طور پر بنی ہاشم کے افراد۔ لیکن فتح مکہ کے وقت تک بنی ہاشم کے صرف چار پانچ افراد نے ایمان قبول کیا۔ اس سے ثابت ہوا کہ مکہ کے تمام بت تو کیا اوندھے ہوتے۔ وہ بت بھی اوندھے نہیں ہوئے جو خاندان بنی ہاشم کے گھروں میں پائے جاتے تھے۔ بلکہ آپ کا چچا عبد مناف یعنی ابوطالب کے ذمہ کعبہ کے بتوں کی دیکھ بھال تھی۔ لیکن وہ مرتے وقت تک بتوں سے چمٹا رہا۔ اور اپنے آپ کو مناف بت کا بندہ سمجھتا رہا۔ حتیٰ کہ مشکل کشا بھی اس معاملہ میں اپنے باپ کی مشکل کشائی نہ کر سکے۔ اور نہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی کوئی تبلیغ اس پر اثر انداز ہوئی۔

جانوروں کا کلام کرنا

یہ ایک طویل داستان ہے جو حضرت عبداللہ بن عباسؓ کی جانب منسوب کی گئی ہے۔ اس کہانی کے الفاظ ہیں۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حمل میں آجانے کی جو نشانیاں تھیں، ان میں سے ایک نشانی یہ ہے کہ اس رات قریش کے سب جانور بولنے لگے۔ اور کہنے لگے کہ رب کعبہ کی قسم آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم شکم مادر میں آگئے۔ وہ دنیا جہاں کی امان اور اہل دنیا کے چراغ ہیں۔ قریش اور دیگر قبائل کی کاہنہ عورتوں میں کوئی ایسی نہ تھی کہ اس کا جن اس کی آنکھوں سے اوجھل نہ ہو گیا ہو۔ اور ان سے کہانت کا علم چھین نہ لیا گیا ہو۔ اس روز دنیا کے تمام بادشاہوں کے تخت اوندھے ہو گئے۔ اور سلاطین اس دن گونگے ہو گئے۔ مشرق کے وحشی جانوروں نے مغرب کے وحشی جانوروں کو جا کر بشارت دی۔ اسی طرح ایک دریا نے دوسرے دریا کو خوش خبری سنائی۔ اور پورے ایام حمل میں ہر ماہ آسمان و زمین سے یہ ندا سنی جانے لگی کہ بشارت ہو کہ حضرت ابوالقاسم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمین پر ظاہر ہونے کا زمانہ قریب آیا۔

حضرت کی والدہ فرماتی تھیں کہ جب میرے حمل کے چھ مہینے گزرے تو خواب میں مجھے کسی نے

ٹھوکر دے کر کہا اے آمنہ تمام جہان کا سردار تیرے پیٹ میں ہے جب وہ پیدا ہو تو اس کا نام محمد رکھنا، اور اپنی حالت کو چھپائے رکھنا۔ کہتی ہیں کہ جب ولادت کا زمانہ آیا تو عورتوں کو جو کچھ پیش آتا ہے، وہ مجھ کو بھی پیش آیا۔ اور کسی کو میری اس حالت کی خبر نہ تھی۔ میں گھر میں تنہا تھی عبدالمطلب خانہ کعبہ کے طواف کو گئے تھے۔ تو میں نے ایک زور کی آواز سنی جس سے میں ڈر گئی۔ میں نے دیکھا کہ ایک سپید مرغ ہے جو اپنے بازو کو میرے دل پر مل رہا ہے، اس سے میری تمام دہشت دور ہو گئی۔ اور درد کی تکلیف بھی جاتی رہی۔ پھر ایک طرف دیکھا کہ سپید شربت ہے۔ پیاسی تھی، دودھ سمجھ کر اس کو پی گئی۔ اس کے پینے سے ایک نور نکل کر مجھ سے بلند ہوا۔ پھر میں نے دیکھا کہ چند عورتیں جن کے قد لمبے لمبے ہیں، گویا عبدالمطلب کی بیٹیاں ہیں۔ وہ مجھے غور سے دیکھ رہی ہیں۔ میں تعجب کر رہی ہوں کہ ان کو کیسے میرا حال معلوم ہوا۔

ایک اور روایت میں ہے کہ ان عورتوں نے کہا کہ ہم فرعون کی بیوی آسیہ اور عمران کی بیٹی مریم اور یہ حوریں ہیں۔ میرا درد زیادہ بڑھ گیا اور ہر گھڑی آواز اور زیادہ بلند تھی۔ اتنے میں ایک سپید دیبا کی چادر آسمان و زمین کے درمیان پھیلی نظر آئی۔ اور آواز آئی کہ اس کو لوگوں کی نگاہوں سے چھپالو، میں نے دیکھا کہ چند مرد ہوا میں معلق ہیں۔ ان کے ہاتھوں میں چاندی کے آفتابے ہیں، اور میرے بدن سے موتی کی طرح پسینہ کے قطرے ٹپک رہے ہیں جس میں مشک خالص سے بہتر خوشبو تھی۔ اور میں دل میں کہہ رہی تھی کہ کاش عبدالمطلب اس وقت میرے پاس موجود ہوتے۔ پھر میں نے پرندوں کا ایک غول دیکھا جو نہ معلوم کدھر سے آئے تھے۔ وہ میرے کمرے میں گھس آئے۔ ان کی منقاریں و چونچیں، زمرد کی اور بازو یاقوت کے تھے۔ میری آنکھوں سے اس وقت پردے اٹھا دیئے گئے۔ تو اس وقت مشرق و مغرب سب میری نگاہوں کے سامنے تھے۔ تین جھنڈے نظر آئے۔ ایک مشرق میں، ایک مغرب میں اور ایک خانہ کعبہ کی چھت پر۔ اب دردِ زہ زیادہ بڑھ گیا۔ تو مجھے ایسا معلوم ہوا کہ مجھے کچھ عورتیں ٹیک لگائے بیٹھی ہیں، اور اتنی عورتیں بھر گئیں کہ مجھے گھر کی کوئی چیز نظر نہ آتی تھی۔ اسی اثنا میں بچہ پیدا ہوا۔ میں نے پھر کر دیکھا تو وہ سجدہ میں پڑا تھا۔ اور دو انگلیوں کو آسمان کی طرف دعا کی طرح اٹھائے ہوئے تھا۔ پھر ایک سیاہ بادل نظر آیا جو آسمان سے اتر کر نیچے آیا۔ اور مجھ پر چھا گیا۔ اور بچہ میری نگاہ سے چھپ گیا۔ اتنے میں ایک منادی سنی کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم

کو زمین کے پورب اور پچھم گھما دو، اور سمندروں کے اندر لے جاؤ۔ کہ سب ان کا نام نامی اور شکل و صورت پہچان لیں، اور جان لیں کہ یہ مٹانے والے ہیں۔ یہ اپنے زمانہ میں شرک کا نشان مٹا دیں گے۔ پھر تھوڑی ہی دیر میں بادل ہٹ گیا۔ اور آپ دودھ سے زیادہ سپید کپڑے میں لپٹے نظر آئے۔ جس کے نیچے ہرا ریشم تھا۔ ہاتھوں میں سفید موتیوں کی تین کنجیاں تھیں۔ اور ایک آواز آئی کہ محمد کو فتح و نصرت اور نبوت کی تین کنجیاں دی گئیں ہیں۔

سید صاحب لکھتے ہیں کہ میں نے دل پر جبر کر کے یہ حکایت نقل کی ہے۔ اس لئے کہ میلاد کے عام جلسوں کی رونق ان ہی روایتوں سے ہے۔ یہ روایت ابونعیم میں حضرت ابن عباسؓ سے نقل کی گئی ہے۔ اور سند کا سلسلہ بظاہر متصل بھی ہے لیکن اگر کسی کو اسماء الرجال سے آگاہی بھی نہ ہو، اور وہ صرف ادب عربی کا صحیح ذوق ہی رکھتا ہو تو وہ فقط روایت کے الفاظ اور عبارت کو دیکھ کر یہ فیصلہ کر دے گا۔ کہ یہ تیسری یا چوتھی صدی کی بنائی ہوئی ہے۔

اس روایت میں یحیٰی بن عبداللہ البابلتی اور ابوبکر بن ابی مریم ہیں۔ پہلا شخص بالکل ضعیف ہے اور دوسرا ناقابل حجت ہے۔ ان کے آگے کے راوی سعید بن عمرو الانصاری اور ان کے باپ عمرو الانصاری کا کوئی پتہ نہیں۔ سیرت النبی ج ۳ ص ۴۲۶

بابلتی۔ اس کا پورا نام یحیٰی بن عبداللہ بن الضحاک ہے۔ ابوسعید اس کی کنیت ہے۔ اس کی روایات بخاری و ترمذی میں پائی جاتی ہیں۔ ابوحاتم کہتے ہیں بابلت رے کا ایک مقام تھا۔ یہ وہاں کا باشندہ تھا۔ پھر حران آکر آباد ہوا۔ یہ یحیٰی بن عبداللہ اوزاعی سے روایات نقل کرتا ہے۔ امام اوزاعی سے اس کی ماں نے شادی کر لی تھی۔ ابوزرعہ رازی کہتے ہیں ضعیف ہے۔ ابن عدی کہتے ہیں، اس کی روایت سے اس کا ضعف صاف طور پر نظر آتا ہے۔ ابن عدی نے اس کی متعدد روایتوں کو منکر قرار دیا ہے۔ ابوحاتم رازی فرماتے ہیں یہ کسی شمار میں نہیں۔

عبداللہ بن الدورقی کا بیان ہے کہ امام یحیٰی بن معین جو فن رجال اور جرح و تعدیل کے امام تھے جب حران گئے تو بابلتی نے ان کو خوش کرنا چاہا۔ تاکہ وہ اس کے خلاف کوئی لفظ زبان سے نہ نکالیں۔ لہٰذا اس نے امام یحیٰی کی خدمت میں سو دینار، کھانا اور کچھ خوشبو بھیجی۔ امام یحیٰی نے کھانا تو کھا لیا۔ اور

دینار واپس کر دیئے۔ ایک روز کسی شخص نے یحییٰ سے سوال کیا کہ بابلتی کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے۔ فرمایا کھانا تو اس کا اچھا تھا لیکن اللہ کی قسم اس نے اوزاعی سے کوئی روایت نہیں سنی (یعنی وہ تمام روایات ناقابل اعتبار ہیں جو وہ اوزاعی سے نقل کرتا ہے۔ میزان الاعتدال ج ۴ ص ۳۹)

ابوبکر بن ابی مریم: یہ شخص قبیلہ سے تعلق رکھتا تھا۔ اور حمص کا باشندہ تھا۔ اس کے باپ کا نام عبداللہ اور ابو مریم کنیت ہے۔ خود اس کی کنیت تو ابوبکر ہے۔ لیکن اس کے نام میں زبردست اختلاف ہے۔ ایک قول یہ ہے کہ اس کا نام بکر ہے، ایک قول یہ ہے کہ بکیر ہے۔ کوئی کہتا ہے عمرو ہے۔ کوئی عامر بتاتا ہے اور کوئی کہتا ہے عبدالسلام ہے۔

ذہبی کہتے ہیں کہ یہ محدثین کے نزدیک ضعیف ہے۔ اس کی روایات ابوداؤد، ترمذی اور ابن ماجہ میں پائی جاتی ہیں۔ یہ بہت عبادت گزار شخص تھا۔ ابوالیمان، بقیہ، اور بابلتی وغیرہ اس سے روایات نقل کرتے ہیں۔ امام احمد وغیرہ فرماتے ہیں یہ ضعیف ہے روایت حدیث میں غلطیاں بہت کرتا ہے۔ ابن عدی کہتے ہیں یہ حجت کے قابل نہیں۔ ابن عدی نے اس کی متعدد روایات کو منکر قرار دیا ہے۔ ابن حبان کہتے ہیں۔ اس کا حافظہ نہایت ردی تھا۔ جب کوئی روایت یہ تنہا بیان کرے تو وہ قابل حجت نہیں۔

بقیہ کا بیان ہے کہ ابوبکر بن ابی مریم کے گاؤں میں زیتون کے درخت بہت تھے۔ اور کوئی درخت ایسا نہ تھا۔ جس کی جانب اس نے منہ کر کے پوری رات عبادت نہ کی ہو، ہر وقت روتا رہتا تھا۔ جوزجانی کہتے ہیں بہت پرہیزگار انسان تھا۔ ۱۵۶ھ میں اس کا انتقال ہوا۔ میزان ج ۴ ص ۴۹۸

گویا یہ کوئی بہت ہی پہنچے ہوئے بزرگ تھے۔ لیکن یہ ہر ہر درخت کی جانب منہ کر کے نماز پڑھنے کی منطق ہماری سمجھ سے بالاتر ہے۔ یہ بھی کوئی سلوک کی منزل ہو گی۔ کیونکہ صوفیاء کو آبادی میں سلوک کی منزل حاصل نہیں ہوتی۔ اسی لئے وہ جنگلوں کا رخ کرتے ہیں۔ ہاں یہ بھی ہو سکتا ہے کہ یہ واقعہ سرے سے ہی جھوٹ ہو، اس لئے اس واقعہ کو نقل کرنے والا ان کا شاگرد بقیہ ہے۔ جو غالی درجہ کا شیعہ ہے۔ بلکہ ابو سعید محدث نے تو بقیہ کے حال پر نہایت عمدہ تبصرہ فرمایا ہے۔ وہ فرماتے ہیں۔

احادیث بقیہ لیست نقیہ، فکن — بقیہ کی احادیث اچھی نہیں ہوتیں تو ان سے

منہاعلی التقیہ - میزان ص۲۳۲ ج۱ تقیہ کرے (یعنی بچ کر رہ)

قارئین یہ ضرور ذہن نشین رکھیں کہ حضرت عباسؓ حضور کے چچا حضور سے صرف ڈیڑھ دو سال بڑے تھے اور ان کے بیٹے عبداللہؓ جو ابن عباس کے نام سے مشہور ہیں۔ اور خلفائے عباسیہ ان ہی کی اولاد سے ہیں یہ ہجرت مدینہ سے صرف دو سال قبل پیدا ہوئے ہیں۔ لہٰذا ان دونوں باپ بیٹوں کے لئے حضور کی ولادت کا حال دیکھنا یا آمنہ سے ملاقات کرنا ممکن نہیں۔ لہٰذا اس سلسلے میں جتنی روایات ان حضرات کی جانب منسوب کی جاتی ہیں۔ وہ سب نہ صرف خالص جھوٹ ہیں۔ بلکہ راوی کی جہالت بھی ثابت کرتی ہیں۔ ایسی روایات کے رد کرنے کے لئے مزید کسی دلیل کی حاجت نہیں۔

ہمیں اس داستان میں سب سے زیادہ حیرت ناک دو باتیں خاص طور پر نظر آئیں۔

۱۔ کوئی عورت زچگی کے وقت کسی مرد کی آمد پسند نہیں کرتی حتٰی کہ خاوند کی بھی۔ کجا کہ ایسے وقت میں وہ اس بات کی خواہش کرے کہ اس کا سُسر اس کے پاس ہو، حالانکہ سُسر سے تو بہو کو ایک خاص قسم کا حجاب ہوتا ہے سُسر سے بے حجاب تو ایک بے حیا عورت ہی ہو سکتی ہے کوئی شریف عورت نہیں ہو سکتی۔

۲۔ جب حضور کی ولادت کے باعث اُس دور کے عاملوں کے جنات غائب ہو گئے۔ اور ان کی کہانت یعنی فنِ عملیات سلب ہو گیا تو اُس دھندے کو اب حضور کے ماننے والوں نے کیسے اپنا لیا؟ اور کاہنوں کی طرح غیب کی خبریں کس طرح بیان کرنے لگے۔ اور کس طرح انہوں نے جنات کی دوستی کو اپنے لئے جائز سمجھا؟

یہ بھی غور طلب امر ہے کہ مشرق و مغرب تو دکھا دیئے جاتے ہیں۔ اور وہاں جھنڈے بھی گاڑے جاتے ہیں۔ لیکن جنوب و شمال کا کسی روایت میں پتہ نہیں چلتا۔ کیا ان راویوں کے نزدیک صرف دو ہی سمتیں ہوتی تھیں؟ پھر تو ان کی عقلوں کا اللہ ہی حافظ ہے۔

پیدائش کے ساتھ سینہ چاک ہونا

اسی قسم کی ایک اور روایت حضرت عباسؓ سے نقل کی جاتی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ میرے چھوٹے بھائی عبداللہ جب پیدا ہوئے تو ان کے چہرے پر سورج کی سی روشنی تھی۔ اور والد نے ایک دفعہ خواب دیکھا تھا کہ

ایک کاہن نے یہ خواب سن کر یہ پیشین گوئی کی کہ اس لڑکے کی پشت سے ایک ایسا بچہ پیدا ہو گا جو تمام دنیا پر حکومت کرے گا۔ جب آمنہ کے شکم سے بچہ پیدا ہوا تو میں نے ان سے پوچھا کہ ولادت کے اثنا میں تم کو کیا کچھ نظر آیا۔ انہوں نے کہا جب میرا درد ہونے لگا تو میں نے بڑے زور کی آواز سنی جو انسانوں کی آواز کی طرح نہ تھی۔ اور سبز ریشم کا پھریرا یاقوت کی چھڑی پر لگا ہوا آسمان و زمین کے بیچ میں گڑا نظر آیا۔ اور میں نے دیکھا کہ بچے کے سر سے روشنی کی کرنیں نکل کر آسمان تک جاتی ہیں۔ شام کے تمام محل آگ کا شعلہ معلوم ہوتے تھے۔ اور اپنے پاس مرغابیوں کا ایک جھنڈ نظر آیا۔ جس نے بچے کو سجدہ کیا۔ پھر اپنے پروں کو کھول دیا۔ اور سعیرہ اسدیہ کو دیکھا کہ وہ کہتی ہوئی گزری کہ تیرے اس بچے نے بتوں اور کاہنوں کو بڑا صدمہ پہنچایا۔ ہائے سعیرہ ہلاک ہو گئی۔ پھر ایک بلند و بالا سپید رنگ جوان نظر آیا۔ جس نے بچے کو میرے ہاتھ سے لے لیا۔ اور اس کے منہ میں اپنا لعاب دہن لگایا۔ اس کے ہاتھ میں سونے کا طشت تھا۔ اس نے بچے کے پیٹ کو پھاڑا۔ پھر اس کے دل کو نکالا۔ اس میں سے ایک سیاہ داغ نکال کر پھینک دیا۔ پھر سبز حریر کی تھیلی کھولی۔ اس میں سے ایک انگوٹھی نکال کر مونڈھے کے برابر لگائی اور اس کو ایک کرتہ پہنا دیا۔ اے عباسؓ میں نے یہ دیکھا۔

اس روایت کو لکھنے کے بعد سید صاحب تحریر فرماتے ہیں۔

اس روایت کے متعلق ہمیں کچھ زیادہ کہنا نہیں ہے کہ ناقلین نے اس کے ضعف کی خود تصریح کی ہے۔ اور سیوطی نے لکھا ہے کہ اس روایت اور اس سے پہلے کی دو روایتوں میں سخت نکارت (یعنی منکر باتیں) ہے۔ اور میں نے اپنی اس کتاب خصائص میں ان تینوں سے زیادہ منکر کوئی روایت نقل نہیں کی (یعنی ہماری کتاب میں منکرات تو بہت ہیں لیکن وہ اتنے اعلیٰ پیمانہ کی نہیں ہیں) اور میرا دل ان کے لکھنے کو نہیں چاہتا تھا لیکن میں نے محض ابونعیم کی تقلید میں لکھ دیا ہے۔ (یعنی اگر ابونعیم نہ لکھتے تو میں بھی نہ لکھتا)

جن روایتوں کو سیوطی لکھنے کے قابل نہ سمجھیں۔ آپ ان کے ضعف کے درجہ کو سمجھ سکتے ہیں کیونکہ سیوطی کی کتابوں کا دار و مدار ہی ضعیف روایتوں پر ہے۔ سیوطی اس روایت کا ماخذ ابونعیم بتلاتے ہیں مگر یہ روایت مجھے دلائل ابی نعیم کے مطبوعہ نسخہ میں نہیں ملی۔

یہ بھی یاد رہے کہ حضرت عباسؓ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک دو سال بڑے تھے جب آمنہ

نے وفات پائی تو وہ سات آٹھ برس کے بچہ ہوں گے۔ سیرت النبی ج ۳ ص ۲۹

رہ گئے حضور کے والد عبداللہ ان کو تو حضرت عباسؓ نے دیکھا بھی نہیں۔ چہ جائیکہ عباسؓ کا ان کو پیدا ہوتے دیکھنا۔

قارئین یہ ضرور سوچتے ہوں گے کہ ولادت کے وقت کی بیشتر کہانیاں حضرت عباسؓ اور ان کے صاحبزادے حضرت عبداللہؓ سے کیوں مروی ہیں۔ ہمارے نزدیک اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ ان روایات کے وضع کرنے والے عباسی دور کے افراد ہیں۔ آخر انہیں حکومت کو خوش بھی کرنا تھا۔ لہٰذا انہیں ہر جگہ عباسیوں کے جد امجد نظر آتے ہیں۔ اگر کسی اور خاندان کی حکومت ہوتی تو اس خاندان کے افراد نظر آتے۔

یہی وجہ ہے کہ ہر لوی شام کے محارت ضرور دیکھتا ہے تاکہ عباسی خانوادوں کا زوال یاد کرکے خوش ہوں۔ اور ممکن ہے کہ ان روایتوں کے باعث راویوں کی جیب بھی گرم ہو جاتی ہو۔ ہاں اس راوی کو یہ قطعاً معلوم نہ تھا کہ مرغابیاں گرم ملک میں نہیں پائی جاتیں۔ مرغابی سرد ملک کا پرندہ ہے۔ صرف پانی پر اترتا ہے گھروں میں نہیں اترتا۔ لیکن اس بے چارے کو اتنی تحقیق نہ تھی۔ ورنہ شاید وہ کسی اور پرندے کا نام لیتا۔

کعبہ پر قبضہ

حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ آمنہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت کا قصہ بیان کرتی تھیں کہ میں حیرت میں تھی کہ تین آدمی دکھائی دیئے۔ جن کے چہرے سورج کی طرح چمک رہے تھے۔ ایک کے ہاتھ میں چاندی کا آفتابہ تھا جس سے مشک کی خوشبو آ رہی تھی، دوسرے کے ہاتھ میں سبز زمرد کا طشت تھا جس کے چار گوشے تھے۔ اور ہر گوشہ میں سپید موتی رکھا تھا۔ ایک آواز آئی۔ اے حبیب اللہ یہ پوری پورب پچھم خشکی و تری سب مجسم ہوکر آئی ہے، اس کے جس گوشہ کو دل چاہے مٹھی میں لے لیجیئے۔ آمنہ کہتی ہیں کہ میں نے گھوم کر دیکھا کہ بچہ کہاں ہاتھ رکھتا ہے۔ میں نے دیکھا کہ اس نے بیچ میں ہاتھ رکھا تو کہنے والے کی آواز سنی کہ رب کعبہ کی قسم محمد نے کعبہ پر قبضہ کرلیا ہے۔ ہاں یہ کعبہ اس کا قبلہ اور مسکن رہے گا۔ تیسرے کے ہاتھ میں سپید حریر تھا۔ اس نے اس کو کھولا تو اس میں سے ایک انگوٹھی نکلی، جس کو دیکھ کر دیکھنے والوں کی آنکھیں حیرت کرتی تھیں، پھر وہ میرے پاس آیا تو طشت والے نے اس انگوٹھی کو لے کر اس آفتابہ سے سات

بار اس کو دھویا۔ اور بچہ کے مونڈھے پر مہر کر دی، اور حریر میں اس کو لپیٹ کر مشک خالص کے تاگے سے باندھ دیا اور تھوڑی دیر تک اپنے بازوؤں میں لپٹائے رکھا۔

ابن عباسؓ کہتے ہیں یہ رضوان جنت تھا پھر بچہ کے کان میں کچھ کہا آمنہ کہتی ہیں میں اسے سمجھ نہ سکی۔ اور پھر اس نے کہا۔ اے محمد بشارت ہو کہ کسی نبی کو کوئی ایسا علم عطا نہیں کیا گیا۔ جو تم کو نہیں دیا گیا۔ تم سب پیغمبروں سے زیادہ شجاع بنائے گئے۔ تم کو فتح و نصرت کی کنجی دی گئی۔ اور رعب و داب بخشا گیا۔ جو تمہارا نام سُنے گا خواہ اس نے تم کو کبھی دیکھا بھی نہ ہو تو وہ کانپ جائے گا۔ اے اللہ کے خلیفہ،

اس روایت کا ماخذ یہ ہے کہ یحیٰی بن عائذ المتوفی ۳۷۵ھ نے اپنی کتاب "میلاد" میں اس کا ذکر کیا ہے۔ ابن دحیہ محدث نے بڑی جرأت کر کے اس کو غریب کہا ہے۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ اس کو غریب کہنا بھی اس کی توثیق ہے۔ یہ تمام تر بے اصل اور بے بنیاد ہے۔ سیرت النبی ج ۳ ص ۵

یہ روایت چوتھی صدی میں وضع کی گئی۔ ان جاہل راویوں نے یہ تصور کر لیا ہے کہ مہر نبوت آپ کے جسم مبارک پر ولادت کے بعد بنائی گئی ہے۔ حالانکہ یہ گوشت کا ایک ٹکڑا تھا جو آپ کی پشت پر مونڈھے کے قریب انگوٹھی کی شکل پر پیدائشی طور پر موجود تھا۔ اس کو مہر نبوت کہتے ہیں۔ بعض احمقوں نے تو اس قسم کی روایات وضع کر ڈالیں کہ اس مہر نبوت میں پورا کلمہ تحریر تھا۔ حالانکہ معاملہ یہ ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے صلح حدیبیہ کے بعد مہر کے طور پر ایک انگوٹھی بنوائی تھی۔ جس میں کلمہ تحریر کرایا تھا۔ جو بعد میں خلفاء کے پاس رہی، اور حضرت عثمانؓ سے بیرارِیس میں گر گئی۔ اور تلاش بسیار کے بعد بھی نہ مل سکی۔ ان احمقوں نے خاتم نبوت کو مہر نبوت بنا دیا۔

یحیی بن عائذ جیسے اشخاص سے کوئی یہ دریافت کرے کہ زچگی کے وقت عورت جس تکلیف سے گزرتی ہے۔ کیا ایسے وقت میں ان تفصیلات کی جانب اس کی توجہ ہو سکتی ہے۔ اس بے چاری کو تو اس وقت اپنا بھی ہوش نہیں ہوتا۔ کجا کہ وہ موتی اور گوشے گننے بیٹھ جائے۔ بریں عقل و دانش بباید گریست۔

تمام دنیا پر قبضہ

آمنہ کا بیان ہے کہ جب میرے یہاں حضورؐ کی ولادت ہوئی تو ایک بڑا ابر کا ٹکڑا نظر آیا، جس میں سے

گھوڑوں کے ہنہنانے پیروں کے چٹپٹانے اور لوگوں کے بولنے کی آوازیں آرہی تھیں۔ وہ ابر کا ٹکڑا بچہ پر چھا گیا۔ اور بچہ میری نگاہوں سے اوجھل ہو گیا۔ البتہ منادی کی آواز سنائی دی کہ محمد کو ملکوں ملکوں پھراؤ۔ اور سمندر کی تہوں میں لے جاؤ۔ کہ تمام دنیا ان کے نام و نشان کو پہچان لے، اور جن و انس، چرند و پرند اور ملائکہ بلکہ ہر ذی روح کے سامنے ان کو لے جاؤ۔ ان کو آدمؑ کا خلق، شیثؑ کی معرفت، نوحؑ کی شجاعت، ابراہیمؑ کی دوستی، اسمٰعیلؑ کی زبان، اسحاقؑ کی رضا، صالحؑ کی فصاحت، لوطؑ کی حکمت، موسیٰؑ کی سختی، ایوبؑ کا صبر، یونسؑ کی طاعت، یوشعؑ کا جہاد، داؤدؑ کی آواز، دانیالؑ کی محبت، الیاسؑ کا وقار، یحییٰؑ کی پاکدامنی اور عیسیٰؑ کا زہد عطا کرو۔ اور تمام پیغمبروں کے اخلاق میں انہیں غوطہ دو۔

آمنہ کہتی ہیں پھر یہ منظر ہٹ گیا۔ تو میں نے دیکھا کہ آپ سبز حریر میں لپٹے ہیں۔ اور اس کے اندر سے پانی ٹپک رہا ہے۔ آواز آئی۔ ہاں محمد نے تمام دنیا پر قبضہ کر لیا۔ اور کوئی مخلوق ایسی نہ رہی جو ان کے حلقۂ اطاعت میں نہ آگئی ہو، کہتی ہیں کہ پھر میں نے دیکھا تو نظر آیا۔ کہ آپ کا چہرہ چودھویں رات کے چاند کی طرح ہے۔ اور مشک خالص کی سی خوشبو آپ سے نکل رہی ہے۔ دفعتہً تین آدمی نظر آئے۔ ایک کے ہاتھ میں چاندی کا آفتابہ ہے۔ دوسرے کے ہاتھ میں سبز زمرد کا طشت ہے۔ اور تیسرے کے ہاتھ میں سپید ریشم ہے۔ اس نے سپید ریشم کو کھول کر اس میں سے انگوٹھی جس کو دیکھ کر آنکھیں خیرہ ہوتی تھیں نکالی۔ پہلے اس نے انگوٹھی کو سات دفعہ اس آفتابہ کے پانی سے دھویا۔ پھر مونڈھے پر مہر کر کے بچہ کو تھوڑی دیر کے لئے اپنے بازوؤں میں لپیٹ لیا۔ اور پھر مجھے واپس کر دیا۔

اس حکایت کی بنیاد یہ ہے کہ قسطلانی نے مواہب لدنیہ میں السعادۃ والبشریٰ نامی ایک میلاد کی کتاب سے اس کو نقل کیا ہے۔ اور السعادۃ والبشریٰ کا مصنف کہتا ہے کہ اس نے خطیب سے اس روایت کو لیا ہے۔ روایات کے لحاظ سے خطیب کی تاریخ کا جو درجہ ہے وہ کسے معلوم نہیں۔ قسطلانی نے اس روایت کو ابونعیم کی طرف بھی منسوب کیا ہے۔ مگر دلائل ابونعیم کے مطبوعہ نسخہ میں تو اس کا پتہ نہیں۔ غنیمت یہ ہے کہ حافظ قسطلانی نے خود تشریح کر دی ہے کہ اس میں سخت نکارت ہے۔ سیرت النبی ج ۳ ص ۵۱۔

ہم تو صرف یہی کہہ سکتے ہیں کہ آمنہ نے جتنے انبیاء کرام کے نام اور ان کے اوصاف بیان کئے ہیں اتنے تو

اُس زمانہ میں پورے اہل مکہ کو بھی معلوم نہ تھے۔ وہ تو صرف ابراہیمؑ و اسماعیلؑ کو باپ ہونے کے ناتے جانتے تھے۔ اس لحاظ سے تو آمنہ بہت عالمہ و فاضلہ عورت تھیں۔

اس روایت کے جھوٹا ہونے کے لئے اتنا ہی کافی ہے کہ تمام دنیا پر آج تک حضور کی امت کا قبضہ نہیں ہوا۔ اس لحاظ سے تو فرشتوں کا جھوٹا ہونا ثابت ہوگا۔ اور اس پر آج تک تمام امت کا اتفاق رہا ہے کہ فرشتے گناہ پر قدرت نہیں رکھتے۔ اس پر بھی امت کا اتفاق ہے کہ فرشتے اللہ تعالیٰ کے علاوہ کسی کے تابع دار نہیں ہوتے۔ جو تمام مخلوق کی اطاعت کا سوال پیدا ہو۔ پھر احادیث میں ہمیں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ایسی بہت سی دعائیں نظر آتی ہیں۔ جن میں آپ نے سانپ، بچھو، باولے کتے، شیر اور درندوں کے پھاڑنے سے پناہ مانگی ہے۔ حتیٰ کہ ایک بار بچھو نے آپ کے کاٹا بھی ہے۔ جو اس امر کا ثبوت ہے کہ درندے اور جانور آپ کے حلقۂ اطاعت میں داخل نہیں۔ اس روایت میں اسی قسم کی اور بہت سی لغویات ہیں۔ جن کی تشریح کی ضرورت نہیں۔ سب سے بڑی لغویت تو یہی ہے کہ اس روایت کی کوئی سند موجود نہیں۔

گہوارے میں کلام کرنا

حافظ ابن حجر نے فتح الباری ج ۶ ص ۳۴۴ پر واقدی کی سیر کے حوالے سے نقل کیا ہے کہ آپ نے گہوارے میں کلام کیا۔ ابن سبع کی خصائص میں ہے کہ فرشتے آپ کا گہوارہ ہلاتے تھے۔ سب سے پہلا فقرہ زبان مبارک سے یہ نکلا۔ الحمد للہ کبیرا والحمد للہ کثیرا۔ ابن عائذ وغیرہ میلاد کی بعض اور کتابوں میں اور فقرے بھی منسوب ہیں۔ مثلاً کہ آپ نے لا الٰہ الا اللہ یا جلال ربی الرفیع پڑھا۔

واقدی کی سیر سے مراد اگر واقدی کی مغازی ہے تو اس کا کلکتہ کا مطبوعہ نسخہ جو میرے پیش نظر ہے۔ اس میں یہ واقعہ مذکور نہیں۔ اور اگر ہوتا بھی تو واقدی کا کیا اعتبار ہے؟ ابن سبع اور ابن عائذ وغیرہ زمانہ متاخر کے لوگ ہیں۔ اور قدماء سے روایت کی نقل میں بے احتیاط ہیں۔ کسی قدیم ماخذ سے اس روایت کا علم نہیں ہوتا۔ معلوم نہیں انہوں نے یہ روایتیں کہاں سے لیں۔ سیرت النبی ج ۳ ص ۵۵۔

اگر ماخذ کا علم ہو جائے تو پھر کہانی کا وجود کیسے باقی رہے گا۔ کیونکہ کہانی تو وہی ہوتی ہے جو خود ساختہ ہو۔ اور ماشاء اللہ ہمارے اکثر مورخین، صوفیاء، واعظین، اور سبائی دور تابعین سے آج تک کہانیاں تیار کرنے

ہی میں مصروف ہیں۔ بلکہ ہر پیر اور ہر ملا کے گھر میں ان کہانیوں کو ڈھالنے کے لئے ٹکسالیں قائم ہیں۔ جہاں سے نئی نئی قسم کی کہانیاں تیار ہو کر بازار میں آتی رہتی ہیں۔ اور جو لوگ اس کاروبار سے مستثنیٰ ہیں وہ پرانی کہانیوں کی نشر و تبلیغ میں مشغول ہیں۔

اس وضع روایت کی ابتدا کوفہ سے ہوئی۔ اور وہیں اس فن نے نشو و نما پائی۔ بقول امام مالکؒ کوفہ میں تو ٹکسالیں قائم ہیں، جہاں دن رات سکوں کی طرح روایت ڈھل کر بازار میں آتی رہتی ہیں۔ مدینہ میں ایسی کوئی ٹکسال نہ تھی۔ اگرچہ مؤرخ محمد بن اسحاق نے مدینہ میں بھی یہ ٹکسال قائم کرنی چاہی تھی لیکن اسے کامیابی حاصل نہ ہو سکی جس کے نتیجہ میں مدینہ چھوڑ کر مکہ چلا گیا لیکن وہاں کا ماحول بھی اس کے لئے سازگار نہ تھا۔ لہٰذا حرمین کی سرزمین کو خیرباد کہہ کر بغداد کی راہ لی۔ یہاں آکر اس نے برسر اقتدار طبقے کو بھی اپنا ہم نوا پایا۔ کیونکہ عباسی حکومت کے بڑے بڑے سرغنے مجوسی تھے۔ اور مجوسیوں کے ہی بل بوتے پر عباسی حکومت قائم ہوئی تھی۔ لہٰذا اس صنعت کو دگنی چوگنی ترقی ہوتی رہی۔ اور آج کل تو ہر شخص ان ہی کہانیوں کو اصل علم تصور کرتا ہے۔

چاند سے باتیں کرنا

بیان کیا جاتا ہے کہ حضرت عباسؓ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا۔ یا رسول اللہ مجھ کو جس نشانی نے آپ کے مذہب میں داخل ہونے کا خیال دلایا، وہ یہ ہے کہ جب آپ گہوارے میں تھے۔ تو میں نے دیکھا کہ آپ چاند سے اور چاند آپ سے باتیں کرتا تھا۔ اور انگلی سے آپ اس کو جدھر اشارہ کرتے تھے، اُدھر جھک جاتا تھا۔ فرمایا ہاں۔ وہ مجھ سے باتیں کرتا تھا اور میں اس سے باتیں کرتا تھا۔ وہ مجھے رونے سے بہلاتا تھا۔ اور عرش کے نیچے جا کر جب وہ تسبیح کرتا۔ تو میں اس کی آواز سنتا تھا۔

یہ حکایت دلائل بیہقی، کتاب المائتین صابونی، تاریخ خطیب اور تاریخ ابن عساکر میں ہے۔ مگر خود بیہقی نے تصریح کر دی ہے کہ یہ صرف احمد بن ابراہیم حُبلی کی روایت ہے، اور وہ مجہول ہے۔ صابونی نے یہ روایت نقل کرنے کے بعد کہا ہے کہ یہ روایت سنداور متن دونوں لحاظ سے غریب ہے۔

علاوہ ازیں حضرت عباسؓ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک دو سال بڑے تھے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم

کی شیرخوارگی کے زمانہ میں وہ خود شیرخوار ہوں گے۔ سیرت النبی ج ۲ ص ۱۷۵

اس کے علاوہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ولادت کے بعد صرف ہفتہ عشرہ مکہ میں رہے ہیں، دو تین روز والدہ نے دودھ پلایا۔ پھر ابولہب کی باندی ثویبہ نے تقریباً ایک ہفتہ دودھ پلایا۔ پھر حلیمہ آپ کو اپنے ساتھ قبیلہ بنی سعد لے گئیں۔ جو مکہ اور طائف کے درمیان آباد تھا۔

رہ گئے چاند سے باتیں کرنے کے تصورات یہ تخیل مسلمانوں میں ہندو مذہب سے آیا ہے۔ کیونکہ ہندو مذہب میں چاند ایک دیوی ہے جو چندرا نامی دیوی کے نام سے یاد کی جاتی ہے۔ اور چودھویں رات میں اس دیوی کو خوش کرنے کے لئے پوجا کی جاتی ہے بلکہ ہندو مذہب میں ایسے جاپ و منتر پائے جاتے ہیں جن کے ذریعہ چندا دیوی کو اپنے قابو میں کیا جا سکتا ہے۔ اور جس کے قابو میں وہ دیوی آجاتی ہے وہ اقتدار کا مالک ہو جاتا ہے۔ اسی لئے ہمارے شعراء بھی چاند کو مخاطب کرتے رہتے ہیں۔ عربی شاعری اس لغویت سے پاک ہے۔ اور اب تو موجودہ سائنس نے ان تمام تخیلات پر پانی پھیر دیا ہے۔ لیکن ہمارا میلادی مُلا آج تک ان ہی کہانیوں میں غرق ہے۔

یہ بھی ذہن نشین رہے کہ تمام مہاجر و انصار صحابہ میں کوئی بھی ایسا صحابی نہیں جو معجزہ دیکھ کر ایمان لایا ہو۔ بلکہ یہ حضرات صحابہ صرف تین امور کو پیش نظر رکھتے ہوئے ایمان لائے ہیں۔

۱۔ قرآن کے دلائل اور اس کا طرز بیاں دیکھ کر۔

۲۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی صداقت و امانت، آپ کے اخلاق حسنہ اور آپ کی اصول پرستی کو دیکھتے ہوئے۔

۳۔ اسلام کی روز بروز ترقی اور شان و شوکت کو دیکھتے ہوئے۔

اہل مکہ بچے کو چاند سے باتیں کرتے دیکھ کر تو کیا ایمان لاتے، وہ تو شق قمر کے معجزے کو دیکھ کر بھی ایمان نہ لائے۔ اور آپ کی شان و شوکت کو دیکھ کر فتح مکہ کے روز پورے اہل مکہ ایمان لے آئے۔ حضرت عباسؓ نے بھی فتح مکہ سے صرف ایک رات قبل ہی اپنے ایمان کا اظہار کیا تھا۔ جب کہ ان کی زوجہ ام الفضلؓ شروع ہی میں ایمان لا چکی تھیں۔

ایک یہودی کی بشارت

بیان کیا جاتا ہے کہ جس شب آپ پیدا ہوئے قریش کے بڑے بڑے سردار جلسہ جمائے بیٹھے تھے۔ ایک یہودی نے جو مکہ میں سوداگری کرتا تھا اُن سے آکر دریافت کیا کیا تمہارے یہاں آج کسی کے گھر بچہ پیدا ہوا ہے؟ سب نے اپنی لاعلمی ظاہر کی۔ اس نے کہا اللہ اکبر، تم کو نہیں معلوم تو خیر میں جو کچھ کہتا ہوں اس کو سن رکھو۔ آج شب کو اس پچھلی امت کا نبی پیدا ہوا ہے۔ اس کے دونوں مونڈھوں کے بیچ میں ایک نشانی ہے اس میں گھوڑے کے ایال کی طرح کچھ اوپر تلے بال ہیں۔ وہ دو دن تک دودھ نہ پئے گا کیونکہ ایک جن نے اس کے منہ میں انگلی ڈال دی ہے۔ جس سے وہ دودھ نہیں پی سکتا۔ جب جلسہ برخواست ہو گیا۔ اور لوگ گھر کو لوٹے تو معلوم ہوا کہ عبداللہ بن عبدالمطلب کے گھر لڑکا پیدا ہوا ہے۔ لوگ اس یہودی کو آمنہ کے گھر لائے۔ اس نے بچے کے پیٹ پر تل دیکھا تو غش کھا کر گر پڑا۔ جب ہوش آیا تو لوگوں نے سبب پوچھا۔ اس نے کہا اللہ کی قسم بنی اسرائیل کے گھرانے سے نبوت رخصت ہو گئی۔ اے قریش تم اس کی پیدائش سے خوش ہو، ہوشیار، اللہ کی قسم یہ ایک دن تم پر ایسا حملہ کرے گا جس کی خبر چار دانگ عالم میں پھیلے گی۔

یہ روایت حاکم کی مستدرک میں ہے، اور حاکم نے اسے صحیح کہا ہے۔ مگر اہل علم جانتے ہیں کہ حاکم کا کسی روایت کو صحیح کہنا ہمیشہ تنقید کا محتاج رہتا ہے۔ چنانچہ حافظ ذہبی نے تلخیص مستدرک کی ج ۲ صفحہ ۶۰۲ میں حاکم کی تردید کی ہے۔ اس کا سلسلۂ روایت یہ ہے کہ یعقوب بن سفیان فسوی، ابوغسان محمد بن یحییٰ کنانی سے اور وہ اپنے باپ یحییٰ بن علی کنانی سے اور وہ محمد بن اسحاق (مصنف سیرت) سے روایت کرتا ہے۔

سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ ابن اسحاق نے خود اپنی سیرت میں یہ روایت نہیں لی۔ ابوغسان محمد بن یحییٰ کو گو بعض محدثین (بخاری) نے ثقہ کہا ہے مگر محدث سلمانی نے اس کو منکر الحدیث (ایسی باتیں بیان کرنے والا جن کی تصدیق دیگر معتبر روایات سے نہیں ہوتی) کہا ہے۔ ابن حزم نے اس کو مجہول کہا ہے بہرحال اس تک غنیمت ہے۔ مگر اس کے باپ یحییٰ بن علی کا کہیں کوئی ذکر نہیں۔ کہ یہ کون تھا، اور کب گزرا ہے؟

اس قسم کی ایک روایت اسی راہب کے متعلق ابوجعفر بن ابی شیبہ سے مروی ہے۔ اور ابونعیم نے

دلائل میں اور ابن عساکر نے تاریخ میں اس کو ذکر کیا ہے لیکن زرقانی نے لکھا ہے کہ ابوجعفر بن ابی شیبہ نامعتبر ہے۔ سیرت النبی ص ۵۳ ج ۳۔

اول تو غور طلب امر یہ ہے کہ سرزمین مکہ میں یہودی کہاں سے آیا۔ ہمیں تو مکہ کی تاریخ میں وہاں یہودیوں کا کوئی وجود نظر نہیں آتا۔ پھر مزید یہ کہ حضور کے دہن مبارک میں جن کا انگلی دینا۔ اس امر کی بین دلیل ہے کہ یہ روایت وضع کرنے والا کوئی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا دشمن ہے جو بشارت کے پردے میں حضور کی ذات اقدس سے اپنا بغض نکالنا چاہتا ہے۔ اب خواہ وہ یہودی ہو یا کوئی مجوسی۔

رہا دو دن تک دودھ نہ پینا تو تمام مؤرخین اور اہل سیر اس پر متفق ہیں جن میں ابن اسحاق بھی داخل ہے کہ آپ نے دو یا تین دن تک اپنی والدہ کا دودھ پیا۔ پھر آپ نے ثوبیہ کا دودھ پیا۔ اس کے بعد آپ کو حلیمہ لے کر چلی گئیں۔

یہ نکتہ بھی غور طلب ہے کہ تل کا نبوت سے کیا تعلق ہے۔ اس سے تو بظاہر یہ محسوس ہوتا ہے کہ جس کے پیٹ پر تل ہو وہ نبی ہو، اور جب پیٹ کے تل کی یہ خصوصیت ہوئی تو اور تلوں میں بھی کچھ نہ کچھ خصوصیات ہوں گی۔

پیدا ہوتے ہی سجدہ کرنا

آمنہ کہتی ہیں کہ جب آپ پیدا ہوئے تو ایک روشنی چمکی جس سے تمام مشرق و مغرب روشن ہو گئے۔ اور آپ دونوں ہاتھ ٹیک کر زمین پر گر پڑے۔ (شاید مقصود یہ ہے کہ آپ سجدہ میں گر گئے) پھر مٹھی سے مٹی اٹھالی۔ (ابن بیاہ اس سے یہ مطلب لیتے ہیں کہ آپ نے پوری روئے زمین پر قبضہ کر لیا) اور آسمان کی طرف سر اٹھایا۔

یہ حکایت ابن سعد میں متعدد طریقوں سے مذکور ہے مگر ان میں سے کوئی قوی نہیں۔ اس کے قریب قریب ابونعیم اور طبرانی میں روایتیں ہیں۔ ان کا بھی یہی حال ہے۔ سیرت النبی ص ۵۳ ج ۳

جہاں تک تمام زمین پر قبضہ کا مسئلہ ہے تو پندرہ سو سال گزر گئے لیکن آج تک ایک روز کے لئے بھی مسلمان تمام دنیا پر قابض نہیں

نور نبوی کی تخلیق

اس موضوع اور ولادت رسول سے متعلق جو روایات عام طور پر کتب سیرت اور میلاد ناموں میں پائی جاتی ہیں۔ ہم اُن پر سید سلیمان ندوی مرحوم کی تحقیق قارئین کی خدمت میں پیش کرنا چاہتے ہیں جو انہوں نے سیرت النبی کی جلد سوئم میں فرمائی ہے۔ سید صاحب لکھتے ہیں۔

اس سلسلہ میں سب سے پہلی روایت یہ آتی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے لوح و قلم، عرش و کرسی، آسمان و زمین اور جن و انس غرض سب سے پہلے نور محمدی کو پیدا کیا۔ اور پھر لوح و قلم، عرش و کرسی، آسمان و زمین اور ارواح و ملائکہ سب چیزیں اسی نور سے پیدا ہوئیں۔ اس کے متعلق۔

اول ما خلق اللّٰہ نوری — سب سے اول اللہ نے میرے نور کو پیدا کیا۔

کی روایت عام طور سے زبانوں سے جاری ہے۔ مگر اس روایت کا احادیث کے دفتر میں مجھے کہیں کوئی پتہ نہیں ملا، البتہ ایک روایت مصنف عبدالرزاق بن ہمام میں ان الفاظ کے ساتھ مروی ہے۔

یا جابر اول ما خلق اللّٰہ نور — اے جابر سب سے اول اللہ تعالیٰ نے

نبیك من نورہ۔ — اپنے نور سے تیرے نبی کے نور کو پیدا کیا۔

اس کے بعد ذکر ہے کہ اس نور کے چار حصے ہوتے، اور اُن ہی سے لوح و قلم۔ عرش و کرسی، آسمان و زمین اور جن و انس کی پیدائش ہوئی۔

زرقانی وغیرہ نے اس روایت کو نقل کیا ہے۔ مگر افسوس ہے کہ اس کی سند نہیں لکھی، ہندوستان میں مصنف عبدالرزاق کی گو دوسری جلد ملتی ہے۔ مگر پہلی نہیں ملتی۔ دوسری جلد دیکھی گئی ہے۔ مگر اس میں یہ حدیث مذکور نہیں۔ اس لئے اس روایت کی تنقید نہیں ہوسکی۔ اور چونکہ کتاب مذکور میں صحیح حدیثوں کے ساتھ ساتھ موضوع حدیثیں تک موجود ہیں۔ اور فضائل و مناقب میں اس کی روایتوں کا اعتبار کم کیا جاتا ہے۔ اس لئے اصولاً

حیثیت سے اس روایت کے تسلیم کرنے میں مجھے پس و پیش ہے۔ اس تردد کو تقویت اس سے اور بھی زیادہ ہوتی ہے کہ صحیح احادیث میں مخلوقات الٰہی میں سب سے پہلے قلم تقدیر کی پیدائش کا تصریحی بیان ہے کہ

اول ما خلق اللّٰہ القلم۔ اللہ تعالیٰ نے سب سے اول قلم کو پیدا فرمایا

(ترمذی کتاب القدر، سیرت النبی ج ۳ ص ۳۰)۔

عبد الرزاق بن ہمام کی مصنف اب دس جلدوں میں شائع ہو چکی ہے۔ لیکن اس میں صحیح، ضعیف، مرسل، منقطع، منکر اور موضوع سب ہی قسم کی روایات ہیں۔

اس کے علاوہ خود عبد الرزاق کی ذات مشکوک ہے۔ محدثین کا بیشتر طبقہ انہیں رافضی قرار دیتا ہے۔ بلکہ بعض تو انہیں کذاب بھی کہتے ہیں۔ اور جو لوگ انکی روایات قبول کرتے ہیں وہ بھی چند شرائط کے ساتھ قبول کرتے ہیں۔

۱۔ چونکہ یہ شیعہ ہیں۔ لہٰذا فضائل و مناقب اور صحابہ کی مذمت میں جو روایات ہیں وہ قبول نہیں کی جائیں گی۔

۲۔ ۲۱۲ھ سے ان کا دماغ جواب دے گیا تھا۔ اور جو شخص بھی چاہتا وہ ان سے حدیث کے نام سے جو چاہتا کہلوا لیتا۔ لہٰذا ۲۱۲ھ کے بعد سے ان کی تمام روایات ناقابل قبول ہیں۔

۳۔ ان سے ان کا بھانجا جو روایات نقل کرتا ہے۔ وہ سب منکر ہوتی ہیں۔

۴۔ یہ معمر سے روایات غلط بیان کرنے میں مشہور ہے۔ اور ان کی عام روایات معمر سے ہوتی ہیں

۵۔ ان عیوب سے پاک ہونے کے بعد اس روایت کے راوی تمام ثقہ ہوں اور سند متصل ہو تو پھر وہ روایت قابل قبول ہو گی۔ ورنہ نہیں۔ یہ تمام شرائط ان حضرات کے نزدیک ہیں جو اس کی روایت قبول کرتے ہیں۔ ورنہ محدثین کا ایک گروہ اس کے رافضی ہونے کے باعث اس کی روایت ہی قبول کرنے کے لئے تیار نہیں۔ بلکہ یزید بن المبارک تو یہاں تک کہتے ہیں کہ یہ واقدی سے زیادہ جھوٹا ہے۔ تفصیل کے لئے کتب رجال ملاحظہ کیجیے۔

اب اس روایت کی معنوی حیثیت پر بھی غور فرمالیں۔ کہ جب اللہ تعالیٰ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے نور سے پیدا کیا۔ اور پھر حضور کے نور سے تمام مخلوقات پیدا ہوئیں۔ گویا اللہ تعالیٰ لا محدود اجزاء و اجسام

پر تقسیم ہو گیا۔ اس لحاظ سے اس کی یہ تقسیم تا قیامت جاری رہے گی۔ اس طرح زمین و آسمان کی ہر شے اللہ کا ایک جزو ہوئی، اور ہر شے میں الوہیت کا مادہ پایا گیا۔ اور کوئی شے ایسی باقی نہیں رہی جو الوہیت سے خالی ہو۔ ایسی صورت میں اگر کوئی شخص اپنے الٰہ ہونے یا انا الحق یا انا ربکم الاعلیٰ کا دعویٰ کرے تو اس کا یہ دعویٰ اپنی جگہ بالکل درست ہوگا۔ اور خالق و مخلوق، عابد و معبود۔ اور مالک و مملوک کا وہ رشتہ جو اللہ تعالیٰ نے پورے قرآن میں بیان کیا ہے فنا ہو کر رہ جاتے۔ یہی تو وہ کہانیاں ہیں جن پر وحدت الوجود اور ہمہ اوست کی بنیادیں قائم ہیں۔ اور جب یہ اجزاء فنا ہو جائیں گے تو اللہ تعالیٰ کی فنا بھی یقینی ہوگی۔ اگر یہ کہا جائے کہ یہ اجزاء فنا نہیں ہوتے بلکہ دوبارہ اللہ کی ذات میں جا کر شامل ہو جاتے ہیں۔ تو عیسائیوں کا حضرت عیسیٰ کے بارے میں یہی تصور ہے۔ اسی سے تو تثلیث وجود میں آئی ہے۔ افسوس یہ ہے کہ عیسائیوں نے اسے صرف تین کی حد تک محدود رکھا۔ اور ہمارے صوفیاء نے تمام مخلوقات کو اس کے احاطہ میں شامل کر لیا۔

پھر غور طلب یہ بھی ہے کہ جب اللہ تعالیٰ کی ذات میں سے ایک جزء علیحدہ کر دیا گیا تو دو امور تو یہ ہی تسلیم کرنے گئے۔

۱۔ اللہ ایک ایسی شے ہے جو اجزاء پر تقسیم ہو سکتی ہے۔ اور جو شے اجزاء پر تقسیم ہوتی ہو، وہ مجسم بھی ہوگی اور فنا بھی ہوگی۔ گویا اللہ تعالیٰ مجسم بھی ہے اور فانی بھی ہے۔

۲۔ جب ایک جزء علیحدہ ہوا۔ تو ذاتِ الٰہی میں نقص لازم آیا۔ (عیاذ باللہ)

ان روایات پر منطقی لحاظ سے آپ کسی طرح بھی غور کر لیں۔ نتیجہ ظاہر ہے کہ یہ سب اللہ تعالیٰ کی ذات پر تبرا ہے۔ عبدالرزاق سے اس کے علاوہ اور کیا توقع کی جا سکتی تھی۔ افسوس تو ہمیں اپنے علماء پر ہے کہ وہ اس روایت کو حضور کی فضیلت تصور کر بیٹھے۔

اس غلط فہمی کا دور کرنا بھی ضروری ہے کہ اللہ تعالیٰ بذاتِ خود ایک نور ہے۔ یہ قطعاً غلط ہے۔ نور تو اس کی ایک مخلوق ہے۔ اور مخلوق اور خالق ایک نہیں ہوتے۔ ورنہ پھر یہی وہی ہمہ اوست کی شکل پیدا ہو جاتی ہے۔

وَجَعَلَ الظُّلُمٰتِ وَالنُّوْرَ۔ اس نے ظلمت اور نور کو پیدا کیا۔

نیز ارشاد ہے۔

وَجَعَلْنَا لَهُ نُوْرًا يَّمْشِيْ بِهٖ فِي النَّاسِ۔ — اور ہم نے انسان کے لئے نور پیدا کیا جس سے وہ انسانوں میں چلتا پھرتا ہے۔

اور ارشاد ہے۔

وَمَنْ لَّمْ يَجْعَلِ اللّٰهُ لَهٗ نُوْرًا فَمَا لَهٗ مِنْ نُّوْرٍ — جس کے لئے اللہ نور پیدا نہ فرمائے اسے نور کہاں سے حاصل ہوگا۔

اور جاعل و مجعول کبھی ایک نہیں ہوسکتے کیونکہ جاعل بمعنی خالق ہے اور مجعول بمعنی مخلوق ہے۔ اور خالق و مخلوق اور فاعل و مفعول کا ایک ہونا امر محال ہے۔ عام لوگ جو مغالطہ کھاتے ہیں وہ اس آیت کی وجہ سے کھاتے ہیں۔

اَللّٰهُ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ۔ — اللہ آسمانوں اور زمینوں کا نور ہے۔

حالانکہ عربی میں نور مصدر ہے۔ اور مصدر کبھی مصدری معنی دیتا ہے کبھی حاصل مصدر کے معنی دیتا ہے کبھی مفعول کے اور کبھی فاعل کے۔ اسی لئے عرب مفسرین اس کا ترجمہ یہ کرتے ہیں۔

اَللّٰهُ مُنَوِّرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ۔ — اللہ آسمانوں اور زمینوں کو منور کرنے والا ہے

عوام اگر دھوکا کھائیں تو اس کی کوئی اہمیت نہیں کیونکہ وہ لاعلم ہیں لیکن اگر علماء بھی اس قسم کی باتیں کہنے لگیں تو اسے تو جہل مرکب ہی کہا جائے گا۔ جب اللہ تعالیٰ خود نور نہیں تو اس کے نور سے کسی کی تخلیق کا کیا سوال پیدا ہوسکتا ہے۔ سیدھے سیدھے یہ کہا جاسکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے نور سے پیدا کیا جس طرح فرشتے لیکن یہ سراسر قرآن کی تکذیب ہے۔ وہ تو کہتا ہے۔

وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ طِيْنٍ — اور ہم نے انسان کو گارے سے پیدا کیا۔

ہمارے نظریہ میں یہ روایت شیعوں کی وضع کردہ ہے۔ اور یہ اس لئے وضع کی گئی ہے تاکہ پنج تن پاک کی کہانیوں کی راہ ہموار ہوسکے کیونکہ ان کہانیوں کی رُو سے یہ نور پانچ حصوں میں تقسیم ہوا ہے۔ اور یہ روایت عبد الرزاق کے علاوہ کسی اور کتاب میں نہیں اور وہ رافضی ہے۔ لہٰذا اس نے اپنے عقیدے کی راہ ہموار

کرنے کے لئے یہ روایت وضع کی۔ کہ جب اہل سنت یہ کڑوی گولی ہضم کرلیں گے تو انہیں دوسری گولی کھلائی جائے گی اور عبدالرزاق کو اب تیرہ سو سال گزر چکے ہیں۔ اتنے طویل عرصے میں تو ہم ہزارہا کڑوی گولیاں نگل چکے ہیں۔ بلکہ اب ہم اہل سنت اس مارفین کے ایسے عادی ہو گئے ہیں کہ اس کے خلاف کوئی بات بھی سننے کے لئے تیار نہیں۔

نور کی منتقلی

روایتوں میں ہے کہ یہ نور پہلے ہزاروں برس سجدے میں پڑا رہا۔ پھر حضرت آدمؑ کے تیرہ و تاریک جسم کا چراغ بنا۔ پھر آدم نے مرتے وقت شیثؑ کو اپنا وصی بنا کر یہ نور ان کے سپرد کیا۔ اسی طرح درجہ بدرجہ ایک سے دوسرے پیغمبر کو سپرد ہوتا ہوا یہ نور عبداللہ کے سپرد ہوا اور پھر عبداللہ سے آمنہ کو منتقل ہوا۔

نور کا سجدے میں پڑے رہنا، اور اس کا موجود رہنا بالکل موضوع ہے۔ اور نور کا ایک دوسرے وصی کو درجہ بدرجہ منتقل ہونا قطعاً بے سروپا ہے۔ ابن سعد، طبرانی، ابونعیم، اور بزار میں اس آیت پاک

اَلَّذِیْ یَرٰاکَ حِیْنَ تَقُوْمُ وَتَقَلُّبَکَ فِی السّٰجِدِیْنَ — وہ آپ کو اس وقت بھی دیکھتا جب آپ کھڑے ہوتے۔ اور سجدہ کرنے والوں میں اپنی حالت تبدیل کرتے رہتے ہیں۔

کی تفسیر میں ایک روایت یہ نقل کی گئی ہے۔ کہ اس آیت کا مطلب یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا پیغمبروں کی پشت بہ پشت منتقل ہونا اللہ تعالیٰ دیکھ رہا تھا۔ لیکن اول تو پوری آیت کے الفاظ اور سیاق و سباق اس مطلب کا ساتھ نہیں دیتے۔ اور دوسرے یہ روایت اعتبار کے قابل نہیں۔ سیرت النبی ج۳ ص۳۲۸۔

اس آیت میں آپ کے کھڑے ہونے اور سجدہ کرنے والوں میں الٹ پھیر سے مراد۔ قیام۔ رکوع اور سجدہ ہے۔ اور مقصود یہ ہے کہ آپ صحابۂ کرام کے ساتھ نماز ادا کرتے ہیں۔ ساجدین سے صحابۂ کرام مراد لئے گئے ہیں۔ اس تفسیر پہ مجاہد، عکرمہ، قتادہ اور تمام مفسرین کا اتفاق ہے۔ رہا ابن عباسؓ کا مسئلہ تو ان کی بھی مشہور تفسیر وہی ہے جو اور حضرات کی ہے۔ یہ تفسیر تو کلبی کذاب نے نقل کی ہے۔ مجاہد اور عکرمہ بھی تو ابن عباسؓ کے شاگرد ہیں۔ انہوں نے ایسی کوئی روایت نقل نہیں کی۔

رہا یہ دعویٰ کہ یہ نور انبیاء کی پشت در پشت منتقل ہوتا رہا، تو سوال یہ ہے کہ حضرت اسمٰعیلؑ کی اولاد میں حضور کے علاوہ اور کون پیغمبر گذرا ہے۔ اسی طرح حضرت نوحؑ کی اولاد میں حضرت ابراہیمؑ تک کوئی نبی نہیں۔ تو یہ دعویٰ ہی سراسر جھوٹا ہے۔ اگر مراد حضور کے آباؤ اجداد ہیں تو آپ کے آباؤ اجداد میں بہت سے مشرک اور بت پرست گزرے۔ اس لحاظ سے بھی یہ روایت جہالت کا بین ثبوت ہے۔

لیکن قاعدہ یہ ہے کہ ایک جھوٹ کو چھپانے کے لئے سو جھوٹ بولنے پڑتے ہیں۔ لہٰذا اسی لئے شیعوں نے یہ عقیدہ وضع کیا کہ حضور کے تمام آباؤ اجداد مسلمان تھے۔ چنانچہ عبدالمطلب کے ساتھ حضرت کا لفظ بڑھایا جاتا ہے۔ مفسرین نے تو اس واقعہ کا کلبی کے نام سے سرسری طور پر ذکر کیا تھا لیکن اہل سیرت نے اسے ایک تمام کہانی بنا کر پیش کیا ہے۔ حتیٰ کہ عبدالحق دہلوی نے مدارج النبوت میں اور ملا باقر مجلسی نے جلاء العیون میں اس کی پوری تفصیل پیش کی۔ اس کے آخر میں یہ ہے کہ عبدالمطلب سے یہ نور دو حصوں میں منقسم ہو گیا۔ عبداللہ اور عبد مناف (یعنی ابوطالب) عبداللہ سے یہ نور حضور کو ملا اور عبد مناف سے حضرت علیؓ کو۔ اسی باعث حضور امام الانبیاء اور حضرت علی امام الاولیاء ہیں۔

گویا حضرت علیؓ حضور کے ساتھ ایک مساوی درجہ رکھتے ہیں۔ ان کو جو کچھ حاصل ہوا حضور کے طفیل میں نہیں بلکہ فطری اور تخلیقی طور پر حاصل ہوا۔ حتیٰ کہ جلاء العیون میں ہے کہ حضرت علیؓ نے پیدائش کے اول ہی دن کلام فرمایا۔ اور حضور سے دریافت کیا کہ کیا تم نے مجھے پہچان لیا۔ حضور نے جواب دیا ہاں۔ پھر حضور نے حضرت علیؓ سے یہی سوال کیا۔ حضرت علیؓ نے بھی اقرار میں جواب دیا۔ اسی روز سے اس دن کا نام عرفہ ہو یعنی پہچان لینے کا دن۔

ہمارا ملا ایک جانب تو منبر پر یہ کہانی بیان کرتا ہے۔ اور دوسری جانب عرفہ ۹ ذی الحجہ کو مناتا ہے۔ اور اس کے لئے اس نے یہ طریقہ اختیار کیا کہ عبدالمطلب سے اس نور کو تقسیم نہیں کیا۔ سیدھے سیدھے عبداللہ کی جانب منتقل کر دیا لیکن عبدالحق نے اس تقسیم کو جاری رکھا۔ اور اس طرح حضرت علیؓ کو امام الاولیاء بنا کر نبوت کے مقابلہ میں ایک متوازی لائن ولایت و امامت کی پیش کر کے دکھا دی۔ اس لحاظ سے ولی کے لئے یہ ضروری نہیں رہا کہ وہ شریعت اسلامیہ کا پابند ہو۔ اس کا صرف اولاد علیؓ سے ہونا کافی ہے۔ اسی لئے ہمارے تمام

پیر صاحبان اولادِ علیؓ میں سے ہوتے رہے۔ یا زبردستی اولادِ علیؓ بن گئے یا بنا دیئے گئے۔ اور اس طرح پیر پرستی سید پرستی اور شاہ پرستی نہ صرف وجود میں آئی بلکہ ایک بلا بن کر سنیوں کے دماغوں پر مسلط ہو گئی۔ اللہ تعالیٰ ہمیں اس کالی ماتی سے محفوظ رکھے۔

نور کے وسیلے سے دُعا

روایت ہے کہ یہ نور جب عبدالمطلب کے سپرد ہوا تو وہ ایک دن خانہ کعبہ میں سوئے ہوئے تھے۔ سو کر اٹھے۔ تو دیکھا کہ ان کی آنکھوں میں سُرمہ اور بالوں میں تیل لگا ہے۔ اور بدن پر جمال و رونق دیا جوانی، کا خلعت ہے۔ یہ دیکھ کر وہ ششدر رہ گئے۔ آخر کار ان کے باپ ان کو قریش کے ایک کاہن کے پاس لے گئے۔ اس نے کہا کہ اللہ نے اجازت دی ہے۔ کہ اس لڑکے کا نکاح کر دیا جائے۔ اس نور کے اثر سے عبدالمطلب کے بدن سے مشک کی خوشبو آتی تھی۔ اور وہ نور ان کی پیشانی میں چمکتا تھا۔ قریش پر جب قحط وغیرہ کی کوئی مصیبت پیش آتی تھی تو اس نور کے وسیلے سے وہ دُعا مانگتے تھے۔ تو قبول ہوتی تھی۔

یہ روایت ابوسعد نیشاپوری المتوفی ۴۰۶ھ نے اپنی کتاب شرف المصطفیٰ میں ابوبکر بن ابی مریم کے واسطے سے کعب احبار (نومسلم یہودی) تابعی سے روایت کی ہے۔ اول تو یہ سلسلہ ایک تابعی تک موقوف ہے آگے کی سند نہیں۔ علاوہ ازیں کعب احبار کو نومسلم اسرائیلیوں میں سب سے بہتر سمجھے جاتے ہیں۔ تاہم امام بخاری ان کے کذب کا تجربہ بیان کرتے ہیں۔ اسلام میں اسرائیلیات اور عجیب و غریب حوادث کی روایات کے سرچشمہ یہی ہیں۔

بیچ کا راوی ابوبکر بن ابی مریم۔ باتفاق محدثین ضعیف ہے۔ اس کا دماغ ایک حادثہ کے باعث ٹھیک نہیں رہا تھا۔ سیرت النبی ج ۳ ص ۷۳۹

کعب کا انتقال حضرت عثمان کے زمانہ میں ہوا یعنی ۳۵ھ سے قبل اور ابوبکر بن ابی مریم کی وفات ۱۵۶ھ میں ہوئی۔ یہ ابوبکر بن ابی مریم نہایت عابد و زاہد انسان تھا۔ اور بالمتقی کے لقب سے مشہور تھا۔ اس کا تفصیلی حال پہلے گزر چکا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ اس نے کشف قبر کے ذریعہ کعب کی روح سے ملاقات کی ہو۔ اور اس

سے یہ روایت سنی ہو۔ ورنہ کعب تو اس کے وجود میں آنے سے بہت پہلے مرچکا تھا۔

عبد مطلب کا اصلی نام شیبہ ہے۔ اس کا باپ ہاشم بغرض تجارت شام گیا۔ راہ میں مدینہ میں قیام کیا۔ وہاں انہیں بنو نجار کی ایک لڑکی سلمیٰ پسند آگئی۔ انہوں نے اس سے شادی کر لی۔ کچھ دن اس کے پاس رہ کر ہاشم شام چلا گیا۔ واپسی میں راہ میں غزہ کے مقام پر ہاشم کا انتقال ہوگیا۔ لیکن سلمیٰ کے پیٹ میں حمل رہ گیا۔ جب بچہ پیدا ہوا تو اس کے سر کے بال سپید تھے۔ اسی لئے اس کا نام شیبہ رکھا گیا۔ اس بچہ نے آٹھ سال تک مدینہ میں پرورش پائی۔ جب ہاشم کے بھائی مطلب کو ان واقعات کی خبر ملی تو وہ مدینہ گیا۔ اور اس بچہ کو اپنے ساتھ مکہ لے آیا۔ اور چونکہ اس بچہ کی پرورش مطلب نے کی تھی۔ اسی لئے لوگ اس بچہ کو عبد المطلب کہنے لگے۔

سوال یہ ہے کہ عبدالمطلب کا باپ تو اس کی پیدائش سے قبل ہی مرگیا تھا۔ کیا مرنے کے پندرہ سولہ سال بعد وہ زندہ ہوکر دوبارہ آیا تھا۔ ظاہر ہے کہ یا تو یہ کعب احبار کا جھوٹ ہے۔ کیونکہ وہ اہل مکہ کے حالات سے بے خبر تھا۔ یا یہ صوفی ابوبکر بن ابی مریم کی بدعقلی کا نتیجہ ہے۔ ہاں ہمیں اس روایت سے چند سبق ضرور حاصل ہوتے ہیں۔

۱۔ یہ وسیلے اور واسطے کفار کی سنت ہیں۔ یہ ایک ایسی شئے ہے جس کی قرآن بھی شہادت دے رہا ہے۔

۲۔ یہ نور اس وقت منتقل ہوتا تھا جب بچہ جوان ہوجاتا تھا۔ کہیں اس نور سے مراد جوانی کا نور تو نہیں۔

۳۔ جن لوگوں کو یہ نور حاصل ہوتا رہا۔ انہوں نے اللہ تعالیٰ کی اجازت کے بغیر شادی نہیں کی۔ اور اجازت الٰہی معلوم کرنے کا طریقہ کاہنوں کے ذریعہ فال کھلوانا تھا۔

۴۔ بچوں کو چاہئے کہ جب وہ جوان ہوں تو سر پر تیل چپڑا کریں۔ اور آنکھوں میں سرمہ لگایا کریں۔ ہوسکتا ہے کہ انہیں بھی یہ نور حاصل ہوجائے۔

عبداللہ سے ایک کاہنہ کی درخواست

(منصب رسالت کے اغوا کی کوشش)

روایت ہے کہ یہ نور جب عبداللہ کی پیشانی میں چمکا یعنی جوانی کا جوبن آیا تو ایک عورت جو کاہنہ تھی اس نے نور کو پہچانا۔ اور چاہا کہ خود عبداللہ سے ہم بستر ہوکر اس نور کی امین بن جائے۔ مگر یہ سعادت اس کی قسمت میں نہ تھی اُس

وقت عبداللہ نے عذر کیا۔ اور گھر چلے گئے۔ وہاں یہ دولت آمنہ کو نصیب ہوئی۔ عبداللہ نے واپس آ کر اس کا ہنہ سے درخواست کی۔ تو اب اس نے رد کر دی۔ کہ اب وہ نور تمہاری پیشانی سے منتقل ہو چکا۔

یہ روایت الفاظ اور جزئیات کے اختلاف کے ساتھ ابن سعد، خرائطی، ابن عساکر، بیہقی اور ابونعیم میں مذکور ہے۔ ابن سعد نے تین طریقوں سے اس کی روایت کی ہے۔ ایک طریقہ میں پہلا راوی واقدی ہے، دوسرے میں کلبی ہے۔ یہ دونوں مشہور دروغ گو ہیں۔ تیسرا طریقہ ابو یزید مدنی تابعی پر جا کر ختم ہو جاتا ہے۔ (یعنی اوپر کے راوی غائب ہیں)۔

ابو یزید مدنی کی اگرچہ بعض ائمہ نے توثیق کی ہے۔ مگر مدینہ کے شیخ امام مالک فرماتے ہیں کہ میں اس کو نہیں جانتا۔ ابو زرعہ کہتے ہیں مجھے نہیں معلوم۔

ابونعیم نے چار طریقوں سے اس کی روایت کی ہے۔ لیکن ان میں کوئی بھی قابل وثوق نہیں۔ ایک طریقہ میں نضر بن سلمہ، احمد ابن محمد، اور عبدالعزیز بن عمران زہری ہیں۔ اور یہ تینوں نامعتبر ہیں۔ دوسرے میں مسلم بن خالد الزنجی ہے۔ جو ضعیف سمجھا جاتا ہے۔ اور متعدد مجہول راوی ہیں۔ تیسرا سلسلہ یزید بن شہاب الزہری پر جا کر ختم ہو جاتا ہے۔ اور وہ اپنے آگے کا سلسلہ بیان نہیں کرتا۔ اور اس کا حال بھی معلوم نہیں۔ بیہقی کا سلسلہ وہی تیسرا ہے۔ خرائطی اور ابن عساکر کا سلسلہ بھی ناقابل اعتبار ہے۔ سیرت النبی ج ۱ ص ۱۴۲

رجال کی مزید تفصیل ہم بعد میں عرض کریں گے۔ سب سے اول تو قارئین کو یہ سمجھ لینا چاہیے کہ یہ بدبخت وہی یہ ثابت کر رہے ہیں کہ حضور کے والد عبداللہ ایک ہوس پرست اور بدکار شخص تھے۔ کہ آپ کو ایک فاحشہ نے اپنی جانب مائل کرنا چاہا۔ اُس وقت کسی خاص وجہ کے تحت انکار کر دیا۔ لیکن بعد میں خود اُس فاحشہ کے پاس درخواست کرنے کے لئے پہنچ گئے۔ خود عقل سے سوچئے کہ یہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی فضیلت بیان ہو رہی ہے۔ یا آپ کے والد پر تبرا ہو رہا ہے۔ اور انہیں بدکار ثابت کیا جا رہا ہے۔

مؤرخ کلبی: ان کی کرم فرمائیوں کے کرشمے متعدد مضامین میں نظر آتے ہیں۔ یہ اپنے دور کے مشہور مؤرخ تھے۔ ماہر انساب اور مسئلہ تفسیر کے امام تصور کئے جاتے ہیں۔ حتیٰ کہ ان کی تفسیری کہانیوں سے کوئی تفسیر خالی نہیں۔ ویسے بھی ایک تفسیر کے مصنف ہیں جو آج تفسیر ابن عباسؓ کے نام سے موسوم ہے۔ اور جو ایک عرصے

ترجمہ ہوکر بازار میں شائع ہو رہی ہے۔ بس فرق یہ ہے کہ آج وہ تفسیر ابن عباس کے نام سے مشہور ہے۔ اور متقدمین میں تفسیر کلبی کے نام سے مشہور تھی۔ اس کا دعوی یہ ہے کہ اس نے یہ تمام تفسیر ابو صالح سے سنی ہے۔ اور ابو صالح نے حضرت عبداللہ بن عباس ؓ سے۔ اسی لئے یہ دو ناموں سے مشہور ہوئی یعنی تفسیر ابن عباس، اور تفسیر کلبی۔ آیئے اب حافظ ذہبی کی زبانی اس کا کچھ حال ملاحظہ کیجئے۔ حافظ صاحب لکھتے ہیں۔

اس کا نام محمد بن السائب ہے۔ ابو النضر اس کی کنیت ہے۔ بنو کلب خاندان سے تعلق رکھتا ہے۔ کوفہ کا باشندہ ہے۔ ماہر انساب، مفسر اور مورخ ہے۔ امام شعبی وغیرہ سے روایات نقل کرتا ہے۔ اس سے اس کا بیٹا ہشام اور ابو معاویہ وغیرہ روایت کرتے ہیں۔ اس کی روایت جامع ترمذی میں پائی جاتی ہے۔

امام سفیان ثوری فرماتے ہیں کلبی خود کہا کرتا تھا کہ مجھ سے ابو صالح نے ایک بار بطور نصیحت یہ بات فرمائی تھی۔ اے کلبی تو نے ابن عباس ؓ کی جتنی روایات مجھ سے سنی ہیں اُنہیں کسی سے بیان نہ کرنا۔ (پھر بھی اس بے حیا نے سب کچھ بیان کر دیا اور پوری ایک کتاب لکھ ڈالی۔ حالانکہ اُستاد نے تقیہ کا حکم دیا تھا۔ اور پھر نہ معلوم اس نے تقیہ کیوں اختیار نہیں کیا۔)

ابو معاویہ کہتے ہیں میں نے کلبی کو یہ کہتے سُنا ہے کہ جتنی جلد میں نے قرآن حفظ کیا ہے۔ اتنی جلد کسی نے قرآن حفظ نہیں کیا۔ میں نے صرف چھ یا سات دن میں قرآن حفظ کر لیا تھا۔ اور جس طرح مجھے بھول واقع ہوئی ہے ایسی بھول کسی کو واقع نہیں ہوئی ہوگی۔ وہ اس طرح کہ میں نے اپنی داڑھی مٹھی میں لی، تاکہ داڑھی نیچے سے کاٹ کر برابر کر لوں اور اوپر سے کاٹ دی۔

امام یزید بن ہارون کا بیان ہے۔ کہ مجھ سے خود کلبی نے یہ بیان کیا کہ میں نے جس شے کو ایک بار یاد کر لیا۔ کبھی بھولا نہیں۔ لیکن ایک بار میں نے حجام کو بلوایا اور اپنی داڑھی برابر کرانے کے لئے مٹھی میں لی۔ اور بجائے نیچے سے کٹوانے کے اوپر سے کٹوا لی۔ (یعنی ایک بار خود کاٹی اور ایک بار حجام سے کٹوائی)

یعلی بن عبید کہتے ہیں کہ امام سفیان ثوری نے لوگوں سے فرمایا اے لوگو اس کلبی کی روایتوں سے بچو۔ کسی نے ان سے عرض کیا۔ آپ بھی تو اس کی روایات نقل کرتے ہیں، انہوں نے فرمایا میں تو اس کے سچ اور جھوٹ کو پہچانتا ہوں، یعنی یہ جانتا ہوں کہ اس کی کون سی روایت درست ہے اور کون سی غلط۔

امام بخاری فرماتے ہیں کہ یحییٰ بن سعید القطان اور عبدالرحمان بن مہدی نے اس سے روایت ترک کی ہے پھر بخاری نے امام سفیان کا یہ قول باسند نقل کیا کہ مجھ سے خود کلبی نے یہ بات کہی تھی کہ میں تجھ سے ابو صالح کے واسطے سے جو بھی حدیث بیان کروں تو سمجھ لے کہ وہ خالص جھوٹ ہے۔

یعلی کا بیان ہے کہ میں کلبی سے قرآن پڑھنے جایا کرتا تھا۔ ایک دن ہوا کہ میں ایک دفعہ شدید بیمار ہوا اور اس بیماری کے باعث سب کچھ بھول گیا۔ میں آل محمد کی خدمت میں گیا۔ انہوں نے میرے منہ میں تھوکا۔ تو مجھے سب کچھ بھولا ہوا یاد آگیا۔ نامعلوم آل محمد میں سے کتنے افراد سے اس نے اپنے منہ میں تھکوایا ہوگا۔

یزید بن زریع فرماتے ہیں یہ کلبی سبائی تھا۔ امام اعمش کوفی کا قول ہے۔ اے لوگوں سبائیوں سے بچو۔ کیونکہ جن علماء کو میں نے دیکھا ہے وہ ان سبائیوں کو کذاب کہا کرتے تھے۔

امام سفیان بن عیینہ نے کلبی کا یہ قول نقل کیا ہے کہ ایک بار مجھ سے ابو صالح نے یہ کہا تھا کہ مکہ میں ایک شخص بھی ایسا نہیں ہے جس سے میں واقف نہ ہوں۔ بلکہ میں تو ہر ایک کے باپ سے بھی واقف ہوں۔

ابن حبان کہتے ہیں۔ یہ کلبی سبائیوں کے اس گروہ سے تعلق رکھتا تھا جو اس امر کا مدعی تھا کہ حضرت علیؓ کی موت واقع نہیں ہوئی۔ وہ دنیا میں دوبارہ تشریف لائیں گے۔ اور دنیا کو عدل سے اسی طرح بھر دیں گے جیسے وہ ظلم سے بھری ہوگی۔ یہ لوگ جب بھی بادل کا کوئی ٹکڑا دیکھتے تو کہتے کہ امیرالمومنین اس میں تشریف رکھتے ہیں۔ (سبائیوں کے اس گروہ کا نام فرقہ رجعیہ ہے)

ہمام کا بیان ہے کہ کلبی تو برملا کہا کرتا تھا کہ میں سبائی ہوں۔

ابوعوانہ کہتے ہیں کہ میں نے خود کلبی کو یہ کہتے سنا ہے کہ جبرئیلؑ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر وحی لے کر آتے۔ لیکن جب حضور بیت الخلاء تشریف لے جاتے تو وہ حضرت علیؓ پر وحی شروع کر دیتے۔ یعنی وہ چالیس پاروں کا قرآن اسی فریب کاری کا نتیجہ ہے۔ جب ہی تو آج تک وہ غائب ہے۔

احمد بن زہیر کا قول ہے کہ میں نے امام احمد بن حنبل سے دریافت کیا کہ کلبی کی تفسیر کا مطالعہ کرنا کیا حلال ہے؟ انہوں نے فرمایا نہیں۔

یحییٰ بن معین کا قول ہے کہ کلبی ثقہ نہیں ہے۔ دارقطنی اور ایک جماعت کہتی ہے کہ متروک ہے جوزجانی

وغیرہ کہتے ہیں یہ کذاب ہے۔

امام ابن حبان فرماتے ہیں۔ اس کا مذہب بھی ظاہر ہے۔ اور اس کا جھوٹ بھی اتنا اظہر من الشمس ہے کہ محتاج تعارف نہیں۔ یہ ابوصالح کے واسطہ سے ابن عباس رضی اللہ عنہ سے تفسیر نقل کرتا ہے۔ حالانکہ ابوصالح نے ابن عباس رضی اللہ عنہ کو دیکھا تک نہیں۔ اور اس نے ابوصالح سے صرف ایک دو ہی باتیں سنی تھیں۔ اب جب بھی اسے جھوٹ بولنا ہوتا ہے تو ابوصالح کو یہ زمین کی تہہ اور تاریکیوں سے باہر نکال لاتا ہے۔ اس کا اور اس کی روایت کا کسی کتاب میں ذکر کرنا بھی حلال نہیں۔ کجا کہ اس کی روایت کو بطور دلیل پیش کیا جائے۔ میزان الاعتدال ج ۳ ص ۵۵۹

اس کا ایک شاگرد رشید عطیہ بن سعد العوفی ہے۔ وہ اس کی روایات کی اشاعت کا ذریعہ تھا۔ اس کلبی کی کنیت جس طرح ابوالنضر ہے۔ اسی طرح ایک کنیت ابوسعید بھی ہے۔ عطیہ جب بھی اس کی روایت بیان کرتا تو کہتا۔ ابوسعید نے یہ روایت بیان کی ہے۔ جس سے لوگ یہ دھوکہ کھاتے کہ ابوسعید سے مراد حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ صحابی ہیں۔ امام احمد بن حنبل فرماتے ہیں عطیہ کلبی کے پاس جایا کرتا تھا اور اس سے تفسیر پڑھا کرتا تھا۔ اور اس کلبی کی ایک کنیت ابوسعید تھی۔ عطیہ دھوکہ دینے کے لئے اس کنیت کو استعمال کرتا تاکہ لوگ اس دھوکہ میں مبتلا ہو جائیں کہ ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ مراد ہیں۔ میزان ج ۳ ص ۸۰

یہاں سے یہ اصول واضح ہوا کہ جس روایت کو عطیہ ابوسعید رضی اللہ عنہ سے نقل کرے۔ وہ کلبی کذاب کا جھوٹ ہے۔ حضرت ابوسعید رضی اللہ عنہ خدری کی حدیث نہیں۔ اتفاق سے ترمذی اور ابن ماجہ وغیرہ میں اس قسم کی متعدد روایات ملتی ہیں۔

اس تفصیل سے یہ بات واضح ہو گئی کہ واقدی اور کلبی نے یہ روایت کس سبب کے تحت بیان کی ہوگی۔ جو طبقہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو نبی ماننے کے لئے تیار نہیں۔ وہ آپ کے والد عبداللہ کو کیسے معاف کر سکتے ہیں۔

اب بقیہ دیگر راویوں کا مختصر سا حال معلوم کر لیں۔ ان کے تفصیلی حال کی اس لئے ضرورت نہیں کہ بقیہ راوی فریب کار نہیں، بلکہ فریب خوردہ اشخاص ہیں۔ اس لئے ان کا مختصر سا جائزہ ہی کافی ہے۔

مسلم بن خالد الزنجی: یہ تبع تابعی ہیں۔ بنو مخزوم کے غلام تھے۔ ان کی کنیت ابوخالد ہے۔ مکہ کے فقیہ تھے۔ ابوداؤد اور ابن ماجہ میں ان کی روایات پائی جاتی ہیں۔ امام شافعی، حمیدی اور مسدد وغیرہ نے ان سے روایات لی ہیں۔

بخاری کہتے ہیں منکر الحدیث ہیں۔ ابو حاتم کہتے ہیں حجت نہیں۔ ساجی کہتے ہیں بہت غلطیاں کرتے ہیں۔ تقدیر کے منکر تھے۔ علی بن المدینی کہتے ہیں کچھ نہیں۔ ابو داؤد کہتے ہیں ضعیف ہے۔ ازرقی کا بیان ہے کہ یہ فقیہ تھے، بہت عبادت گزار تھے اور ہمیشہ روزے رکھا کرتے تھے یعنی غلبۂ زہد میں حفظ حدیث کی جانب توجہ نہیں تھی۔ سنہ ۱۸ھ میں اسی سال کی عمر میں ان کا انتقال ہوا۔ میزان الاعتدال ص۱۰۲ ج۴۔

نضر بن سلمہ: یہ شاذان المروزی کے لقب سے مشہور ہے۔ ابو حاتم رازی فرماتے ہیں۔ یہ احادیث تیار کیا کرتا تھا۔ یعنی دماغ کی بھٹی میں۔ ابن عدی کہتے ہیں یہ مدینۃ الرسول میں مقیم تھا۔ اس کی کنیت ابو محمد تھی۔

عبدان کا بیان ہے کہ میں نے عبد الرحمان بن خراش سے دریافت کیا۔ کہ غلام خلیل مدینہ کے علماء کی جو احادیث بیان کرتا ہے وہ کیسی ہیں۔ انہوں نے جواب دیا کہ اس نے عبد اللہ بن شعیب سے چوری کی ہیں۔ اور عبد اللہ بن شعیب نے شاذان سے۔ اور شاذان نے انہیں خود وضع کیا ہے۔ اور اس شاذان کا نام نضر بن سلمہ ہے۔ میزان ص۲۵۶ ج۴۔

عبد اللہ کے فراق میں دو سو عورتوں کا مر جانا

حضرت عباسؓ سے روایت کی گئی ہے۔ کہ عبد مناف اور قبیلہ مخزوم کی دو سو عورتیں گنی گئیں جنہوں نے اس غم میں کہ عبد اللہ سے ان کو یہ دولت حاصل نہیں ہوئی مر گئیں لیکن انہوں نے شادی نہیں کی۔ اور قریش کی کوئی عورت ایسی نہ تھی جو اس غم میں بیمار نہ پڑ گئی ہو۔

یہی حکایت ہے جس کا غلط ترجمہ اردو مؤلفین میلاد نے یہ کیا ہے کہ اس رات دو سو عورتیں رشک و حسرت سے مر گئیں۔ یہ روایت سند کے بغیر زرقانی شرح مواہب لدنیہ میں بصیغۂ رُوِیَ بیان کی گئی ہے جس سے ثابت ہوتا ہے کہ خود مصنف کو بھی اس کی صحت میں کلام ہے۔ درحقیقت یہ روایت بالکل بے سند اور بے اصل ہے۔ کسی معتبر کتاب میں اس کا پتہ نہیں۔ سیرت النبی ص۷۲۲ ج۳۔

ہمارے ذہن نارسا میں تو صرف سیدھی سیدھی چند باتیں آتی ہیں جو ہم ہدیۂ ناظرین کرتے ہیں۔

۱۔میلادیوں سے ہماری درخواست ہے کہ بنو عبد مناف اور بنو مخزوم کی دو سو عورتوں کی فہرست پیش کریں۔ ہماری جانب سے انہیں یہ اجازت ہے کہ شادی شدہ لڑکیوں کو بھی وہ اس میں داخل کر سکتے ہیں؟

۲۔ ہمیں بنو مخزوم اور بنو عبد مناف کی صرف دس دس لڑکیوں کے نام بتادیں جنہوں نے زندگی بھر شادی نہ کی ہو۔ چلئے پانچ پانچ عورتوں ہی کے نام گنا دیں؟

۳۔ یہ غم صرف ان دو خاندانوں کی لڑکیوں کو کیوں ہوا۔ آخر بنو زہرہ، بنو جمح، بنو اسد، بنو خویلد، بنو تیم، بنو عدی اور بنو غالب کی لڑکیوں کو کیوں نہیں ہوا؟

۴۔ ولید بن مغیرہ اور ابو جہل وغیرہ جو بنو مخزوم سے تعلق رکھتے تھے۔ اور آپ کے پکے دشمن تھے کہیں ان کو اسی بات کی عداوت تو نہ تھی کہ ان کی ماؤں اور بہنوں نے فراق عبداللہ میں جان دیدی تھی؟

۵۔عبد مناف کے ایک بیٹے کا نام ہاشم تھا جس کی اولاد بنو ہاشم کہلاتی ہے۔ ہمیں یہ بتایا جائے کہ بنو ہاشم کی کتنی عورتوں نے جان دی یا وہ کنواری بیٹھی رہیں؟

۶۔اس کہانی سے تو یہ ثابت ہوگا کہ عبداللہ کی شب وصال اہل مکہ کے لئے غم کی رات تھی۔ اس رات کو تو وہ محرم کی طرح غم مناتے ہوں گے۔ اور عبداللہ پر تبرا کرتے ہوں گے۔ اس سے حضور کی فضیلت ثابت ہوگی۔ یا حسین الفاظ میں حضور اور آپ کے والد پر تبرا ہوگا۔ نہ معلوم ہمارے ان ملاؤں نے اپنی عقل کو کہاں گروی رکھ دیا ہے؟

ایک کاہن کی پیشن گوئی

ابونعیم، حاکم، بیہقی اور طبرانی میں ایک روایت ہے کہ ایک بار عبدالمطلب یمن گئے۔ وہاں ایک کاہن اُنکے پاس آیا اور اُن کی اجازت سے ان کے نتھنوں کو دیکھ کر بتایا کہ ایک ہاتھ میں نبوت اور دوسرے میں بادشاہی کی علامت ہے [illegible] بنو زہرہ سے جاکر شادی کرو۔

[illegible] تمام مصنفین [illegible] عمران الزہری سے [illegible] اس کی نسبت میزان میں ہے کہ امام [illegible]

عبدالعزیز کے بعد کا راوی یعقوب بن محمد الزہری ہے۔ جس کی نسبت یحییٰ بن معین کہتے ہیں کہ اگر ثقہ راوی سے روایت کرے تو لکھو، ابوزرعہ نے کہا وہ کچھ نہیں، وہ واقدی کے قریب ہے۔ امام احمد نے کہا وہ کچھ نہیں۔ اس کی حدیث لاشئے کے برابر ہے۔ ساجی نے کہا وہ منکرالحدیث ہے۔ علاوہ ازیں اس روایت میں بعض اور مجہول راوی ہیں۔ حاکم نے مستدرک میں اس کو روایت کیا ہے۔ لیکن امام ذہبی نے نقد مستدرک میں یعقوب اور عبدالعزیز دونوں کو ضعیف کہا ہے۔ سیرت النبی ج ۳ صفحہ ۴۷

دنیا جانتی ہے کہ حضور کی والدہ آمنہ بنو زہرہ خاندان سے تعلق رکھتی تھیں۔ یہ بھی دنیا جانتی ہے کہ آپؐ کے والد کا نام عبداللہ اور دادا کا نام عبدالمطلب ہے۔ اگر یہ بات عبداللہ سے کہی جاتی تو خلاف واقعہ نہ ہوتی لیکن اس روایت کے راوی باپ کے بجائے دادا کی بنوزہرہ میں شادی کرا رہے ہیں۔ جس سے یہ بات ثابت ہوگی کہ بادشاہت و نبوت اس لڑکے یا اس لڑکے کی اولاد کے حصہ میں آئے گی جس کی ماں بنوزہرہ سے تعلق رکھتی ہو۔ یعنی نہ صرف حضور کی والدہ بلکہ حضور کی دادی کا تعلق بھی بنوزہرہ سے ہو۔

عبدالمطلب نے اپنی زندگی میں متعدد شادیاں کیں، جن میں سے ایک لڑکی بنوزہرہ خاندان سے تعلق رکھتی تھی۔ اس لڑکی کا نام ہالہ بنت اُہیب تھا۔ یہ آمنہ کی چچازاد بہن تھیں۔ عبدالمطلب نے جس روز اپنے بیٹے عبداللہ کا نکاح آمنہ سے کیا اسی روز اپنا نکاح ہالہ سے کیا۔ اس طرح باپ بیٹے دونوں نے ایک دن شادی رچائی۔ عبدالمطلب کے یہاں ہالہ سے جو لڑکا پیدا ہوا اس کا نام حمزہ ہے۔ اس طرح حضرت حمزہؓ آپ کے خالہ زاد بھائی بھی ہوئے۔ یہ تمام تفصیل علامہ ابن حزم نے اپنی الجمہرۃ الانساب میں بیان کی ہے۔ اور نبوت و بادشاہت عبداللہ کی اولاد کو ملی۔ نہ کہ حمزہؓ اور ان کی اولاد کو۔ کیا یہ جاہل راوی حضور سے یہ نعمتیں چھین کر حضرت حمزہؓ کے سپرد کرنا چاہتے ہیں۔ حیرت تو ہمیں بیہقی، حاکم، ابونعیم، طبرانی اور ابن سعد جیسے لوگوں پر ہے کہ یہ حضرات روایت پرستی کے مرض میں مبتلا ہو کر عقل کو بھی خیرباد کہہ دیتے ہیں۔

آتشکدوں کا بجھنا

روایت ہے کہ ولادت کی رات کسریٰ کے محل میں زلزلہ پڑ گیا۔ اور اس کے چودہ کنگورے گر پڑے۔

اور ساوہ کی نہر (واقع فارس) اور بعض روایتوں میں طبریہ کی نہر (واقع شام) خشک ہو گئی۔ اور فارس کا آتش کدہ جو ہزاروں برس سے روشن تھا بجھ گیا۔ اور کسریٰ نے ایک ہولناک خواب دیکھا جس کی تعبیر یمن کے ایک کاہن سطیح سے دریافت کی گئی۔

یہ قصہ بیہقی، خرائطی، ابن عساکر اور ابونعیم میں سند اور سلسلۂ روایت کے ساتھ مذکور ہے۔ ان سب کا مرکزی راوی مخزوم بن ہانی ہے۔ جو اپنے باپ ہانی مخزومی سے جس کی عمر ڈیڑھ سو برس کی تھی نقل کرتا ہے۔ ہانی نام کا کوئی صحابی جو مخزومی قریشی ہو اور جو ڈیڑھ سو برس کی عمر رکھتا ہو معلوم نہیں۔ (بلکہ اس نام کا بنو مخزوم میں کوئی صحابی نہیں گزرا) اصابہ وغیرہ میں اسی روایت کے سلسلے میں ان کا نام مشکوک طور پر آیا ہے۔ ان کے صاحبزادے مخزوم بن ہانی سے محدثین میں کوئی بھی شناسا نہیں۔ نیچے کے راویوں کا بھی یہی حال ہے۔

یہاں تک کہ ابن عساکر جیسے ضعیف روایتوں کے سرپرست بھی اس روایت کو غریب کہنے کی جرأت کرتے ہیں۔ اور ابن حجر جیسے کمزور روایتوں کے سہارا اور پشت پناہ بھی اس کو مرسل ماننے کو تیار ہیں۔ ابونعیم کی روایت میں محمد بن جعفر بن اعین مشہور وضاع ہے۔ سیرت النبی ص ۱۴۳ ج ۳

یہ روایت تو خیر سراسر داستان ہے لیکن ابن ہشام نے محمد بن اسحاق سے نقل کیا ہے کہ یہ ایک خواب تھا جو آپ کی والدہ نے دیکھا تھا۔ اور ایک حدیث سے خواب کی جانب اشارہ بھی ملتا ہے۔ اگرچہ اس میں خواب بیان نہیں کیا گیا۔ اس کے الفاظ ہیں۔

انا دعاء ابی ابراھیم وبشارۃ	میں اپنے باپ ابراہیم کی دُعا، اپنے بھائی عیسٰی
اخی عیسٰی ورؤیا امی۔	کی بشارت اور اپنی ماں کا خواب ہوں۔

اگر اس خواب سے مراد یہی خواب ہے۔ تو خواب کا ہرگز مقصود یہ نہیں ہوتا کہ اسی وقت تعبیر سامنے آجائے بلکہ بعض اوقات ایک عرصۂ دراز کے بعد تعبیر سامنے آتی ہے۔ مثلاً حضور نے اپنی اُمت کے دو لشکروں کو سمندر میں جہاد کی غرض سے سفر کرتے دیکھا۔ پہلا بحری جہاد حضرت عثمانؓ کے زمانہ میں امیر معاویہؓ کی ماتحتی میں ہوا۔ اور دوسرا بحری جہاد امیر معاویہؓ کے دور میں یزید کی ماتحتی میں ہوا۔

اسی طرح اس خواب سے مراد حکومت فارس و ایران کی تباہی ہے۔ جو آپ کی اُمت کے ذریعے آپ کے بعد عمل میں آئی۔ ۱۶ھ میں حضرت عمرؓ کے حکم سے حضرت سعدؓ بن ابی وقاص نے قادسیہ کے میدان میں ایرانیوں کو شکست فاش دے کر مدائن پر قبضہ کیا۔ اور نوشیرواں کے محل میں جمعہ پڑھایا۔ یہ تھا وہ زلزلہ جو کسریٰ کے ایوان میں آیا تھا اس کے بعد حضرت عثمانؓ کے آخر زمانہ تک مسلمان ایران میں جہاں تک بڑھتے رہے وہاں تک کے آتش کدے بجھتے رہے۔

یہ بھی ذہن میں رہے کہ ایران میں صرف ایک ہی آتش کدہ نہ تھا بلکہ ہر ہر شہر اور ہر ہر گاؤں میں آتش کدے روشن تھے۔ سب سے بڑا آتش کدہ بخارا میں تھا جو بہار کے نام سے مشہور تھا۔ یہ آتش کدہ خلیفہ ولید بن عبدالملک بن مروان کے زمانہ میں ختم ہوا۔ بنو امیہ سے اصل رقابت تو یہی ہے۔

ہم اپنے قارئین کو یہ بھی بتا دیں کہ جنگ قادسیہ ۱۰ محرم ۱۶ھ کو واقع ہوئی۔ یہ اسی کا تو غم ہے جو ماتم حسین کے نام سے یہ سبائی مناتے ہیں۔ اور اتفاق سے یہ کربلا کے قریب بھی ہے۔ یہیں سے حضرت حُسینؓ نے کوفہ جانے کا ارادہ ملتوی کیا۔ اور یزید کی بیعت کے ارادے سے شام کا رُخ اختیار کیا۔ جس کو یہ سبائی ٹولہ برداشت نہ کر سکا۔ اور ۲۲ صفر کو نینوی کی سرزمین میں حضرت حسینؓ کو شہید کر دیا۔ جیسا کہ مورخ طبری نے مورخ ابن سعد اور مورخ واقدی سے نقل کیا ہے۔ کربلائی داستانیں تو اس واقعہ کے ڈھائی سو سال بعد ابو مخنف نے وضع کیں۔

رہا نہر ساوہ ، طبریہ کا خشک ہونا۔ وہ تو ظہور دجال کی نشانیوں میں داخل ہے۔ ان جاہلوں نے اس کا تعلق [illegible] سے جوڑ دیا۔

نبی کریمؐ مختون پیدا ہوئے تھے؟

[illegible] مشہور ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم مختون پیدا ہوئے تھے۔ اور اس سلسلہ میں [illegible]

سید سلیمان ندوی اس روایت پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

یہ روایت متعدد طریقوں سے مروی ہے۔ مگر ان میں کوئی طریقہ بھی ایسا نہیں جو ضعیف نہ ہو۔ حاکم نے مستدرک میں لکھا ہے کہ آپ کا مختون پیدا ہونا متواتر روایتوں سے ثابت ہے۔ اس پر علامہ ذہبی نے تنقید کی ہے کہ تواتر کجا صحیح طریقہ سے ثابت نہیں۔ (مستدرک ج ۲ باب اخبار النبی) اور بقول علامہ ابن القیم اگر یہ ثابت بھی ہو تو اس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی کوئی فضیلت نہیں کیونکہ ایسے بچے اکثر پیدا ہوتے رہتے ہیں۔ سیرت النبی ص ۲۳۵ ج ۳

ہم نے زاد المعاد کا مطالعہ کیا تو معلوم ہوا کہ علامہ ابن القیم نے ایک روایت یہ بھی نقل کی ہے کہ آپ کے دادا عبد المطلب نے ساتویں دن آپ کی ختنہ کرائی اور تمام اہل مکہ کی دعوت کی۔ جس پر قریش کے متعدد شعراء نے قصیدے کہے۔ پھر امام ابن القیم نے ان قصائد کے چند اشعار بھی نقل کئے ہیں۔

امام ابن القیم نے اپنے زمانہ کے کئی افراد کے نام لکھ کر یہ بیان کیا ہے کہ یہ حضرات مختون پیدا ہوئے تھے۔ اور یہ حضور کی کوئی تخصیص نہیں۔

برکاتِ محمدی

یہ وہ سرخی ہے جو قاری احمد پیلی بھیتی نے اپنی کتاب تاریخ مسلمانان عالم کی جلد دوم میں جو تاریخ مصطفی کے نام سے موسوم ہے، قائم کی ہے، اس سرخی کے تحت وہ تاریخی برکات اور معجزات بیان کئے گئے ہیں جو آپ کی ذات کے باعث حلیمہ کے ساتھ راہ میں یا ان کے یہاں قیام کے دوران پیش آئے۔ ہم یہ تمام داستاں قاری احمد پیلی بھیتی کی زبانی قارئین کے سامنے پیش کئے دیتے ہیں۔ قاری صاحب تاریخ اسلام کے مصنف ہیں انہوں نے یہ کتاب تاریخی کتب کو پیش نظر رکھتے ہوئے لکھی ہے، انہوں نے جن واقعات کا ذکر کیا ہے۔ ہم نے انہیں خود متعدد کتابوں مثلاً ابن سعد، ابن اثیر، ابن ہشام، مدارج النبوت اور مواہب لدنیہ وغیرہ میں دیکھا ہے۔ اس لحاظ سے یہ بیان صرف قاری صاحب کا نہیں۔ بلکہ ان تمام افراد کا مطمح نظر ہے جن کا تعلق تاریخ سے ہے۔ اور ان علماء کا بھی جو ان کہانیوں کے ہم نوا ہیں اور جو اس امر کے خواہاں رہتے ہیں کہ کسی نہ کسی طرح حضور کے معجزات اور کرامات میں اضافہ کیا جائے۔ خواہ وہ واقعہ فرضی ہی کیوں نہ ہو، اور خواہ وہ کسی صورت میں ہمیں حاصل ہوا ہو۔ اس طرح وہ ملا بھی ان کہانیوں کا شکار ہیں جن کا فن خطابت ان ہی کہانیوں کا مرہون منت ہے، ان کی ذات سے اگر ان کہانیوں کو جدا کر دیا جائے، تو ان کی روٹیاں کمانے کا دھندا ختم ہو جائے۔ اور اکثر مساجد بے رونق ہو جائیں۔

الغرض قاری صاحب فرماتے ہیں، حلیمہ کا بیان ہے کہ جب میں سیدہ آمنہ کے گھر اس دُرِّ یتیم کو لینے گئی، تو آپ سو رہے تھے، ماں نے اشارے سے بتایا، میں قریب گئی، چہرۂ مبارک کی تابانی دیکھی، تو جگانے کی ہمت نہ ہوئی، محبت سے پیشانی پر ہاتھ رکھا۔ آپ نے آنکھیں کھول دیں، مجھے دیکھا اور مسکرائے، آنکھوں کا نور اور معصومانہ مسکراہٹ دیکھ کر مجھے یقین ہو گیا، کہ اگرچہ یہ بچہ یتیم ہے، مگر اپنی عظمت و شرافت میں مکہ کے بچوں کا سردار معلوم ہوتا ہے۔ اس کی برکتوں سے نہ صرف میری پریشانیاں دور ہوں گی، بلکہ بہت سے یتیم بچے اور نادار انسان فیض حاصل کریں گے (گویا اس وقت حالت کفر میں بھی حلیمہ صاحب الہام ولیہ اور کشف کی مالک تھیں) مجھ سے ضبط نہ ہو سکا، فرط محبت سے جھکی، پیشانی کو چوما، اور گود میں اٹھا لیا، تھوڑی دیر سیدہ آمنہ کے پاس بیٹھی، پھر ان کی اجازت سے مولود مسعود کو گود میں لے کر اپنے خیمہ میں آئی، شوہر نے جمالِ جہاں آرا کو دیکھا، اور کہا حلیمہ یہ تو اللہ

کی بڑی نعمت ہے، مجھے امید ہے کہ یہ بچہ ہمارے حق میں فرشتۂ رحمت ثابت ہوگا (مواہب لدنیہ، مدارج النبوت)

حلیمہ کہتی ہیں کہ میں نے سیدھی طرف سے آپ کو دودھ پلایا، آپ نے خوب سیر ہوکر پیا، اور پھر آرام سے گہوارے میں سو گئے، اس کے بعد میں نے عبداللہ رضاعی بھائی کو پلایا اس نے بھی خوب سیر ہوکر پیا اور اسے بھی نیند آگئی، قدوم محمدی کی یہ پہلی برکت تھی، کہ میرے سوکھے ہوئے سینے میں دودھ کی فراوانی ہوگئی۔ وہ عبداللہ جو بھوک سے بلکتا رہتا تھا۔ آج آرام سے سو رہا ہے۔ صرف یہی نہیں۔ بلکہ اب ہماری اونٹنی کے تھن بھی دودھ سے بھر گئے تھے۔ ہم دو آدمیوں نے خوب پیٹ بھر کر پیا۔ اور پھر بھی برتن میں دودھ بچ رہا۔ اس دور قحط سالی میں یہ پہلی رات تھی کہ ہم کھاپی کر آسودہ ہوتے، اور چین کی نیند سوتے۔

جناب حلیمہ کہتی ہیں کہ صبح کو ہم نے سیّدہ آمنہ اور عبدالمطلب کو رخصتی سلام کیا۔ نور نظر کو گود میں لے کر اسی نحیف ولاغر سواری پر بیٹھے، مگر اب حالت ہی بدل چکی تھی جس دراز گوش اونٹنی سے قدم اُٹھائے نہیں جاتے تھے۔ اور جو آتے وقت قافلہ سے پیچھے رہی تھی۔ اور آخر میں مکہ پہنچی تھی۔ اب اس کی رفتار اتنی تیز تھی کہ قافلہ سے آگے چل رہی تھی۔ ساتھی حیران تھے کہ حلیمہ کی سواری کے جانوروں میں یہ توانائی اور قوت کہاں سے اتنی جلدی آگئی (کیا حلیمہ متعدد سواریوں پر سوار ہوکر آئی تھیں۔ اور جب اتنے جانور ان کے پاس موجود تھے تو وہ غریب اور فاقہ مست کیسے ہوتیں) وہ نہیں جانتی تھی کہ راکب براق حلیمہ کی گود میں رونق افروز ہیں۔ یہ تمام برکتیں اُسی در یتیم کی ذات سے وابستہ ہیں جن کو قبیلے کی تمام عورتوں نے یتیم خیال کر کے لینے سے انکار کر دیا تھا۔ (ابن ہشام، روض الانف)

حلیمہ کہتی ہیں کہ آپ کی برکتیں صرف مکہ میں یا راستہ تک محدود نہیں رہیں بلکہ جب ہم اپنے گاؤں میں پہنچے تو وہاں بھی برکات محمدی کے بے شمار نظارے آنکھوں کے سامنے آتے رہے، وہ جنگل جو قحط زدہ ہو رہا تھا۔ جہاں کی گھاس خشک ہوچکی تھی، اب اس سر سبز و شاداب ہونے لگا، بکریاں جو بھوک سے بے حال ہوچکی تھیں، پیٹ بھر کر جنگل سے شام کو گھر واپس آنے لگیں، قبیلے کے لوگوں نے اپنے بچوں اور چرواہے سے کہا کہ تم بھی اسی جنگل میں بکریاں چرایا کرو، جہاں حلیمہ کی بکریاں چرا کرتی ہیں۔ (ابن سعد)

عدل ونفاست: حلیمہ کا بیان ہے کہ آپ گہوارہ میں بھی عدل و انصاف پر اس درجہ عمل پیرا تھے کہ میں آپ کو کبھی دوسری سمت سے دودھ پلانا چاہتی تھی تو آپ نہ پیتے تھے، اس

کی وجہ صرف ایک ہی ہو سکتی تھی، کہ آپ اپنے رضاعی بھائی عبداللہ کے حق کا لحاظ رکھتے تھے۔ اسی طرح مزاج میں شروع ہی سے اس قدر نفاست اور شرم تھی، کہ آپ نے کبھی کپڑوں میں پیشاب پاخانہ نہیں فرمایا۔ اگر حاجت ہوتی تو روتے تھے، جب میں کپڑا اوڑھا دیا کرتی تھی تو خاموش ہو جاتے تھے۔ حلیمہ بھی کہتی ہیں کہ اگر میں کسی کام میں مصروف ہوتی تھی۔ تو ایسا محسوس ہوتا تھا کہ کوئی آپ کو بہلا رہا ہے۔ اور آپ اطمینان سے لیٹے ہوئے ہیں۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ قدرت نے آپ کی فطرت میں شرم و حیا اور عدل و انصاف کو ودیعت فرمایا تھا۔

بولنا اور چلنا:۔ دو مہینے کی عمر میں آپ بیٹھنے لگے تھے۔ اور پانچ مہینے کی عمر میں بیروں چلنے لگے تھے۔ اور سات ماہ کی عمر میں تیز چلتے تھے۔ آٹھ مہینے کی عمر ہوئی تو آپ اچھی طرح بولنے لگے تھے۔ آپ کا پہلا کلام لا الٰہ الا اللہ تھا۔

آپ کبھی بچوں کے ساتھ نہیں کھیلے، بلکہ رضاعی بھائی کو کھیلتے ہوئے دیکھتے تو اُن کو منع فرماتے تھے۔ بعض تاریخوں میں بچوں کے ساتھ کھیلنے کا ذکر پایا جاتا ہے، مگر شاہ عبدالحق محدث دہلوی نے اسے غلط قرار دیا ہے۔ آپ کی ذات فیض و برکات کا ایسا منبع تھی کہ جو بیمار بچے پاس آکر بیٹھ جاتے تھے۔ تندرست ہو جاتے تھے، بیمار بکریوں پر اگر آپ ہاتھ پھیرتے تھے، تو شفا مل جاتی تھی۔ حلیمہ کہتی ہیں، آپ دیکھتے تھے تو مجھ پر ایک قسم کی ہیبت طاری ہو جاتی تھی۔ اور یہ کیفیت مجھ پر اس درجہ غالب تھی کہ میں آپ کی موجودگی میں کبھی اپنے شوہر سے بھی ملاقات نہ کر سکی۔

واپسی مکہ: سرکار عالم جب پورے دو سال کے ہوئے تو حلیمہ نے آپ کا دودھ چھڑا دیا۔ آپ نے اس وقت زبان مبارک سے یہ الفاظ ارشاد فرمائے۔ اللہ اکبر کبیرا والحمد للہ کثیرا و سبحان اللہ بکرۃ و اصیلا۔

بیہقی نے حضرت عباسؓ سے روایت کی ہے کہ آپ کا پہلا کلام یہ تھا۔ حیرت ہے کہ حضرت عباسؓ اپنی والدہ کا دودھ چھوڑ کر دو سال کی عمر میں یہ تماشا دیکھنے کے لئے قبیلہ بنی سعد پہنچ گئے، یعنی اللہ تعالیٰ کی پاکی بیان کرنے کے سلسلہ میں یہ پہلا کلام تھا، ورنہ بولنے کی ابتدا تو لا الٰہ الا اللہ سے ہوئی تھی۔ حلیمہ کہتی ہیں۔ جب آپ دو سال کے تھے تو اچھے خاصے بڑے معلوم ہوتے تھے۔ میرا دل نہیں چاہتا تھا کہ آپ کو اپنے

گھر سے جُدا کیا جاتے۔ اور ماں کو واپس کیا جاتے۔ مگر دستور کے مطابق مجھے دودھ چھڑانے کے بعد آپ کو مکہ لے جانا پڑا۔ تاکہ میں آپ کو آپ کی والدہ کے سپرد کر دوں، مگر اتفاق سے جب مکہ پہنچی تو وہاں طاعون کی وبا پھیلی ہوئی تھی۔ لوگ پریشان تھے۔ مجھے آپ کو واپس لانے کے لئے ایک اچھا موقعہ ہاتھ آگیا۔ چنانچہ میں نے آپ کے دادا اور والدہ سے کہا کہ مکہ میں طاعون کی وبا کے زمانہ میں آپ کا رہنا مناسب معلوم نہیں ہوتا۔ اگر آپ کہیں تو میں اپنے ہمراہ واپس لے جاؤں، اللہ کی عنایت کہ میرا مشورہ قبول ہوا۔ سب راضی ہو گئے۔ اور میں آپ کو اپنے ساتھ واپس لے آئی۔ ماں کا دل نہیں چاہتا تھا کہ اب بچہ کو علیحدہ رکھا جاتے۔ مگر حلیمہ کے اصرار اور وبا کے زور نے واپس کرنا ہی مناسب سمجھا۔ آپ جانے لگے تو ماں نے پیار کیا۔ اور فرمایا بیٹا تھوڑے دن کے لئے ابھی اپنی مشفقہ دائی حلیمہ کے پاس اور رہو، پھر ہم بلا لیں گے۔ آنحضرت نے محبت سے ماں کو دیکھا، اور دوبارہ قبیلہ بنی سعد میں واپس آگئے۔ تاریخ مسلمانان عالم ص ۸۶ ج ۲

یہ وہ داستان ہے جو تاریخ و سیر کی عام کتابوں میں کہیں تفصیلاً اور کہیں اجمالاً مذکور ہے۔ حتیٰ کہ عبدالحق محدث دہلوی نے بھی مدارج النبوت میں معارج النبوت کے حوالے سے اس داستان کو نقل کر کے اپنی نظر میں بہت بڑا تاریخی اور مذہبی کارنامہ انجام دیا ہے۔ شکر ہے کہ علامہ شبلی نے اپنی سیرت النبی کو اس قسم کی لغویتوں سے محفوظ رکھا لیکن افسوس یہ ہے کہ انہوں نے ان روایات پر کوئی کلام بھی نہیں کیا۔

علامہ شبلی کے شاگرد رشید جناب سید سلیمان ندوی مرحوم جو مورخ ہونے کے ساتھ ساتھ محدث، محقق اور ماہر رجال بھی تھے، انہوں نے سیرت النبی کی جلد سوئم میں ان تمام داستانوں پر محققانہ بحث فرمائی۔ اور حقیقت یہ ہے کہ انہوں نے تحقیق کا حق ادا کر دیا۔ اس لئے ہم بہتر یہ سمجھتے ہیں کہ بجائے اس کے خود ہم اس داستان پر کوئی کلام کریں، کیوں نہ سید صاحب مرحوم کی تحقیق قارئین کے سامنے پیش کر دیں۔ سید صاحب تحریر فرماتے ہیں:۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی رضاعت اور شیر خوارگی کے زمانہ کے فضائل اور معجزات جب آپ کو حلیمہ سعدیہ اپنے گھر لے جاتی ہیں، ابن اسحاق، ابن راہویہ، ابو یعلیٰ، طبرانی، بیہقی، ابو نعیم، ابن عساکر اور ابن سعد میں یہ تفصیل مذکور ہیں۔

حلیمہ سعدیہ کا آنا، آپ کا ان کو دیکھ کر مسکرانا، حلیمہ کے خشک سینوں میں دودھ بھر آنا، آپ کا صرف ایک طرف کے سینہ سے سیر ہو جانا، اور دوسری طرف کا اپنے رضاعی بھائی کے لئے بنظر انصاف چھوڑ دینا، آپ کے سوار ہوتے ہی حلیمہ کی کمزور اور دبلی پتلی گدھی کا تیز رو، طاقت ور اور فربہ ہو جانا، اور حلیمہ کے قبیلہ کی قحط زدہ زمین کا سرسبز و شاداب اور ہرا بھرا ہو جانا۔ حلیمہ کی بکریوں کا موٹا ہونا اور سب سے زیادہ دودھ دینا۔ آپ کا غیر معمولی نشوونما پانا۔ دو برس کی عمر میں آپ کا سینہ چاک ہونا۔ حلیمہ کا اس واقعہ سے ڈر کر آپ کو آمنہ کے پاس واپس لانا۔ اور آمنہ کا حلیمہ کو تسلی دینا۔ یہ تمام واقعات ان کتابوں میں بہ تفصیل مذکور ہیں۔

لیکن یہ تمام واقعات دو طریقوں سے مروی ہیں۔ ایک طریقہ کا مشترک راوی جہم بن ابی جہم ایک مجہول شخص ہے۔ اور دوسرے کا مشترک راوی واقدی ہے۔ جس کا کوئی اعتبار نہیں۔

پہلے طریقہ سے اس کو ابن اسحاق، ابن راہویہ، ابو یعلیٰ، طبرانی اور ابو نعیم نے روایت کیا ہے۔ اس کا سلسلۂ سند یہ ہے کہ ابن اسحاق نے کہا کہ مجھ سے جہم بن ابی جہم مولیٰ حارث بن حاطب جمحی نے بیان کیا۔ اور وہ کہتا ہے کہ مجھ سے عبداللہ بن جعفرؓ بن ابی طالب نے خود بیان کیا یا کسی ایسے شخص نے بیان کیا۔ جس نے عبداللہ رضؓ بن جعفر سے سنا۔ اور عبداللہ رضؓ بن جعفر نے حلیمہ سعدیہ سے سُنا۔

اس روایت میں سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ جہم اس روایت کا خود عبداللہؓ بن جعفر سے سننا یقینی نہیں بتاتا۔ بلکہ وہ کہتا ہے کہ عبداللہؓ بن جعفر یا کسی نے اُن سے سن کر کہا۔ معلوم نہیں وہ کون تھا، اور کیسا شخص تھا؟ ابو نعیم وغیرہ متاخرین نے اس روایت کو اس طرح بیان کیا ہے کہ یہ شک سرے سے نظر انداز ہو گیا ہے۔ (یا عمداً گرا دیا گیا ہے) اگر بالفرض جہم نے عبداللہ بن جعفرؓ سے سنا تو عبداللہ بن جعفرؓ جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں آٹھ نو برس کے تھے، اور ۷ھ میں ملک حبش سے مدینہ آئے تھے۔ ان کا حلیمہ سے ملنا، اور ان سے نقل روایت کرنا محتاج ثبوت ہے۔

بلکہ علمائے سیر و رجال میں خود حلیمہ کے اسلام یا نبوت کے بعد آپؐ سے ملاقات میں اختلاف ہے۔ صرف ایک دفعہ غزوۂ ہوازن کے موقعہ پر ان کا آنا کسی کسی نے بیان کیا ہے۔ (حالانکہ صحیح یہ ہے کہ وہ حلیمہ کی بیٹی شیما اور ان کا خاندان حالت کفر میں گرفتار ہو کر آیا تھا کیونکہ جنگ بنی ہوازن حلیمہ کے خاندان ہی سے

ہوئی تھی) مگر اس موقعہ پر عبداللہ بن جعفرؓ کا جو کمسن تھے۔ موجود ہونا اور ان سے نقل روایت کرنا محتاج ثبوت ہے۔ (بلکہ فتح مکہ اور اس کے بعد کے غزوات میں کوئی بچہ آپ کے ہمراہ نہ تھا)

جہم بن ابی جہم جو اس روایت کا سر بنیاد ہے۔ ذہبی نے میزان الاعتدال میں اسی روایت کی تقریب سے اس کا نام لکھ کر لکھا ہے لایعرف۔ یعنی معلوم نہیں یہ کون شخص تھا؟

دوسرا طریقہ وہ ہے جس کا مرکزی راوی واقدی ہے، اس سلسلہ سے ابن سعد، ابونعیم اور ابن عساکر نے اس واقعہ کو لکھا ہے۔ یہ سلسلہ علاوہ ازیں کہ واقدی کے سلسلہ سے موقوف ہے۔ یعنی یہ سلسلہ کسی صحابی تک نہیں پہنچتا۔ اس کو واقدی زکریا بن یحییٰ بن یزید سعدی سے اور وہ اپنے باپ یحییٰ بن یزید سعدی سے نقل کرتا ہے۔

ابن سعد نے دوسری جگہ پر ایک اور سلسلہ سے اس کو واقدی سے روایت کیا ہے۔ اور واقدی عبداللہ بن زید بن اسلم سے، اور عبداللہ اپنے باپ زید بن اسلم تابعی سے نقل کرتا ہے۔ یہ سلسلہ بھی علاوہ ازیں کہ اس کا پہلا راوی واقدی ہے۔ اور روایت بھی موقوف ہے۔ زید مذکور کی نسبت اہل مدینہ کلام کرتے تھے، اور ان کے بیٹے عبداللہ کو اکثر محدثین نے ضعیف کہا ہے۔ اس لئے یہ سلسلہ بھی استناد کے قابل نہیں۔ ابونعیم نے تیسری روایت میں واقدی کے سلسلہ سے ان واقعات کو بے سند لکھا ہے۔ سیرت النبی ص۱۵۵ ج۲

ہمارے نزدیک پہلے سلسلہ کی بنیادیں دو ہیں۔ ایک جہم بن ابی جہم۔ اور دوسرا محمد بن اسحاق۔

حافظ ابن حجر لسان المیزان میں لکھتے ہیں۔

جہم بن ابی الجہم عبداللہ بن جعفر سے روایت کرتا ہے۔ اور اس سے محمد بن اسحاق۔ اسے کوئی نہیں جانتا۔ اس نے حلیمہ سعدیہ والا قصہ بیان کیا ہے۔ لسان المیزان ص۱۴۲ ج۲

تقریباً یہی الفاظ حافظ ذہبی نے میزان الاعتدال ص۲۲۶ ج۱ پر ذکر کئے ہیں۔

گویا یہ روایت دراصل جہم پر موقوف ہے۔ اور جہم کو کوئی نہیں جانتا کہ کون ہے اور اس سے محمد بن اسحاق کے علاوہ کوئی روایت بھی نہیں کرتا۔ اور محمد ابن اسحاق نے بھی اس سے صرف یہی داستان کی نقل ہے۔ جو اس امر کا ثبوت ہے کہ محمد بن اسحاق نے صرف اسی داستان سرائی کے لئے جہم بن ابی جہم کو فرضی ہیرو بنا کر پیش کیا ہے۔ ورنہ جہم کی نہ کوئی حقیقت ہے اور نہ کوئی وجود ہے۔ اس طرح اس روایت میں چار عیوب پیدا ہو گئے۔

۱۔ عبداللہ بن جعفرؓ نے حلیمہ سے کوئی روایت نہیں سنی۔

۲۔ خود جہم نے عبداللہؓ سے کوئی روایت نہیں سُنی۔

۳۔ جہم سے کوئی شخص واقف نہیں۔

۴۔ حلیمہ کا اسلام لانا خود مشکوک ہے۔ کجا کہ عبداللہ بن جعفرؓ کا ان سے حدیث سننا۔

ہمارے نزدیک اس روایت میں پانچواں عیب محمد بن اسحاق کی ذات ہے۔ لہٰذا اس پر کلام کرنا اور اس کی شخصیت کو ظاہر کرنا بھی ضروری ہے۔

مورخ محمد بن اسحٰق: یہ رئیس المورخین تسلیم کیا جاتا ہے۔ اور تاریخ پر سب سے اول اسی نے کتاب لکھی جو المغازی کے نام سے مشہور ہوئی۔ مورخین کے نزدیک اس کا قول حرفِ آخر کا درجہ رکھتا ہے۔ کتب احادیث میں بھی اس کی روایات پائی جاتی ہیں۔ اسی لئے محدثین اور ماہر رجال نے اس پر خوب کلام کیا ہے۔ اور اس کی ذات کے بارے میں تین آرا ہیں۔

۱۔ یہ ثقہ اور قابل قبول ہے۔ لیکن جب یہ کسی روایت کو تنہا نقل کرے تو ناقابل قبول ہے۔ جیسا کہ یہ روایت۔

۲۔ تاریخ میں قابل قبول ہے۔ لیکن حدیث میں قابل قبول نہیں۔

۳۔ ہر صورت میں ناقابل قبول ہے۔

امام ذہبی نے میزان الاعتدال میں تینوں طبقوں کی آرا جمع کردی ہیں۔ ہم انہیں قارئین کی خدمت میں پیش کر رہے ہیں۔ قارئین خود فیصلہ فرمالیں کہ ان میں سے کس کی رائے بہتر ہے۔ اور کس کے قول میں وزن ہے۔ امام ذہبی لکھتے ہیں۔

محمد بن اسحاق کے دادا کا نام یسار ہے۔ اس کی کنیت ابوبکر ہے۔ اس کا دادا یسار عین التمر کی جنگ میں قید ہوکر آیا تھا۔ اور قیس بن مخرمۃ بن عبدالمطلب بن عبد مناف کی غلامی میں دیا گیا تھا۔ چونکہ محمد بن اسحٰق۔ اور اس کے باپ دادا کے مالک مدینہ میں رہتے تھے۔ اس لئے یہ مدنی کہلاتا تھا۔ اس نے صحابہ میں سے حضرت انس المتوفی ۹۳ھ کو دیکھا ہے۔

یہ سعید بن ابی ہند، سعید المقبری، عطاء، اعرج، نافع اور ان کے ہم عصر لوگوں سے روایات نقل کرتا ہے۔

اس سے روایات واحادیث نقل کرنے والے حماد بن زید، حماد بن سلمہ، ابراہیم بن سعد، یزید بن ہارون، سلمۃ الابرش اور زیاد بکائی وغیرہ ہیں۔ کچھ لوگوں نے اسے ثقہ قرار دیا ہے۔ اور کچھ نے اسے ردی اور واہی کہا ہے۔ ذہبی فرماتے ہیں۔ اس کی حدیث اچھی ہوتی ہے۔ میرے نزدیک اس کی حدیث میں کوئی عیب نہیں..... مگر سیرت میں منکر اور منقطع روایات اور جھوٹے اشعار نقل کرتا ہے۔

خداش کا بیان ہے کہ میں نے امام الرجال یحیٰ بن سعید القطان کو کہتے سُنا ہے کہ انہوں نے عبید اللہ القواریری سے دریافت کیا۔ کہ تم کہاں جا رہے ہو؟ انہوں نے جواب دیا وہب بن جریر کے پاس تاکہ ان سے سُن کر سیرت لکھوں۔ امام یحیٰ نے فرمایا۔ پھر تو تو بے پناہ جھوٹ لکھے گا۔ (یعنی سیرت جھوٹ سے پاک نہیں ہو سکتی۔ یا اس کی وجہ یہ ہوگی کہ وہب بن جریر نے چونکہ سیرت کی روایات محمد بن اسحاق سے نقل کی ہیں۔ لہٰذا امام یحیٰ ان تمام روایات کو جھوٹا قرار دے رہے ہیں)

امام احمد بن حنبل ؒ فرماتے ہیں ابن اسحاق کی حدیث اچھی ہے۔ لیکن یحیٰ بن معین ؒ کہتے ہیں کہ اگرچہ یہ ثقہ ہے۔ لیکن اس کی حدیث اچھی نہیں۔ علی بن المدینی کا بیان ہے۔ میرے نزدیک اس کی حدیث صحیح ہے۔ اور مجھے تو دو احادیث کے علاوہ کوئی منکر نظر نہیں آئی۔

امام نسائی فرماتے ہیں یہ قوی نہیں۔ دارقطنی کہتے ہیں اس کی حدیث حجت نہیں ہے۔ شعبہ نے ایک بار تو یہ کہا کہ یہ سچا ہے۔ اور دوسری بار فرمایا کہ یہ حدیث میں مسلمانوں کا امیر ہے۔ محمد بن عبد اللہ بن نمیر کا بیان ہے اس پر قدری ہونے کا الزام ہے اسی لئے لوگ اس سے دور بھاگتے تھے۔ امام ابو داؤد فرماتے ہیں یہ قدری بھی اور معتزلی بھی ہے۔

فرقہ قدریہ تقدیر الٰہی کا منکر تھا اور وہ یہ کہتا تھا کہ ہر شے انسان کے قبضہ میں ہے۔ اور معتزلہ فرقہ صفات باری، معجزات، اور فرشتوں وغیرہ کا منکر تھا۔ گویا ابن اسحاق قدری بھی ہے اور صفات باری کا منکر بھی کیونکہ نسلاً بھی مجوسی تھا۔

امام سلیمان تیمی فرماتے ہیں کذاب ہے۔ وہیب کا بیان ہے کہ میں نے ہشام بن عروہ سے [illegible]
[illegible] ہیں نے اس کے بارے میں امام مالک سے دریافت کیا [illegible]

عبدالرحمن بن مہدی کا بیان ہے کہ یحیی بن سعید القطان اور امام مالک دونوں بن اسحاق کو مجروح قرار دیتے تھے۔

ابن ادریس کا بیان ہے کہ میں ایک روز امام مالک کی خدمت میں حاضر تھا۔ کسی نے اُن سے کہا کہ ابن اسحاق کہتا ہے کہ مالک کا علم میرے سامنے پیش کیا کرو، میں ان کے علم کی کسوٹی ہوں۔ امام مالک نے فرمایا۔ اسے لوگو دجالوں میں سے اس دجال کو دیکھو کہ کیا کہتا ہے۔

امام سفیان بن عیینہ فرماتے ہیں میں نے مسجد خیف میں ابن اسحاق کو دیکھا تھا۔ مجھے تو اس کے پاس جاتے بھی ڈر محسوس ہوا کہ کہیں لوگ مجھے بھی قدری نہ کہنے لگیں۔ حماد بن سلمہ کا بیان ہے کہ میں ابن اسحاق کی روایات بحالت مجبوری لیتا ہوں۔

امام یحیٰی بن سعید القطان فرماتے ہیں کہ کسی نے ابن اسحاق سے دریافت کیا کہ شرجیل بن سعد کی حدیث کے بارے میں تم کیا کہتے ہو۔ کہنے لگا کہ اس سے تو صرف ایک شخص روایت کرتا ہے۔ (یہ شرجیل حضرت سعدؓ بن عبادہ صحابی کے بیٹے تھے) امام یحیٰی فرماتے ہیں اس ابن اسحاق پر حیرت ہے کہ شرجیل کی حدیث تو قبول نہیں کرتا۔ اور اہل کتاب کی روایت قبول کرتا ہے۔

ابن ابی فدیک کا بیان ہے کہ میں نے خود اسے یہودیوں سے روایات لکھتے دیکھا ہے۔ امام احمد فرماتے ہیں۔ یہ بہت زیادہ تدلیس سے کام لیتا ہے (یعنی درمیان سے راوی گرا دیتا ہے)۔

ابن عدی لکھتے ہیں کہ یہ مرغے لڑایا کرتا تھا۔ امام یحیٰی بن سعید القطان کہتے ہیں میں گواہی دیتا ہوں کہ محمد بن اسحاق کذاب ہے۔

ابو عمر و الشیبانی کا بیان ہے کہ میں نے ابن اسحاق کو دیکھا ہے کہ وہ احادیث و روایات لکھ کر شعراء کے پاس لے جایا کرتا۔ اور ان سے کہتا کہ ان مضامین پر اشعار لکھ دو۔ پھر ان اشعار کو صحابہ کی جانب منسوب کر دیتا۔ یہی ابوبکر الخطیب نے اپنی تاریخ بغداد میں لکھا ہے۔

ابو داؤد طیالسی کا بیان ہے کہ ایک روز ابن اسحاق نے کہا کہ مجھ سے ایک ثقہ راوی نے روایت کیا ہے تو جھٹ ایک شخص نے سوال کیا۔ اس کا نام کیا ہے؟ جواب دیا یعقوب یہودی۔ یعقوب بن شیبہ کا بیان ہے کہ میں نے یحیٰی بن معین سے ابن اسحاق کے بارے میں دریافت کیا۔ فرمایا کچھ نہیں ہے۔

دراوردی کا بیان ہے کہ ہم ابن اسحاق کی مجلس میں اس سے علم حاصل کر رہے تھے۔ اچانک وہ اونگھنے لگا۔ جب نیند دور ہوئی تو کہنے لگا کہ میں نے ابھی خواب دیکھا ہے کہ ایک انسان مسجد میں داخل ہوا۔ اس کے پاس ایک رسی ہے۔ اس نے وہ رسی ایک گدھے کے گلے میں ڈالی جو مسجد میں گھس آیا تھا۔ پھر اسے گھسیٹ کر باہر لے گیا۔ ابھی کچھ وقفہ نہ گزرا تھا کہ ایک شخص مسجد میں داخل ہوا۔ اس کے پاس ایک رسی تھی۔ اس نے وہ رسی ابن اسحاق کے گلے میں ڈالی۔ اور باہر گھسیٹتا ہوا لے گیا۔ امیر کے سامنے پیش کیا۔ اور قدری ہونے کے باعث اس کے کوڑے لگائے گئے۔

حمید بن حبیب کا بیان ہے کہ ابراہیم بن ہشام الامیر نے اس کے کوڑے لگائے تھے۔ اور میں اس وقت وہاں موجود تھا۔

مکی بن ابراہیم کا بیان ہے کہ ابن اسحاق صفات الٰہی کے بارے میں بہت بیہودہ قسم کی روایات بیان کرتا ہے۔ میں اس کے پاس ایک بار گیا تھا۔ لیکن اس نے جب اس قسم کی روایات بیان کیں تو میں اٹھ کر چلا آیا اور پھر کبھی نہیں گیا۔ آیئے ہم ان میں سے ایک اپنے قارئین کو بھی سنا دیں۔ کیونکہ نقل کفر کفر نہ باشد۔ ہاں قارئین سے یہ ضرور درخواست کریں گے کہ روایت پڑھنے کے بعد استغفار ضرور فرمالیں۔

کہتا ہے کہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے حضرت عبداللہ بن عباسؓ کے پاس کسی کو بھیجا کہ کیا محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے رب کو دیکھا تھا۔ انہوں نے جواب دیا ہاں۔ اللہ تعالیٰ ایک کرسی پر بیٹھا تھا جو سونے کی بنی ہوئی تھی۔ جسے چار فرشتے اٹھائے ہوئے تھے۔ ایک فرشتہ انسانی صورت کا تھا۔ ایک شیر کی صورت کا۔ ایک بیل کی اور ایک گدھ کی۔ اللہ تعالیٰ سبز رنگ کے خیمہ میں بیٹھا تھا۔ اس کے ارد گرد سونے کی ٹڈیاں تھیں **اللّٰھم انی اعوذ بك من ھذا البھتان العظیم۔**

اس کا انتقال ۱۵۱ھ میں ہوا۔ میزان الاعتدال ج ۳ ص ۴۶۸ تا ۴۷۵

اب قارئین خود ہی فیصلہ فرمالیں کہ اس روایت کا کیا حال ہوگا۔ اور یہ بھی سوچ لیں کہ جو شخص اسلام کے دعویٰ کے باوجود تقدیر اور صفات الٰہی کا منکر ہو اور اللہ کو مجسم قرار دیتا ہو۔ اس کا ایمان کس قسم کا ہوگا۔

اس کہانی کو واقدی نے بھی نقل کیا ہے۔ جیسا کہ سید صاحب نے سطور بالا میں اس کا ذکر فرمایا۔ اور جہاں

بھی واقدی کا ذکر آیا ہے۔ سید صاحب نے اسے دروغ گو اور ناقابل اعتبار قرار دیا ہے۔ آیئے اب اس واقدی کا حال بھی تفصیل سے سن لیجئے۔

مورخ واقدی: اس کا نام محمد بن عمر بن واقد ہے۔ اس کا دادا واقد عبداللہ بن بریدۃ بن الحصیب المدنی کا غلام تھا۔ اسی نسبت سے یہ سلمی اور مدنی کہلاتا ہے۔ یہ قاضی بھی رہا ہے۔ اس کی متعدد تصانیف ہیں۔ حافظ ذہبی فرماتے ہیں۔

یہ اپنے ضعف کے باوجود بہت بڑا عالم تصور کیا جاتا ہے۔ ابن ماجہ میں اس کی ایک روایت پائی جاتی ہے۔ لیکن ابن ماجہ اس کا نام لینے کی بھی جسارت نہیں کر سکے۔ اور ایک شیخ کہکر اس کا ذکر کیا۔ یہ بغداد کا قاضی رہا ہے۔ ۱۳۰ھ میں پیدا ہوا، اور ۲۰۷ھ میں اس کا انتقال ہوا۔

امام احمد بن حنبل فرماتے ہیں۔ واقدی کذاب ہے۔ احادیث کو تبدیل کرتا رہتا ہے۔ زہری کے بھانجے کی روایات معمر کی جانب منسوب کر دیتا ہے۔ یحیٰی بن معین نے ایک بار فرمایا یہ ثقہ نہیں ہے۔ اور ایک بار فرمایا اس کی حدیث نہ لکھی جائے۔ امام ابو حاتم رازی فرماتے ہیں متروک ہے۔ ان ہی ابو حاتم اور نسائی کا قول ہے کہ احادیث وضع کیا کرتا تھا۔ دار قطنی کہتے ہیں ضعیف ہے۔ ابن عدی کہتے ہیں اس کی احادیث محفوظ نہیں۔ اور بلاسی کی نازل کردہ ہے۔

امام ابن الجوزی فرماتے ہیں۔ لوگوں کو دھوکہ دینے کے لئے یہ خود کو محمد بن ابی شملہ بھی کہلاتا تھا۔ علی بن المدینی کہتے ہیں یہ احادیث وضع کیا کرتا تھا۔

سلیمان الشاذکونی فرماتے ہیں۔ واقدی دو حال سے خالی نہیں۔ یا یہ سب سے سچا انسان ہے یا سب سے زیادہ جھوٹا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ میں نے اس سے کچھ روایات لکھیں۔ جب میں نے واپسی کا ارادہ کیا تو وہ لکھا ہوا مجموعہ لے کر آیا۔ اور ان روایات کے بارے میں اس سے سوال کیا۔ تو اس نے ایک حرف کی تبدیلی بھی نہیں کی۔

[illegible]

اسحاق بن الطباع کا بیان ہے کہ میں نے مکہ کے راستہ میں واقدی کو دیکھا ہے۔ یہ تو نماز بھی بُری طرح ادا کیا کرتا تھا۔ اسحاق بن راہویہ فرماتے ہیں۔ میرے نزدیک تو یہ احادیث وضع کرتا ہے۔ امام ذہبی فرماتے ہیں اس کے ضعف پر اجماع ہے۔ میزان الاعتدال صـ ۶۶۲ ج ۳

سید مہدی علی خاں جو پہلے ایک شیعہ کٹر مجتہد تھے۔ پھر اللہ تعالیٰ نے انہیں شرف با ایمان کیا۔ ایمان لانے کے بعد انہوں نے رد شیعیت میں آیات بینات تحریر فرمائی۔ جس کا آج تک یہ مجوسی برادری جواب نہ دے سکی۔ وہ شیعوں کی کتاب منتہی المقال فی اسماء الرجال سے ابراہیم بن محمد بن ابی یحیٰ ابو سحاق المدنی کے حال میں نقل کرتے ہیں۔

ابراہیم بن محمد بن ابی یحیٰ یہ ابو اسحاق المدنی ابو جعفر وغیرہ سے روایت کرتا ہے۔ یہ ہمارا مخصوص آدمی ہے۔ اسی لئے عام لوگ (یعنی اہل سنت) اس کو ضعیف قرار دیتے ہیں۔ اور ہمارے بعض ساتھیوں نے مخالفین سے یہ بات نقل کی ہے کہ واقدی کی تمام کتابیں اسی ابراہیم بن محمد بن ابی یحیٰ کی کتابیں ہیں۔ جنہیں واقدی نے نقل کر کے اپنے مصنف ہونے کا دعویٰ کر دیا۔ منتہی المقال صـ ۲۵

شیخ اپنی فہرست میں لکھتے ہیں کہ واقدی نے ابراہیم کی کتابیں نقل کر کے اپنی جانب منسوب کیں۔ اسی باعث عام لوگ اس ابراہیم کو ضعیف کہتے ہیں اسی لئے میزان الاعتدال کا مصنف لکھتا ہے کہ یہ ابراہیم کذاب ہے رافضی ہے۔ آیات بینات صـ ۲۱۹

یعنی واقدی جو کچھ بھی بیان کرتا ہے اور لکھتا ہے۔ ان کا عوام الناس (اہل سنت) سے کوئی تعلق نہیں وہ تو درپردہ مخصوص آدمی ہے جو بطور تقیہ سنیت اختیار کئے ہوئے تھا۔ اور علم سینہ بسینہ یعنی آئمہ کا علم سینوں میں پھیلا رہا تھا۔ اسی لئے مہدی علی خاں ایک مقام پر لکھتے ہیں۔

واقدی ان بزرگوار مصنفوں میں ہیں کہ ان کی کتابیں نہ صرف ضعیف روایتوں بلکہ موضوع اور غلط اور جھوٹی خبروں سے بھری ہوئی ہیں۔ اور ان کے غیر معتبر ہونے پر اکثر محققین اور علماء کا اتفاق ہے۔ آیات بینات ۲۱

جب یہ بات واضح ہو گئی کہ اول تو واقدی خود ناقابل اعتبار اور جھوٹا ہے۔ ثانیاً اس کی حیثیت تو صرف ایک مہرہ کی ہے اس نے جو کچھ بھی لکھا ہے۔ وہ اس کا تحریر کردہ نہیں بلکہ اس نے سب کچھ ابراہیم بن محمد بن ابی یحیٰ

سے نقل کیا ہے۔ لہٰذا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس ابراہیم کی تصویر بھی قارئین کو دکھا دی جائے۔ کیونکہ اصل ڈور اس کے قبضہ میں ہے۔

ابراہیم بن محمد : اس کی روایت بھی ابن ماجہ میں پائی جاتی ہے۔ اس کے دادا کا نام سمعان اور ابو یحییٰ کنیت ہے ۱۸۴ھ میں اس کا انتقال ہوا۔

امام یحییٰ بن سعید القطان فرماتے ہیں کہ میں نے امام مالک سے دریافت کیا۔ کیا یہ ابراہیم حدیث میں ثقہ ہے۔ فرمایا نہیں۔ بلکہ یہ تو دین میں بھی ثقہ نہیں۔ خود امام یحییٰ بن سعید القطان کا قول یہ ہے کہ یہ کذاب ہے۔

امام احمد بن حنبل فرماتے ہیں۔ محدثین نے اس کی روایت ترک کر دی ہے۔ یہ قدری ہے۔ معتزلی ہے۔ ایسی روایات بیان کرتا ہے جن کا کوئی وجود نہیں ہوتا۔ امام بخاری فرماتے۔ ابن المبارک اور دیگر لوگوں نے اس کی روایت ترک کر دی ہے۔ یہ قدری تھا، جہمی تھا۔

عبداللہ بن احمد کا بیان ہے کہ میرے والد امام احمد فرمایا کرتے تھے۔ یہ قدری جہمی ہے۔ ہر قسم کی بلا اس میں پائی جاتی ہے۔ محدثین نے اس کی حدیث ترک کر دی ہے۔ یحییٰ بن معین کا قول ہے کہ یہ ابراہیم کذاب ہے۔ رافضی ہے۔ علی بن المدنی کہتے ہیں یہ قدری تھا کذاب ہے۔

نسائی اور دارقطنی کہتے ہیں۔ متروک ہے۔ سعید بن ابی مریم کہتے ہیں اس کا دعویٰ تھا کہ میں نے عطا سے سات ہزار مسائل سنے ہیں۔ اس نے ایک مؤطا بھی تصنیف کی تھی جو امام مالک کی مؤطا سے کئی گنا بڑی تھی۔ حلال و حرام پر بھی اس کی ایک کتاب تھی۔

ابن حبان کہتے ہیں یہ قدری تھا۔ اور جہمی تھا۔ اور حدیث میں جھوٹ بولتا تھا۔ امام شافعی بچپن میں اس کے پاس جا کر بیٹھا کرتے تھے۔ اس سے بہت سی باتیں سُن سُن کر امام شافعی کے ذہن میں بیٹھ گئی تھیں۔ جب آخر عمر میں امام شافعی مصر پہنچے اور اپنی مبسوط کتاب (کتاب الام) کی تصنیف شروع کی تو متعدد احادیث اور تاریخی واقعات کی انہیں ضرورت پیش آئی اور ان کے پاس اس وقت کتابیں نہ تھیں۔ لہٰذا اپنے حافظے سے کام لیتے ہوئے انہیں جو کچھ یاد تھا۔ تحریر کیا۔ اسی باعث ان کی کتاب میں اس ابراہیم کی روایات پائی جاتی ہیں۔ کبھی وہ اس کا ذکر کنیت سے کرتے ہیں اور کبھی نام سے۔

ابراہیم بن سعد المدنی کا بیان ہے کہ جب ہم حدیث کی تلاش میں مختلف علماء کے پاس جایا کرتے تھے تو اس زمانہ میں ہم اس ابراہیم کو خرافہ کہہ کر یاد کیا کرتے تھے۔

یحییٰ الاسدی کہتے ہیں کہ اس ابراہیم نے ایک روز ایک مسافر کے سامنے تیس احادیث بیان کیں۔ جو اس کے نظریہ میں بہت عمدہ تھیں۔ لیکن جب اس نے دیکھا کہ سننے والا کچھ خوش نہیں ہوا۔ تو کہنے لگا۔ کہ اگر تو اس گدھے کے پاس جاتا اور وہ تجھ سے صرف تین احادیث بھی بیان کر دیتا تو خوش ہو جاتا۔ گدھے سے اس کی مراد امام مالک بن انس تھے۔

یزید بن ہارون کہتے ہیں۔ یہ ابراہیم کذاب ہے۔ نعیم بن حماد کا بیان ہے۔ کہ میں نے اس کی کتابیں پانچ دینار میں حاصل کی تھیں۔ ایک روز اس نے مجھے ایک کتاب نکال کر دکھائی جس میں قدریہ کے مسائل تھے، پھر دوسری کتاب دکھائی اس میں جہمیہ کے خیالات کا تذکرہ تھا۔ میں نے اس سے سوال کیا کہ کیا تمہاری اپنی رائے بھی یہی ہے؟ اس نے اقرار کیا۔ میں نے اس کی کتابیں وہیں پھاڑ کر پھینک دیں۔ میزان ص ۵۹ ج ۱

ان تمام تفصیلات سے قارئین کو یہ بھی اندازہ ہو گیا ہو گا کہ تاریخ میں فرقہ معتزلہ، فرقہ جہمیہ، فرقہ قدریہ اور دیگر فرقے جو عالم وجود میں آئے۔ ان کے درپردہ شیعہ اور مجوسی ذہن کارفرما تھا۔ اور اصل مقصود اسلام کو باطل قرار دینا اور اس کی اصل صورت کو مٹانا تھا۔ تاکہ مسلمان انہی مسائل میں اُلجھ کر ایک دوسرے سے دست و گریباں ہو جائیں۔ اور اسلام کی شان و شوکت ختم ہو کر رہ جائے۔ اور حقیقت بھی یہی ہے کہ وہ اپنی اس فریب کاری میں کامیاب رہے۔ لیکن آج بھی وہ خواہ کیسا ہی رنگ اختیار کر لیں۔ رہتے وہ شیعہ ہی ہیں۔

بات چل رہی تھی حلیمہ کے گھر کے قصہ کی کہ اس کہانی کو واقدی نے بھی روایت کیا ہے۔ وہ اس کہانی کو عبداللہ بن زید بن اسلم سے روایت کرتا ہے۔ امام یحییٰ بن معین، ابوزرعہ رازی اور نسائی کہتے ہیں کہ یہ ضعیف ہے۔ دراصل زید بن اسلم کے تین بیٹے ہیں۔ عبداللہ، عبدالرحمان اور اسامہ۔ محدثین کی ایک جماعت عبداللہ کو ضعیف اور دوسروں کو معتبر قرار دیتی ہے۔ کچھ محدثین عبدالرحمان کو ضعیف اور بقیہ دونوں کو معتبر کہتے ہیں۔ تو اگر دیا اسامہ کو [illegible] معتبر [illegible] حقیقت [illegible] تینوں ضعیف ہیں۔ میزان ص ۳۲۵ ج ۲۔

یہودیوں کے منصوبے آپؐ کے قتل سے متعلق

حلیمہ کے پاس قیام کے زمانہ میں ایک اور واقعہ بھی راویوں نے بیان کیا ہے۔ کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھ کر بعض یہودیوں نے یا عرب قیافہ شناسوں نے (روایت میں اختلاف ہے) یہ معلوم کر لیا۔ کہ آپ نبی آخر الزماں ہیں۔ اور یہی ہمارے آبائی کیش اور مذہب کو دنیا سے مٹائیں گے۔ یہ سمجھ کر انہوں نے خود آپ کو قتل کرنا چاہا یا دوسروں کو آپ کے قتل پر آمادہ کرنا چاہا۔ (روایت میں اختلاف ہے) ایک روایت میں ہے کہ یہ واقعہ اس وقت پیش آیا جب حلیمہ آپ کو پہلے پہل مکہ معظمہ سے لے کر عکاظ کے میلہ میں لائیں۔ وہاں قبیلہ ہذیل کا ایک قیافہ شناس بڈھا تھا۔ عورتیں اپنے اپنے بچوں کو لے کر اس کے پاس آتی تھیں، اور فال نکلواتی تھیں۔ اس کی نظر جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر پڑی تو وہ چلا اٹھا کہ اسے قتل کر ڈالو۔ مگر آپ لوگوں کی نظروں سے غائب ہو چکے تھے۔ حلیمہ آپ کو لے کر چل دی تھیں۔ لوگوں نے بڈھے سے واقعہ پوچھا۔ تو اس نے کہا کہ میں نے ابھی وہ بچہ دیکھا جو تمہارے اہل مذہب کو قتل کرے گا۔ اور تمہارے بتوں کو توڑے گا۔ اور کامیاب ہو گا۔ اس کے بعد لوگوں نے آپ کو بہت ڈھونڈا مگر آپ نہ ملے حلیمہ نے اس کے بعد آپ کو پھر کسی قیافہ شناس اور فال دیکھنے والے کے سامنے پیش نہیں کیا۔

ایک اور روایت میں ہے کہ اس بڈھے کی عقل جاتی رہی، اور وہ حالت کفر میں مر گیا۔ دوسری روایت میں یہ واقعہ اس طرح ہے کہ آمنہ نے حلیمہ کو کہہ دیا تھا کہ میرے بچہ کو یہودیوں سے بچائے رکھنا۔ اتفاق سے جب وہ آپؐ کو لے کر چلیں تو کچھ یہودی راستہ میں مل گئے۔ انہوں نے آپ کا حال سُن کر ایک دوسرے سے کہا کہ اس کو مار ڈالو، پھر انہوں نے دریافت کیا کہ کیا یہ بچہ یتیم ہے؟ حلیمہ نے کہا نہیں۔ میں اس کی ماں ہوں۔ اور اپنے شوہر کو بتایا کہ وہ اس کا باپ ہے۔ انہوں نے کہا کہ اگر یہ یتیم ہوتا تو ہم اس کو قتل کر ڈالتے۔ اور چونکہ ان کو یہ معلوم ہوا کہ یہ یتیمی کی علامت بچہ میں نہیں پائی جاتی تھی۔ اس سے ان کا یقین جاتا رہا۔

سید سلیمان ندوی مرحوم اس روایت پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

یہ روایتیں ابن سعد ص۱ ج ۱ و ص۹ میں ہیں۔ مگر حالت یہ ہے کہ پہلی روایتوں کا ماخذ واقدی کی داستانیں ہیں۔ اور اس پر بھی ان کے سلسلے ناتمام ہیں۔ آخری روایت کا سلسلہ یہ ہے۔ عمرو بن عاصم کلابی، ہمام بن یحیٰ اور اسحاق بن عبداللہ۔ گو یہ تینوں عموماً ثقہ اصحاب ہیں مگر ان کی روایت موقوف ہے۔ یعنی آخری راوی اسحاق بن عبداللہ گو تابعی ہیں۔ مگر وہ کسی صحابی سے اس کا سنا ظاہر نہیں کرتے۔ معلوم نہیں یہ روایت کہاں سے پہنچی۔

سیرت النبی ص۳۵ ج ۲

یہاں ہمیں سید صاحب مرحوم کی اس رائے سے کہ یہ تینوں عموماً ثقہ راوی ہیں کچھ اختلاف ہے۔

جہاں تک ہمام بن یحیٰ البصری کا تعلق ہے۔ بے شک وہ بصرہ کے مشہور ثقہ علماء میں شمار ہوتے ہیں۔ لیکن ان میں کچھ خامیاں بھی ہیں۔ حافظ ذہبی ان کے تذکرہ میں فرماتے ہیں۔

حافظ ابوحاتم کہتے ہیں یہ ثقہ ہیں لیکن ان کا حافظہ کچھ خراب ہے۔ یحیٰ بن سعید القطان ان کے حافظہ کے باعث ان سے قطعاً راضی نہ تھے۔ امام احمد فرماتے ہیں۔ میں نے یحیٰ بن سعید القطان کو دیکھا ہے کہ وہ تین افراد کے بارے میں بہت بری رائے رکھتے تھے۔ ایک حجاج بن ارطاۃ، دوسرے محمد بن اسحٰق اور تیسرے یہ ہمام۔ حتیٰ کہ وہ ان تینوں کے سلسلہ میں کسی سے گفتگو کے لئے بھی تیار نہ تھے۔

عمرو بن علی کا بیان ہے کہ عبدالرحمان بن مہدی تو اس ہمام سے روایت کرتے، لیکن یحیٰ نہ اس سے کوئی روایت لیتے اور نہ وہ اس کے حافظہ سے خوش تھے۔ اور نہ اس کی لکھی ہوئی احادیث سے۔

عفان کا بیان ہے کہ ہمام اپنی لکھی ہوئی یادداشت کو دیکھنے کے لئے تیار نہ ہوتا کیونکہ وہ اسے عیب تصور کرتا۔ اور پھر اگر کسی وقت اچانک مسودہ پر نظر پڑتی تو کہتا ہم اللہ سے استغفار چاہتے ہیں۔ ہم تو بہت سے غلطیاں کرتے رہے ہیں ۱۶۴ھ میں اس کا انتقال ہوا۔ مجموعی طور پر ہمام کا حافظہ خراب تھا۔ اس لئے اس کی روایت پر اعتماد نہیں کیا جا سکتا۔ میزان ص۳۰۹ ج ۴

ہمام سے یہ روایت عمرو بن عاصم کلابی   نقل کرتا ہے۔ یہ بھی مشہور سچے عالم ہیں۔ یحیٰ بن معین نے انہیں ثقہ کہا ہے۔ نسائی کہتے ہیں ان کی روایت میں کوئی حرج نہیں۔ ابوداؤد کہتے ہیں میں اس کی روایت سے خوش نہیں۔ اگر بندار اس سے روایت نہ لیتے تو میں اس کی روایت ترک کر دیتا۔ ابوحاتم اس کی روایت کو حجت نہ سمجھتے

تھے۔ اس کا انتقال ۲۱۳ھ میں ہوا۔

رہا اسحاق بن عبداللہ کا معاملہ تو اسحاق بن عبداللہ نامی تو متعدد افراد ہیں۔ سید صاحب نے اس کا اتا پتہ تحریر نہیں کیا۔ صرف یہ لکھا کہ وہ تابعی ہے۔ تو تابعین میں پانچ اسحاق بن عبداللہ نامی موجود ہیں۔ ایک اسحٰق بن عبداللہ بن جعفر الہاشمی ہیں جن کا کچھ حال معلوم نہیں۔ ایک اسحاق بن عبداللہ بن الحارث بن نوفل الہاشمی ہیں جو ثقہ ہیں۔ ایک اسحٰق بن عبداللہ بن الحارث بن کنانۃ العامری ہیں یہ کام چلاؤ ہیں۔ ایک اسحٰق بن عبداللہ بن ابی طلحۃ الانصاری المدنی ہیں یہ ثقہ ہیں حجت ہیں اور ایک اسحٰق بن عبداللہ بن ابی فروۃ المدنی ہے یہ ناقابلِ اعتبار ہے۔ ہمارے نزدیک یہ روایت اسی آخری شخص سے مروی ہے۔

اسحٰق بن عبداللہ بن ابی فروہ: یہ حضرت عثمانؓ کی اولاد کا غلام تھا۔ بلا سند روایات نقل کرنے میں مشہور تھا۔ ایک بار امام زہری نے اس کو بلا سند حدیث بیان کرتے دیکھا تو فرمایا۔ اے ابن ابی فروہ اللہ تجھے قتل کرے۔ تو اللہ کے معاملہ میں کتنا بے خوف ہے۔ تو حدیث کی سند کیوں بیان نہیں کرتا۔ ایسی روایات کیوں بیان کرتا ہے۔ جن کی نہ کوئی مہار ہوتی ہے اور نہ لگام۔

بخاری کہتے ہیں محدثین نے اس کی روایت کو ترک کر دیا ہے۔ اور امام احمد اس کی حدیث سے منع کرتے تھے۔ بلکہ جوزجانی تو یہ کہتے ہیں کہ امام احمد بن حنبل فرمایا کرتے تھے کہ میرے نزدیک اس اسحاق کی روایت بیان کرنا بھی حلال نہیں۔ ابوزرعہ کہتے ہیں یہ متروک ہے۔ یحیٰی بن معین وغیرہ کہتے ہیں اس کی روایت نہ لکھی جائے۔ ابن عدی نے اس کی کئی روایات کو منکر قرار دیا ہے۔ اور خاص طور پر اہل حجاز سے جتنی بھی روایات نقل کرتا ہے۔ وہ منکر ہوتی ہیں۔ اس کا انتقال ۱۴۴ھ میں ہوا۔ میزان ج ۱ ص ۱۹۳۔ اس کی روایات ابوداؤد، ترمذی اور ابن ماجہ میں پائی جاتی ہیں۔ سید صاحب آگے تحریر فرماتے ہیں۔

تقریباً اس واقعہ کو ابونعیم نے دلائل میں اس طرح بیان کیا ہے کہ حلیمہ جب آپ کو مکہ سے لے کر روانہ ہوئیں تو ایک وادی میں پہنچ کر ان کو حبش کے کچھ لوگ ملے۔ حلیمہ ان کے ساتھ ہو گئیں۔ انہوں نے جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا تو آپ کی نسبت کچھ دریافت کیا۔ اس کے بعد آپ کو خوب غور سے دیکھنا شروع کیا۔ دونوں مونڈھوں کے بیچ میں مہر نبوت تھی۔ وہ دیکھی۔ آپ کی آنکھوں میں تھوڑی سرخی تھی اس کو دیکھتے

رہے۔ پھر پوچھا کہ کیا بچہ کی آنکھوں میں یہ سرخی کسی بیماری سے ہے یا ہمیشہ سے اسی طرح کی ہے۔ حلیمہ نے کہا نہیں ہمیشہ سے اسی طرح ہے انہوں نے کہا اللہ کی قسم یہ پیغمبر ہے۔ یہ کہہ کر انہوں نے چاہا کہ بچہ کو حلیمہ سے چھین لیں۔ لیکن اللہ نے آپ کی حفاظت کی۔

ابونعیم کی اس روایت کا سلسلہ نہایت ضعیف اور کمزور ہے اور اس کی رواۃ مجہول الحال لوگ ہیں۔

سیرت النبی ص۵۵ ج ۳

ہم تو ان تمام روایات کو پڑھنے کے بعد صرف اس نتیجے پر پہنچے کہ ان مجوسی مورخین کے دلوں میں حضور کی جانب سے بغض بھرا ہوا ہے۔ اسی لئے کبھی وہ یہودیوں سے آپ کو قتل کروانا چاہتے ہیں، کبھی عیسائیوں سے، کبھی عربوں کو سامنے لاتے ہیں اور کبھی قیافہ شناسوں اور کاہنوں کو۔ وہ اس قسم کے واقعات بیان کر کے اپنے دور کے یہودیوں، عیسائیوں اور قریش کے علاوہ دیگر عربوں کو اسلام کے خلاف اکسانا چاہتے ہیں۔ اور چونکہ حضور قریش سے تعلق رکھتے تھے۔ لہٰذا اس طرح قریش سے نفرت خود بخود وجود میں آجاتی ہے۔ جب ہم تاریخ کا مطالعہ کرتے ہیں تو ہمیں صاف نظر آتا ہے کہ بنو عباس اور ابومسلم خراسانی نے اہل یمن اور قحطانی عربوں میں قریش کی دشمنی پیدا کی۔ اور ان دونوں کی کشمکش میں بنوامیہ کی حکومت ختم ہوئی۔ اور ان روایات کا مقصد واضح ہو کر سامنے آگیا۔ اور یہ تمام مورخین بنو عباس کے چمچہ گیر تھے۔ اور چونکہ اس وقت ایسا ماحول پیدا نہیں ہوا تھا کہ کوئی مسلمان حضور کی ذات اقدس پر حملہ برداشت کر لیتا۔ لہٰذا اپنی دیو مالائی داستانوں کو حضور کے فضائل کے رنگ میں پیش کیا گیا تاکہ اُمت کے ذہن سے آپ کی ذات کے بارے میں وہ تاثر ختم ہو جائے جو قرآن نے قائم کیا تھا۔ اور حقیقت یہ ہے قرآن نے حضور کی جو شخصیت بیان کی ہے آج اس سے کوئی مُسلم واقف نہیں۔ بلکہ ہم حضور کو ان عجمی داستانوں کے ایک ہیرو کے روپ ہی میں دیکھتے ہیں۔

اگر واقعہ یہ نہیں ہے تو پھر یہ تسلیم کرنا ہوگا کہ جب حضور پیدا ہوئے تو دنیا کا کوئی فرد بشر ایسا نہ تھا جو حضور کی آمد اور نبوت کے مقصد سے واقف نہ ہو۔ پھر پیدائش کے بعد نبوت تک مختلف فرضی معجزات بھی ظاہر ہوتے رہے لیکن تب بھی نبوت کے بعد مخصوص افراد کے علاوہ کسی نے ایمان قبول نہیں کیا۔ اور کسی نے ایمان لانے کے بعد کبھی یہ بیان نہیں کیا کہ یا رسول اللہ ہم نے ایسا واقعہ دیکھا تھا یا سُنا تھا جو ہم ایمان لاتے ہیں۔

اگر ان روایات کا بنظر غائر مطالعہ کیا جائے تو ان میں اور بھی بہت سے عیوب نظر آئیں گے۔ مثلاً جب پہلے پہل حلیمہ آپؐ کو لے کر مکہ سے چلیں تو عکاظ کے میلے میں پہنچ گئیں۔ آپ کی پیدائش ربیع الاول میں ہوئی۔ دو یا تین روز والدہ کا دودھ پیا۔ پھر سات روز ثوبیہ کا دودھ پیا۔ پھر آپ کو حلیمہ لے کر چلی گئیں۔ اور عکاظ کا میلہ ذی الحجہ میں حج کے بعد لگا کرتا تھا۔ کیا وہ دس ماہ تک مکہ ہی میں ٹھہری رہیں اور اس کے بعد سفر شروع کیا یا اس طویل عرصہ میں مسلسل سفر میں رہیں؟ حالانکہ پہلی روایات اس کی تردید کر رہی ہیں۔

ان متعدد روایات میں یہ پایا جاتا ہے کہ حضور کی آنکھوں میں سرخی تھی۔ حالانکہ کتب احادیث میں صحابہ کرام جو حلیہ بیان کر رہے ہیں۔ اس میں ایک صفت یہ بھی ہے کہ آپؐ اکحل العینین تھے۔ اکحل العینین اس شخص کو کہا جاتا ہے۔ جس کی آنکھوں میں سپیدی کی جگہ خوب گہری سپیدی اور سیاہی کی جگہ خوب گہری سیاہی ہو۔ اور ایسی آنکھیں حسین تصور کی جاتی ہیں۔ آنکھوں میں سرخی ہونا حسن کی علامت نہیں۔ اور حضور سب سے زیادہ حسین تھے۔ یہ آپ کے اصل حلیۂ مبارک کو تبدیل کیا گیا ہے۔ اسی سے آپ ان روایات کا اندازہ فرمالیں۔

بادلوں کا ساتھ چلنا

بیان کیا جاتا ہے کہ حلیمہ پیار و محبت کی وجہ سے آپ کو دھوپ میں نکلنے نہیں دیتی تھیں۔ ایک دن آپ اپنی رضاعی بہن کے ساتھ دھوپ میں نکل پڑے۔ حلیمہ نے دیکھا تو لڑکی پر خفا ہوگئیں۔ کہ تم دھوپ میں کیوں لے گئیں۔ لڑکی نے کہا اماں جان میرے بھائی کو دھوپ نہیں لگتی۔ میں نے دیکھا کہ اس پر بادل سایہ کئے تھے۔ جدھر یہ بچہ جاتا تھا اُدھر وہ بھی چلتے تھے۔ اور جہاں یہ رک جاتا تھا وہ بھی رک جاتے تھے۔ اس کیفیت سے وہ یہاں تک پہنچا ہے۔

ابن سعد نے اس واقعہ کو دو طریقوں سے نقل کیا ہے۔ ایک میں صرف واقدی کا حوالہ ہے۔ اور اس کے آگے کوئی نام نہیں دیا۔ ص۶۸ ج ۱ اور دوسرے میں ہے کہ واقدی نے معاذ بن محمد سے اور اس نے عطا سے اور عطا نے ابن عباسؓ سے سنا۔ ابن سعد کے علاوہ ابو نعیم، ابن عساکر اور ابن طرماح نے بھی اسی سلسلہ سے اس واقعہ کو نقل کیا ہے۔ مگر اس سلسلہ میں واقدی کے علاوہ معاذ بن محمد مجہول اور نا معتبر ہے (اور ابن عباسؓ ہجرت مدینہ سے دو سال قبل پیدا ہوئے تھے) سیرت النبی ص۱۶۰ ج ۳۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلّم کی کفالت

آج کل تعلیم یافتہ طبقہ میں یہ سوال بڑی شد ومد سے کیا جاتا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی کفالت کس نے کی؟ اردو زبان میں تمام مصنفین سیرت۔ تمام مؤرخین۔ اور تمام علماء وصوفیاء بلکہ سابقہ ادوار میں بھی اکثر یہی لکھتے آئے ہیں کہ عبدالمطلب کے مرنے کے بعد نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی کفالت آپ کے حقیقی چچا ابوطالب نے کی۔

پاک وہند میں تقسیم ہند سے قبل یہ ایک امر مسلمہ تسلیم کیا جاتا تھا۔ جس میں کسی قسم کے شک وشبہ کی کوئی گنجائش نہ تھی۔ بلکہ یہ تمام تاریخی داستانیں ایمانیات کا درجہ رکھتی تھیں۔ لیکن جب پاکستان میں محمود احمد عباسی مرحوم نے خلافت معاویہؓ ویزید لکھ کر شیعیت کو چیلنج کیا۔ تو متعدد حضرات کی رگ شیعیت پھڑک اٹھی۔ قاری طیب صاحب مرحوم نے ایک کتاب لکھ کر اپنی حسینیت کا ثبوت دیا۔ اور مودودی صاحب نے خلافت وملوکیت لکھ کر شیعیت کا پرچار کیا اور متعدد صحابہ پر تنقید کی۔ جس کا نتیجہ یہ برآمد ہوا کہ وہ سیلاب جو محمود احمد عباسی کی جانب نہ صرف بڑھ رہا تھا بلکہ لپیٹ میں لے چکا تھا۔ اس کا رُخ مودودی صاحب کی جانب مُڑ گیا۔ اور ان کی کتاب کے رد میں متعدد تحقیقی تصانیف وجود میں آئیں۔ اور جواب الجواب کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ جس کا ایک بہتر نتیجہ سامنے آیا کہ کچھ لوگ ایسے پیدا ہو گئے۔ جنہوں نے تاریخ کی تحقیق شروع کر دی۔ جس کی وجہ سے جہاں بہت سے حقائق کھل کر سامنے آئے۔ وہاں بطور ردعمل ایک ایسا طبقہ بھی وجود میں آیا جس نے حضرت علیؓ کی ذات کو اپنا ہدف بنا لیا۔ اس طبقہ نے ہر اس واقعہ کا رد ضروری تصور کیا۔ جس کا تعلق حضرت علیؓ کی ذات سے ہو۔ کیونکہ انہیں ہر واقعہ کے پس پردہ شیعیت کارفرما نظر آتی تھی۔ ان کا مقصود بغض علیؓ نہ تھا بلکہ بغض شیعیت تھا۔ اگرچہ بعض حضرات اس سلسلہ میں اعتدال سے آگے بڑھ گئے۔

دوسری جانب اُن حضرات نے جو ان داستانوں پر آنکھیں بند کر کے ایمان لاتے تھے ان داستانوں کا دفاع

کیا اور ان لوگوں پر خارجیت کے فتوے صادر کئے جو ان داستانوں پر ایمان نہ رکھتے تھے۔ اس مقابلہ بازی کے نتیجہ میں کچھ علماء تو خارجیت کی جانب مائل ہو گئے۔ اور کچھ نے اپنے آپ کو شیعی عقائد میں رنگ لیا۔ اس طرح علماء دیوبند اور علماء اہل حدیث تین حصوں میں تقسیم ہو گئے۔

۱۔ وہ ٹولہ جو ان داستانوں کا دفاع کرنا اپنا دینی فریضہ تصور کرتا ہے۔ اور امیر معاویہؓ وغیرہ پر تنقید کرنا اپنے لئے لازم سمجھتا ہے۔

۲۔ دوسرا وہ ٹولہ جسے خاندان بنی ہاشم یا اس خاندان کے کسی صحابی میں کوئی خوبی نظر نہیں آتی۔

۳۔ وہ علماء جو تمام صحابہ کی محبت داخل دین تصور کرتے ہیں۔ اور ایسی تاریخی داستانوں کو جس سے کسی صحابی کی عظمت میں فرق آتا ہو، انہیں خالص جھوٹ سمجھتے ہیں۔ اتفاق سے حضور کی کفالت کے مسئلہ میں بھی یہ علماء متعدد حصوں میں بٹے ہوتے ہیں۔ اکثریت تو وہی اپنا صدیوں پرانا راگ الاپ رہی ہے۔ اس کے سامنے بس یہی ایک جواب ہے کہ صاحب لوگ یہی کہتے اور لکھتے چلے آتے ہیں۔ جب کہ دوسرا طبقہ اتنے زبردست دلائل پیش کرتا ہے کہ پہلا طبقہ لاجواب ہو کر فتوے بازی کا سہارا لیتا ہے۔ لیکن اس فتوی بازی سے عوام پر اچھا تاثر پیدا نہیں ہو رہا ہے۔ بلکہ اب یہی امور شیعیت اور سنیت کی پہچان بن گئے ہیں۔ لہٰذا کفالت رسول کے معاملہ میں ٹھنڈے دل سے غور کرنے کی ضرورت ہے۔

جو طبقہ ابو طالب کی کفالت کا منکر ہے۔ ہم اس کے دلائل اسی طبقہ کے ایک نمائندہ اور مشہور اہل حدیث عالم حکیم فیض عالم شہید صدیقی کی "حقیقت شیعہ" نامی کتاب سے قارئین کے سامنے پیش کرتے ہیں۔ حکیم صاحب لکھتے ہیں۔

ہماری تمام مروجہ تاریخیں، ہمارے تمام علماء اور پیران عظام، ہمارے سب کے سب واعظ اور خطیب ہماری تمام مجالس اور محافل، غرضیکہ ہمارا تمام معاشرہ الاماشاء اللہ بُری طرح اس غلط فہمی کا شکار ہے کہ عبد المطلب کے انتقال کے بعد ابو طالب جس کا اصل نام عبد مناف (مناف بت کا بندہ) تھا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا کفیل ہوا، حالانکہ یہ واقعہ صریحاً غلط اور بالکل بے بنیاد ہے۔ بلکہ اصل بات یہ ہے کہ عبد المطلب کے انتقال کے بعد آپ کی پرورش آپ کے بڑے چچا زبیر بن عبد المطلب نے کی مگر شیعی پروپیگنڈے نے اس حقیقت کے چہرے کو نہایت چالاکی

سے مسخ کر کے ابوطالب (عبد مناف) کا مقام بلند کر کے دکھانے کے لئے تمام واقعہ کو اس طرح سوڑ توڑ کر تمام معاشرہ کے ذہنوں میں اس طرح راسخ اور پختہ کر دیا ہے۔ کہ آج بڑے بڑے عالم اور فاضل بھی اس حقیقت سے واقف نہیں۔

اس ایک واقعہ ہی سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ شیعی تصورات نے اپنے پروپیگنڈے کے بل بوتے پر حقائق کو مسخ کر کے پوری قوم کے ذہنوں کو اپنے مزعومہ تصورات میں کس طرح جکڑ رکھا ہے۔ یزید کو اللہ تعالیٰ نے بخش دیا۔ اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور سینکڑوں اجل صحابہ اس امر کے گواہ ہیں مگر شیعی پروپیگنڈے نے اپنے جالوں میں اس طرح سے پوری ملت کو جکڑ لیا۔ کہ وہ آج تک اسے بخشنے کو تیار نہیں۔ ذرا ابوطالب کے اسی ایک واقعہ سے دوسری باتوں کا اندازہ کیجئے۔ ؏

قیاس کن زگلستانِ من بہار مرا

عبدالمطلب کی وفات کے وقت ان کے چھ بیٹے زندہ تھے :	زبیر، حارث، عبد مناف (ابوطالب) عبدالعزیٰ (ابولہب) عباس اور حمزہ۔ ان میں سے زبیر، عبداللہ، عبد مناف تینوں ایک ماں سے سگے بھائی تھے۔ زبیر سب سے بڑے تھے۔

طبقات ابن سعد میں زبیر کے متعلق لکھا ہوا ہے۔

۱۔ والزبیر وکان شاعرا شریفا والیہ اوصی عبدالمطلب ۔طبقات ابن سعدؒ ج ۱	زبیر شاعر اور باعزت شخص تھے۔ اور ان ہی کو عبدالمطلب نے اپنا وصی کیا تھا۔
۲۔ فاما الزبیر بن عبدالمطلب فکان اشراف وجوھھا۔ شرح ابن ابی الحدید	لیکن زبیر بن عبدالمطلب تو وہ قریش کے معزز اور باوقار سرداروں میں سے تھا۔

۳۔ مؤلف کتاب المجر یعنی قدیم ترین مؤرخ ابو جعفر محمد بن حبیب المتوفی ۲۴۵ھ نے۔ الحکام من قریش ثم من بنی ہاشم کے عنوان کے تحت لکھا ہے کہ بنی ہاشم میں سے عبدالمطلب کے بعد زبیر اور ان کے بعد ابوطالب سردار ہوئے۔ کتاب المجر ص ۱۳۲

۴۔ اشراف قریش میں ہے کہ حرب بن امیہ کے مرنے کے بعد جب عہدوں کی تقسیم ہوئی تو ہاشمی خاندان میں بالترتیب، زبیر، ابوطالب، حمزہ رضی اللہ عنہ اور عباس رضی اللہ عنہ سردار ہوئے۔

۵۸۱ شمسی (عیسوی) میں فجار[1] کی جنگ لڑی گئی۔ یہ جنگ قبیلہ ہوازن اور قبیلہ قریش کے درمیان لڑی گئی۔ اس جنگ میں بنو ہاشم کے سردار زبیر تھے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی عمر اس وقت بیس سال تھی۔ آپ اس جنگ میں مسلح شامل ہوئے۔ مگر عملاً جنگ میں حصہ نہیں لیا۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی پیدائش ۵۷۱ شمسی کو ہوئی۔ حرب فجار ۵۸۱ شمسی کو لڑی گئی۔ اس حساب سے اس وقت عمر شریف بیس سال سے کچھ کم یا زیادہ تھی۔ اور آپ تیر اٹھا اٹھا کر اپنے چچا زبیر کو دیتے رہے۔ ابو طالب کا اس لڑائی میں کہیں ذکر نہیں آتا۔ (تاریخ اسلام اکبر شاہ خاں ص ۱۹۵۔ اشراف قریش ص ۱۹۵۔

۵۔ کتاب المحبر میں مرقوم ہے ھو فتیان قریش۔ زبیر قریش کے جواں مردوں میں سے تھے ص ۱۶۹

۶۔ شرح ابن ابی الحدید میں ہے کہ زبیر رحیم، کریم اور انصاف پرور تھے مظلوموں کی دادرسی کے متعلق آپ کے کئی واقعات نقل کرنے کے بعد لکھا ہے۔ کہ عبد المطلب کی زندگی میں آپ ایک مظلوم کے سلسلہ میں حرب بن اُمیہ سے اُلجھ پڑے۔ معاملہ نے طول کھینچا تو آپ اپنے بھائی الغیداق کی ہمراہی میں اس مظلوم کو لے کر کعبہ میں جا پہنچے۔ مگر معاملہ اور بڑھ گیا۔ تو تمام بنو عبد المطلب تلواریں سونت کر آپ کی مدد کے لئے پہنچ گئے۔

۷۔ اپنے زمانہ کے تاجر اور صاحب ثروت شخص تھے۔

۸۔ کسی زمانہ میں عرب میں چند لوگوں نے عہد کیا تھا۔ جو مظلوموں کی اعانت وغیرہ کی دفعات پر مبنی تھا۔ اُس عہد نامہ پر عمل وغیرہ متروک ہو چکا تھا۔ مگر اس کی یاد ابھی تک لوگوں کے دلوں میں موجود تھی۔ زبیر بن عبد المطلب نے حرب فجار کے بعد اس کی تجدید کی۔ یعنی عبد اللہ بن جدعان کے مکان پر تمام قبائل کے سرداروں کو اکٹھا کیا۔ اور اس واقعہ کی یاد دلا کر از سر نو تجدید کی۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی عمر شریف اس وقت اکیس بائیس سال کی تھی۔ اور آپ اپنے چچا زبیر کے ساتھ تھے۔ تاریخ کی کتابوں میں اسی کو حلف الفضول کہا جاتا ہے۔ شرح ابن ابی الحدید۔ تاریخ اسلام اکبر شاہ خان ص ۹۷ ج ۱

---

[1] آج محرم کو حضرت حسینؓ کی شہادت کی وجہ سے متبرک سمجھنے والوں کو معلوم ہونا چاہیئے کہ محرم کا مہینہ زمانہ کفر میں بھی حرمت کا مہینہ تھا۔ اس جنگ کو حرب فجار اس لئے کہتے ہیں کہ یہ محرم الحرام میں لڑی گئی۔ سیدہ فاطمہؓ کا نکاح ۱۱ محرم کو ہوا۔ روافض کو چاہیئے کہ وہ حضرت علیؓ کی اس سنت کو زندہ کریں۔

۹۔ زبیر کے مرنے پر ان کی بہن حضرت صفیہؓ نے ایک بڑا زوردار مرثیہ کہا تھا۔ فرماتی ہیں۔

(۱) تو روئے نیک ذات زبیر پر۔ اُن پر رونے سے یہ بات جاتی رہی کہ کسی کریم پر روتی۔

(۲) یا زمین کسی کریم و شریف کو پھینک دیتی۔ تو میں ملامت نہ کرتی۔ یا زمین کسی کے مرنے پر بدحالی اور تنگی ہو جاتی تب بھی میں پرواہ نہ کرتی۔

(۳) اور میرے جی میں تو یہ بات تھی کہ میں مرنے والوں کو چھوڑ دوں۔ اور ان کے پیچھے کوئی مرثیہ نہ کہوں۔

(۴) مگر زبیر کے مرنے کو میں کیسے بھول جاؤں۔ اس کے مرنے پر صبر نہ کر سکی۔ کیونکہ میں نے اپنے سب بھائیوں میں زبیر کو کریم تر پایا۔

(۵) اگر میں اپنی زبان سے اس کا مرثیہ نہ کہتی تو آنسو بہ بہ کر میری پسلیوں کو چور چور کر دیتے۔

سوائے زبیر کے ہمیں کسی تاریخ میں نظر نہیں آتا۔ کہ حضرت صفیہؓ نے کسی بھائی کے مرنے پر مرثیہ کہا ہو۔ حضرت حمزہؓ کی شہادت کا آپ کو بہت صدمہ ہوا۔ مگر مرثیہ ان پر بھی نہیں کہا اور ابو طالب کا تو ذکر ہی نہیں۔

زبیر کی وفات کا صحیح سن نہیں ملتا۔ مگر حلف الفضول کے تھوڑے عرصہ بعد معلوم ہوتا ہے کہ آپ مر گئے۔ اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو اس وقت کسی کی کفالت کی ضرورت نہ تھی۔ آپ بھرپور جوان تھے۔ اور آزادانہ تجارت کرتے تھے۔

اب تصویر کا دوسرا رُخ بھی ملاحظہ کیجیے۔

۱۔ زبیر کے مرنے کے بعد عبد مناف (ابو طالب) خاندان کا سردار ہوا۔ اس کی مالی حالت بہت کمزور تھی۔

۲۔ عبد مناف غریب تھا۔ اس لئے اپنے اس خاندانی عہدے کو نبھا نہیں سکتا تھا۔ اور اس کی جگہ اس کے بھائی عباس سقایہ اور رفادہ وغیرہ کے امور انجام دیتے تھے۔

۳۔ قریش کا ذریعۂ معاش تجارت تھا۔ اور تجارت کے لئے شام اور یمن کی طرف سفر کرنے پڑتے تھے۔ اس زمانہ میں عرب جیسے ملک میں جہاں چوری، لوٹ مار، اور ڈاکہ زنی کو ایک کھیل سمجھا جاتا تھا۔ وہی لوگ سفر کر سکتے تھے۔ جو صحت مند اور صحیح الاعضاء ہوتے تھے۔ مگر ابو طالب جو صحت کے لحاظ سے کمزور اور ایک ٹانگ سے لنگڑے تھے۔ اور صعوبتِ سفر برداشت کرنے سے قاصر تھے۔ اس لئے ان کی مالی حالت بہت تپلی تھی۔

العارف میں ابن قتیبہ نے قریش کے مختلف خاندانوں کے جسمانی نقائص والوں کی ایک فہرست دی ہے۔ العرج (لنگڑے) کے عنوان کے تحت سرفہرست ابوطالب کا نام ہے۔ المعارف ص۲۵۲

۴۔ چونکہ لمبے سفر سے معذور تھے۔ اس لئے گھر پر ہی کوئی چھوٹا موٹا کام کر کے گزر اوقات کر لیا کرتے تھے۔ ابن قتیبہ لکھتے ہیں کہ گھر پر ہی خوشبوئیں بنا کر بیچ لیتے تھے۔

۵۔ ان کی یہ حالت باپ کی زندگی ہی میں تھی۔ یہی وجہ ہے کہ عبدالمطلب کی سرداری یا زبیر کی سرداری کے زمانہ میں ان کا نام کہیں نہیں ملتا۔ اور نہ ہی عہد جاہلیت کے کسی اہم واقعہ میں ان کا ذکر ملتا ہے۔

اب عبدالمطلب کی بصیرت، معاملہ فہمی، وجاہت اور فراست کو دیکھتے ہوئے یہ تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ انہوں نے وفات کے وقت نبی علیہ السلام کی کفالت کا بوجھ یقیناً اس بیٹے کے سپرد کیا ہو گا جو غریبوں کا ہمدرد، مظلوموں کا مددگار، صاحب فراست، نیکی اور پارسائی کا مجسمہ، قبیلہ کا سردار، ذی عزت، ذی وجاہت، صاحب حوصلہ اور جرأت مند شخص تھا۔ نہ کہ اس بیٹے پر یتیم پوتے کی کفالت کا بوجھ ڈالا ہو گا جو معمولی حیثیت کا ایک اپاہج اور کثیر العیال انسان تھا۔ اس مقام پر یاران طریقت نے پہلے تو قرعہ اندازی کا مفروضہ کھڑا کیا۔ کہ عبدالمطلب نے کفالت و پرورش کے لئے زبیر اور عبدمناف اپنے دو بیٹوں کے درمیان قرعہ ڈالا جو ابوطالب کے نام نکل آیا۔ اس لئے انہوں نے آنحضور کی پرورش کی۔

اس قرعہ اندازی کے خالق کی نظر اس طرف کیوں نہ گئی کہ عبدالمطلب کے پانچ صاحب حیثیت بیٹے اور بھی موجود تھے۔ صرف ان دو کے درمیان قرعہ اندازی کیوں ہوئی؟ اصل بات یہ ہے کہ آپ کی کفالت کی ذمہ داری تو عبدالمطلب نے زبیر کے کندھوں پر ڈالی تھی۔ اب چونکہ اس سعادت کا سہرا ابوطالب کے سر باندھنا مقصود تھا اور زبیر کا نام درمیان سے نکالنا مقصود تھا اس لئے دو ہی کا نام لیا گیا۔

پھر دوسرا شوشہ یہ چھوڑا کہ حضور علیہ السلام کی پرورش زبیر اور ابوطالب نے کی۔

اس دوسرے فلسفے کے خالق کو اتنا نظر نہ آیا کہ زبیر تو ایک رئیس تھے اور ابوطالب ایک غریب آدمی۔ ایک امیر کے گھر رہنے والے بچے کو غریبانہ قسم کے ماحول میں پہنچانے کی اور وہ بھی شراکت میں اس کی کیا ضرورت محسوس ہوئی۔ پھر یہ اختراع کی گئی کہ زبیر کی وفات کے بعد ابوطالب نے پرورش کی۔

صفحات بالا میں بدلائل یہ ثابت کیا گیا ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی عمر شریف حلف الفضول کے وقت بیس سال سے زیادہ تھی۔ اور زبیر کی وفات اس کے بعد ہوتی ہے۔ اور اس وقت آپ آزادانہ تجارت کا شغل اپنا چکے تھے۔ پھر ابو طالب کی پرورش چہ معنی دارد؟

درایات سے آگے بڑھ کر اب روایات کو دیکھئے۔

اصل بات یہ ہے کہ عبدالمطلب نے مرتے وقت اپنے یتیم پوتے کی کفالت کی ذمہ داری زبیر کے سپرد کی تھی۔ عبدالمطلب اپنی آنکھوں سے زبیر کی بلند کرداری اور غربا پروری کے مظاہرے دیکھ چکے تھے۔ اور انہیں یقین تھا کہ زبیر ہی اس بوجھ کے اٹھانے کا اہل ہے۔ اور زبیر کو اپنے یتیم بھتیجے سے بے پناہ محبت اور غیر معمولی انس تھا۔ بچپن میں انہیں گودوں میں اٹھائے پھرتے۔ ہاتھوں پر جھلاتے اور لوریاں گنگناتے۔ چنانچہ الاصابہ میں ہے کہ زبیر بن عبدالمطلب نبی علیہ الصلاۃ والسلام کو جب وہ چھوٹے تھے، جھلایا کرتے تھے۔ اور کہتے جاتے تھے۔ یہ محمد میرے بھائی عبداللہ کی نشانی ہے۔ بڑے عیش و آرام سے جئے، اور بڑی اعلیٰ عزت اور توقیر پائے۔ الاصابہ ج ۲ ص ۳۰۵۔

زبیر کے ایک بیٹے کا نام عبداللہ تھا۔ عہد رسالت میں جوان تھے۔ جب کبھی نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آتے تو آپ اپنے پہلو میں بٹھاتے۔ نہایت محبت سے پیش آتے۔ اور فرماتے یہ میرا بھائی اور میری ماں (دادی) کا بیٹا ہے۔ اس کا باپ مجھ سے بڑا نیک سلوک کرتا تھا۔ الاصابہ ج ۲ ص ۳۰۶

زبیر کے ایک بیٹے طاہر کے نام پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے ایک بیٹے کا نام طاہر رکھا (شرح ابن ابی الحدید) حضرت صفیہؓ نے اپنے بھائی زبیر کے نام پر اپنے بیٹے کا نام زبیر رکھا۔

زبیر کی چار بیٹیاں تھیں۔ چاروں اسلام لائیں۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا بچپن اور آغاز شباب ان کے ساتھ گزرا تھا۔ اس لئے آپ ان کی بڑی عزت فرمایا کرتے تھے۔ الغرض زبیر بن عبدالمطلب اپنی نیک خصلتوں اور اعلیٰ صفتوں کی وجہ سے تمام خاندان میں اعلیٰ مقام رکھتے تھے۔ اور تمام خاندان میں نہایت عزیز اور محبوب تھے۔

لیکن اس باب میں شیعیت نے اس چابک دستی کے ساتھ زبیر کی بجائے عبد مناف کو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا کفیل بنا کر پیش کیا ہے۔ کہ مولانا اکبر شاہ خاں نجیب آبادی جیسا بالغ نظر مورخ، اور مولانا شبلی جیسا تجربہ کار نقاد اور وسیع النظر مورخ بھی جگہ جگہ لکھ گیا کہ شاہ تہامہ عبدالمطلب کی وفات کے بعد بنی ہاشم کی [illegible] زبیر۔

سر پر رکھتے ہیں اور حلف الفضول کی تجدید کا سہرا بھی زبیر کے سر پر باندھتے ہیں، مگر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی کفالت کی سعادت ابوطالب کے سپرد کر دیتے ہیں۔

اسی طرح مولانا شبلی لکھتے ہیں کہ ابوطالب اور عبداللہ چونکہ سگے بھائی تھے۔ اس لئے آنحضور کی کفالت ابوطالب کے سپرد کی گئی۔ دوسرے مقام پر یہی علامہ شبلی علامہ ابن قتیبہ کو ایک نامور اور مستند مصنف کہتے ہیں، اور لکھتے ہیں کہ محدثین بھی ان کے اعتماد کے قائل ہیں۔ المعارف ص۶ مگر ابن قتیبہ کی یہ تحریر نامعلوم اُن کی اور سید سلیمان ندوی کی نظر سے سیرت النبی لکھتے وقت کیوں اوجھل ہو گئی کہ فاطمہ بنت عمرو کے بطن سے عبدالمطلب کے تین بیٹے تھے، زبیر، عبداللہ اور عبد مناف (یہی بات ابن حزم نے جمہرۃ الانساب میں لکھی ہے)

ایک مستندیات ترک کر دی، اور ایک سُنی سنائی غلط بات لکھ دی۔ حالانکہ حرب فجار کے ذکر میں زبیر کے متعلق لکھتے ہیں کہ آل ہاشم کے سردار زبیر تھے۔ اور اسی صف میں جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بھی تھے۔ پھر حلف الفضول کے ضمن میں بھی لکھتے ہیں کہ زبیر بن عبدالمطلب جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا اور خاندان کے سرگروہ تھے انہوں نے یہ تجویز پیش کی تھی۔

اسی طرح شعب ابی طالب کی اصطلاح آج زبان زد خاص و عام ہے۔ اور مولانا بھی بغیر تحقیق کئے شعب ابی طالب ہی لکھتے چلے گئے۔ اصل میں یہ پہاڑ کا ایک درہ تھا جو بنو ہاشم کا موروثی تھا۔ چونکہ کفار مکہ کے مقاطعہ کے وقت اسی شعب بنی ہاشم میں تمام بنو ہاشم پناہ گزیں ہوئے تھے۔ اور اس وقت بنو ہاشم کے سردار ابوطالب تھے۔ اس لئے شعب ابی طالب مشہور ہو گیا (بلکہ مشہور کر دیا گیا) مگر افسوس کہ مولانا جیسا محقق بھی ایسی غلط فہمیوں کو دور نہ کر سکا۔ البتہ بہت بعد سید سلیمان ندوی نے سیرۃ النبی کے حاشیہ پر اس کی اصلاح کی۔ اکبر شاہ خاں بھی شعب بنی ہاشم کے نام سے اپنی تاریخ میں اس کا ذکر کرتے ہیں۔ اور شیعہ خود اسے شعب بنی ہاشم کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔ (الزہرا ص۹ مصنفہ خان بہادر اولاد حیدر فوق)

سیرت الحلبیہ کی ایک عبارت ہے کہ ابوطالب کو مالی کی ایسی تنگی تھی کہ ان کے گھر والے کھانا خواہ سب مل کر کھاتے یا جُدا جُدا کسی کا پیٹ نہ بھرتا تھا۔ لیکن جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ کھاتے تو سب سیر ہو جاتے۔ اسی قسم [illegible] ابوطالب کی کفالت کے سلسلہ میں بیان کی گئی ہیں۔ (حالانکہ اس واقعہ سے کفالت قطعاً

ثابت نہیں ہوتی۔ بلکہ ممکن ہے کہ چچا ہونے کے ناطے آپ ابوطالب کے گھر آتے جاتے رہتے ہوں، جیسا کہ بچوں کی عام عادت ہوتی ہے۔ اور وہ کھانے پر روک لیتے ہوں۔ ورنہ حضور ابوطالب کے گھر رہتے تو لازمی بات تھی کہ مستقل طور پر کھانا بھی وہیں کھاتے تو ابوطالب کے گھر والوں کو کبھی بھی فاقہ کی نوبت نہ آتی۔ اور نہ اس کہانی کی پھر کوئی ضرورت ہوتی۔ یہ کہانی تو خود یہ ثابت کر رہی ہے کہ آپ ابوطالب کے گھر نہیں رہتے تھے اسی لئے جب آپ تشریف لاتے اور ان کے ساتھ کھانا کھاتے تو اس وقت ان کا پیٹ بھی بھر جاتا تھا، جن میں نبی علیہ السلام کی کرامات کی آڑ میں ابوطالب کے مقام کو بلند کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اور بعد میں آنے والوں نے ان کو بعینہ قبول کر لیا۔ یہ سوچنے کی زحمت کسی نے گوارا نہ کی کہ سردار قبیلہ زبیر ہیں۔ ان کی غربا پروری اور اقربا نوازی کی داستانوں سے تاریخوں کے صفحات پر ہیں۔ یتیم بھتیجے کو لوریاں دیتے، اور ہاتھوں پر اچھالتے ہیں اور خوش ہوتے ہیں۔ مگر ایسے محبوب اور پیارے بھتیجے کو فاقوں کا شکار ہونے کے لئے ابوطالب کے پاس چھوڑ دیتے ہیں۔ اور پھر باپ کے حکم کی بھی پرواہ نہیں کرتے۔ جو مرتے وقت یتیم پوتے کے حق میں وہ مرد بزرگ فرما گئے تھے۔

آگے چلئے اور تاریخ کا ذرا دقت نظری سے مطالعہ کیجئے۔ اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا وہ زمانہ دیکھئے۔ جب تبلیغ کے سلسلہ میں آپ کو قریش مکہ سے اذیتیں پہنچتی ہیں۔ مگر ہمیں کسی تاریخ میں اشارۃً بھی لکھا ہوا نہیں ملتا کہ ابوطالب نے یا اس کی اولاد میں سے کسی ایک نے ایک بار بھی آپ کی معاونت یا مدد کے لئے ہاتھ بڑھایا ہو۔ ہمیں اگر نظر آتا ہے تو حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا اسم گرامی نظر آتا ہے اور یا حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کا نام چند سال بعد ابوجہل کی بدکلامی کے سلسلہ میں نظر آتا ہے۔

اس سے آگے بڑھ کر دیکھئے کہ زبیر کے مرنے کے بعد آپ کو اپنی متاہل زندگی کا خیال آیا۔ آپ نے ابوطالب کو ام ہانی رضی اللہ عنہا کے لئے پیغام بھیجا۔ مگر اس شفیق تایا نے اپنے ماموں کے بیٹے ہبیرۃ بن ابی وہب سے نکاح کر دیا اور بھتیجے کو جواب دے دیا۔ (طبقات ابن سعد ص ۱۵۲ ج ۲۔ تاریخ طبری۔ کتاب المحبر، الاصابہ)

نبی علیہ السلام نے جب اس بات کا تایا سے شکوہ کیا۔ تو اس شفیق تایا نے جو جواب دیا۔ وہ آج بھی تاریخ کے صفحات پر موجود ہے۔

بھتیجے ان لوگوں سے تو ہماری قرابتیں پہلے سے ہوتی آئی ہیں۔ اور اشراف کا میل اشراف سے ہی ہوتا ہے مگر تو تو ایک محتاج آدمی ہے۔ (تاریخ طبری۔ الاصابہ۔ طبقات ابن سعد)۔ (خود تو فقر و فاقہ میں مبتلا ہونے اور محتاج ہونے کے باوجود شریف بن رہا ہے۔ اور بھتیجے کو دائرہ شرافت سے خارج کر رہا ہے۔ ایسا کم ظرف انسان حضور کی کیا کفالت کرتا۔ اور جس نے اپنے کسی بیٹے کی بھی پرورش نہ کی ہو۔ اور تمام بچوں کو دوسروں کے ٹکڑوں پر ڈالے رکھا ہو وہ شریف ہے)

اس ایک واقعہ سے ہی اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ ابوطالب کی کفالت کی تمام روایات محض وضعی من گھڑت اور کذب و افتراء کے پلندے ہیں۔ ابوطالب کا یہی اشراف خاندانی داماد نبوت کے بعد آنحضور کی شان میں ہجو بکتا رہا۔ اور ہر غزوہ میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے مقابل آتا رہا۔ آخر فتح مکہ کے روز نجران کی طرف بھاگ گیا اور بحالت کفر کہیں مر گیا۔ حقیقت مذہب شیعہ از ص۱۴۸ تا ص۱۵۶

حکیم فیض عالم صاحب مرحوم نے جو تاریخی مواد پیش کیا ہے۔ اس سے چند امور واضح ہو کر سامنے آتے ہیں۔

۱۔ ابوطالب فقیر و محتاج تھا۔ اس کے پاس کوئی ذریعہ معاش نہ تھا۔ اور لنگڑے ہونے کے باعث تجارتی سفر کرنے پر بھی قدرت نہ رکھتا تھا۔ اس کے اہل و عیال کو کبھی پیٹ بھر کر کھانا نصیب نہیں ہوا۔ اس نے کسی مصیبت کے وقت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی مدد نہیں کی (یعنی جسمانی مدد۔ بلکہ اپنی اعانت کو زبانی اعانت تک محدود رکھا) حتیٰ کہ آپ کو رشتہ دینے سے انکار کیا۔ آپ کو فقر کا طعنہ دیا۔ اور آپ کو ہبیرہ کے مقابلہ میں غیر شریف قرار دیا۔ اور اس کا داماد ہمیشہ حضور کا دشمن رہا۔

۲۔ عبدالمطلب کے مرنے کے بعد زبیر بنو ہاشم کا سردار ہوا۔ یہ بہت بہادر، سخی، فیاض اور سرمایہ دار تھا۔ بھتیجے سے بے پناہ محبت کرتا تھا۔ حضور مختلف مقامات پر اس کے ساتھ رہے۔ اور حضور کی جوانی تک یہ زندہ رہا یعنی بیس سال کی عمر تک اور حضور اس وقت تجارت فرمانے لگے تھے۔

حکیم صاحب مرحوم نے جو جو جزئیات پیش کئے ہیں۔ اور زبیر و ابوطالب کی جو حالت بیان کی ہے۔ ہمیں اس سے قطعاً انکار نہیں۔ لیکن کسی صحیح روایت میں یہ بالصراحت کہیں نہیں پایا جاتا کہ زبیر نے آپ کی کفالت کی ہو۔ اوصاف ایک جدا شے ہیں اور نفس واقعہ کا ثبوت یا انکار ایک جداگانہ امر ہے۔ رہا یہ خیال کہ ایک

سرمایہ دار کے ہوتے ہوئے ایک فقیر کے ذمہ یتیم کی کفالت کا بار کیسے ڈالا جاسکتا ہے۔ لیکن ہم دنیا میں دیکھتے، سنتے اور پڑھتے آئے ہیں کہ بسا اوقات پیسے والے کچھ کام نہیں آتے۔ بلکہ غریب کام آجاتے ہیں۔ اگر زبیر واقعتاً ایسے ہی مجسمۂ اوصاف تھے تو عبدالمطلب کے مرنے کے بعد جہاں حضور کی کفالت کا مسئلہ پیش نظر تھا۔ وہاں حمزہؓ و عباسؓ بھی یتیم ہوئے تھے۔ حمزہؓ آپ سے صرف چھ ماہ اور عباسؓ ڈیڑھ سال بڑے تھے۔ تو کیا زبیر نے ان کی کفالت کی؟

ہم جب اس نظر سے تاریخ کا مطالعہ کرتے ہیں تاکہ ذہن کسی نتیجہ پر پہنچ سکے تو آج تک ہمیں کسی تاریخ نساب کی کتاب میں یہ نظر نہیں آیا کہ عباسؓ کی پرورش فلاں شخص نے کی۔ لیکن حضرت حمزہؓ کے سلسلہ میں بن حزم جمہرۃ الانساب میں لکھتے ہیں کہ ان کی پرورش ان کی نانی نے کی جو حضور کی بھی نانی تھیں۔

یہ اس امر کا ثبوت ہے کہ زبیر اور ابولہب جیسے سرمایہ داروں نے اپنے بھائی کی پرورش بھی گوارا نہیں اور جو لوگ اپنے بھائی کی پرورش نہ کرسکیں۔ وہ بھتیجے کی پرورش کیسے کریں گے؟ کسی وقت خونی نسبت کا بش آجانا یا بظاہر محبت جتانا اور شے ہے اور دس بارہ سال کی ذمہ داری اٹھانا ایک جدا شے ہے۔

اسی لئے آج کل ایک نیا تخیل ابھر کر سامنے آرہا ہے اور وہ یہ کہ کسی نے بھی آپ کی کفالت نہیں۔ لیکن ایسی صورت میں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آپ نے زندگی کے دس بارہ سال پھر کیسے گزارے۔ اور ں کے سہارے زندگی کے یہ دن پورے کئے۔

اس سلسلہ میں شاہ بلیغ الدین صاحب کا دعویٰ یہ ہے کہ چونکہ آپ کے والد ایک تاجر تھے۔ اور بہت بڑے سرمایہ دار تھے۔ اور انہوں نے اتنا ترکہ چھوڑا تھا کہ آپ نے اس کے بل بوتے پر عیش کے ساتھ اپنی زندگی کا یہ وقت گزارا لیکن اس تخیل پر بھی متعدد اعتراضات واقع ہوتے ہیں۔

۱۔ عبداللہ نے اپنے ترکہ میں ایک مکان اور کچھ بکریاں چھوڑی تھیں۔ جو از روئے تاریخ آپ کو ملی تھیں۔ عبداللہ نے کوئی بڑا سرمایہ نہیں چھوڑا، اور نہ وہ اپنے وقت کے ویلکا یا با دانی تھے۔

۲۔ اگر بالفرض اتنی دولت چھوڑی بھی تھی تو اتنی کم سنی کی عمر میں یہ کہاں احساس ہوتا ہے کہ اس دولت کو کیسے خرچ کرنا ہے۔ اور کس طرح سنبھال کر رکھنا ہے۔ پھر دورِ جاہلیت میں وراثت کے سلسلہ میں جو قانون رائج

تھا۔ وہ سراسر اس تخیل کی نفی کرتا ہے ۔اس قانون وراثت کو مفسر قرطبی نے ایک آیت کا شان نزول بیان کرتے ہوئے لکھا ہے ۔ وہ لکھتے ہیں۔

کہ جب حضرت اوس رضؓ بن ثابت الانصاری کا انتقال ہوا۔ تو انہوں نے ایک بیوی چھوڑی جس کا نام ام کحہؓ تھا۔ اور تین بیٹیاں چھوڑیں۔ حضرت اوسؓ کے چچازاد بھائی جن کے نام حضرت اوسؓ نے وصیت کی تھی۔ جن کا نام سویدؓ اور عرفجہؓ تھا۔ انہوں نے تمام مال پر قبضہ کرلیا۔ اور بھتیجیوں کو کچھ نہیں دیا۔ کیونکہ اصول یہ تھا۔

وکانوا فی الجاھلیۃ لا یورثون	زمانۂ جاہلیت میں اہل عرب نہ تو عورتوں کو
النساء ولا الصغیر وان	وراثت دیتے تھے۔ اور نہ چھوٹے بچے کو
کان ذکرا۔	خواہ وہ لڑکا ہی کیوں نہ ہو۔

یہ لوگ اس کی دلیل میں اپنا یہ قانون پیش کیا کرتے تھے۔

لا یعطی الامن قاتل علی	مال وراثت اس شخص کے علاوہ کسی کو نہیں
ظھور الخیل، وطاعن بالرمح ؛	دیا جا سکتا۔ جو گھوڑے کی پشت پر سوار ہو
وضارب بالسیف وحاز الغنیمۃ	کر جنگ کرے۔ نیزے سے کسی کو زخمی کرے
قرطبی ص ۱۶۱۲ ج ۲ -	تلوار سے لڑے اور مال غنیمت حاصل کرے۔

ام کحہؓ حضور کی خدمت میں حاضر ہوئیں، اور تمام وقوعہ عرض کیا۔ آپ نے ان دونوں کو طلب کیا۔ ان سے سوال کیا۔ تو انہوں نے جواب میں عرض کیا۔

ولدھا لا یرکب فرسا،	اس کا لڑکا نہ گھوڑے پر سوار ہو سکتا ہے۔ نہ
ولا یحمل کلا، ولا	کوئی بار اٹھا سکتا ہے۔ اور نہ کسی دشمن کو
ینکا عدوا۔	مقابلہ کر کے ذلیل کر سکتا ہے۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔ اس وقت اس قبضہ سے رکو، جب تک اللہ تعالیٰ کا کوئی حکم نہ آئے۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔

لِلرِّجَالِ نَصِيبٌ مِّمَّا تَرَكَ	ماں باپ اور اقرباء جو کچھ چھوڑ کریں اس

الْوَالِدَانِ وَالْاَقْرَبُوْنَ وَلِلنِّسَاءِ	میں مردوں کا بھی حصہ ہے۔ اور ماں باپ اور
نَصِيْبٌ مِّمَّا تَرَكَ الْوَالِدَانِ	رشتہ دار جو کچھ چھوڑا کریں اس میں عورتوں کا بھی
وَالْاَقْرَبُوْنَ مِمَّا قَلَّ مِنْهُ اَوْ كَثُرَ	حصہ ہے۔ یہ مال تھوڑا ہو یا زیادہ۔ ہر ایک کا حصہ
نَصِيْبًا مَّفْرُوْضًا ○ النساء آیت ۷	متعین کردیا گیا ہے۔

سیوطی۔ لباب النقول فی اسباب النزول میں اسی واقعہ کو ابن جریر کے حوالہ سے سدی سے نقل کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

کان اهل الجاهلیة لا یورثون	اہل جاہلیت نہ تو لڑکی کو ورثہ دیدیتے تھے۔
الجواری ولا الضعفاء من الغلمان	اور نہ کمزور لڑکے کو۔ کسی کی اولاد میں سے وہ
لا یرث الرجل من ولده الامن	ہی شخص وارث ہو سکتا تھا جو جنگ وجدل کی
اطاق القتال۔	طاقت رکھتا ہو۔

لباب النقول مع جلالین مصری ص ۶۹

اس روایت میں اس کی بھی تشریح ہے کہ مرنے والے کا نام عبدالرحمانؓ تھا جو حسانؓ بن ثابت کے بھائی تھے۔
ابوالشیخ اور ابن حیان نے کتاب الفرائض میں تفسیر ابن عباس کے حوالہ سے ابن عباسؓ کا یہ قول نقل کیا ہے۔

کان اهل الجاهلیة لا یورثون	اہل جاہلیت نہ تو لڑکیوں کو ترکہ دیتے تھے۔
البنات ولا الصغار الذکور۔	اور نہ چھوٹے لڑکوں کو۔

لباب النقول مع جلالین مصری ص ۶۹

پھر کہتے ہیں کہ اوسؓ بن ثابت کا انتقال ہوا۔ اور انہوں نے دو بیٹیاں اور ایک چھوٹا بچہ چھوڑا۔ اوسؓ کے چچا زاد بھائی خالدؓ اور عرفطہؓ نے اوسؓ کے چھوڑے ہوئے مال پر قبضہ کرلیا۔

ان حوالہ جات سے یہ بات تو ثابت ہوگئی کہ عبداللہ نے اگر کوئی سرمایہ چھوڑا تھا تو وہ کسی ایسے ہی شخص کے قبضہ میں گیا جو لڑنے کی طاقت رکھتا ہو۔ اس صورت میں جہاں حضور اپنے باپ کے مال سے محروم رہے۔ وہاں ابوطالب اپنے لنگڑے ہونے کے باعث اور حمزہؓ و عباسؓ بچہ ہونے کی وجہ سے محروم رہے۔ اس طرح

اس مال پر صرف دو ہی شخصوں نے قبضہ کیا ہوگا۔ ابو لہب یا زبیر بن عبدالمطلب۔

حضرت اوسؓ کے واقعہ سے اشارۃً یہ بات بھی ثابت ہوئی کہ اہل عرب عام طور پر مکان پر قبضہ نہیں کیا کرتے تھے۔ ورنہ ام کحہ رہائش کا مسئلہ بھی پیش کرتیں۔ لہٰذا عبداللہ کا چھوڑا ہوا مکان حضور کو ملا۔

اس امر کا ثبوت کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی کفالت کسی نے نہیں کی۔ اور نہ آپ کی ذات اقدس پر کسی کا احسان ہے۔ قرآن کا یہ فرمان ہے۔

اَلَمْ يَجِدْكَ يَتِيْمًا فَاٰوٰى ۝ کیا اللہ نے آپ کو یتیم نہیں پایا تو پھر آپ کو ٹھکانہ دیا۔

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے ٹھکانہ دینے کا ذکر فرمایا۔ کفالت کا ذکر نہیں کیا۔ اور ٹھکانہ جہاں ابوطالب کا گھر ہو سکتا ہے، وہاں زبیر کا گھر بھی ہو سکتا ہے۔ اور اپنے باپ کا گھر بھی۔ لیکن طرز بیاں سے یہ ظاہر ہو رہا ہے کہ یہ ٹھکانہ اللہ تعالیٰ نے دیا تھا۔ یعنی یہ کسی غیر کی ملکیت نہ تھا۔

اس موقعہ پر مفسر قرطبی نے جعفر بن محمد کا ایک قول نقل کیا ہے کہ اُن سے دریافت کیا گیا کہ اس کی کیا وجہ کہ اللہ تعالیٰ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو باپ اور ماں دونوں کی جانب سے یتیم ولیسیر کیا۔ انہوں نے جواب دیا۔

لئلا یکون لمخلوق علیہ حق۔ قرطبی ج۸ ص۱۸۶ تاکہ آپ کی ذات پر مخلوق میں سے کسی کا حق نہ ہو

جب اللہ تعالیٰ نے یہ گوارا نہ کیا کہ آپ پر آپ کے ماں باپ کا احسان ہو تو چچاؤں کا احسان کیسے تسلیم کیا جا سکتا ہے۔ ان الفاظ کے ذریعہ جعفر بن محمد نے اس بات کو قبول کر لیا ہے۔ کہ ان کے پڑدادا ابوطالب کا حضور کی ذات پر کوئی احسان نہیں۔

اب رہا یہ تخیل کہ آپ کی پرورش زبیر نے کی اور آپ اس طرح عیش کے ساتھ زندگی گزارتے رہے۔ یہ آپ کے والد نے اتنا سرمایہ چھوڑا تھا۔ اور وہ آپ کو حاصل بھی ہو گیا تھا۔ اور آپ اس کے بل بوتے پر آرام کی زندگی گزارتے رہے تو قرآن اس کی بھی تردید کر رہا ہے۔ آگے ارشاد ہوتا ہے۔

وَوَجَدَكَ عَآئِلًا فَاَغْنٰى ۝ اور اللہ نے آپ کو محتاج پایا تو غنی کیا۔

قرطبی اس کی تشریح کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

اے فقیرا لا مال لك اے فاغناك	یعنی آپ فقیر تھے آپ کے پاس کوئی مال
بخدیجة رضی اللہ عنہا یقال	نہ تھا۔ تو آپ کو حضرت خدیجہؓ کے ذریعہ غنی
عال الرجل یعیل عیلۃ اذا افتقر	کیا۔ عربی میں عال، یعیل، عیلہ اس وقت بولا
قال احیحۃ بن الجلاح ۔	جاتا ہے جب انسان فقر میں مبتلا ہو۔ احیحہ بن
فما یدری الفقیر متی غناہ،	الجلاح کا شعر ہے۔ کوئی فقیر نہیں جانتا کہ اسے
وما یدری الغنی متی یعیل ۔	غنا کب حاصل ہوگا۔ اور کوئی غنی نہیں جانتا کہ
قرطبی ص۱۸۹، ج ۸	وہ فقیر کب ہو جائے گا۔

قرآن اس امر کی شہادت دے رہا ہے کہ آپ پر ایسا وقت بھی گزرا ہے کہ آپ نے تنگ دستی اور فقر و فاقہ میں بھی وقت گزار رہا ہے۔ اور یہ دور اس وقت تک رہا ہے جب تک آپ نے حضرت خدیجہؓ کے مال سے تجارت شروع نہیں فرمادی۔ گویا عبدالمطلب کی وفات کے بعد آپ تنگ دستی میں مبتلا رہے۔ اور زبیر جیسے سرمایہ دار نے آپ کی کوئی مدد نہیں کی۔ اور نہ آپ کے پاس باپ کا چھوڑا ہوا اتنا مال تھا کہ جس پر آپ گزر اوقات کر سکتے۔ یا تو آپ کے باپ نے مال چھوڑا نہیں۔ یا آپ کے سرمایہ دار چچا ہضم کر گئے۔ لہٰذا اب دو ہی صورتیں ممکن ہیں۔

۱۔ آپ کی پرورش اور کفالت ابوطالب نے کی لیکن اس کا غلط ہونا تو ہم اوپر ثابت کر چکے ہیں۔

۲۔ آپ نے کسی کا احسان اٹھانا گوارا نہیں کیا۔ اور اپنا پیٹ پالنے کا ذریعہ خود پیدا کیا۔ لیکن آخر وہ ذریعہ کیا تھا۔ تو ہمیں صحیح بخاری کتاب الاجارہ میں حضرت ابوہریرہؓ سے یہ حدیث ملتی ہے کہ آپ نے یہ ارشاد فرمایا کہ کوئی نبی ایسا نہیں گزرا جس نے بکریاں نہ چرائی ہوں۔ صحابہ نے دریافت کیا اور یا رسول اللہ کیا آپ نے بھی؟

قال نعم کنت ارعاھا لاھل	آپ نے فرمایا ہاں۔ میں اہل مکہ کی سکوں
مکۃ علی قراریط۔ بخاری ص۳۰، ج ۱	کے عوض بکریاں چرایا کرتا تھا۔

اس حدیث سے یہ بات ثابت ہوگئی کہ آپ اہل مکہ کی بطور معاوضہ بکریاں چراتے اور اس پر اپنی گزر اوقات کرتے۔ لیکن متاخرین علماء میں سے وہ حضرات جن کے ذہنوں پر ابوطالب کے سلسلہ کی فرضی روایات چھائی

ہوئی تھیں۔انہوں نے اس حدیث کا یہ جواب دینے کی کوشش کی ہے کہ قراریط سے مراد سکے نہیں۔یہ ایک جگہ کا نام ہے۔لیکن اول تو امام بخاری اسے اُجرت کے بیان میں لے کر آئے ہیں جس سے اس دھاندلی کا رد ہوجاتا ہے۔دوئم پھر اہل مکہ کی بکریاں چرانے کا کیا سوال تھا۔آپ اپنی ذاتی بکریوں کا ذکر نہیں فرما رہے ہیں ۔اہل مکہ کی بکریوں کا ذکر کر رہے ہیں۔اگر پھر بھی یہ کوئی کہتا ہے کہ آپ کی کفالت ابوطالب نے کی تو میرا جواب یہ ہوگا کہ ہاں ،لیکن آپ سے اہل مکہ کی بکریاں زبردستی چرواکر اپنا پیٹ بھرتا رہا۔اسی حدیث کو دیکھتے ہوئے بعض حضرات تو یہ بھی لکھ گئے کہ آپ بکراریاں چراکر جہاں اپنی گزر اوقات کرتے رہے۔ وہاں ابوطالب اور اس کے بچوں کا پیٹ بھی بھرتے رہے۔اس طرح ابوطالب پر حضور کا احسان ہوگا۔نہ کہ حضور پر ابوطالب کا۔اور ہمارا مقصود بھی یہی ہے۔بلکہ اس کی اس طرح سے بھی تائید ہوتی ہے کہ حضرت علیؓ کی پیدائش کے ایک روز بعد آپ نے اپنے چچا حضرت عباسؓ سے فرمایا۔چچا آپ تو جانتے ہیں کہ میرا چچا ابوطالب تنگدست ہے۔کیوں نہ ہم اس سے ایک ایک بیٹا لیکر اس بیٹے کی ذمہ داری اپنے سر لے لیں۔عباسؓ اس پر تیار ہوگئے۔اور انہوں نے جعفر کو لے لیا۔اور حضور نے علیؓ کو۔اور یہ وہ وقت تھا جب حضور کی شادی ہوچکی تھی۔اور آپ کا بار خدیجہؓ اٹھا رہی تھیں۔ایسی صورت میں آپ چچا کے ساتھ اس کے علاوہ کوئی اور سلوک نہ کرسکتے تھے۔شادی سے قبل تو ابوطالب اور اس کی اولاد کی ذمہ داری آپ نے خود اٹھا رکھی تھی۔اب آپ نے اس کا یہ ذریعہ تلاش کیا۔بقیہ دو بیٹے طالب اور عقیل اس وقت خود جوان تھے۔اس طرح ابوطالب پر صرف بیوی کی ذمہ داری رہ گئی باقی ذمہ داریوں سے وہ سبکدوش ہوگیا۔ہمارے مورخین کو چاہیئے کہ اب وہ تاریخ میں یہ تلاش نہ کریں کہ حضور کا کفیل کون تھا۔بلکہ یہ تلاش کریں کہ ابوطالب اور اس کے دو بیٹوں عقیل اور طالب کا کفیل کون تھا؟اگر وہ ایسا کریں گے تو بہت بڑا تحقیقی کارنامہ انجام دیں گے۔

بحیرا راہب کی داستان

ان مشہور عام مذہبی داستانوں میں ایک بحیرا نامی راہب کی داستان بھی ہے، جو تمام کتب تاریخ و سیر میں مختلف انداز میں کمی بیشی کے ساتھ پائی جاتی ہے۔ اتفاق سے یہ قصہ حدیث کی مشہور و معروف کتاب ترمذی میں بھی پایا جاتا ہے۔ جس کے سبب علمائے کرام نے اسے ایمانیات کا درجہ دے دیا۔ لیکن ترمذی کی روایت میں چند ایسے امور بھی آگئے ہیں جو قطعاً خلاف عقل ہیں۔ جس کے باعث متعدد چوٹی کے علماء نے اس سلسلہ میں قلابازیاں کھائیں، حتیٰ کہ حافظ ابن حجر نے نفس واقعہ کو تو صحیح قرار دیا۔ لیکن کچھ اجزاء کو باطل تسلیم کیا۔ اور کچھ محدثین نے سرے سے اس واقعہ کا انکار کیا۔

ہم سب سے پہلے اس قصہ کو سیرت کی ایک مشہور کتاب اصح السیر سے نقل کرتے ہیں جو حکیم عبدالرؤف دانا پوری کی تصنیف ہے۔ حکیم صاحب اپنی کتاب کے ص۵۱ پر رقم طراز ہیں۔

حضور کی عمر جب بارہ سال دو ماہ ہوئی۔ اس وقت خواجہ ابوطالب نے تجارت کی غرض سے شام کا سفر کیا۔ اور حضور کو بھی اپنے ساتھ لے گئے۔ جب مقام تیما میں پہنچے تو وہاں بحیرا راہب ملا۔ بعض روایتوں میں ہے کہ یہ یہود عالم تھا۔ اور بعض روایتوں میں ہے کہ یہ نصرانی عالم تھا۔ واللہ اعلم۔ اس نے کتب قدیمہ کی پیشین گوئیوں کے مطابق آپ میں نبوت کی کچھ علامات دیکھیں، اور خواجہ ابوطالب سے پوچھا کہ یہ لڑکا جو تمہارے ساتھ ہے کون ہے؟ انہوں نے کہا کہ یہ میرا بھتیجا ہے۔ بحیرا نے کہا کہ کیا آپ کو اس کے ساتھ محبت ہے؟ انہوں نے کہا بے شک۔ بحیرا نے کہا کہ میں آپ کو ایک بات بتاتا ہوں بخدا آپ انہیں اگر شام لے گئے تو یہود ان کے دشمن ہو جائیں گے۔ اور قتل کرنا چاہیں گے۔ آپ ان کو واپس لے جایئے۔ چنانچہ خواجہ ابوطالب وہیں سے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کو ساتھ لے کر واپس چلے آئے۔ بعض روایتوں میں ہے کہ آپ کو کسی غلام کے ساتھ واپس کیا۔ اصح السیر ص۵۱

حکیم عبدالرؤف صاحب نے جہاں واقعہ کو انتہائی اختصار کے ساتھ بیان کیا۔ وہاں اپنی جانب سے حتی الامکان یہ کوشش بھی کی کہ اس واقعہ میں جو خرافات پائی جاتی ہیں اور جو جو اس واقعہ پر اعتراضات وارد ہوتے ہیں۔ اُن کا حتی الامکان دفاع کیا جائے۔ اور اس کی انجام دہی کے لئے انہوں نے اصل واقعہ میں دل کھول کر تحریف کی۔ اور دیانت و امانت کے تمام اصولوں کو خیرباد کہہ دیا۔ کیونکہ اگر وہ ایسا نہ کرتے تو عبد مناف (ابوطالب) کی خواجگیت کیسے پروان چڑھتی۔ کیونکہ وہ امام الاولیاء کے والد محترم ہیں۔ اسی لئے صوفیاء شیعوں کی ہمنوائی میں اُن کی خواجگیت کی کہانیاں تراشتے رہتے ہیں۔

ہمارے نزدیک اصل مسئلہ یہ ہے کہ تمام محدثین، مفسرین اور تمام فقہائے اہل سنت اس پر متفق ہیں کہ ابوطالب کافر مرا اور جہنم رسید ہوا۔ جب کہ مجوسی طبقہ انہیں مقام نبوت تک پہنچا دیتا ہے۔ صوفیاء جو ہمیشہ کشتیوں میں پاؤں رکھے رہے، اور اپنے عقائد و نظریات میں ہمیشہ شیعوں کی کاسہ گدائی کرتے رہے۔ اور فقہی مسائل میں سنیت کا ڈھونگ رچاتے رہے۔ ان کے لئے امام الاولیاء کے باپ کو کافر کہنا ایک دشوار عمل ہے۔ اسی لئے عبدالحق محدث دہلوی نے اسے مؤمن قرار دیا۔ اور حکیم عبدالرؤف داناپوری قادری نے ہر جگہ اس کے نام کے ساتھ خواجہ کے خطاب کا اضافہ کیا۔ کیونکہ وہ تمام خواجگان کا جد امجد تھا۔ حالانکہ یہ لفظ خواجہ فارسی ہے۔ اور کوئی عرب اس لفظ کے معنی سے شناسا نہیں۔ اور نہ پانچویں صدی تک ہم نے کہیں کسی کے ساتھ خواجہ کا لفظ دیکھا۔ ہاں ہمیں مغلیہ دور میں محلات شاہی میں خواجہ سرا ضرور نظر آتے ہیں۔ جو خدام کی طرح ہوشیار باش کی آوازیں لگاتے پھرتے تھے۔ کیونکہ احادیث کی رُو سے ابوطالب کو جہنم کے کنارے پر آگ کے جوتے پہنا کر کھڑا کر دیا جائے گا۔ ممکن ہے کہ بقیہ جہنمی اسے اپنا خواجہ سرا بنا کر کھڑا کر دیں۔ اور اس کے ذمہ یہ کام سپرد کر دیں کہ کسی جنتی کو ادھر نہ آنے دینا۔ اور جو خواجہ نظر آئے اسے بتا دینا کہ خواجگان کا اصل مقام یہ ہے۔

اب قاری احمد پیلی بھیتی قادری کی بھی سنئے۔ وہ اپنی کتاب تاریخ مسلمانان عالم میں لکھتے ہیں۔

ابوطالب کی آخری منزل وہ جگہ تھی جسے بصریٰ کہتے تھے۔ آج کل اس جگہ کو حوران کہتے ہیں عرب سے شام کو آنے والے تجارتی قافلے اسی شہر بصریٰ میں ٹھہرے ہوتے تھے۔ قیام گاہ سے تھوڑے فاصلہ

بزبحیرا راہب کی مشہور خانقاہ تھی۔ بحیرا دین مسیح کا بہت بڑا متقی (بلکہ پہنچا ہوا ولی) اور عبادت گزار شخص تھا۔ توریت انجیل اور دیگر آسمانی کتابیں اس کے ذہن میں محفوظ تھیں۔ وہ اچھی طرح جانتا تھا۔ کہ نبی آخرالزماں کے پیدا ہونے کی علامتیں کیا ہیں۔ وہ اکثر قریش کے تجارتی قافلوں کو خانقاہ سے دیکھنے کے لئے آتا تھا۔ کہ یہ معلوم کر سکے کہ نبی آخرالزماں اس میں موجود ہیں یا نہیں۔

اتفاق کی بات کہ ابوطالب کا قافلہ گھاٹی سے اُتر کر قیام کرنا چاہتا ہی تھا۔ کہ بحیرا کی نظریں پڑ گئیں۔ اور وہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ ایک ابر کا ٹکڑا قافلہ کے ایک بچہ پر سایہ کئے ہوئے ہے۔ اور تمام حجر و شجر سجدے کے لئے جُھک رہے ہیں۔ اور السلام علیک یا رسول اللہ کہہ رہے ہیں۔ ابھی قافلہ والے اچھی طرح سے دم بھی نہ لینے پائے تھے۔ کہ بحیرا خانقاہ سے ابوطالب کے قریب آگیا۔ اور آنحضرت کا ہاتھ پکڑ کر کہنے لگا کہ یہ بچہ سید العالمین اور رسول پروردگار ہے۔

مؤرخین کا بیان ہے کہ بحیرا نے اہل قافلہ کی اپنی خانقاہ میں دعوت بھی کی تھی۔ جب سب لوگ بیٹھ گئے تو وہ آنحضرت کو بڑے غور سے دیکھتا رہا۔ کھانے سے فارغ ہو کر سب کو رخصت کر دیا۔ مگر ابوطالب اور آنحضرت کو روک لیا۔ اور ابوطالب سے آنحضرت کے متعلق بہت سے سوالات کئے۔ خواب و بیداری کے حالات پوچھے، رشتہ دریافت کیا۔ ابوطالب نے والد کی وفات کا حال بتایا۔ شانہ مبارک کو دیکھا۔ اور مہر نبوت کو کتب سماویہ کے مطابق پا کر ابوطالب سے کہا کہ میں آپ کو ہمدردانہ مشورہ دیتا ہوں کہ آپ جلدی واپس گھر چلے جائیں۔ یہود کو نبی عربی سے سخت عداوت ہے۔ مجھے اُن کی طرف سے اندیشہ ہے کہ وہ ان کو دیکھیں گے تو ضرور نقصان پہنچانے کی تدبیریں کریں گے۔ ابوطالب نے بحیرا کے مشورے کو قبول کیا۔ اور بصریٰ ہی میں خرید و فروخت کر کے واپس آگئے۔

طبری وغیرہ کا بیان ہے کہ بحیرا نے آپ کے ہاتھ چومے، اور نبوت کی تصدیق کی۔ یعنی قبل از نبوت آپ پر ایمان لائے۔ ایک روایت یہ بھی ہے کہ بحیرا جس وقت آپ کو خانقاہ میں دیکھ رہا تھا۔ اور ابوطالب سے کہہ رہا تھا کہ ان کو یہود سے بچانا۔ اس وقت سات رومی عیسائی آڑ میں کھڑے ہوتے سُن رہے تھے۔ بحیرا نے اُن سے معلوم کیا کہ تم لوگ یہاں کیوں آئے ہو، تو انہوں نے کہا کہ ہم کو اطلاع ملی تھی کہ نبی عربی اس ماہ میں یہاں

آنے والے ہیں۔ بحیرا نے کئی دن تک ان کو اپنی خانقاہ ہی میں ٹھہراتے رکھا۔ تاریخ مسلمانانِ عالم ص۱۰۹ ج ۲

ان ہر دو مصنفین نے واقعہ کے آخری جزیہ کو قطعاً تبدیل کر دیا ہے۔ ورنہ متقدمین مؤرخین کا بیان تو یہ ہے کہ ابو طالب نے آپ کو بلال اور ابو بکر کے ساتھ واپس کر دیا۔ اور بعض روایات میں ہے کہ ابو بکر نے بلال کے ساتھ واپس کر دیا۔

اصل یہی وہ جملہ ہے۔ جس سے اس واقعہ کی تمام عمارت منہدم ہوتی ہے۔ اور شبلی مرحوم نے سیرت النبی میں اسی پر کاری وار کیا تھا۔ لہٰذا بعد کے اردو مصنفین نے اس جملہ کو صاف اڑا دیا۔ حالانکہ دیانت و صداقت کا تقاضا تو یہ تھا کہ ایک غلط شے کو غلط تسلیم کر لیتے۔ لیکن زمیں جنبد زماں جنبد نہ جنبد گل محمد خاں کے مصداق کسی تصوف کے مریض سے یہ بات کیسے ممکن ہو سکتی تھی۔ کیونکہ پھر ابو طالب کی خواجگیت، کفالت اور سیادت سب ہوا ہو جاتی ہے۔

اصل جملہ اور اصل واقعہ پر تو ہم علامہ شبلی مرحوم اور علامہ سید سلیمان ندوی مرحوم وغیرہ کی زبانی بحث کریں گے۔ انہوں نے جو کچھ بحث کی ہے اور انہوں نے جو اعتراضات کئے ہیں اُن کے علاوہ ہمارے ذہن میں مزید نئے سوالات پیدا ہو رہے ہیں۔ لہٰذا ہم پہلے انہیں پیش کرنا چاہتے ہیں۔

۱۔ شام میں حضور کی زندگی کو یہودیوں سے کیا خطرہ پیدا ہو سکتا تھا؟ اس لئے کہ شام میں اس وقت عیسائیوں کی حکومت تھی۔ اور یہودی وہاں غلامانہ زندگی بسر کر رہے تھے۔ اگر کوئی خطرہ پیدا ہو سکتا تھا تو وہ عیسائیوں سے ہو سکتا تھا۔ اور قاری احمد صاحب نے بحیرا کے ذریعہ خطرہ یہودیوں کا بیان کیا۔ اور تلاش کے لئے عیسائی کو کھینچ لائے، یہ عجیب دوغلی پالیسی ہے۔ پھر یہ دونوں مصنفین غزوۂ موتہ کے حالات میں لکھتے ہیں کہ حضور نے دعوتِ اسلام کے لئے خط دے کر حارث بن عمیر ازدی کو حاکم بصری کی جانب روانہ کیا۔ لیکن اس عیسائی حاکم نے انہیں شہید کر دیا۔ جس کی وجہ سے غزوۂ موتہ واقع ہوا۔ اور صحیح بخاری کی حدیث سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے۔ تو اس حال میں خطرہ یہودیوں کی جانب سے ہوا یا عیسائیوں کی طرف سے گویا یہ بات تو سراسر جھوٹ ہوئی۔

اصل امر یہ ہے کہ جب ان حضرات نے بحیرا کو ایک متقی اور عابد ولی تصور کرتے ہوئے اسے پہلا مؤمن تسلیم کر لیا تھا تو اب یہ کیسے ممکن تھا کہ اس کی قوم کا دفاع نہ کیا جائے۔ لہٰذا یہ الزام یہودیوں کے سر تھوپا لیکن

ابھی ایک ہی لائن تحریر کی تھی کہ اپنی اس تحریکاری کو قطعاً بھول بیٹھے۔ اور دوسروں کا شکار کرتے کرتے خود شکار ہو گئے۔

۲۔ اگر یہ مان لیا جائے کہ [illegible] یہودیوں سے خطرہ تھا تو آپ نے تجارت کے سلسلہ میں حضرت خدیجہؓ کا مال لے کر شام کے متعدد سفر کئے جن میں سے ایک سفر کا ذکر آگے آ رہا ہے۔ آخر عالم شباب میں یہ خطرات یکایک کیسے رفع ہو گئے؟ اور وہ تمام علامات نبوت کہاں چلی گئیں جو عیسائی دنیا کا ایک ایک بچہ جانتا تھا؟

۳۔ تمام مورخین اس پر متفق ہیں کہ عبد مناف کا کوئی ذریعہ معاش نہ تھا۔ اور پاؤں سے لنگڑے ہونے کے باعث سفر وغیرہ سے بھی معذور تھا گھر پر ہی عطر بنا کر بیچ لیا کرتا تھا۔ اس کی تمام زندگی فقر و فاقہ میں گزری حتیٰ کہ اپنی [illegible] کو بھی دوسروں کے ٹکڑوں پر چھوڑ دیا ایسی صورت میں شام کا یہ تجارتی سفر کیا اس لئے تو وضع نہیں کیا گیا کہ ابوطالب کی خواجگیت ثابت کی جائے۔ اور اسے مومن ثابت کرنے کے لئے راہ ہموار کی جائے۔

۴۔ اگر ابوطالب تاجر تھا۔ اور تجارت کی غرض سے اتنے طویل طویل سفر کیا کرتا تھا۔ تو پھر اپنی اولاد کو دوسروں کے ٹکڑوں پر کیوں چھوڑا؟ فیا للعجب۔

۵۔ جب بحیرا راہب نے آپ کی نبوت کو قبول کر لیا۔ اور قبل از نبوت ہی آپ پر ایمان لے آیا تو گویا سب سے پہلا صاحب ایمان وہی ہوا۔ تو حضرت ابوبکر صدیقؓ، حضرت خدیجہؓ اور حضرت زید بن حارثہؓ اور دیگر سابقین اسلام کس درجہ میں شامل ہوتے ہیں۔ کیا یہ ان صحابہ کرام پر مخفی تبرا نہیں ہے؟ کیونکہ آگے بھی ایک اور عیسائی ولی کا تذکرہ آ رہا ہے۔ کاش کوئی عالم اور مورخ اس بات کو سوچے کہ کس عمدہ طریقے سے سابقین اولین کو عیسائیوں سے بھی پیچھے دھکیل دیا گیا ہے۔ استغفر اللہ ربی من کل ذنب واتوب الیہ۔

۶۔ جب راہ میں شجر و حجر آپ کو سجدہ کر رہے تھے۔ بادل سائے کر رہے تھے۔ اور درخت سایوں کے لئے جھک رہے تھے۔ تو سوال یہ ہے کہ یہ تمام امور سب اہل قافلہ نے اپنے سامنے ہوتے ہوئے دیکھے تھے۔ یا صرف اس واقعہ کے راوی کو اپنی تخلیق سے قبل نظر آتے تھے، اگر سب نے دیکھے تھے تو بعد از نبوت ان میں سے کتنے افراد ایمان لائے۔ اور کون کون اس قافلہ میں شریک تھا؟ اور تو کوئی کیا ایمان لاتا جب وہی شخص ایمان نہ لایا جس کے بھتیجے کے لئے یہ تمام کرامات ظاہر ہو رہی تھیں۔ اور اگر بحیرا اور ابوطالب کے علاوہ ان واقعات کو کسی اور نے [illegible] دیکھا تھا تو ابوطالب تو کافر مرا۔ اور بحیرا کا اس واقعہ کے بعد پوری تاریخ اسلام میں کہیں تذکرہ

نظر نہیں آتا۔ تو پھر یہ واقعہ راویوں سے کس نے بیان کیا؟

یہ تو وہ چند اعتراضات ہیں جو عقلی طور پر پیدا ہو رہے تھے۔ لیکن علامہ شبلی مرحوم کو اس روایت کی سند پر بھی کچھ اعتراضات ہیں۔ لیکن ہم یہ اعتراضات پیش کرنے سے قبل ضروری تصور کرتے ہیں کہ ترمذی کی روایت کو بھی قارئین کے سامنے پیش کر دیا جائے۔

ترمذی نے حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ سے نقل کیا ہے کہ ابو طالب قریش کے سرداروں کے ساتھ شام گیا۔ آپ کے ساتھ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم بھی تھے۔ یہ لوگ جب راہب کے قریب پہنچے۔ تو اس جگہ ان لوگوں نے منزل کی۔ اور اپنے کجاوے کھول دیئے۔ راہب انہیں دیکھ کر نیچے اترا۔ اس سے قبل یہ لوگ جب اُدھر سے گزرتے تو وہ قطعاً نیچے نہ اترتا اور نہ ان لوگوں کی جانب کوئی توجہ دیتا۔ یہ لوگ تو کجاوے کھولنے میں مشغول تھے۔ اور وہ راہب ان کے درمیان سے گزرتا ہوا حضور تک پہنچا۔ اور آپ کا ہاتھ تھام کر بولا۔ یہ سید العالمین ہیں۔ رب العالمین کے رسول ہیں۔ انہیں اللہ تعالیٰ رحمت للعالمین بنا کر بھیجے گا۔ سرداران قریش نے استفسار کیا تمہیں یہ بات کیسے معلوم ہوئی؟ کہنے لگا جب تم گھاٹی سے اتر رہے تھے تو کوئی پتھر اور کوئی درخت ایسا نہ تھا جو سجدہ میں نہ گر گیا ہو۔ اور یہ چیزیں نبی کے علاوہ کسی کو سجدہ نہیں کرتیں۔ اور میں ختم نبوت کو پہچانتا ہوں جو سیب کی طرح مونڈھے پر ہو گی۔ پھر واپس لوٹ گیا۔ اور ان کے لئے کھانا تیار کیا۔ جب وہ کھانا لے کر ان لوگوں کے پاس آیا تو اونٹوں کے گلہ میں پہنچتے ہی اس نے لوگوں سے کہا کہ اس لڑکے کو بلاؤ۔ آپ جب آئے تو آپ پر بادل سایہ کئے ہوئے تھا۔ جب آپ لوگوں کے قریب پہنچے تو آپ نے دیکھا کہ لوگ درخت کے سایہ میں بیٹھ چکے تھے۔ جب آپ بیٹھے تو سایہ نے اُدھر ہی رُخ کر لیا۔ راہب یہ دیکھ کر بولا۔ دیکھو سایہ اُدھر ہی ہو گیا ہے۔ ابھی وہ درمیان میں کھڑا انہیں قسمیں دے رہا تھا کہ اس بچہ کو روم نہ لے جاؤ۔ کیونکہ اگر رومی اسے دیکھیں گے تو اسے صفات سے پہچان لیں گے اور اسے قتل کر دیں گے۔

اچانک روم کی جانب سے سات آدمی آتے نظر آئے۔ وہ اُن کی جانب متوجہ ہوا۔ اور اُن سے دریافت کیا کس لئے آئے ہو؟ انہوں نے جواب دیا کہ ہونے والا نبی اس شہر میں آیا ہے۔ لہٰذا ہر طرف آدمی اس کی تلاش میں روانہ کئے گئے ہیں۔ ہمیں اس کی آمد کی یہاں خبر ملی تھی تو ہمیں اس جانب روانہ کیا گیا۔ اس نے سوال کیا کہ کیا

تمہارے پیچھے تم سے بہتر کوئی فرد نہیں ہے۔ وہ بولے ہمیں تو اس راہ کی جانب بھیجا گیا تھا۔ اس نے سوال کیا اگر اللہ کسی کام کے کرنے کا ارادہ کر لے کیا کوئی شخص اسے روک سکتا ہے؟ وہ بولے نہیں۔ راہب نے کہا اچھا تو لوٹ جاؤ۔ اور خود بھی ان کے ساتھ کھڑا ہو گیا۔ اور جاتے جاتے بولا۔ میں تمہیں اللہ کی قسم دیتا ہوں کہ اس کا ولی کون ہے۔ ابوطالب نے کہا میں۔ وہ ابوطالب کو قسمیں دیتا رہا۔ حتیٰ کہ ابوطالب نے آپ کو مکہ لوٹا دیا۔ اور آپ کے ساتھ ابوبکر اور بلال کو بھیج دیا۔ اس راہب نے آپ کے زادِ راہ کے لئے کیک اور زیتون دیا۔ ترمذی کہتے ہیں یہ حدیث حسن غریب ہے۔ اور ہمیں اس سند کے علاوہ اس کی کوئی اور سند معلوم نہیں۔ ترمذی ص۲۱۵ ج ۲

ترمذی کی اس روایت سے یہ بات تو ظاہر ہو گئی کہ دشمنی کا خطرہ یہودیوں سے نہ تھا۔ رہا عیسائیوں کا مسئلہ تو جب آپ نے صلح حدیبیہ کے بعد مختلف بادشاہوں کے نام دعوت اسلام کے خطوط لکھے۔ تو شاہ مصر مقوقس، شاہ روم قیصر اور شاہ حبش نجاشی نے اور نجران کے اس وفد نے جو مدینہ آیا تھا۔ اس بات کا اقرار کیا تھا کہ ہم یہ تو جانتے تھے کہ ایک نبی آنے والا ہے۔ لیکن ہمیں یہ معلوم نہ تھا کہ وہ عرب کی سرزمین سے ہو گا۔ اور ان واقعات کو یہ مورخین خود نقل کرتے ہیں۔ گویا اس قسم کی تمام روایات جھوٹی ہوئیں جن کی رو سے حضور کی تمام علاماتِ کا ان کو علم تھا۔

رہا یہ سوال کہ شجر و حجر نبی کے علاوہ کسی کو سجدہ نہیں کرتے۔ تو وہ نبی کو بھی سجدہ نہیں کرتے۔ وہ تو اللہ کو سجدہ کرتے ہیں۔ ارشاد الٰہی ہے۔

اَلَمْ تَرَاَنَّ اللّٰہَ یَسْجُدُ لَہٗ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ وَالشَّمْسُ وَالْقَمَرُ وَالنُّجُوْمُ وَالْجِبَالُ وَالشَّجَرُ وَالدَّوَابُّ۔ الآیۃ۔

اے نبی کیا آپ نہیں دیکھتے کہ آسمانوں و زمینوں میں جتنی چیزیں ہیں۔ اور سورج اور چاند اور ستارے اور درخت اور چوپائے اُس ذاتِ الٰہی کو سجدہ کرتے ہیں۔

ایسی صورت میں یہ کیسے تسلیم کر لیا جائے کہ شجر و حجر حضور کو سجدہ کر رہے تھے۔ اور اتفاق سے اس تمام صورتِ حال کو دیکھنے اور بیان کرنے والا کافر تھا۔ اور چچا کی یہ اچھی محبت تھی کہ اپنے خطرات کے باوجود آپ کو ابوبکرؓ کے ساتھ واپس کر دیا جو آپ سے سوا دو سال چھوٹے تھے۔ اب یا تو ابوطالب کی عقل ماری گئی تھی یا اس قصے

واضعین کی۔یا ابوطالب بھی ان رومیوں کے ساتھ سازش میں شریک تھا۔

عبدالحق محدث دہلوی اپنی مشکوۃ کی شرح اللمعات میں لکھتے ہیں کہ محدثین کہتے ہیں یہ واقعہ کیسے ممکن ہو سکتا ہے اس لئے کہ بلالؓ تو اس وقت تک پیدا بھی نہیں ہوئے تھے۔ اور ابوبکرؓ آپ سے دو سال چھوٹے تھے۔ لہٰذا یہ حدیث ضعیف ہے۔ اور بعض محدثین کہتے ہیں یہ روایت باطل ہے۔ حاشیہ ترمذی۔

اب ہم اس روایت پر وہ اعتراضات پیش کرنا چاہتے ہیں جو علامہ شبلی نے سیرت النبی میں لکھے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ یہ روایت ناقابل اعتبار ہے۔ اس روایت کے جس قدر طریقے ہیں وہ سب مرسل ہیں۔ یعنی راوی اول واقعہ کے وقت خود موجود نہ تھا۔ اور اس راوی کا نام بیان نہیں کرتا جو شریک واقعہ تھا۔

اس روایت کا سب سے مستند طریقہ وہ ہے جو ترمذی میں مذکور ہے۔ اس کے متعلق تین باتیں قابل لحاظ ہیں۔

۱۔ ترمذی نے اس روایت کے متعلق لکھا ہے کہ یہ حسن غریب ہے۔ اور ہم اس حدیث کو اس طریقہ کے علاوہ کسی اور طریقے سے نہیں جانتے۔ حسن کا مرتبہ صحیح سے کم ہوتا ہے۔ اور جب غریب بھی ہو تو اس کا رتبہ اور گھٹ جاتا ہے۔

۲۔ اس حدیث کا ایک راوی عبدالرحمان بن غزوان ہے۔ اس کو بہت سے لوگوں نے اگرچہ ثقہ بھی کہا ہے۔ لیکن اکثر اہل فن نے اس کی نسبت بے اعتباری ظاہر کی ہے۔ علامہ ذہبی میزان الاعتدال میں لکھتے ہیں کہ عبدالرحمان منکر حدیثیں بیان کرتا ہے۔ جن میں سب سے بڑھ کر منکر روایت وہ ہے۔ جس میں بحیرا کا واقعہ مذکور ہے۔

۳۔ حاکم نے مستدرک میں اس روایت کی نسبت لکھا ہے کہ یہ حدیث بخاری و مسلم کی شرائط کے مطابق ہے۔ لیکن علامہ ذہبی نے تلخیص المستدرک میں حاکم کا یہ قول نقل کر کے لکھا ہے کہ میں اس حدیث کے بعض واقعات کو موضوع۔ جھوٹا اور بنایا ہوا خیال کرتا ہوں۔

۴۔ اس روایت میں مذکور ہے کہ حضرت بلالؓ اور حضرت ابوبکرؓ بھی اس سفر میں شریک تھے۔ حالانکہ اس وقت بلالؓ کا وجود بھی نہ تھا۔ اور حضرت ابوبکرؓ بچے تھے۔

۵۔ اس روایت کے آخری راوی حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ ہیں۔ وہ شریک واقعہ نہ تھے۔ اور اوپر کے راوی کا نام نہیں بتاتے۔ ترمذی کے علاوہ طبقات ابن سعد میں جو سلسلۂ سند مذکور ہے وہ مرسل یا معضل ہے۔ یعنی جو روایت مرسل ہے اس میں تابعی جو ظاہر ہے کہ شریک واقعہ نہیں ہے کسی صحابی کا نام نہیں لیتا ہے۔ اور جو روایت معضل ہے۔ اس میں راوی اپنے اوپر کے دو راوی جو تابعی اور صحابی ہیں ان کا نام نہیں لیتا ہے۔

۶۔ حافظ ابن حجر روایت پرستی کی بنا پر اس حدیث کو صحیح تسلیم کرتے ہیں۔ لیکن چونکہ حضرت ابوبکرؓ اور بلالؓ کی شرکت بداہتہً غلط ہے۔ اس لئے مجبوراً اقرار کرتے ہیں کہ اس قدر حصہ غلط ہے۔ جو غلطی سے روایت میں شامل ہو گیا ہے۔ لیکن حافظ ابن حجر کا یہ دعویٰ بھی صحیح نہیں کہ اس روایت کے تمام روات قابل سند ہیں۔ عبدالرحمان بن غزوان کی نسبت خود ان ہی حافظ ابن حجر نے تہذیب التہذیب میں لکھا ہے کہ وہ خطا کرتا تھا۔ اس کی طرف سے اس وجہ سے بھی شبہ پیدا ہوتا ہے کہ اس نے ممالیک کی روایت نقل کی ہے۔ ممالیک کی ایک روایت ہے جس کو محدثین جھوٹ اور موضوع خیال کرتے ہیں۔ سیرت النبی ص۱۸۱ ج ۱

یہ وہ اعتراضات ہیں جو علامہ شبلی نعمانی نے اپنی سیرت النبی جلد اول میں کئے ہیں۔ لیکن اس قصہ پر ابھی اعتراضات کا سلسلہ ختم نہیں ہوا۔ بلکہ شبلی کے شاگرد خاص یعنی سید سلیمان ندوی مرحوم جنہوں نے سیرت النبی کی تکمیل فرمائی ہے۔ تیسری جلد میں موضوع روایات کے ذیل میں اس واقعہ پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

یہ روایت اختصار اور تفصیل کے ساتھ سیرت کی اکثر کتابوں میں اور بعض حدیثوں میں مذکور ہے۔ مگر ابن اسحاق اور ابن سعد وغیرہ کتب سیر میں اس کے متعلق جس قدر روایتیں ہیں اُن سب کے سلسلے کمزور اور ٹوٹے ہوئے ہیں۔ اس قصہ کا سب سے محفوظ طریقۂ سند وہ ہے جس میں عبدالرحمان بن غزوان جو ابو نوح قراد کے نام سے مشہور ہے یونس بن ابی اسحاق سے اور وہ ابوبکر بن ابی موسیٰ سے اور وہ اپنے باپ ابوموسیٰ اشعریؓ سے اس کی روایت کرتے ہیں۔

یہ قصہ اس سلسلۂ سند کے ساتھ جامع ترمذی، مستدرک حاکم، مصنف ابن ابی شیبہ، دلائل بیہقی اور دلائل ابی نعیم میں مذکور ہے۔ ترمذی نے اس کو حسن غریب اور حاکم نے صحیح کہا ہے۔ استاذ مرحوم نے سیرت کی پہلی جلد طبع اول ص۱۲۰ و طبع دوم ص۱۶۸ میں اس روایت پر پوری تنقید کی ہے۔ اور عبدالرحمان بن غزوان کو

اس سلسلہ میں مجروح قرار دیا ہے۔ اور حافظ ذہبی کا یہ قول نقل کیا ہے کہ وہ اس روایت کو موضوع سمجھتے ہیں۔

۱۔ سب سے اول یہ کہ حضرت ابوموسیٰ اشعری مسلمان ہو کر ۷ھ میں مدینہ آئے تھے۔ اور یہ واقعہ اس سے پچاس برس پہلے کا ہے۔ حضرت ابوموسیٰؓ نہ تو خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک سے اور نہ کسی اور شریک واقعہ کی زبان سے اپنا سننا بیان کرتے ہیں۔ اس لئے یہ روایت مرسل ہے۔

۲۔ اس واقعہ کو حضرت ابوموسیٰؓ سے ان کے صاحبزادے ابوبکر روایت کرتے ہیں۔ مگر ان کی نسبت کلام ہے کہ انہوں نے اپنے باپ سے کوئی روایت سنی بھی ہے یا نہیں چنانچہ ناقدین فن کو اس باب میں بہت کچھ شک ہے۔ امام احمد بن حنبل نے تو اس سے قطعی انکار کیا ہے۔ بنابریں یہ روایت منقطع ہے۔ اس کے سوا ابن سعد نے لکھا ہے کہ وہ ضعیف سمجھے جاتے ہیں۔

۳۔ ابوبکر سے یونس بن ابی اسحاق اس واقعہ کو نقل کرتے ہیں۔ گو متعدد محدثین نے ان کی توثیق کی ہے۔ تاہم عام فیصلہ یہ ہے کہ وہ ضعیف ہیں، یحییٰ کہتے ہیں کہ ان میں سخت بے پروائی تھی۔ شعبہ نے ان پر تدلیس کا الزام قائم کیا ہے۔ امام احمد ان کی اپنے باپ سے روایت کو ضعیف اور عام روایتوں کو مضطرب اور ایسی ویسی کہتے ہیں۔ ابوحاتم کی رائے ہے کہ گو وہ راست گو ہیں لیکن ان کی اپنے باپ سے حدیث حجت نہیں۔ ساجی کا قول ہے کہ وہ سچے ہیں۔ اور بعض محدثین نے ان کو ضعیف کہا ہے۔ ابوحاتم کا بیان ہے کہ ان کو اکثر اپنی روایتوں میں وہم ہو جاتا تھا۔

۴۔ چوتھا راوی عبدالرحمان بن غزوان ہے۔ جس کا نام مستدرک اور ابونعیم میں ابونوح قرار ہے۔ اس کو اگرچہ بہت سے لوگوں نے ثقہ کہا ہے۔ تاہم وہ متعدد منکر روایتوں کا راوی ہے۔ ممالیک والی جھوٹی حدیث اسی نے روایت کی ہے۔ ابواحمد حاکم کا بیان ہے کہ اس نے امام لیث سے ایک منکر روایت نقل کی ہے۔ ابن حبان نے لکھا ہے کہ وہ غلطیاں کرتا تھا اور امام مالک اور لیث کی طرف سے ممالیک والی حدیث نقل کرنے کی وجہ سے اس کی طرف سے دل میں خلجان ہے۔

۵۔ حافظ ذہبی میزان میں لکھتے ہیں کہ عبدالرحمان بن غزوان کی منکر روایتوں میں سب سے زیادہ منکر بحیرا راہب کا قصہ ہے۔ اس قصہ کے غلط ہونے کی دلیل یہ ہے کہ اس کی روایت میں ہے کہ ابوبکرؓ نے بلالؓ کو آپؐ کے ساتھ کر دیا۔ حالانکہ حضرت ابوبکرؓ اس وقت بچہ تھے۔ اور حضرت بلالؓ پیدا بھی نہ ہوئے تھے۔

۶۔ حاکم نے مستدرک میں اس واقعہ کو نقل کر کے لکھا ہے کہ یہ بخاری و مسلم کی شرط کے مطابق ہے۔ حافظ ذہبی مستدرک کی تلخیص میں لکھتے ہیں کہ میں اس روایت کو بنایا ہوا خیال کرتا ہوں کیونکہ اس میں بعض واقعات غلط ہیں۔

۷۔ امام بیہقی اس کی صحت کا اعتراف نہیں کرتے۔ شبلی لکھتے ہیں کہ یہ قصہ ابن سیرین میں مشہور ہے۔ سیوطی نے خصائص میں امام موصوف کے اس فقرہ سے یہ سمجھا ہے کہ وہ بھی اس کے ضعف کے قائل ہیں۔ اس کے اصل روایت میں ابن سعد وغیرہ نے جو اور سلسلے نقل کئے ہیں سب کمزور ہیں جن میں کوئی بھی محفوظ نہیں۔

ہمارے نزدیک اس روایت میں ایک لطیفہ یہ بھی ہے، اور وہ یہ کہ کسی کتاب میں تو یہ ہے کہ ابوطالب نے آپ کو ابوبکرؓ اور بلالؓ کے ساتھ واپس کر دیا۔ اور کسی روایت میں ہے کہ ابوبکرؓ نے آپ کو واپس کر دیا۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آپ کو اس سفر میں کون اپنے ساتھ لے گیا تھا اگر کہتے ہو کہ ابوطالب لے کر گیا تو ہمارے نزدیک پھر اس سے زیادہ احمق کوئی انسان نہ تھا جس نے ایسے خطرات کے باوجود اور اتنے طویل سفر میں جو تقریباً ایک ماہ کا تھا ایک ایسے بچہ کو آپ کی حفاظت کے لئے ساتھ کیا جو خود آپ سے دو سال چھوٹا تھا۔ اور اگر یہ کہتے ہو کہ آپ ابوبکرؓ کے ساتھ گئے تھے۔ لہٰذا ابوبکرؓ نے آپ کو واپس کر دیا تو گویا سالار قافلہ ابوبکرؓ ہوئے جو خود بچے تھے پھر اس واقعہ میں ابوطالب جیسے لنگڑے کو گھسیٹ لینے کی کیا ضرورت تھی۔ ہو سکتا ہے کہ یہ بچوں کا کوئی تفریحی پروگرام ہو۔ کیونکہ یہ قصہ خود ایک تفریح سے زیادہ نہیں۔ ہمیں تو افسوس اس کا ہے کہ ہمارا قیمتی وقت اس لغو قصے کے پیچھے برباد ہوا۔ اور دماغ سوزی علیحدہ رہی۔ لہٰذا اب ہم اس قصہ کو حکیم فیض عالم شہید کے چند الفاظ پر ختم کرتے ہیں حکیم صاحب لکھتے ہیں۔

وضاعین نے ابوطالب کی داستان اس چابک دستی سے تیار کی کہ ابوطالب کی ہمراہی میں نبی علیہ السلام کا سفر شام تک تخلیق کر لیا۔ اور پھر بحیرا راہب کا قصہ گھڑ کر عجب گل فشانیاں کیں۔ حالانکہ ابوطالب بے چارے سفر کے قابل ہی نہ تھے۔ حقیقت مذہب شیعہ ص۱۵۵

شام کا ایک اور سفر

نسطورا ولی کی کہانی

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم حضرت خدیجہ کا مال تجارت لے کر متعدد بار شام اور یمن تشریف لے گئے مورخین کا بیان ہے کہ آپ ایک بار بصری بھی تشریف لے گئے تھے لیکن اب وہاں ایک نیا ولی گدی نشیں تھا جس کا نام نسطورا تھا۔ اب یہ اللہ بہتر جانتا ہے کہ پہلا مومن وولی بحیرا تا حال زندہ تھا یا مر گیا تھا۔ اور نسطورا نامی ولی نے بحیرا کی جگہ سنبھال لی تھی۔ یا اس کی کوئی نئی گدی تھی جس پر یہ براجمان تھا۔ ہم تو بہر صورت صرف اتنی بات جانتے ہیں کہ عیسائی متعصبین ان ہی دو واقعات کو پیش کر کے یہ کہا کرتے ہیں کہ محمدؐ نے دنیا کو جو کچھ بھی تعلیم دی اور قرآن کی صورت میں جو کتاب پیش کی وہ ہمارے ان ولیوں سے سیکھ کر دی تھی۔ گویا وہ ایسے صاحب کرامات بزرگ تھے کہ ایک ہی نظر میں انہوں نے سب کچھ سکھا دیا۔ خیر یہ باتیں تو ہمارے موضوع سے علیحدہ ہیں ہمارے نزدیک تو نفس واقعہ ہی کا کوئی وجود نہیں۔ آیئے پہلے اصل کہانی قاری احمد پیلی بھیتی کی زبانی سن لیجئے۔ قاری صاحب لکھتے ہیں۔

آپ کے ساتھ اس سفر میں حضرت خدیجہؓ کا غلام میسرہ بھی تھا۔ اس کی زبانی روایت ہے کہ ہر جگہ آپ پر ابر سایہ افگن رہتا کبھی فرشتے اپنے پروں کا سایہ کرتے تھے۔ ایک عیسائی خانقاہ کے قریب جہاں نسطورا نامی راہب رہتا تھا۔ آپ نے ایک درخت کے نیچے آرام کیا۔ راہب نے یہ دیکھا تو میسرہ سے پوچھا کہ یہ کون شخص ہے۔ اس نے نام و نشان بتلایا۔ راہب نے کہا کہ اس درخت کے نیچے پیغمبر کے سوا اور کوئی نہیں ٹھہرا ہے۔ پھر دریافت کیا کہ کیا ان کی آنکھوں میں ہمیشہ یہ سرخی رہتی ہے۔ غلام نے اثبات میں جواب دیا۔ راہب نے کہا تو یقیناً یہ آخری زمانہ کا پیغمبر ہے۔ تم کبھی اس کی رفاقت نہ چھوڑنا۔ اسی درمیان میں ایک شخص سے خرید و فروخت میں کوئی جھگڑا پیش آیا۔ خریدار نے آپ سے کہا لات و عزیٰ کی قسم کھاؤ۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا میں ان

کی قسم نہیں کھاتا۔ راہب نے میسرہ سے کہا کی قسم یہ پیغمبر ہے۔اس کی صفتیں ہماری کتابوں میں لکھی ہیں۔

میسرہ کا بیان ہے کہ جب دوپہر کی سخت دھوپ پڑتی۔تو دو فرشتے آپ پر سایہ کرتے۔جب آپ تجارت سے فارغ ہو کر مکہ آرہے تھے۔اتفاق سے حضرت خدیجہؓ اس وقت چند سہیلیوں کے ساتھ کوٹھے پر تھیں۔حضرت خدیجہ کی آپ پر نظر پڑی کہ آپ اونٹ پر سوار ہیں۔اور دو فرشتے آپ پر سایہ فگن ہیں۔انہوں نے یہ منظر اپنی سہیلیوں کو دکھایا۔اور میسرہ سے اس کا تذکرہ کیا۔میسرہ نے کہا پورے سفر میں یہی تماشا دیکھتا آیا ہوں۔اور اس کے بعد اس نے نسطورا راہب کی گفتگو بھی خدیجہ سے دہرائی۔مدارج النبوت۔تاریخ مسلمانان عالم ص۱۲۳ ج ۲

اس واقعہ سے یہ بات تو پایہ ثبوت کو پہنچ گئی کہ شام میں آپ کو کسی سے کوئی خطرہ نہیں تھا۔نہ یہود کی جانب سے اور نہ عیسائیوں سے۔گویا پہلا واقعہ تو سراسر جھوٹ تھا۔کہ آپ کو شام میں کوئی خطرہ ہے۔سچ کہتے ہیں کہ دروغ گو را حافظہ نباشد۔

دوئم۔نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس جب کوئی فرشتہ آتا تو یا تو انسانی صورت میں آتا۔یا نظر آئے بغیر پس پردہ سے اس کی آواز آتی۔عام دستور وحی یہی تھا۔لیکن یہ میسرہ نامی بیرو تمام سفر میں برملا اپنی آنکھوں سے فرشتوں کو دیکھتا رہا۔حالانکہ غیر نبی کو فرشتہ نظر نہیں آتا۔ہاں غیر نبی کو موت کا فرشتہ ضرور نظر آتا ہے۔چنانچہ اس لحاظ سے تو اس کا مقام نبوت سے بھی بالاتر ہوا۔اور یہ کیسے معلوم ہوا کہ جو چیز سایہ کئے ہوتے ہے وہ فرشتہ ہے۔کیا کفار عرب کو فرشتوں کی شناخت کا کوئی مخصوص علم عطا ہوا تھا؟

سوئم۔اس مخصوص درخت کے نیچے انبیاء ہی قیام کیا کرتے تھے۔کیا یہ نسطورا نامی ولی کا مشاہدہ تھا۔پھر تو اس کی عمر شیطان کی عمر تھی۔یا اس درخت کا اتا پتہ بھی انجیل میں موجود تھا۔یا اس درخت کی یہ کرامت تھی کہ جو بھی اس کے نیچے بیٹھ جاتا وہ نبی بن جاتا؟

چہارم میسرہ کا بیان ہے کہ حضرت خدیجہؓ سہیلیوں کے ساتھ کوٹھے پر چڑھی ہوئی تھیں۔اور سہیلیوں کو بھی انہوں نے یہ منظر دکھایا تھا۔کیا کوئی مورخ یہ ثابت کر سکتا ہے کہ حضرت خدیجہؓ کی فلاں سہیلی آپ کی نبوت

کے بعد آپؐ پر اس لئے ایمان لائی ہو کہ اس نے یہ منظر دیکھا تھا اور پھر اس نے یہ واقعہ دوسروں سے بھی بیان کیا ہو۔

پنجم۔ جب اس راہب نے میسرہ کو یہ وصیت کی تھی کہ تو ان کی رفاقت نہ چھوڑنا اور وہ غیب کے مکاشفات دیکھتا آیا تھا لیکن اس کے باوجود ہمیں حضورؐ کی مکی زندگی میں کسی میسرہ نامی صحابی کا کہیں کوئی تذکرہ نظر نہیں آتا۔ کیا اسے زمین کھا گئی یا آسمان نگل گیا تھا۔ یا یہ تمام عجائبات دیکھنے کے باوجود کافر ہی رہا اور گمنامی کی موت مر گیا؟

ششم۔ کہا جاتا ہے کہ جب حضرت خدیجہؓ کی حضورؐ سے شادی ہوئی تو حضرت خدیجہؓ کی عمر چالیس سال تھی۔ ذرا دل پر ہاتھ رکھ کر بتائیے کیا یہ کوٹھے چڑھنے اور سہیلیوں سے اشارے بازی کرنے کی عمر ہے۔ پھر مزید لطف یہ ہے کہ چالیس سال کی عمر تک تو حضرت خدیجہؓ کے یہاں پہلے خاوند سے صرف دو بچے ہوئے اور چالیس سال کی عمر کے بعد حضورؐ سے سات بچے ہوئے۔ کیا یہ بھی کوئی معجزہ تھا۔ یا ان مجوسی مورخین نے حضرت خدیجہؓ کی عمر اس لئے بڑھائی تاکہ یہ کہنے کے لئے راہ ہموار ہو جائے کہ حضرت فاطمہؓ کے علاوہ آپ کی کوئی صاحبزادی نہیں۔ ہمیں تو دال میں کالا نظر آتا ہے۔

آئیے اب ذرا سید صاحب کی زبانی اس کی سند کا حال بھی سن لیجئے۔

یہ واقعہ ابن اسحاق، ابن سعد، ابو نعیم اور ابن عساکر میں ہے۔ ابن اسحاق میں اس روایت کی کوئی سند نہیں ہے۔ بقیہ کتابوں میں اس کی سند یہ ہے کہ ان کتابوں کے مصنفین واقدی سے اور واقدی موسیٰ بن شیبہ سے اور وہ عمیرہ بنت عبداللہ بن کعب سے اور عمیرہ ام سعد بنت کعب سے اور وہ یعلیٰ بن منیہ صحابی کی بہن نفیسہ بنت منیہ سے جو صحابیہ تھیں روایت کرتے ہیں۔ واقدی کی بے اعتباری تو محتاج بیان نہیں۔ اس کے علاوہ موسیٰ بن شیبہ کی نسبت امام احمد بن حنبل کہتے ہیں اس کی حدیثیں منکر ہیں۔ عمیرہ بنت کعب اور ام سعد کا حال معلوم نہیں۔
سیرت النبی ص ۶۹۴ ج ۳ -

یعنی سند کے لحاظ سے یہ واقعہ تو پہلے واقعہ سے بھی گیا گزرا ہے اور اس لحاظ سے خلاف عقل بھی ہے کہ اگر ایسی صورت پیش آتی تو تمام اہل قافلہ کے مشاہدہ میں یہ بات آتی کہ آپ پر فرشتے سایہ کئے ہوئے ہیں۔ اور جب ان کے مشاہدہ میں آتی تو مکہ میں جگہ جگہ اس کے چرچے ہوتے۔ جس کا تقاضا یہ ہے کہ جب آپ نے دعوائے نبوت کیا۔ تو لوگوں کو یہ واقعہ یاد آنا چاہیئے تھا اور متعدد افراد کو اس واقعہ کے تعلق سے اسلام لانا چاہیئے تھا لیکن ایسا ہرگز نہیں ہوا۔ جو اس واقعہ کے جھوٹ ہونے کا ثبوت ہے۔

قریش کی دعوت

مورخین واہل سیر لکھتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اعلان صفا کے چند روز بعد حضرت علیؓ کو حکم دیا کہ دعوت کا سامان کرو، تمام خاندان عبدالمطلب اور دیگر رشتہ داروں کو مدعو کیا گیا۔ تقریباً چالیس افراد نے دعوت میں شرکت کی۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے کھانے کے بعد کھڑے ہو کر فرمایا۔ میں تم لوگوں کے لئے وہ چیز لے کر آیا ہوں جو تمہارے لئے دین و دنیا دونوں کی کفیل ہو، میں نہیں جانتا کہ عرب بھر میں کوئی شخص اپنی قوم کے لئے ایسا نادر تحفہ لے کر آیا ہو۔ کون ہے جو اس بار گراں کے اٹھانے میں میرا ساتھ دے۔ اور میری رفاقت اختیار کرے۔

تمام مجلس میں سناٹا تھا۔ دفعۃً حضرت علیؓ نے اٹھ کر کہا۔ گو مجھ کو آشوب چشم ہے، گو میری ٹانگیں پتلی ہیں اور گو میں سب سے نوعمر ہوں۔ تاہم میں آپ کا ساتھ دوں گا۔

قریش کے لئے یہ ایک حیرت انگیز منظر تھا۔ کہ دو لوگ جن میں سے ایک سیزدہ سالہ نوجوان ہے دنیا کی قسمت کا فیصلہ کر رہے ہیں۔ حاضرین کو بے ساختہ ہنسی آگئی لیکن آگے چل کر زمانہ نے بتا دیا کہ یہ سراپا سچ تھا۔ سیرت النبی ص۲۱۰ ج ۱۔ تاریخ مسلمانان عالم ص۱۶۰ ج ۲

علامہ شبلی مرحوم نہ معلوم کس رو میں اس واقعہ کو نقل کر گئے۔ لیکن ان کے شاگرد رشید سید سلیمان ندوی مرحوم نے اس کے حاشیہ میں تحریر کیا۔

یہ روایت طبری ص۱۷۱ ج ۳ اور تفسیر ص۷۴ ج ۱۹ میں عبدالغفار بن قاسم اور منہال بن عمرو کے واسطے سے مروی ہے۔ پہلا شیعی اور متروک ہے۔ اور دوسرا بدمذہب اس روایت میں اور بھی وجوہ ضعف بلکہ وجوہ وضع موجود ہیں۔

سید صاحب نے تو حقیقت حال اشاروں اشاروں میں بیان کی تھی۔ لیکن قاری احمد پیلی بھیتی کی رگ خواجگیت اور رگ قادریت اسے برداشت نہ کر سکی۔ بے چارے اسی واقعہ کی صحت کے بارے میں تو کیا لکھتے لیکن سید صاحب پر اپنے دل کا غبار نکالنے بیٹھ گئے لکھتے ہیں۔

مولانا شبلی نے بھی اس روایت کو سیرت النبی جلد اول میں درج کیا ہے۔ جو طبری کی تاریخ اور تفسیر سے

ماخوذ ہے۔ لیکن سید سلیمان ندوی نے استاد کی تحریر کردہ روایت کو ضعیف کہا ہے اور حاشیہ میں لکھا ہے کہ اس کے راویوں میں عبدالغفار بن قاسم شیعی متروک ہے۔ دوسرا بد مذہب ہے جس کا نام منہال بن عمرو ہے۔

نقد و نظر اچھی چیز ہے مگر اتنی سختی بھی ٹھیک نہیں کہ مولانا شبلی کی برسوں کی محنت اور کاوش کو غیر معتبر کہہ دیا جائے۔ تاریخ مسلمان عالم ص۱۶۱ ج ۲

قاری صاحب سے پہلی عرض تو یہ ہے کہ کلام اللہ کے علاوہ وہ کون سی کتاب ہے جس کے ہر ہر حرف پر آنکھیں بند کر کے ایمان لایا جاسکے۔ یا روئے زمین کی وہ کون سی کتاب ہے جس کا ہر ہر حرف غلط ہو۔ ظاہر ہے کہ کسی فن کی بھی کتاب ہو۔ وہ انسان کی کدو کاوش کا نتیجہ ہوتی ہے۔ انسان کا علم بھی محدود ہے۔ اس کی عقل بھی محدود ہے اور اس کی سوچ بھی محدود ہے۔ لہٰذا نقد و نظر ایک لازمی شے ہے۔ ورنہ کسی باطل شے کو باطل قرار دینا ممکن نہ ہوگا۔ یہی وجہ ہے کہ ہر دور میں کچھ نہ کچھ ایسے افراد ضرور موجود رہے۔ جنہوں نے غلط چیزوں کو تنقیدی نگاہ سے دیکھا۔ سید صاحب کی اس تحریر سے علامہ شبلی کی کاوش پر کوئی اثر نہیں پڑا۔ اس لئے کہ ان کا مقصود بھی تحقیق تھی۔ اور انہوں نے بہت سی ایسی کہانیوں کا رد کیا۔ جو ان کے نزدیک غلط تھیں۔ پھر بھی آپ نے انہیں اپنی کتاب میں درج کیا۔ حتیٰ کہ اس واقعہ کو بھی۔ جو اس امر کا ثبوت ہے کہ آپ کو شبلی سے کوئی ہمدردی نہیں۔ آپ کو تکلیف اس بات کی ہے کہ جھوٹ کو جھوٹ کیوں کہا گیا۔ اور خاص طور پر اس واقعہ کو، کیونکہ اس واقعہ کو تو آپ حضرات فضیلت علیؓ میں نقل کرتے ہیں۔ اس لئے آپ کی رگ قادریت اسے برداشت نہ کر سکی۔

آیئے پہلے ہم سید صاحب مرحوم کے اشارات کی وضاحت پیش کر دیں۔ پھر بقیہ گفتگو ہوگی۔

منہال بن عمرو: اس روایت کا ایک راوی المنہال بن عمرو الکوفی ہے۔ اس نے کسی صحابی سے کوئی روایت نہیں سنی۔ یحییٰ بن سعید القطان فرماتے ہیں یہ ناقابل اعتبار ہے۔ جوزجانی اپنی ضعفاء میں لکھتے ہیں بد مذہب تھا۔ ابن حزم نے اس پر بھی اعتراض کیا ہے۔ شعبہ نے اس کی روایت ترک کر دی تھی۔ مسلم نے بھی اس کی روایت نہیں لی۔ میزان ص۱۹۲ ج ۴۔

اس منہال کو اگر ثقہ بھی تسلیم کر لیا جائے۔ تب بھی یہ روایت قابل قبول نہ ہوگی۔ اس لئے کہ اس نے اوپر کے راوی بیان نہیں کئے۔ اس طرح ایک تابعی اور ایک صحابی سند سے غائب ہے۔ اور جس روایت سے دو

راوی چھوٹ جائیں اسے اصطلاح محدثین میں معضل کہا جاتا ہے۔ اور معضل روایت بدترین درجہ کی ضعیف سمجھی جاتی ہے۔

اس منہال سے اس روایت کو نقل کرنے والا عبدالغفار بن قاسم ہے۔ اس کا حال بھی ملاحظہ ہو۔ امام ذہبی میزان میں لکھتے ہیں۔

عبدالغفار بن قاسم اس کی کنیت ابو مریم الانصاری ہے۔ ذہبی کہتے ہیں۔ یہ ثقہ نہیں ہے۔ بلکہ رافضی ہے۔ امام علی بن المدینی جو فن رجال میں بخاری مسلم، ابو داؤد اور نسائی کے استاد ہیں فرماتے ہیں۔ یہ شیعوں کا رئیس (مجتہد) تھا۔ احادیث وضع کیا کرتا تھا۔ یحیٰ بن معین فرماتے ہیں۔ یہ کچھ نہیں ہے۔ امام بخاری کہتے ہیں یہ محدثین کے نزدیک قوی نہیں۔

امام شعبہ کا بیان ہے کہ میں نے ابو مریم کی ایک بات پر سماک الحنفی کو یہ الفاظ کہتے سنا۔ اللہ کی قسم تو جھوٹ بولتا ہے۔

عبدالواحد بن زیاد کا بیان ہے کہ ابو مریم نے ایک روز لوگوں کے سامنے قرآن کی ایک آیت کی تفسیر کرتے ہوئے یہ دعویٰ کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنی امت کے اعمال دیکھنے کے لئے دنیا میں دوبارہ تشریف لائیں گے۔ میں نے اس سے کہا تو جھوٹ بولتا ہے۔ وہ ڈھیٹ بن کر بولا کہ تو مجھے جھٹلاتا ہے۔

ابو داؤد طیالسی کا بیان ہے کہ میں قسم کھا کر کہتا ہوں کہ ابو مریم جھوٹا ہے میں اس سے ملا ہوں۔ اور میں نے اس کی باتیں سنی ہیں۔ اس کا نام عبدالغفار بن قاسم ہے۔

امام احمد بن حنبل کا ارشاد ہے کہ ہم ابو عبیدہ سے احادیث سننے جایا کرتے تھے لیکن جب کبھی وہ ابو مریم کی روایات بیان کرنا چاہتے تو لوگ شور مچا دیتے تھے کہ ہم اس کی کوئی روایت سننا نہیں چاہتے۔ نیز امام احمد یہ بھی فرماتے ہیں کہ یہ حضرت عثمانؓ کی برائیوں میں روایات بیان کیا کرتا تھا۔

ابو حاتم اور نسائی کہتے ہیں یہ متروک الحدیث ہے۔ عفان نے بھی اس کی روایت قبول نہیں کی۔ امام شعبہ نے اس سے ابتدا میں روایات سُنی تھیں۔ لیکن جب ان پر اس کا جھوٹ کھلا تو انہوں نے اس سے روایت لینا چھوڑ دیا۔ ابو مریم ۱۶۰ھ تک زندہ رہا۔ میزان الاعتدال ص ۲۴۰ ج ۲

ان تمام بیانات سے یہ بات تو واضح ہو گئی کہ یہ روایت عبدالغفار بن قاسم ابو مریم الانصاری کی وضع کردہ ہے۔

اس نے حضرت علیؓ کی شان بڑھانے کے لئے یہ روایت وضع کی۔ لیکن اپنی اس موضوع کہانی میں چند ایسے نقائص چھوڑ رہے ہیں کہ اگر اس روایت کو بلحاظ سند صحیح بھی فرض کر لیا جائے۔ تب بھی معنوی اعتبار سے یہ درست نہ ہوگی۔ غالباً اسی لئے سید صاحب نے یہ جملہ تحریر فرمایا کہ اس کے موضوع ہونے کی اور بھی وجوہات ہیں۔

آیئے چند وجوہات ہم بھی پیش کئے دیتے ہیں۔

۱۔ راوی یہ دعویٰ کر رہا ہے کہ حضرت علیؓ بچپن سے آشوب چشم کے مریض تھے۔ گویا ان کا یہ مرض دائمی تھا۔ حالانکہ ان کو یہ مرض فتح خیبر کے وقت لاحق ہوا تھا۔ اور کسی اور موقعہ پر کسی نے بھی ان کی اس دائمی بیماری کا تذکرہ نہیں کیا۔

۲۔ اس واقعہ سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ اس وقت تک کسی نے ایمان قبول نہیں کیا تھا۔ حالانکہ اس وقت تک تیس سے زیادہ افراد ایمان قبول کر چکے تھے۔ خود خاندان عبدالمطلب میں حضرت علیؓ کے بڑے بھائی حضرت جعفرؓ اور ان کی زوجہ اسماءؓ بنت عمیس، عبیدہؓ بن حارث بن عبدالمطلب اور حضرت عباسؓ کی زوجہ ام الفضلؓ ایمان قبول کر چکی تھیں۔ اسی طرح حضور کی صاحبزادیاں۔ یہ سب بھی مشرف با سلام ہو گئی تھیں۔ گویا یہ روایت ان تمام صحابہ اور صحابیات پر تبرا ہے۔

۳۔ اس میں اختلاف ہے کہ اسلام کے وقت حضرت علیؓ کی عمر کیا تھی۔ کوئی پانچ، کوئی سات، کوئی نو، کوئی گیارہ اور کوئی تیرہ بیان کرتا ہے۔ لیکن جعفر بن محمد کا قول ہے کہ حضرت علیؓ کی شہادت کے وقت عمر اٹھاون سال تھی۔ ایک روایت یہ بھی بیان کی جاتی ہے کہ جنگ بدر کے وقت حضرت علیؓ کی عمر بیس سال تھی۔ اور ایک روایت ہمیں یہ بھی نظر آتی ہے کہ ایک بار حضرت علیؓ اور حضرت فاطمہؓ میں اس عمر کے مسئلہ پر گفتگو چھڑی ہوئی تھی۔ کہ علیؓ بڑے ہیں یا فاطمہؓ، فاطمہؓ کا دعویٰ تھا کہ میں بڑی ہوں۔ حضرت علیؓ کے چچا حضرت عباس نے سن کر یہ فیصلہ دیا کہ علیؓ فاطمہؓ سے چار پانچ روز بڑے ہیں۔ اور فاطمہؓ نبوت سے پانچ سال قبل پیدا ہوئیں۔ ان تینوں واقعات سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ حضرت علیؓ بعثت رسول کے وقت پانچ سال کے اور اس واقعہ کے وقت آٹھ سال کے بچہ تھے۔ اسی لئے راوی کو یہ کہنے کی ضرورت پیش آئی کہ لوگ حضرت علیؓ کی بات پر ہنسنے لگے۔ اس طرح یہ حضرت علیؓ کی ذات پر ایک طنز بھی ہے۔ الغرض اس واقعہ کی کوئی کل سیدھی نہیں۔

اس تمام تفصیل سے ایک بات ضرور سامنے آتی ہے کہ حضرت علیؓ کے بارے میں یہ دعویٰ کیا جاتا ہے کہ حضور نے اُن کی پرورش کی اور یہ صحیح بھی ہے۔ لیکن ایک دعویٰ یہ بھی کیا جاتا ہے کہ وہ سب سے پہلے اسلام لائے۔ پانچ سال کی عمر ایمان لانے کی نہیں ہوتی۔ اس وقت تو بچہ کو ان باتوں کا ہوش بھی نہیں ہوتا لیکن ایک جانب ان کے ایمان کا خوب ڈھنڈورا پیٹا جاتا ہے۔ اور دوسری جانب حضور کی صاحبزادیوں کے ایمان لانے کا ذکر تاریخ و سیر کی کسی کتاب میں موجود نہیں۔ حالانکہ حضرت زینبؓ اس وقت جوان تھیں، اور حضرت رقیہؓ بھی جوان ہونے کے قریب تھیں۔ اور حضرت رقیہؓ ہجرت حبشہ سے قبل حضرت عثمانؓ کی زوجیت میں آچکی تھیں۔ اور ہجرت حبشہ نبوت کے پانچویں سال ہوئی۔ لیکن ان تمام امور کے باوجود حضرت زینبؓ اور حضرت رقیہؓ کے ایمان لانے کا کوئی مورخ ذکر نہیں کرتا اگر اس کی وجہ یہ ہے کہ چونکہ اُن کی پرورش حضور نے فرمائی تھی اور وہ حضور کے رنگ میں رنگی ہوئی تھیں لہٰذا اس لئے اُن کے ایمان کا تذکرہ نہیں کیا گیا۔ تو حضرت علیؓ نے بھی حضور کے یہاں پرورش پائی تھیں۔ لہٰذا آپ کے ایمان کے تذکرہ کی بھی کوئی ضرورت نہ تھی۔ یہی وجہ ہے کہ محدثین نے کسی جگہ بھی حضرت علیؓ کے ایمان کا تذکرہ نہیں کیا۔

ہاں ہم اپنے قارئین کو ایک لطیفہ ضرور سنانا چاہتے ہیں کہ ایک جانب سبائی یہ تسلیم کرتے ہیں کہ حضرت علیؓ اور حضرت فاطمہؓ ہم عمر تھے۔ دوسری جانب یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ حضرت فاطمہ نبوت کے پانچ سال بعد پیدا ہوئیں اس لحاظ سے اس واقعہ دعوت کے دو سال بعد حضرت علیؓ پیدا ہوتے ہیں۔

پھر یہ سبائی ایک جانب یہ بھی دعویٰ کرتے ہیں کہ حضرت فاطمہؓ معراج کے بعد پیدا ہوئیں۔ اور دراصل ان کی پیدائش جنت کا ایک سیب کھانے کے باعث ہوئی تھی۔ معراج، ہجرت مدینہ سے ایک سال قبل ہوئی ہے۔ گویا حضرت علیؓ اور حضرت فاطمہؓ کی شادی کے وقت عمر صرف تین سال تھی۔ اس طرح جنگ بدر بھی حضرت علیؓ کے ہاتھ سے گئی۔

ان کے بعض مجتہدین اس کے قائل ہیں کہ حضرت فاطمہؓ کی عمر بہت زیادہ تھی۔ حتیٰ کہ شادی کے وقت بوڑھی معلوم ہوتی تھیں۔ اور اسی سبب سے لوگ انہیں ام ابیہا (یعنی اپنے باپ کی ماں) کہا کرتے تھے تفصیل کیلئے آیات بینات اور مولانا عبدالشکور لکھنوی کی کتابیں ملاحظہ فرمائیں۔ ہم تو صرف یہی عرض کر سکتے ہیں کہ اونٹ رے اونٹ تیری کون سی کل سیدھی۔

حضرت عمرؓ کا اسلام

حضرت عمرؓ کے اسلام کا واقعہ جو تمام کتب سیر اور کتب تاریخ میں مذکور ہے۔ اور ہر مولوی بر سر منبر جسے گا گا کر سناتا ہے۔ جس پر ہر شخص سر دھنتا نظر آتا ہے۔ اس واقعہ کو سبائیوں نے اتنی شہرت دی ہے کہ علامہ شبلی جیسے مورخ بھی اس مغالطہ کا شکار ہو گئے۔ اور ان کی اس جانب توجہ بھی نہ ہوئی کہ اس واقعہ کی سندات کا مطالعہ کر لیتے۔ یا اس واقعہ میں جو زہر بھرا ہوا ہے اسی پر نظر ڈال لیتے۔ وہ بھی اس مشہور عام قصہ کو الفاروق اور سیرت النبی میں بایں الفاظ نقل کرتے ہیں۔

حضرت عمرؓ کا ستائیسواں سال تھا کہ آفتاب رسالت طلوع ہوا یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مبعوث ہوئے۔ حضرت عمرؓ کے گھرانے میں زید بن عمرو بن نفیل کی وجہ سے توحید کی آواز نامانوس نہیں رہی تھی۔ چنانچہ سب سے پہلے زید کے بیٹے سعیدؓ اسلام لائے۔ حضرت سعیدؓ کا نکاح حضرت عمرؓ کی بہن فاطمہؓ سے ہوا تھا۔ اس تعلق سے فاطمہؓ بھی مسلمان ہو گئیں۔ لیکن اسی خاندان میں ایک اور معزز شخص نعیمؓ بن عبداللہ نے بھی اسلام قبول کر لیا تھا لیکن حضرت عمرؓ ابھی تک اسلام سے بیگانہ تھے۔ ان کے کانوں میں جب یہ صدا پہنچی تو سخت برہم ہوتے۔ یہاں تک کہ قبیلے میں جو لوگ اسلام لا چکے تھے ان کے دشمن بن گئے لبینہ ان کے خاندان کی کنیز تھی۔ جس نے اسلام قبول کر لیا تھا۔ اس کو بے تحاشا مارتے اور مارتے مارتے تھک جاتے تو کہتے کہ دم لے لوں، پھر ماروں گا۔ لبینہ کے سوا اور جس جس پر قابو چلتا تھا۔ زدوکوب سے دریغ نہیں کرتے تھے۔ لیکن اسلام کا نشہ ایسا تھا کہ جس کو چڑھ جاتا تھا اترتا نہ تھا۔ ان تمام سختیوں پر ایک شخص کو بھی وہ اسلام سے بددل نہ کر سکے۔ آخر مجبور ہو کر نعوذ باللہ خود ذات نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے قتل کا ارادہ کیا۔ تلوار کمر سے لگا کر سیدھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف چلے۔ کارکنانِ قضا نے کہا۔ ع آمد آں یارے کہ ما می خواستیم۔

راہ میں اتفاقاً نعیمؓ بن عبداللہ مل گئے۔ ان کے تیور دیکھ کر پوچھا خیر ہے، بولے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا فیصلہ کرنے جاتا ہوں۔ انہوں نے کہا پہلے اپنے گھر کی خبر لو۔ خود تمہاری بہن اور بہنوئی اسلام لا چکے ہیں۔

فوراً بہن اور بہنوئی کے ہاں پہنچے۔ وہ قرآن پڑھ رہی تھیں۔ اُن کی آہٹ پاکر چپ ہوگئیں۔ اور قرآن کے اجزا چھپا لئے لیکن آواز ان کے کانوں میں پڑ چکی تھی۔ بہن سے پوچھا یہ کیا آواز تھی۔ بولیں کچھ نہیں۔ انہوں نے کہا میں سُن چکا ہوں تم دونوں مرتد ہوگئے ہو۔ یہ کہہ کر بہنوئی سے دست وگریباں ہوگئے۔ اور جب ان کی بہن خاوند کو بچانے کو آئیں تو ان کی بھی خبر لی۔ یہاں تک کہ ان کا جسم لہولہان ہوگیا لیکن اسلام کی محبت اس سے بالاتر تھی۔ بولیں کہ عمرؓ جو بن آئے کر دو لیکن اسلام اب دل سے نہیں نکل سکتا۔ ان الفاظ نے حضرت عمرؓ کے دل پر خاص اثر کیا۔ بہن کی طرف محبت کی نگاہ سے دیکھا۔ اُن کے جسم سے خون جاری تھا۔ دیکھ کر اور بھی رقت ہوئی۔ فرمایا۔ تم لوگ جو پڑھ رہے تھے مجھ کو بھی سناؤ۔ فاطمہؓ نے قرآن کے اجزا سامنے لاکر رکھ دیئے۔ اٹھا کر دیکھا تو یہ سورت تھی۔

سَبَّحَ لِلّٰہِ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۚ وَھُوَ الْعَزِیْزُ الْحَکِیْمُ ۔ الحدید ۱

آسمانوں اور زمینوں میں جتنی بھی اشیا ہیں سب اللہ کی تسبیح کرتی ہیں۔ اور وہ غالب حکیم ہے۔

ایک ایک لفظ پر ان کا دل مرعوب ہوتا جاتا تھا۔ یہاں تک کہ جب اس آیت پر پہنچے۔

فَاٰمِنُوْا بِاللّٰہِ وَرَسُوْلِہٖ

تو اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لاؤ

تو بے اختیار پکار اٹھے۔ اشھد ان لا الٰہ الا اللہ واشھد ان محمداً رسول اللہ۔

یہ وہ زمانہ تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حضرت ارقمؓ کے مکان میں جو کوہِ صفا کی تلی میں واقع تھا پناہ گزیں تھے۔ حضرت عمرؓ نے آستانہ مبارک پر پہنچ کر دستک دی چونکہ شمشیر بکف گئے تھے۔ صحابہ کو تردد ہوا لیکن حضرت امیر حمزہؓ نے کہا آنے دو، مخلصانہ آیا ہے تو بہتر ہے۔ ورنہ اسی کی تلوار سے اس کا سر قلم کر دوں گا۔ حضرت عمرؓ نے اندر قدم رکھا۔ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خود آگے بڑھے۔ اور ان کا دامن پکڑ کر فرمایا۔ کیوں عمرؓ کس ارادے سے آیا ہے۔ نبوت کی پرجلال آواز نے ان کو کپکپا دیا۔ نہایت خضوع کے ساتھ عرض کیا۔ کہ ایمان لانے کے لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بے ساختہ اللہ اکبر پکار اٹھے اور ساتھ ہی تمام صحابہ نے مل کر اس زور سے اللہ اکبر کا نعرہ مارا کہ مکہ کی تمام پہاڑیاں گونج اٹھیں۔ (انساب الاشراف بلاذری)

طبقات ابن سعد، اسد الغابہ، ابن عساکر، کامل ابن اثیر، سیرت النبی ص۲۲۳ ج۱۔ اصح السیر ص۹۱

یہ واقعہ بلحاظ سند کیسا ہے۔ اس پر تو ہم بعد میں بحث کریں گے لیکن واقعہ کی یہ نوعیت خود اس بات کی شہادت دے رہی ہے کہ یہ واقعہ سراسر جھوٹ اور صریح اتہام ہے۔ جس کے مختلف شواہد ہیں۔

۱۔ اس واقعہ میں سورۃ حدید کی ابتدائی آیات کی تلاوت کا ذکر ہے جو مدینہ منورہ میں فتح مکہ کے بعد نازل ہوئی اور مورخین کا دعوی یہ ہے کہ حضرت عمر ۶ نبوی میں اسلام لائے یعنی جس آیت کی اُن سے اسلام کے وقت تلاوت کرائی جا رہی ہے۔ وہ ان کے ایمان لانے کے پندرہ سال بعد نازل ہوئی۔ جس کی صرف دو وجہ ہو سکتی ہیں۔ یا تو اس کے راوی قرآن سے مطلقاً جاہل تھے۔ یا اس میں درپردہ راز یہ ہے کہ کسی نہ کسی طرح حضرت عمرؓ کے اسلام کو فتح مکہ کے بعد ثابت کر کے انہیں مؤلفۃ القلوب میں داخل کر دیا جائے اور اس طرح ان کے ایمان پر شک و شبہ کی راہ ہموار ہو۔ کیونکہ وہ اہل مکہ جو فتح مکہ کے بعد ایمان لائے انہیں شیعہ خارج از ایمان سمجھتے ہیں۔ اور مودودی صاحب کو بھی ان کے ایمان پر شک و شبہ ہے لیکن اللہ تعالی نے اس صورت میں خود وضاحت فرما دی ہے کہ فتح مکہ کے بعد ایمان لانے والے بھی پکے مومن اور جنتی ہیں لیکن سبائی ہوں یا خواہ ان کے سنی ایجنٹ۔ وہ صرف ان ہی لوگوں کے ایمان میں شک و شبہ کرتے ہیں جن کا تعلق بنو امیہ سے ہے۔ اور جن کا تعلق بنی ہاشم سے ہے۔ مثلاً ابو سفیانؓ بن حارث، عقیلؓ بن ابی طالب اور ام ہانیؓ وغیرہ ان کے ایمان پر کسی نے حرف گیری نہیں کی۔ آخر اس کی وجہ بغض معاویہؓ کے علاوہ اور کیا ہو سکتی ہے؟

۲۔ اس روایت میں یہ دعوی کیا گیا ہے کہ حضرت عمرؓ کو اپنی بہن اور بہنوئی کے اسلام کا کوئی علم نہ تھا۔ لیکن امام بخاری نے اپنی صحیح میں باب اسلام سعیدؓ بن زید کے تحت حضرت سعیدؓ بن زید کا یہ ارشاد نقل کیا ہے۔

واللہ لقد رایتنی وان عمر	اللہ کی قسم میں نے خود کو اس حال میں دیکھا
لموثقی علی الاسلام قبل ان یسلم	ہے کہ اسلام لانے سے قبل حضرت عمر مجھے
عمر ولو ان احداً ارفض	باندھ کر ڈال دیا کرتے تھے لیکن تم نے

للذی متعتم بعثمان لکان۔ — مسلمان ہونے کے باوجود عثمان کے ساتھ
صحیح بخاری ص۵۴۹ ج ۱ — وہ حرکت کی ہے کہ احد پہاڑ بھی ریزہ
ریزہ ہو جائے۔

اس قول کی سند کے راوی انتہائی اعلیٰ پائے کے لوگ ہیں یعنی قتیبہ بن سعید، سفیان ثوری، اسمٰعیل بن ابی خالد اور قیس بن ابی حاتم۔

حضرت سعیدؓ کے اس قول سے یہ ثابت ہو گیا ہے کہ حضرت عمرؓ کو اپنی بہن اور بہنوئی کے اسلام کا نہ صرف علم تھا۔ بلکہ وہ اپنے بہنوئی کو اسلام کے باعث باندھ کر ڈال دیا کرتے تھے۔ تو اس قصہ میں یہ دعویٰ کہ حضرت عمرؓ کو علم نہ تھا سراسر جھوٹ ہے۔

۳۔ اس قصہ کے آخر میں ہے کہ حضرت عمرؓ نے جب اسلام کا اظہار کیا تو صحابہ نے اتنی زور سے نعرۂ تکبیر لگایا کہ مکہ کی پہاڑیاں گونج اٹھیں۔ ہمارے نزدیک ان راویوں کی یہ سب سے بڑی حماقت ہے۔ اس لئے کہ حضور اس وقت دارارقم میں مخفی تھے۔ اور صحابہ چھپ چھپ کر آپ کی خدمت میں جایا کرتے تھے۔ صحابہ کرام نعرہ لگانے کی غلطی ہرگز نہ کر سکتے تھے جس سے حضور اور تمام صحابہ کا راز فاش ہو جاتا۔

۴۔ بقول اس راوی کے جب حضرت عمرؓ کو بہن اور بہنوئی کے اسلام کا علم نہ تھا۔ تو نعیمؓ بن عبداللہ کو یہ راز فاش کرنے کی کیا ضرورت پیش آگئی تھی۔ یا اللہ نہ کرے وہ گھر پھونک تماشا دیکھنا چاہتے تھے۔ یہ حضرت نعیمؓ کی ذات پر کھلا تبرا ہے۔

۵۔ ایک بہادر اور طاقتور شخص کے لئے لڑکی کو مار مار کر تھک جانا اور پھر سانس لینے کے لئے بیٹھنا دو حال سے خالی نہیں۔ یا تو مارنے والا ایک کمزور انسان ہے جو اتنی جلدی ہانپ جاتا ہے۔ یا ایسا ظالم اور سنگدل ہے کہ وہ اس بات تک کا خیال نہیں کرتا کہ جس کو مارا جا رہا ہے وہ ایک لڑکی ہے۔ ہمارے نزدیک اس کہانی کا مقصود یہی ہے کہ حضرت عمرؓ کو ظالم اور سنگ دل ثابت کیا جائے۔

۶۔ یہ لبینہ جسے مارا جاتا تھا۔ اس کا ذکر ہمیں اس واقعہ کے علاوہ تاریخ میں کہیں نظر نہیں آتا اس کی وجہ کیا ہے؟

۷۔ حضرت حمزہؓ کے یہ الفاظ کہ اسی کی تلوار سے اس کا سر قلم کر دوں گا۔ کہیں یہ الفاظ اس لئے تو وضع نہیں کئے گئے تاکہ آئندہ مجوسی داستان میر حمزہؓ تیار کر سکیں۔ اور پھر اس کی قبولیت میں کسی قسم کے شک شبہ کی گنجائش نہ رہے۔ غالباً شبلی مرحوم کا ذہن بھی داستان میر حمزہ سے متاثر ہے۔ اس لئے کہ سب سے اول اس داستان کے مصنف نے حضرت حمزہؓ کے ساتھ میر کا لفظ لگایا ہے۔ ورنہ تمام کتب احادیث کتب تاریخ۔ کتب رجال اور کتب انساب میں ہمیں ان کے نام کے ساتھ یہ لفظ کہیں نظر نہیں آتا۔ اور ہمارے ہندو پاک میں میر سید کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ آخر یہ کس رشتے سے سید بنے ہیں۔ اگر واقعتاً یہ سید ہیں تو پھر عباسی بھی یقیناً سید ہیں۔

۸۔ حیرت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم توان کے لئے یہ دعا فرمائیں۔

اللهم اعز الاسلام بعمر بن الخطاب۔	اے اللہ عمر کے ذریعہ اسلام کو عزت عطا فرما۔

اور اسی سبب انہیں مراد رسول کہا جاتا ہے۔ اور اس دعا کے باوجود وہ تلوار لے کر میدان میں آجائیں حیف صد حیف۔

ایسی صورت میں تو ہمیں اس میں بھی اشتباہ ہو رہا ہے کہ حضرت عمرؓ سنہ نبوی میں ایمان لائے ممکن ہے کہ یہ بھی مؤرخین کی ایک دسیسہ کاری ہو، اور وہ اس سے بہت قبل اسلام لا چکے ہوں۔ جیسا کہ آئندہ صحیح روایات سے اس کا اندازہ ہوتا ہے۔

آمدم برسر مطلب۔ ایک دوسری روایت میں سورۃ حدید کی آیات کے بجائے سورۃ طہٰ کی ابتدائی آیات کا ذکر ہے۔ بقیہ کہانی وہی ہے۔ یہ ہر دو روایات طبقات ابن سعد، مسند ابی یعلیٰ، سنن دار قطنی، مستدرک للحاکم، بیہقی، طبرانی، بزار اور ابو نعیم میں پائی جاتی ہیں۔ دار قطنی نے اسے بہت مختصراً قاسم بن عثمان کے ذریعہ حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے۔

حضرت انسؓ مدینہ منورہ کے باشندہ ہیں۔ اور ہجرت مدینہ کے بعد اسلام لائے۔ ان کی والدہ نے انہیں حضور کی خدمت کے لئے پیش کیا۔ اس وقت ان کی عمر دس سال تھی۔ یعنی جب حضرت

عمرؓ اسلام لائے تو یہ تین سال کے بچہ تھے۔ اور اس وقت ان کی پوری قوم کافر تھی۔ انہوں نے یہ واقعہ کس سے سُنا۔ اُس صحابی کا کوئی ذکر موجود نہیں۔

قاسم بن عثمان: حضرت انسؓ کی جانب یہ واقعہ منسوب کرنے والا قاسم بن عثمان ہے۔ امام بخاری فرماتے ہیں یہ ایسی روایات بیان کرتا ہے جس کا کوئی شاہد نہیں ہوتا۔ امام ذہبی تلخیص مستدرک میں لکھتے ہیں کہ یہ قصہ نہایت ردی اور منقطع ہے۔ میزان میں فرماتے ہیں اس نے حضرت عمرؓ کے اسلام کا قصہ نقل کیا ہے۔ جو انتہا سے زیادہ منکر ہے۔ میزان اعتدال ص۳۷۵ ج ۳

حافظ ابن حجر لسان المیزان میں لکھتے ہیں کہ اس نے حضرت عمرؓ کے اسلام کا قصہ نقل کیا ہے۔ جو انتہا سے زیادہ منکر ہے۔ دار قطنیؒ کہتے ہیں یہ قوی نہیں ہے۔ لسان المیزان ص۴۶۳ ج ۴

اسحاق بن ابراھیم الحنینی: اس کی سند کا دوسرا راوی اسحاق بن ابراہیم الحنینی ہے۔ ذہبی لکھتے ہیں یہ بکواسات کا ماہر ہے۔ عقیلی کہتے ہیں یہ امام مالک سے جتنی روایات نقل کرتا ہے۔ سب بے بنیاد ہوتی ہیں۔ بخاری کہتے ہیں اس پر اعتراض ہے۔ نسائی کہتے ہیں یہ ثقہ نہیں ہے۔ ۲۱۶ھ میں اس کا انتقال ہوا۔ میزان الاعتدال ص۱۷۹ ج ۱

اسامۃ بن زید بن اسلم: اس کا تیسرا راوی اسامۃ بن زید بن اسلم ہے۔ امام احمد اور یحییٰ بن معین کہتے ہیں ضعیف ہے۔ نسائی وغیرہ کہتے ہیں قوی نہیں ہے۔ میزان الاعتدال ص۱۷۴ ج ۱

گویا اس قصہ کا ایک راوی بھی قابل اعتماد نہیں ہے۔

یہ تو وہ کہانی تھی جس کی کوئی حقیقت نہیں۔ آیئے اب اصل واقعات کو دیکھیے کہ کس طرح رونما ہوتے ہیں جو حضرت عمرؓ کے اسلام کا سبب بنے۔

۱۔ سب سے پہلا سبب تو یہ ہے کہ زید بن عمرو بن نفیل ان لوگوں میں سے ہیں جنہوں نے حضور کی نبوت سے قبل سرزمین مکہ میں توحید کا نعرہ بلند کیا۔ اور بت پرستی کی مخالفت کی۔ اور بتوں کے نام پر چڑھائے ہوئے کھانوں سے دوسروں کو روکا۔ یہ زید حضرت عمرؓ کے چچا تھے۔ زید کو اسی سلسلہ میں بہت

سی تکالیف بھی پہنچائی گئیں۔ ظاہر ہے کہ یہ امور حضرت عمرؓ کی زندگی میں پیش آئے۔ اُن پر زید کی باتوں کا کچھ نہ کچھ تاثر قائم ہونا ضروری ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اعلانِ نبوت کے چند ہی روز بعد ان زید کے بیٹے سعیدؓ مشرف باسلام ہوئے۔ ان کی بہن سعیدؓ کے نکاح میں تھیں، اور سعیدؓ کی بہن زید کی بیٹی حضرت عمرؓ کے نکاح میں آئیں۔ پھر سعیدؓ کے اسلام کے بعد حضرت عمرؓ انہیں گھر میں باندھ کر ڈال دیا کرتے تھے۔ اس طرح گھر کی صورتِ حال یہ تھی کہ بہن اور بہنوئی مسلمان، ہمسر مکہ کا موحد اور بیوی ایک موحد کی بیٹی اور ایک مسلمان کی بہن۔ اس صورتِ حال سے ان کے ذہن کا متاثر ہونا لازمی امر تھا۔ انہیں اگر اسلام پر کسی کو مارنا ہوتا تو پہلے سعیدؓ کو مارتے۔ لیکن حضرت سعیدؓ کا بیان یہ ہے کہ مجھے باندھ کر رکھتے۔ یعنی ان کا اسلام تو انہیں قبول تھا لیکن دیگر لوگوں سے اُن کا ملنا جلنا پسند نہ تھا

۲۔ امام بخاری نے صحیح اور متصل سند کے ساتھ حضرت عمرؓ سے نقل کیا ہے کہ میں ایک روز کفار کے بتوں کے درمیان لیٹا ہوا تھا کہ ایک شخص ایک بچھڑا لے کر آیا۔ اور اسے ذبح کیا اور اس کے ذبح ہوتے ہی ایک چیخنے والے کی چیخ سنائی دی۔ اتنی زبردست چیخ میں نے کبھی نہیں سنی تھی۔ وہ کہہ رہا تھا۔ اے دشمن، عمدہ کام ظہور پذیر ہوا ہے۔ ایک عقل مند انسان ہے جو کہتا ہے لا الٰہ الا اللہ۔

[illegible] یہ چیخ سن کر لوگ بھاگ کھڑے ہوئے لیکن [illegible] میں نے تہیہ کر لیا [illegible] حقیقتِ حال معلوم [illegible] آواز آئی۔ [illegible] میں وہاں سے چلا آیا۔ ابھی چند دن نہ گزرے تھے کہ سننے میں آیا [illegible] نبی ہے۔ [illegible]

امام بخاری نے اس واقعہ پر باب اسلام عمرؓ بن الخطابؓ کی سرخی قائم کی ہے۔ گویا وہ اس واقعہ کو حضرت عمرؓ کے اسلام کا اصل سبب سمجھتے ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ اسی واقعہ نے ان کے دل میں جستجو کا مادہ پیدا کر دیا ہو لیکن اس صورت میں وہ سبب کونسا ہے جو اظہارِ اسلام کا ذریعہ بنا۔

ہم جب [illegible] چھان بین کرتے ہیں تو امام احمد بن حنبل نے اپنی مسند میں حضرت عمرؓ کی زبانی نقل کیا [illegible]

شروع فرمادی۔ اور سورت الحاقہ کی تلاوت شروع کی۔ میں کھڑا سنتا رہا۔ میں نے قرآن مجید کے اسلوب بیان کو دیکھ کر دل میں یہ خیال کیا کہ یہ کوئی شاعر ہے۔ ابھی یہ خیال گزرا ہی تھا کہ آپ نے یہ آیت تلاوت فرمائی

وَمَا هُوَ بِقَوْلِ شَاعِرٍ قَلِيلًا مَّا تُؤْمِنُونَ ○	یہ کسی شاعر کا قول نہیں۔ تم بہت کم ایمان لاتے ہو۔

میں نے دل میں خیال کیا کہ یہ کوئی کاہن ہے جو میرے دل کا حال بھی جان گیا۔ لیکن اس کے بعد آپ نے یہ آیت تلاوت فرمائی۔

وَلَا بِقَوْلِ كَاهِنٍ قَلِيلًا مَّا تَذَكَّرُونَ ○	یہ کسی کاہن کا قول بھی نہیں۔ تم بہت کم نصیحت حاصل کرتے ہو۔

آپ نے آخر تک پوری سورت تلاوت کی۔ اور میرے دل میں اسلام پوری طرح گھر کر گیا۔

یہ ہے اصل واقعہ۔ لیکن چونکہ اس واقعہ کی ابتدا میں یہ الفاظ تھے کہ میں حضور کو چھیڑنے کی غرض سے نکلا۔ یار لوگوں نے اسے قتل کے منصوبے سے تبدیل کر دیا۔ اور مفت میں بہن اور بہنوئی کو بھی پٹوا دیا۔

ہم نے جو کچھ پیش کیا ہے اس کا ایک خاکہ سید سلیمان ندوی کی زبانی بھی سن لیجئے۔ وہ اپنے استاد محترم شبلی نعمانی کا رد کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

استاذ مرحوم نے سیرت کی پہلی جلد میں حضرت عمرؓ کے اسلام کا واقعہ جس طرح لکھا ہے وہ حرف بحرف الفاروق کی نقل ہے۔ اس میں مذکور ہے کہ حضرت عمرؓ نے اپنی بہن سے لیکر جو سورت پڑھی۔ اور جس سے متاثر ہو کر وہ مسلمان ہوئے۔ وہ

سَبَّحَ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ۔	آسمانوں اور زمینوں میں جتنی بھی مخلوقات ہیں۔ وہ اللہ کی تسبیح کرتی ہیں۔

یعنی سورۂ حدید تھی۔ اس میں شک نہیں کہ بزار، طبرانی، بیہقی اور ابونعیم میں یہ روایت بھی ہے لیکن حد درجہ کمزور ہے۔ علاوہ ازیں حضرت عمرؓ کا اسلام مکہ کا واقعہ ہے۔ اور سورۂ حدید مدنی ہے۔ اس کو حضرت عمرؓ اس وقت کیونکر پڑھ سکتے تھے۔ استاذ مرحوم نے الفاروق میں یہ واقعہ کتب رجال و تاریخ کے حوالہ

سے نقل کیا ہے لیکن حدیث دسیر کی کتابوں میں یہ واقعہ دو صورتوں سے مذکور ہے۔ ایک تو وہی مشہور صورت ہے کہ حضرت عمرؓ تلوار کر سے لگا کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے قتل کے ارادے سے نکلے تھے۔ کہ راہ میں ایک مسلمان سے ملاقات ہوگئی۔ اس نے حضرت عمرؓ کے ارادے کا حال سن کر کہا کہ پہلے اپنے گھر کی تو خبر لو، تمہاری بہن اور بہنوئی اس نئے دین میں داخل ہوچکے ہیں۔ حضرت عمرؓ غصہ میں اپنی بہن کے گھر گئے اور مار پیٹ کی۔ بالآخر انہوں نے قرآن کی ایک سورت لے کر بہن سے پڑھی۔ اور وہ سورۂ طٰہٰ تھی۔ اور جب اس آیت پر پہنچے۔

اِنَّنِیٓ اَنَا اللّٰہُ لَآ اِلٰہَ اِلَّآ اَنَا	یقیناً میں اللہ ہوں۔ میرے علاوہ کوئی الٰہ
فَاعْبُدْنِیْ وَاَقِمِ	نہیں۔ پس میری عبادت کر۔ اور میرے
الصَّلٰوۃَ لِذِکْرِیْ	ذکر کے لئے نماز قائم کر۔

تو یہ اثر ہوا کہ دل سے لا الٰہ الا اللہ پکار اٹھے۔ اور دراقدس پر حاضری کی درخواست کی۔ یہ روایت ابن سعد، ابویعلی، دارقطنی، حاکم اور بیہقی میں حضرت انسؓ بن مالک سے مروی ہے۔ لیکن حددرجہ کمزور ہے۔ اور اُن دونوں میں ایسے روات ہیں جو قبول کے لائق نہیں۔ اور محدثین نے اس کی تصریح کی ہے۔

سید صاحب مرحوم حاشیہ میں اس کی مزید وضاحت کرتے ہوتے لکھتے ہیں۔

دارقطنی نے اس روایت کو مختصراً لکھ کر کہا ہے کہ اس کا ایک راوی قاسم بن عثمان بصری قوی نہیں۔ (باب الطہارۃ للقرآن) ذہبی نے مستدرک حاکم صہ۵۱۹ ج ۴ کے استدراک میں لکھا ہے کہ یہ روایت واہی اور منقطع ہے۔ اور میزان الاعتدال میں قاسم بن عثمان کے حال میں جو اس روایت کا ایک راوی ہے لکھا ہے۔ اس نے حضرت عمرؓ کے اسلام کا قصہ بیان کیا ہے وھی منکرۃ جداً اور وہ نہایت ہی منکر ہے۔ کنز العمال (فضائل عمر بن الخطاب) میں بھی اس روایت کی کمزوری ظاہر کی گئی ہے۔ ان روایتوں کے مشترک راوی، اسحاق بن یوسف، قاسم بن عثمان، اسحاق بن ابراہیم الحنینی اور اسامہ بن زید بن اسلم ہیں۔ اور یہ سب پایۂ اعتبار سے ساقط ہیں۔

اس کے بعد سید صاحب نے مسند احمد کی روایت نقل کی۔ اور اس پر کوئی جرح نہیں کی۔ ہاں آخر میں یہ ضرور لکھا ہے کہ ابن اسحاق نے ان دونوں روایتوں کو بہت کچھ گھٹا بڑھا کر اپنی سیرت میں بغیر سند کے لکھا ہے۔ اس لئے وہ اس باب میں سند کے قابل نہیں۔ سیرت النبی ص۳۳۵ ج ۲

ہاں ابن اسحٰق نے ایک کرشمہ ضرور دکھایا ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ وہ کہتا ہے کہ حضرت عمرؓ رات کو شراب کی تلاش میں نکلے تھے۔ اور مکہ کی ایک ایک بھٹی پر مارے مارے پھر رہے تھے۔ اتفاق سے کعبہ میں پہنچ گئے (کیا وہاں بھی کوئی بھٹی موجود تھی ؟) حالانکہ تمام کتب احادیث اور کتب تفاسیر چیخ چیخ کر کہہ رہی ہیں کہ شراب کی حرمت کا سبب حضرت عمرؓ کی ذات ہے۔ ان ہی کے اصرار پر شراب حرام ہوئی۔ اور متعدد مورخین نے دعوی کیا ہے کہ حضرت عمرؓ نے زمانۂ جاہلیت میں بھی شراب کو ہاتھ نہیں لگایا۔ لیکن ابن اسحاقؒ جیسے مجوسی کے دل کو اُن پر الزام لگائے بغیر کیسے قرار آتا۔ اس لئے اس نے حضرت عمرؓ کو بدنام کرنے کے لئے کعبہ میں شراب کی بھٹی لگادی۔ اسی سے قارئین اندازہ کرلیں کہ حضور کے قتل کے پس پردہ کون سی ذہنیت کارفرما ہے۔ یہ وہی ذہنیت ہے۔ جس کا پرچار ایک شیعہ نے اس طرح کیا تھا ؎

بشکست پشت ہزبران عجم را | برباد و فنا داد تخت جم را
این عربدہ زغصب خلافت علی نیست | زاں عمر کینہ قدیم است عجم را

حضرت عمرؓ اور ان کی اولاد سے عجمیوں کو پرانا کینہ چلا آرہا ہے۔ اور ہمارے مورخ بھی عجمی ہیں۔ لہٰذا وہ کینہ نکالنا تو ضروری ہے۔ اور شاعر کے بقول حضرت علیؓ کی خلافت کا جو جھگڑا کیا جاتا ہے۔ اس کی کوئی حقیقت نہیں۔ اس کے پس پردہ بھی بغض عمرؓ کام کر رہا ہے۔ محمدؒ بن اسحاق کا تفصیلی حال ہم پہلے پیش کر چکے ہیں۔ کہ وہ کس قسم کا انسان تھا۔

ہاں ہمیں افسوس تو ان حضرات پر ہے جو عالم بھی تھے اور خود کو محقق بھی سمجھتے تھے۔ لیکن انہوں نے ابن اسحاق بلکہ اس سے بھی بدترین افراد کی روایات نقل کر کے۔ انہیں تاریخی حقائق قرار دیا۔ اور صحابہ پر تبرا کیا۔ بلکہ ایک مشہور زمانہ محقق نے تو عذر گناہ بدتر از گناہ پر عمل کرتے ہوئے ان کذابین کے بارے میں یہ فرمایا کہ اگر ہم ان کی روایات چھوڑ دیں گے۔ اور حدیث کی طرح تاریخی روایات کی چھان بین کریں گے

تو ہمارے پاس کیا بچے گا۔ اور ظاہر ہے کہ جب کچھ نہ بچے گا تو حضرت عثمانؓ پر قرابت داری، امیر معاویہؓ پر ملوکیت، عمروؓ بن عاص پر چال بازی اور دھوکہ دہی، مغیرہؓ بن شعبہ پر سیاسی رشوت دینے اور ولیدؓ بن عقبہ پر فاسق ہونے کا الزام کیسے قائم کیا جاتے گا۔ اور جب یہ سب چیزیں غلط قرار پائیں گی تو خلافت و ملوکیت کیسے وجود میں آئے گی۔

شعب بنی ہاشم میں محصور ہونا

اس سلسلہ میں سب سے اول تو یہ ذہن میں رکھیں کہ دو پہاڑوں کے درمیان کا وہ درہ جسے بعد کے مورخین نے شعب ابی طالب کے نام سے مشہور کیا ہے۔ اس کا اصل نام شعب بنی ہاشم ہے۔ یہ درہ بنو ہاشم کا موروثی تھا۔ اور اسی درہ میں تمام بنی ہاشم کے مکانات تھے۔ یہ کسی خاص فرد بشر کی ملکیت نہ تھا۔ سبائیوں نے اسے ابوطالب کی جانب منسوب کر کے مشہور کر دیا۔ جس سے یہ تاثر لیا جانے لگا کہ یہ ابوطالب کی ملکیت تھا۔ حتیٰ کہ پاک و ہند کا ہر فرد اسے شعب ابی طالب ہی کے نام سے یاد کرتا ہے۔ اور شبلی جیسا مورخ بھی اس مغالطہ کا شکار ہو گیا ہے۔ یا انہوں نے روانی تحریر میں شعب ابی طالب کی سرخی قائم کر دی۔

واقعہ کی نوعیت کچھ اس طرح ہے کہ جب کفار قریش نے یہ دیکھا کہ مسلمانوں پر اتنی سختیوں کے باوجود اسلام پھیلتا جا رہا ہے۔ اور روز بروز ان کی تعداد میں اضافہ ہو رہا ہے۔ اور جو لوگ ان حالات سے تنگ آ کر حبشہ ہجرت کر گئے تھے۔ انہیں شاہ حبشہ نے پناہ دی ہے۔ لہٰذا انہوں نے مل کر اب یہ فیصلہ کیا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے خاندان کو محصور کر کے اور فقر و فاقہ میں مبتلا کر کے تباہ و برباد

کر دیا جائے۔

چنانچہ تمام قبائل نے ایک معاہدہ مرتب کیا۔ کہ کوئی شخص نہ خاندان بنی ہاشم سے قرابت داری کرے گا۔ نہ ان کے ہاتھ خرید و فروخت کرے گا۔ نہ اُن سے ملے گا اور نہ ان کے پاس کھانے پینے کا سامان جانے دے گا۔ یہ معاہدہ نبوت کے ساتویں سال محرم میں مرتب کیا گیا۔ اور منصور بن عکرمہ نے یہ معاہدہ لکھ کر در کعبہ پر آویزاں کر دیا۔

ابو طالب مجبور ہو کر تمام قبیلے بنی ہاشم کے ساتھ اس درہ میں پناہ گزیں ہو گئے۔ اور تین سال تک بنی ہاشم نے اس محاصرہ میں بسر کی۔ یہ زمانہ ایسا سخت گزرا کہ طلح کے پتے کھا کھا کر گزارا کرتے تھے۔ حدیثوں میں جو صحابہ کی زبان سے مذکور ہے کہ ہم طلحہ کی پتیاں کھا کر گزارہ کرتے۔ یہ اسی زمانہ کا واقعہ ہے۔ حضرت سعدؓ بن ابی وقاص کا جو یہ بیان ہے کہ ہمارے پتے کھا کھا کر ہونٹ ایسے ہو گئے تھے۔ جیسے اونٹ کے ہونٹ ہوں۔ جب ہم اجابت کرتے تو وہ اونٹ کی مینگنیوں کی طرح ہوتی۔ ایک دفعہ رات کو سوکھا ہوا چمڑا میرے ہاتھ آگیا۔ میں نے اسے پانی سے دھویا۔ آگ پر بھونا۔ اور پانی میں ملا کر کھایا۔ یہ سب اسی دور کے حالات ہیں۔ گویا اس مقاطعہ میں وہ تمام حضرات شریک تھے جو مشرف باسلام ہو چکے تھے۔

یہ بھی ذہن میں رہے کہ ہاشم کے باپ عبد مناف   جس وقت بنی ہاشم کا یہ مقاطعہ کیا گیا۔ تو ہاشم کے دو بھائیوں کی اولاد نے حضورؐ کا ساتھ دیا۔ یعنی بنو نوفل اور بنو مطلب۔ اور بقیہ تین بھائیوں کی اولاد نے ان کا ساتھ نہیں دیا۔ اسی لئے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم مال فے میں سے بنو مطلب اور بنو نوفل کو مال عطا کیا کرتے تھے۔ جب حضرت عثمانؓ نے جو ہاشم کے چوتھے بھائی عبد شمس کی اولاد میں سے تھے۔ آپ سے دریافت کیا کہ آپ ہمیں اس مال سے کیوں نہیں نوازتے۔ تو آپ نے جواب میں فرمایا کہ مقاطعہ کے وقت بنو نوفل اور بنو مطلب نے ہمارا ساتھ دیا۔ لیکن بنو عبد شمس نے ہمارا ساتھ نہیں دیا۔ یہ واقعہ صحیح مسلم میں مذکور ہے۔

اس مقاطعہ میں مسلم اور غیر مسلم کی تمیز نہ تھی۔ بلکہ ابولہب کے علاوہ تمام خاندان بنی ہاشم، خاندان بنی مطلب اور خاندان بنی نوفل کے خلاف یہ مقاطعہ عمل میں آیا۔ حالانکہ ان تینوں خاندانوں کے بیشتر

افراد کافر تھے۔ چونکہ عرب میں ایک خاندان دوسرے خاندان کے کسی فرد پر ہاتھ نہیں اٹھا سکتا تھا۔ ورنہ جنگ کا ایک ایسا سلسلہ شروع ہوتا۔ جو صدیوں تک منقطع نہ ہوتا۔ اس لحاظ سے قریش کا ہر خاندان حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر ہاتھ اٹھاتے ہوئے ڈرتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ مکی زندگی میں کسی تاریخ اور کسی سیرت کی کتاب میں آپ کو یہ کہیں نظر نہیں آئے گا کہ حضرت علیؓ پر اسلام کی خاطر فلاں مصائب ڈھائے گئے۔ یا انہوں نے اسلام کی خاطر فلاں فلاں تکلیف برداشت کی۔ کیونکہ انہیں خاندان بنی ہاشم کی پشت پناہی حاصل تھی۔ اس لئے اُن پر کوئی دست اندازی نہ کر سکا۔ اگر حضور کو صحیح معنی میں ابو طالب اور بنی ہاشم کی حمایت حاصل ہوتی تو آپ پر بھی ہرگز کوئی زیادتی نہیں ہو سکتی تھی۔

ابن سعد نے روایت کیا ہے کہ جب بچے بھوک سے روتے تھے۔ تو اس درہ سے باہر آواز آتی تھی۔ قریش سُن سُن کر خوش ہوتے تھے۔ لیکن بعض رحم دل انسانوں کو رحم بھی آتا تھا۔ حضور کی بھی کمسن بچیاں تھیں (یعنی فاطمہ اور ام کلثوم) ایک دن حکیمؓ بن حزام نے جو حضرت خدیجہؓ کے بھتیجے تھے۔ تھوڑے سے گیہوں اپنے غلام کے ہاتھ حضرت خدیجہؓ کے پاس بھیجے۔ راہ میں ابو جہل نے دیکھ لیا۔ اور چھین لینا چاہا۔ اتفاق سے ابو البختری کہیں سے آ گیا۔ اگرچہ وہ کافر تھا لیکن اس کو رحم آیا۔ وہ بولا کہ ایک شخص اپنی پھوپھی کو کچھ بھیجنا چاہتا ہے۔ تو اسے کیوں روکتا ہے۔

یہ ہے اُس مقاطعہ کا پس منظر۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ یہ مقاطعہ آخر کیسے ختم ہوا۔ اس کے خاتمہ کے لئے جو داستان سرائی کی گئی۔ وہ ابن اسحاق، ابن سعد، بیہقی اور ابو نعیم نے اس طرح نقل کی ہے۔
کہ قریش نے جب بنو ہاشم کا مقاطعہ کر کے انہیں شعب بنی ہاشم میں محصور کیا۔ اور باہم معاہدہ مرتب کر کے تحریری صورت میں در کعبہ پر لٹکایا۔ تو چند سال کے بعد اللہ تعالیٰ نے دیمک کو بھیجا۔ جس نے کاغذ کو کھا لیا۔ ایک روایت میں ہے کہ اللہ کا نام چھوڑ کر باقی عبارت کو جس میں بنو ہاشم کے مقاطعہ کا عہد تھا۔ دیمک نے کھا لیا تھا۔ ایک اور روایت میں ہے کہ اللہ کا نام کھا لیا تھا۔ اور باقی عبارت چھوڑ دی تھی۔ اللہ تعالیٰ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو اس پر مطلع کیا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ابو طالب سے اس کا ذکر کیا۔ ابو طالب نے قریش کو اس کی خبر کی۔ اور بالآخر اس واقعہ کے جھوٹ اور سچ ہونے پر معاہدہ باقی

رہنے یا ٹوٹ جانے کا فیصلہ قرار پایا۔ کفار نے جب کاغذ کو اتار کر دیکھا تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے قول کی تصدیق ہوگئی۔

سید سلیمان ندوی مرحوم اس کی تردید کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

ابن اسحٰق کی روایت تو بے سند ہے۔ بقیہ تمام روایتیں واقدی یا ابن لہیعہ سے مروی ہیں۔ جن کا اعتبار نہیں۔ اور جو ثقہ راویوں سے مروی ہیں تو وہ تمام تر مرسل ہیں۔ ان تمام روایتوں میں اگر کوئی بہتر روایت ہے تو وہ بیہقی میں موسیٰ بن عقبہ کی ہے جو امام زہری سے اس کو روایت کرتے ہیں۔ مگر وہ زہری تک پہنچ کر رہ جاتی ہے کسی صحابی تک نہیں پہنچتی۔ سیرت النبی ص۶۶ ج ۳

زہری بے شک ایک مسلمہ امام ہیں۔ لیکن اُن کی روایت اسی صورت میں قبول کی جا سکتی ہے جب وہ اوپر کی سند بیان کریں۔ اس لئے کہ وہ چھوٹے درجہ کے تابعی ہیں۔ اور بڑے درجہ کے تابعین سے روایت نقل کرتے ہیں۔ اس طرح اوپر کے دو راوی غائب ہیں۔ اور جب دو راوی ایک دم سے غائب ہوں تو محدثین ایسی روایت کو معضل کہتے ہیں۔ جو بدترین ضعیف روایت سمجھی جاتی ہے۔ اور زہری کی تو مرسلات بھی قابل قبول نہیں۔

امام ترمذی نے کتاب العلل میں امام یحیی بن سعید القطان کا قول نقل کیا ہے۔ وہ فرماتے ہیں۔

ان مرسلات یحیی بن ابی کثیر لیس	یحی بن ابی کثیر کی مرسلات کچھ نہیں۔ اسی طرح
بشئ وهکذا مرسلات الزهري وسفیان	زہری اور سفیان بن عیینہ کی مرسلات ہیں۔
بن عیینة۔	

محمد بن اسحاق اور واقدی کا حال ہم پہلے پیش کر چکے ہیں۔ اب ابن لہیعہ کا بھی کچھ حال ملاحظہ فرمالیں۔ کیونکہ یہ محدثین میں بہت شہرت رکھتے ہیں۔

ابن لہیعہ: اس کا نام عبداللہ ہے۔ ابو عبدالرحمان اس کی کنیت ہے۔ مصر کا عالم تھا۔ وہاں کا قاضی بھی رہا۔ تبع تابعی ہے۔ ابوداؤد، ترمذی اور ابن ماجہ میں اس کی روایات پائی جاتی ہیں۔ لیکن ترمذی نے اسے خود ضعیف کہا ہے۔ یحی بن معین فرماتے ہیں یہ ضعیف ہے۔ قابل حجت نہیں۔ حمیری کا بیان ہے کہ یحیٰ بن سعید القطان اسے کچھ نہ سمجھتے تھے۔ عبدالرحمان بن مہدی فرماتے ہیں۔ میں اس کی روایت نہیں لیتا

اوراس کی وجہ یہ ہے کہ اس نے اپنی کچھ روایات لکھ کر بھیجی تھیں۔ جن میں ا س نے یہ بیان کیا تھا کہ یہ روایات میں نے عمرو بن شعیب سے سنی ہیں۔ لیکن جب میں نے یہ روایات امام عبداللہ بن المبارک کو پڑھ کر سنائیں تو وہ اندر گھر میں گئے۔ اور اس ابن لہیعہ کی کتاب کی نقل اٹھا کر لے آئے۔ اس کتاب میں اُن تمام روایات کے بارے میں یہ لکھا ہوا تھا۔ کہ ابن لہیعہ نے یہ تمام روایات اسحاق بن ابی فروہ سے سنی ہیں جو ناقابل اعتبار راوی ہے۔ ابن لہیعہ نے اسحاق کا نام تبدیل کرکے عمرو بن شعیب کی جانب یہ روایات منسوب کر دیں۔

(اس نے اپنے جھوٹ کو چھپانے کے لئے بہانہ یہ تراشا کہ میرے گھر میں آگ لگ گئی تھی جس سے میرے تمام مسودات جل گئے۔ اس لئے میں اب روایت میں بھول جاتا ہوں)

یحیٰ بن بکیر کا بیان ہے کہ اس کے گھر میں ۱۷۰ھ میں آگ لگی تھی جس سے اس کے مسودات جل گئے۔ لیکن عثمان بن صالح کہتے ہیں کہ کوئی مسودہ نہیں جلا تھا۔ صرف یہ ہوا تھا کہ اس مسودے میں چند اجزا علیحدہ نقل کر رکھے تھے۔ اور وہ لوگوں کو اسی میں سے روایات سنایا کرتا تھا اس نقل کا کچھ حصہ جل گیا تھا۔ عثمان بن صالح یہ بھی فرماتے ہیں کہ میں اس کی بیماری کی ابتدا سے واقف ہوں۔ ایک روز میں اور عثمان بن عتیق جمعہ پڑھ کر آ رہے تھے۔ ہمارے آگے آگے گدھے پر سوار یہ ابن لہیعہ جا رہا تھا۔ اچانک اس پر فالج گرا۔ اور یہ گدھے سے نیچے گر پڑا۔ عثمان بن عتیق ایک دم سے آگے بڑھے۔ انہوں نے اسے سہارا دے کر بٹھایا۔ اور پھر ہم اسے اس کے گھر پہنچا کر آئے۔ اس کی اصل بیماری یہ تھی۔

امام احمد بن حنبل فرماتے ہیں یہ مثنیٰ بن الصباح سے احادیث لکھتا۔ اور انہیں عمرو بن شعیب کی جانب منسوب کر دیتا۔ یحیٰ بن معین کہتے ہیں یہ قوی نہیں، ایک بار فرمایا یہ ضعیف ہے۔

یحیٰ بن سعید القطان کا قول ہے کہ مجھے بشر بن السری نے حکم دیا کہ اگر تیری ابن لہیعہ سے ملاقات ہو تو تو اس سے کوئی روایت نہ لینا۔ یحیٰ بن معین فرماتے ہیں۔ یہ کتابیں جلنے سے قبل بھی ضعیف تھا اور بعد میں بھی ضعیف ہے۔

ابوزرعہ رازی فرماتے ہیں۔ اس کی ابتدائی اور آخری روایات سب برابر ہیں۔ ہاں ابن المبارک اور ابن وہب اس سے جو روایات نقل کرتے ہیں۔ وہ پرکھ کر نقل کرتے ہیں۔ نسائی کہتے ہیں ضعیف ہے۔ اور یہ

بھی فرماتے ہیں کہ میں نے اپنی سنن میر ،اس کی کوئی روایت نہیں لی۔ سوائے ایک روایت کے کہ سورۃ حج میں دو سجدے ہیں۔

ابن ابی مریم کا بیان ہے کہ آخرعم رمیں اس کے پاس گیا تو ہر ہر قوم کی ایک جماعت اس سے احادیث پڑھ رہی تھی۔ اور یہ اُن سے منصور، اعمش ،اور علماء عراق کی احادیث بیان کر رہا تھا۔ میں نے اس سے سوال کیا۔ تیرا اہل عراق کی احادیث سے کیا تعلق ۔تو مصر کا باشندہ ہے۔ تجھے اہل عراق کی احادیث کا کیسے علم ہوا۔ کہنے لگا کہ راہ چلتے یہ احادیث میرے کانوں میں پڑ گئی تھیں۔ (یعنی بلاتحقیق انہیں بیان کرنا شروع کر دیا۔)

ابوزرعہ اور ابوحاتم کہتے ہیں۔اس کا معاملہ پریشان کن ہے۔ لیکن شہادت کے طور پر اس کی روایات لکھی جائیں۔ جوزجانی کا بیان ہے کہ اس کی حدیث پر کوئی نور نہیں ہوتا۔ یہ حجت کے قابل نہیں۔

امام احمد فرماتے ہیں۔ ابن لہیعہ کی ، حدیث حجت نہیں لیکن میں اس کی روایات اس لئے لکھتا ہوں کہ شاید کسی حدیث صحیح کی اس کی روایت سے تا ئید ہوتی ہو۔

امام ذہبی فرماتے ہیں۔ اسے خلیفہ منا سور نے ۱۵۵ھ میں مصر کا قاضی بنایا تھا اور تیس اشرفی ماہانہ اس کا وظیفہ متعین کیا تھا۔ یہ نوماہ اس عہدے پر فا ئز رہا۔

ابوالاسود النضر کا بیان ہے کہ مصر کے ع لماء جو احادیث بیان کرتے تھے۔ ان کیمطابق اس نے بہت کم فیصلے کئے ہیں۔

امام ابن حبان اس کی زندگی کا مختصر سا جائز ہ ان الفاظ میں پیش کرتے ہیں کہ ابن لہیعہ ۹۶ھ میں پیدا ہوا ۱۷۴ھ میں وفات پائی۔ طبعاً یہ نیک آدمی تھا۔ لیکن ضعیف راویوں سے روایت نقل کرتا۔ اور درمیان سے ان کا نام اڑا دیتا۔ پھر اس کی کتابیں جل گئیں۔ اسی لئے بعض محدثین کا قول یہ ہے کہ جن حضرات نے اس سے ابتدا میں احادیث نقل کی ہیں تو وہ معتبر ہیں۔ اور وہ چار شخص ہیں۔ عبداللہ بن المبارک، عبداللہ بن وہب، عبداللہ بن یزید المقریٔ اور عبداللہ بن مسلمۃ القعنبی۔ یہ لوگ جو اس سے روایت نقل کریں گے وہ قابل قبول ہو گی۔ ورنہ نہیں۔

آخرعم ر میں اس کی جتنی روایات ہیں سب بے بنیا د ہیں۔ یہ ضعیف راویوں سے موضوع روایات نقل کرتا

اور انہیں ثقہ راویوں کی جانب منسوب کر دیتا ہے۔ بخاری نے کتاب الضعفاء میں اس کو ضعیف اور اس کی روایت کو منکر قرار دیا ہے۔

ہم اس کی حقیقت حال ظاہر کرنے کیلئے اس کی ایک روایت پیش کئے دیتے ہیں۔

اس نے حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص سے یہ روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مرض الموت میں فرمایا۔ میرے بھائی کو میرے پاس بلاؤ۔ لوگوں نے ابوبکرؓ کو بلایا۔ آپ نے ان کی جانب سے منہ پھیر لیا اور پھر فرمایا میرے بھائی کو بلاؤ تو عثمانؓ بلائے گئے۔ آپ نے ان کی جانب سے بھی منہ پھیر لیا۔ پھر فرمایا میرے بھائی کو بلاؤ۔ اب علیؓ کو بلایا گیا۔ آپ نے انہیں اپنے کپڑے میں چھپا لیا۔ جب علیؓ آپ کے پاس سے نکلے تو لوگوں نے دریافت کیا کہ حضور نے تم سے کیا باتیں کیں کہنے لگے۔ حضور نے مجھے علم کے ایک ہزار دروازوں کی تعلیم دی۔ اور ہر دروازے میں ایک ہزار دروازے تھے۔

امام ابن عدی کامل میں فرماتے ہیں۔ یہ روایت اسی ابن لہیعہ کی وضع کردہ ہے۔ کیونکہ وہ غالی شیعہ تھا۔ میزان الاعتدال ص۴۷۵ ج ۲

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ یہ مقاطعہ کیسے ختم ہوا۔ اس کا کوئی نہ کوئی سبب تو ضرور ہوگا۔ بیشک اس کے اسباب رونما ہوتے۔ لیکن وہ سب دنیاوی اسباب تھے۔ قدرتی اور آسمانی اسباب نہ تھے۔ اب ان اسباب کا حال علامہ شبلی کی زبانی سن لیجیے۔

متصل تین برس تک آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور تمام آل ہاشم نے یہ مصیبتیں جھیلیں۔ بالآخر دشمنوں ہی کو رحم آیا اور خود ان ہی کی طرف سے اس معاہدہ کے توڑنے کی تحریک ہوئی۔ ہشام عامری جو خاندان بنی ہاشم کا قریبی رشتہ دار اور اپنے قبیلہ میں ممتاز تھا۔ وہ چوری چھپے بنوہاشم وغیرہ کو غلہ وغیرہ بھیجتا رہتا تھا۔ ایک دفعہ وہ زہیر کے پاس جو عبدالمطلب کا نواسا تھا۔ گیا۔ اور کہا کیوں زہیر تم کو یہ پسند ہے کہ تم کھاؤ، پیو، ہر قسم کا لطف اٹھاؤ اور تمہارے ماموں کو ایک دانہ تک نصیب نہ ہو، زہیر نے کہا کیا کروں۔ تنہا ہوں، ایک شخص بھی میرا ساتھ دے تو میں اس ظالمانہ معاہدہ کو پھاڑ کر پھینک دوں، ہشام عامری نے کہا میں موجود ہوں، دونوں مل کر مطعم بن عدی کے پاس گئے۔ ابوالبختری، ابن ہشام [illegible] سود نے بھی

ساتھ دیا۔ دوسرے دن سب مل کر حرم میں گئے۔ زہیر نے سب لوگوں کو مخاطب کر کے کہا۔ اے اہل مکہ یہ کیا انصاف ہے کہ ہم لوگ آرام سے بسر کریں اور بنو ہاشم کو آب و دانہ نصیب نہ ہو۔ اللہ کی قسم جب تک یہ ظالمانہ معاہدہ چاک نہ کر دیا جائے گا میں باز نہ آؤں گا۔ ابوجہل برابر سے بولا۔ ہرگز اس معاہدہ کو کوئی ہاتھ نہیں لگا سکتا۔ زمعہ نے کہا تو جھوٹ کہتا ہے۔ جب یہ لکھا گیا تھا۔ ہم تو اُس وقت بھی راضی نہ تھے۔ جبیرؓ بن مطعم نے ہاتھ بڑھا کر اس دستاویز کو چاک کر دیا مطعم بن عدی، عدی بن قیس، زمعہ بن الاسود، ابو البختری اور زہیر وغیرہ سب ہتھیار باندھ کر بنو ہاشم کے پاس گئے۔ اور ان کو درہ سے نکال لائے بقول ابن سعد یہ سنہ نبوی کا واقعہ ہے۔

یہ تمام واقعہ ابن ہشام، طبری اور ابن سعد وغیرہ میں مذکور ہے۔ اس واقعہ کے کچھ دن بعد حضرت خدیجہؓ انتقال کر گئیں۔ اور ابوطالب بھی مر گیا۔ اس کے بعد معراج کا واقعہ پیش آیا۔ سیرت النبی ص ۲۲۶ ج ۱

معراج رسول

اور

اُمِّ ھانی کا گھر

یہ ایک مشہور داستان ہے کہ جس رات آپ کو معراج ہوئی اُس رات آپ اُمِّ ہانی کے گھر آرام فرما رہے تھے۔ وہیں سے آپ کو معراج ہوئی۔ حالانکہ قرآن پکار پکار کر کہہ رہا ہے۔

سُبْحٰنَ الَّذِیْٓ اَسْرٰی بِعَبْدِہٖ لَیْلًا — پاک ہے وہ ذات جو راتوں رات اپنے
مِّنَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ اِلَی الْمَسْجِدِ الْاَقْصَا — بندے کو مسجد حرام سے مسجد اقصٰی تک لے گئی۔

صحیح بخاری اور صحیح مسلم میں حضرت انسؓ بن مالک اور حضرت مالکؓ بن صعصعہ کے ذریعہ حضور کا یہ فرمان مروی ہے۔ اَنَا فِی الْبَیْتِ (میں بیت اللہ میں تھا) اَنَا فِی الْحَطِیْمِ (میں حطیم میں تھا)۔ لیکن تب بھی ہمارے علماء برسر منبر اپنی تقاریر میں، اپنے مضامین اور اپنی تصنیفات میں یہی فرماتے اور لکھتے نظر آتے ہیں

کہ معراج ام ہانیؓ کے گھر سے ہوئی۔ اتفاق سے جن علما کی نظر قرآن و حدیث پر گئی۔ انہوں نے تب بھی اس روایت کو اپنے دامن سے چمٹائے رکھا۔ کچھ حضرات نے تو یہ تاویل فرمائی کہ ام ہانیؓ کا گھر حطیم میں تھا۔ حالانکہ حطیم میں کسی کا بھی مکان موجود نہ تھا۔ اور مولوی احتشام الحق تھانوی مرحوم نے تو عجیب کمال کر دکھایا۔ انہوں نے اپنے متعدد مضامین میں جو اخبار جنگ میں شائع ہوتے رہے۔ فرمایا کہ آپؐ ام ہانیؓ کے گھر لیٹے ہوئے تھے۔ دو فرشتے آئے۔ انہوں نے ام ہانیؓ کے گھر کی چھت پھاڑی۔ اور آپ کو کعبہ اٹھا کر لے گئے۔ یہ طریقہ اس لئے اپنایا گیا کہ کوئی قرآن پیش کر کے ان کا رد بھی نہ کر سکے۔ اور ام ہانیؓ سے جو ناتہ ہے وہ بھی ہاتھ سے نہ چھوٹے۔ حالانکہ ان کے جواب کے لئے صحیح بخاری اور صحیح مسلم کے یہ الفاظ کافی ہیں ارکہ میں بیت اللہ میں تھا۔ میں حطیم میں تھا۔ لیکن چونکہ ام ہانیؓ کی داستان ذہنوں سے چمٹی ہوئی تھی۔ لہٰذا فرشتوں کو بھی نقب زنی کا فن سکھانا پڑا۔ ہمیں اس واقعہ پر جو اعتراضات ہیں وہ تو ہم بعد میں پیش کریں گے پہلے سید سلیمان ندوی مرحوم کی تحقیق بھی ملاحظہ فرمائیے۔

بعض نیچے درجہ کی روایتوں اور تاریخ کی کتابوں میں ام ہانی کا بیان ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو میرے گھر میں معراج ہوئی۔ ام ہانیؓ کا گھر شعب ابی طالب میں تھا۔ یہ روایت مشہور دروغ گو کلبی کی ہے۔ اس روایت میں حد درجہ لغو اور غریب و منکر باتیں مذکور ہیں۔

مسند ابی یعلیٰ میں ام ہانیؓ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم عشاء کی نماز پڑھ کر ہم لوگوں کے ساتھ میرے مکان میں سوئے۔ شب کو میری آنکھ کھلی تو آپ کو نہ پایا۔ رؤسائے قریش کی دشمنی کے باعث دل میں عجیب عجیب بدگمانیاں پیدا ہونے لگیں۔ نیند نہ آئی۔ صبح اٹھ کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے معراج کا واقعہ بیان کیا۔ اور فرمایا کہ میں رؤسائے قریش سے کہنے جاتا ہوں۔ میں نے آپ کا دامن پکڑ لیا کہ للہ اُن سے یہ نہ کہئے وہ آپ کی تکذیب کریں گے۔ اور آپ کی جان پر حملہ کریں گے۔ لیکن آپ نے نہ مانا اور دامن جھٹک کر چلے گئے۔

ان روایتوں میں علاوہ اور لغویات کے عشاء اور صبح کی نماز و جماعت کی بات کس قدر غلط ہے۔ کہ یہ نماز پنجگانہ تو عین شب معراج میں فرض ہوئی ہے۔ ظاہر ہے کہ اس قسم کی روایتوں کا صحیحین کے مقابلہ میں کیا

رتبہ اور اعتبار ہو سکتا ہے۔ اس لئے اس میں کوئی شک نہیں کہ معراج کی شب آپ خانہ کعبہ میں تھے۔

سیرت النبی ص۱۰۱ ج ۲

سید صاحب مرحوم نے اس روایت کو اس قابل بھی تصور نہیں کیا کہ اس پر کھل کر تبصرہ فرماتے۔ اور اس کی ضرورت بھی نہیں۔ اس لئے کہ اس کہانی کا واضع مفسر اور مؤرخ کلبی ہے۔ جو تفسیر ابن عباسؓ کا واضع ہے۔ اس نے یہ روایت تفسیر میں بیان کی۔ اور وہاں سے بعد میں آنے والے اسے لے اڑے۔ ہم اس کا تفصیلی حال پہلے بیان کر چکے ہیں۔ یہ تو واقدی سے بھی زیادہ بدترین انسان ہے لیکن اس روایت میں ایسے متعدد عیوب بھی ہیں کہ اگر اس کے راوی معتبر بھی ہوتے تب بھی یہ روایت ماننے کے قابل نہ تھی۔

۱۔ام ہانی فتح مکہ کے روز اسلام لائیں۔ اور معراج ہجرت نبوی سے قبل ہوئی۔

۲۔ عشاء اور صبح وغیرہ کی نمازیں اسی رات تو فرض ہوئی تھیں۔ کیا فرضیت سے قبل ہی نمازیں پڑھ لی گئیں۔

۳۔لفظ ہم سے ام ہانیؓ کی کیا مراد ہے۔ اگر ان کی مراد ان کا خاوند ہے تو وہ حضور کا بدترین دشمن تھا۔ اور فتح مکہ کے بعد بھاگ کر نجران چلا گیا۔ پھر وہاں سے روم چلا گیا۔ اور عیسائی بن گیا۔ اور اسی حالت میں مر گیا۔

۴۔حضور نے حضرت خدیجہؓ سے قبل ان ام ہانیؓ کے لئے ابوطالب کو پیغام نکاح دیا تھا۔ جس کا ذکر اوپر آ چکا ہے۔ اور ابوطالب نے آپ کو فقیر اور غیر شریف بتا کر صاف انکار کر دیا تھا۔ اور اس کا نکاح ہبیرہ سے کیا جو آپ کا بدترین دشمن ثابت ہوا۔ ایسی صورت میں کیا یہ ممکن ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اس کے گھر جا کر سوئیں گویا اس کلبی رافضی نے اپنی اس کہانی کے ذریعہ حضور کی ذات اقدس پر دو الزام قائم کئے۔

(ا) اگر ہبیرہ کی موجودگی میں سوئے تو اس سے زیادہ بے غیرتی کوئی نہیں ہو سکتی کہ آپ اس شخص کے گھر جا کر سوئیں۔ جس کے باعث آپ کو فقیر اور غیر شریف قرار دیا گیا۔ اور اب آپ کا دشمن بھی ہے۔ ممکن ہے کہ وہ آپؐ کو اپنا رقیب بھی تصور کرتا ہو۔

(ب) اور اگر ہبیرہ کی غیر موجودگی میں سوئے تو گویا آپؐ نے ایک دشمن کو یہ موقعہ فراہم کیا کہ وہ آپ کی

عفت و عصمت پر حملہ آور ہو۔

۵۔ یہ کہانی قرآن اور صحیح احادیث کے خلاف ہے۔

۶۔ آپ پوری رات گھر سے کیسے باہر رہ سکتے تھے۔ جب کہ آپ کے گھر میں دو کمسن لڑکیاں یعنی فاطمہؓ اور ام کلثومؓ موجود تھیں۔ انہیں چھوڑ کر کسی دوسرے کے گھر سونے کا کیا مقصد۔

۷۔ بقول راوی ام ہانیؓ آپ کا دامن پکڑ کر آپ کو یہ واقعہ بر سر عام بیان کرنے سے روکنا چاہتی ہیں تاکہ لوگوں کو علم نہ ہو۔ یہ اس امر کا ثبوت ہے کہ اُس رات گھر پر پہرہ موجود نہیں تھا۔ یہ حضور کی ذات اقدس پر کتنا رکیک حملہ ہے اور جب پہرہ موجود نہیں تھا تو وہ کون سے افراد تھے جو ام ہانیؓ کے گھر سوئے تھے، اور جنہوں نے جماعت کے ساتھ عشاء کی نماز پڑھی تھی۔

یہ روایت ایک طویل داستاں ہے ہم اس کے کچھ حصے آگے پیش کریں گے۔

معراج سے متعلق چند مزید داستانیں

تاریخ و سیر کی کتابوں سے واپسی کے بعد کے سلسلہ میں مختلف واقعات نقل کئے جاتے ہیں۔ جن میں سے ایک واقعہ یہ بھی ہے کہ راستہ میں آپ کو قریش کے اونٹ اور قافلے ملے تھے۔ ان قافلوں والوں پر جو کچھ گزر رہی تھی، آپ نے اہل مکہ کے سامنے بیان کیا کہ فلاں فلاں وقت پہنچے گا۔ اور وہ اسی وقت وہاں پہنچا۔

بعض لوگ حضرت صدیقؓ کے پاس گئے۔ اور ان سے کہا کہ تمہارے رسول تو کہتے ہیں کہ وہ رات کو بیت المقدس سے ہو آئے ہیں۔ جہاں قافلہ ایک مہینہ میں جاتا اور ایک مہینہ میں آتا ہے صدیقؓ نے فرمایا اگر وہ کہتے ہیں تو میں اس کی تصدیق کرتا ہوں۔ میں تو ان کی اس سے بڑی بات کی بھی تصدیق کرتا ہوں۔ وہ کہتے ہیں کہ آسمان سے میرے پاس فرشتے آتے ہیں۔ اور میں اس کو قبول کرتا ہوں۔ اس کے بعد حضرت صدیقؓ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ اور عرض کیا۔ یا رسول اللہ کیا آپ نے ایسا فرمایا ہے، آپ نے کہا ہاں۔ صدیقؓ نے فرمایا میں اس کی تصدیق کرتا ہوں۔ جو کچھ آپ فرماتے ہیں وہ سچ ہے۔ اسی وجہ سے

حضرت ابوبکرؓ کا لقب صدیقؓ ہو گیا۔ اصح السیر ص۱۰۲

ایک روایت ہے کہ جب رات کو آپ کے اعزا نے آپ کو بستر پر نہ پایا تو آپ کو ڈھونڈنے کے لئے پہاڑوں اور غاروں میں نکل گئے۔ کیونکہ انہیں یہ خوف پیدا ہوا کہ کہیں قریش آپ کو گزند نہ پہنچائیں۔ ان قصوں کے آخر میں یہ بھی ہے کہ جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں سے معراج کا واقعہ بیان کیا۔ تو بہت سے مسلمانوں کے ایمان متزلزل ہو گئے اور اکثر مسلمان مرتد ہو گئے۔

فارتد کثیرا ممن اسلم — تو بہت سے مسلمان مرتد ہو گئے

ان واقعات کی ابتدا میں یہ بھی ہے کہ معراج ام ہانیؓ کے گھر سے ہوئی۔ اور ام ہانیؓ نے آپ کو صبح کے وقت باہر جانے اور لوگوں کے سامنے یہ واقعہ بیان کرنے سے روکا۔ یہ وہ ام ہانیؓ والی کہانی نہیں ہے۔ جس کا ذکر اوپر کیا گیا تھا۔ بلکہ یہ کہانی حضرت ابو ہریرہؓ کی جانب منسوب کی گئی ہے۔ حالانکہ حضرت ابو ہریرہ ؁ میں اسلام لائے۔ اور ان کا مکہ سے کوئی تعلق نہ تھا۔

سید سلیمان ندوی اس کہانی پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

یہ تمام قصے سرتاپا لغو اور باطل ہیں۔ ابن اسحاق اور ابن سعد نے تو سرے سے ان واقعات کے اسناد نہیں لکھے۔ لیکن ابن جریر طبری، بیہقی، ابن ابی حاتم، ابویعلی، ابن عساکر نے ان کی سندیں ذکر کی ہیں۔ ان کے رواۃ ابوجعفر رازی، ابو ہارون عبدی اور خالد بن یزید ابی مالک ہیں جن میں سے ابوجعفر رازی گو بجائے خود ثقہ ہیں۔ مگر بے سروپا روایتوں کے بیان کرنے میں بے باک ہیں۔ بقیہ دو مشہور کذاب اور دروغ گو ہیں۔

ابن جریر طبری نے حسن بصری، قتادہ اور ابن زید سے بھی واقعہ ارتداد نقل کیا ہے۔ لیکن ان کا سلسلہ اُن سے آگے نہیں بڑھتا۔

اس واقعہ کے انکار کی سب سے پرزور دلیل ہمارے پاس یہ ہے کہ اس وقت مکہ میں جو اصحاب اسلام لائے تھے۔ وہ گنے چنے لوگ تھے۔ جو ہم کو نام بنام معلوم ہیں۔ ان میں سے کسی کی پیشانی پر ارتداد کا داغ نہیں۔ سیرت النبی ص۴۱۹ ج ۳۔

جہاں تک حسن بصری تابعی، قتادہ تابعی اور ابن زید تبع تابعی کے اقوال کا سوال ہے یہ ان کی آرا ہیں حدیث نہیں۔ اور ان حضرات کو قرآن کی ایک آیت کے باعث مغالطہ ہوا ہے۔ وہ آیت یہ ہے۔

وما جعلنا الرؤیا التی اریناك الا فتنة للناس۔ — اور ہم نے جو کچھ آپ کو دکھایا تھا۔ وہ لوگوں کی آزمائش کے لئے دکھایا تھا۔

ان حضرات نے اس آزمائش کو صحابہ کے لئے آزمائش تصور کر لیا۔ حالانکہ یہ واقعہ کفار کے لئے آزمائش تھا۔

رہا اس تفصیلی روایت کا سوال تو یہ حضرت ابوہریرہؓ سے مروی ہے۔ اسے ابوجعفر رازی نے ربیع بن انس سے نقل کیا ہے۔ وہ اسے ابوالعالیہ کے ذریعہ ابوہریرہؓ سے نقل کرتے ہیں۔ ربیع بن انس اور ابوالعالیہ مسلم امام ہیں لیکن ان سے یہ روایت ابوجعفر رازی کے علاوہ کوئی نقل نہیں کرتا۔ ابوجعفر سے یہ کہانی نقل کرنے والا ابو ہارون عبدی ہے۔ اور اس سے نقل کرنے والا خالد بن یزید بن ابی مالک ہے۔ یہ تینوں کس حیثیت کے افراد ہیں۔ سید صاحب نے ان کی جانب اشارے کئے ہیں لیکن ہم امام ذہبی کی زبانی ان کی صحیح صورت حال قارئین کے سامنے پیش کئے دیتے ہیں۔

ابوجعفر رازی: اس کا نام عیسیٰ بن ابی عیسیٰ ہے۔ یہ بصرہ میں پیدا ہوا، اور رے میں سکونت اختیار کی اس سے اس کا بیٹا عبداللہ اور ابونعیم روایت کرتے ہیں۔ یحییٰ بن معین اور ابوحاتم کہتے ہیں یہ ثقہ ہے لیکن علی بن المدینی کہتے ہیں یہ غلطیاں کرتا ہے۔ روایات میں خلط ملط کرتا ہے۔ فلاس کہتے ہیں اس کا حافظہ بہت خراب تھا ابن حبان کہتے ہیں یہ منکر روایات بیان کرتا اور انہیں مشہور ائمہ کی جانب منسوب کر دیتا ہے (جیسا کہ اس روایت کو ربیع بن انس اور ابوالعالیہ کی جانب منسوب کر دیا) ابوزرعہ کہتے ہیں اسے بہت وہم ہوتا تھا۔ ذہبی میزان میں فرماتے ہیں اس نے ربیع بن انس کے ذریعہ ابوالعالیہ سے اور ابوالعالیہ ابوہریرہؓ سے اس سند کے ذریعہ اس نے معراج کے سلسلہ میں ایک طویل روایت بیان کی ہے۔ جس میں بہت سی باتیں منکر ہیں۔ میزان ص۳۲۰ ج ۳

امام ذہبی نے صرف ابوجعفر رازی کے باعث اسے منکر قرار دے دیا۔ حالانکہ اس کا تو صرف حافظہ

خراب تھا۔ اس میں تو صرف اتنا ہی عیب تھا کہ لغو روایات کو مشہور ائمہ کی جانب منسوب کر دیتا۔ لیکن جب ان کے ساتھ بقیہ دو راویوں کو اور ملا لیا جائے۔ جن کا ذکر ہم ذیل میں کر رہے ہیں۔ پھر قارئین خود ہی فیصلہ کریں کہ اس کہانی کو کیا کہا جائے۔

خالد بن یزید: یہ دمشق کا باشندہ ہے۔ اس کا نسب نامہ خالد بن یزید بن عبدالرحمان بن ابی مالک الدمشقی ہے۔ یحییٰ ابن معین کہتے ہیں۔ یہ واہی انسان ہے۔ امام احمد فرماتے ہیں یہ کچھ نہیں۔ نسائی کا قول ہے یہ ثقہ نہیں ہے۔ دار قطنی کہتے ہیں ضعیف ہے۔

ابن ابی الحواری کا بیان ہے کہ میں نے امام یحییٰ بن معین کو یہ فرماتے سنا کہ عراق میں ایک کتاب ایسی ہے جسے دفن کر دینا چاہیئے وہ تفسیر کلبی ہے (یعنی تفسیر ابن عباس۔ ام ہانی کی پہلی کہانی اسی کتاب سے تعلق رکھتی ہے) اور شام میں بھی ایک ایسی کتاب ہے جسے دفن کرنا چاہیئے۔ وہ خالد بن یزید کی کتاب الدیات ہے۔ اس خالد کا دل اس وقت تک خوش نہیں ہوتا جب تک اپنے باپ اور صحابہ پر جھوٹ نہ بول لے۔

یہی احمد بن ابی الحواری کہتے ہیں کہ میں نے یہ کتاب خالد سے نقل کی تھی۔ بعد میں میں نے ایک عطار کو دیدی۔ وہ اس میں دوائیں باندھ باندھ کر لوگوں کو دیا کرتا تھا۔ ذہبی کہتے ہیں یہ ۱۰۵ھ میں پیدا ہوا۔ اور اسی سال کی عمر میں اس کا انتقال ہوا۔ میزان ص۲۹۲ ج ا

گویا یہ خالد تمام محدثین کے نزدیک ناقابل اعتبار اور امام یحییٰ بن معین کے نزدیک کذاب ہے۔ صحابہ پر جھوٹ بولتا ہے۔

اب تیسرے راوی ابو ہارون العبدی کا چہرہ بھی دیکھ لیجئے۔

ابو ہارون العبدی: اس کا نام عمارة بن الجوین ہے۔ ترمذی اور ابن ماجہ میں اس کی روایات پائی جاتی ہیں۔ ذہبی کہتے ہیں ضعیف ہے۔ امام حماد بن زید فرماتے ہیں کذاب ہے۔ امام احمد کا قول ہے کہ کچھ نہیں ہے۔ یحییٰ بن معین کہتے ہیں ضعیف ہے۔ اس کی روایات کی تصدیق نہیں ہوتی۔ نسائی کا قول ہے متروک الحدیث ہے۔ ابن حبان کا بیان ہے کہ یہ حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ کی جانب ایسی روایات منسوب کرتا ہے جو انہوں نے بیان نہیں کیں۔

امام شعبہ کہتے ہیں کہ اگر کوئی مجھے دو باتوں کا اختیار دے کہ یا قتل ہونا منظور کر لو یا اس ابوہارون کی روایات لوگوں کے سامنے بیان کرو، تو میں قتل ہونا منظور کروں گا لیکن اس کی روایت بیان کرنے کے لئے تیار نہیں۔ میں پہلے ہر قافلہ والوں سے اس کا حال پوچھتا لیکن پھر اتفاق سے یہ بصرہ آگیا۔ اس کے پاس ایک کتاب تھی۔ میں نے اسے دیکھا تو اس میں حضرت علیؓ کی برائیاں لکھی ہوئی تھیں۔

دارقطنی کا قول ہے کہ یہ متلون المزاج شخص تھا۔ کبھی رافضی بن جاتا تھا۔ اور کبھی خارجی۔ ابن حبان فرماتے ہیں یہ حضرت ابوسعید خدریؓ کے نام سے جتنی روایات بیان کرتا ہے۔ وہ سب جھوٹ ہیں۔ انہوں نے یہ روایات کبھی بیان نہیں کیں۔ جوزجانی کا قول ہے کہ ابوہارون کذاب ہے۔ صحابہ پر تہمتیں لگاتا ہے۔

امام شعبہ فرماتے ہیں میں اس کے پاس گیا۔ اور اس سے سوال کیا کہ تمہارے پاس ابوسعید خدریؓ کی جو لکھی ہوئی روایات ہیں وہ مجھے دکھاؤ۔ اس نے ایک کتاب نکال کر میرے سامنے رکھی۔ اس میں ایک روایت یہ بھی تھی کہ حضرت ابوسعیدؓ فرماتے ہیں کہ عثمانؓ بن عفان اپنے مرنے اور دفن ہونے سے قبل اللہ کا منکر بن چکا تھا۔ میں نے وہ کتاب اسے واپس کر دی اور اٹھ کر چلا آیا۔

یعنی ایک کتاب میں حضرت علیؓ کی برائیاں تھیں اور دوسری میں حضرت عثمانؓ کی۔ اب بات کھل کر سامنے آگئی کہ بہت سے مسلمان مرتد ہو گئے تھے۔ جن میں حضرت علیؓ اور حضرت عثمانؓ بھی داخل ہیں۔ اسی سے اس روایت کا اندازہ کر لیجئے۔ کہ یہ سبائی مؤرخین آپ کو کس منزل پر لے جانا چاہتے ہیں۔

یحیٰ بن معین فرماتے ہیں۔ اس کے پاس ایک صحیفہ تھا۔ جسے یہ صحیفۃ الوحی کہا کرتا تھا۔ صالح بن محمد کا بیان ہے کہ یہ تو فرعون سے بھی زیادہ جھوٹا ہے۔ ۱۳۴ھ میں اس کا انتقال ہوا۔ میزان ص ۱۷۳ ج ۳

اس تمام کہانی کے ذریعہ اول تو صحابہ کا مرتد ہونا ظاہر کیا گیا۔ اور دوسرے ام ہانیؓ کے گھر سے معراج کا ذکر کر کے حضور کی ذات پر الزام لگانے کی کوشش کی گئی۔ یہ ہے ان جھوٹی کہانیوں کا خلاصہ۔

کیا معراج ایک خواب تھا؟

ان سبائیوں اور خاص طور پر مؤرخین نے جہاں ہزارہا قسم کے سیاہ کارنامے انجام دیئے ہیں۔ وہاں صحابۂ کرام کی ذات کو بدنام کرنے اور اسلام کی صورت کو مسخ کرنے کا کوئی پہلو باقی نہیں چھوڑا۔ معراج سے متعلقہ پہلی روایات میں در پردہ حضورؐ کی ذاتِ اقدس پر تبرا کیا گیا۔ اور حضرات صحابہ کو مرتد ثابت کیا گیا۔ لیکن چونکہ ان سبائیوں کو ام المؤمنین عائشہؓ اور حضرت امیر معاویہؓ سے خاص بغض ہے۔ لہٰذا ان ہر دو حضرات کی جانب یہ بات منسوب کی گئی کہ یہ معراج جسمانی کے قائل نہ تھے۔ بلکہ یہ معراج کو ایک خواب تصور کرتے تھے۔ اگر واقعتاً معراج کی حیثیت ایک خواب کی ہوتی تو نہ کسی کے مرتد ہونے کا کیا سوال تھا۔ نہ قریش کے مذاق اڑانے کا اور نہ اُم ہانیؓ کے گھر کی کہانی وضع کرنے کا۔ آخر ان سبائیوں کو یہ داستانیں وضع کرنے کی کیا ضرورت پیش آئی تھی؟

حضرت امیر معاویہؓ اور حضرت عائشہؓ کی جانب جو روایات منسوب کی گئیں۔ ان ہی کو دیکھتے ہوئے سرسید نے معراج کے جسمانی ہونے کا انکار کیا تھا۔ اور قادیانی بھی ان ہی روایات کو سہارا بنا کر غلام احمد قادیانی کی معراج روحانی کے گیت گاتے رہے۔

امیر معاویہؓ کا قول: امیر معاویہ کے اس قول کو ابن ہشام نے زیاد البکائی کے واسطہ سے محمد بن اسحاق سے نقل کیا ہے۔ اس کے الفاظ ہیں۔

عن محمد بن اسحق قال حدثنی	محمد بن اسحاق سے مروی ہے کہ مجھ سے یعقوب
یعقوب بن عتبۃ بن المغیرۃ ان	بن عتبہ بن المغیرہ نے بیان کیا کہ معاویہؓ بن
معاویۃ بن ابی سفیان	ابی سفیان سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے
کان اذا سئل عن مسری رسول	معراج کے سلسلہ میں دریافت کیا گیا۔ انہوں
اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال	نے فرمایا یہ اللہ کی جانب سے ایک سچا خواب تھا۔
کانت رؤیا من اللہ صادقۃ۔	

اس روایت میں اگر ہم محمد بن اسحاق کی ذات اور اس کی مجوسیت کو بھی نظر انداز کر دیں تو یعقوب بن عتبۃ المغیرۃ تبع تابعی ہیں۔ ۱۲۸ھ میں ان کا انتقال ہوا۔ انہوں نے امیر معاویہؓ کو کیا خواب میں دیکھا تھا؟ اور کیا خواب میں امیر معاویہؓ نے ان سے اپنی اس رائے کا اظہار کیا تھا۔ اور یعقوب نے اس شخص کا نام نہیں لیا جس سے یعقوب نے امیر معاویہؓ کا یہ قول سنا تھا۔ درمیان سے یہ روایت منقطع ہوئی اور منقطع روایت قابل قبول نہیں ہوتی۔

پھر عربی لحاظ سے رؤیا مصدر ہے جس کے معنی دیکھنے کے آتے ہیں۔ یہ آنکھوں سے دیکھنے پر بولا جاتا ہے۔ خواب کے معنی میں تو مجازی طور پر استعمال ہوتا ہے۔ اس کا کیا ثبوت ہے۔ کہ امیر معاویہؓ نے اس لفظ کا استعمال مجازی معنیٰ میں کیا ہے۔ اور لغوی معنیٰ مراد نہیں لئے۔ اس صورت میں یہ روایت خود دلیل نہیں بن سکتی۔ بلکہ یہ خود دلیل کی محتاج ہوگی۔ اور دعویٰ اور دلیل ایک نہیں ہوا کرتے۔

ہمارے نزدیک یہ ساری کارستانی محمد بن اسحاق کی ہے۔ اس کے علاوہ اسے کوئی روایت نہیں کرتا۔ اور مجوسی ہونے کے ناتے اسے امیر معاویہ سے جو تعلق ہوگا اسے بیان کرنے کی بھی ضرورت نہیں ویسے ہم اس کا تفصیلی حال پہلے عرض کر چکے ہیں۔

محمد بن اسحاق سے اس کی مغازی نقل کرنے والے اصل دو افراد ہیں۔ ایک زیاد البکائی اور ایک سلمۃ الابرش۔ ابن ہشام نے زیاد البکائی سے اس کتاب کو نقل کر کے ترتیب دیا ہے۔ گویا سیرت ابن ہشام دراصل مغازی محمد بن اسحاق ہے۔ جو ابن ہشام نے زیاد البکائی سے نقل کی تھی۔ اور زیاد نے محمد بن اسحاق سے۔ آج دنیا میں محمد بن اسحاق کے نام کی اگر کوئی کتاب موجود ہے تو وہ یہی سیرت ابن ہشام ہے۔ یعنی جس طرح تفسیر کلبی تفسیر ابن عباس کے نام سے مشہور ہوگئی۔ اسی طرح مغازی ابن اسحاق سیرت ابن ہشام کے نام سے مشہور ہوگئی۔ چونکہ ابن ہشام نے اس کتاب کو زیاد البکائی سے نقل کیا ہے۔ اس لئے ہم زیاد البکائی کا بھی کچھ حال پیش کئے دیتے ہیں۔

مؤرخ زیاد البکائی: اس کا پورا نام زیاد بن عبداللہ بن الطفیل البکائی ہے۔ یہ کوفہ کا باشندہ تھا۔ اسے متعدد محدثین نے ثقہ قرار دیا ہے۔ امام بخاری نے بھی اس سے ایک

ے ابن اسحاق کا نسخہ مل گیا ہے۔

روایت نقل کی ہے لیکن دوسرے راوی کے ساتھ۔ گویا یہ اس روایت میں تنہا نہیں ہے مسلم میں بھی اس کی روایات پائی جاتی ہیں۔ امام احمد نے بھی اس سے روایات لی ہیں۔

امام احمد فرماتے ہیں یہ سچا ہے ابو زرعہ بھی اسے سچا کہتے ہیں۔ یحیٰ بن معین فرماتے ہیں غزوات کی روایات نقل کرے پھر تو کوئی حرج نہیں۔ لیکن بقیہ روایات میں ہرگز بھی قابل قبول نہیں۔ نسائی کہتے ہیں ضعیف ہے قوی نہیں ہے۔ ابو حاتم کا قول ہے کہ یہ حجت نہیں ہے۔ ابن المدینی فرماتے ہیں ضعیف ہے۔ ابن سعد کہتے ہیں کہ اگرچہ محدثین نے اس سے روایات لی ہیں لیکن محدثین کے نزدیک یہ حجت نہیں۔ صالح جزرہ کا بیان ہے کہ فی الذات تو ضعیف ہے۔ لیکن مغازی کی روایات میں معتبر ہے۔ عبداللہ بن ادریس کہتے ہیں۔ محمد بن اسحاق کے اقوال اور روایات نقل کرنے میں اس سے زیادہ قابل اعتبار کوئی نہیں۔ اس لئے کہ اس زیاد نے ابن اسحاق کی مغازی اسے دو دفعہ پڑھ کر سنائی تھی۔ اس کا انتقال ۱۸۲ھ میں ہوا۔ میزان ص۹۱ ج۲

اس تفصیل سے چند امور ظاہر ہوئے۔

۱۔ اکثر محدثین کے نزدیک یہ ناقابل اعتبار ہے۔

۲۔ جن کے نزدیک قابل اعتبار ہے۔ ان کے نزدیک بھی مغازی یعنی غزوات رسول کی روایات میں معتبر ہے۔ بقیہ روایات میں نہیں۔

۳۔ ہاں محمد بن اسحاق کے اقوال کو سب سے زیادہ صحیح طور پر نقل کرتا ہے۔

اتفاق سے اس روایت کا تعلق غزوات النبی سے نہیں۔ اس لئے بھی یہ روایت ناقابل قبول ہے۔ گویا کہ اس روایت میں تین عیوب جمع ہو گئے۔

۱۔ زیاد البکائی ناقابل اعتبار ہے۔

۲۔ ابن اسحاق مجوسی ہے یہودیوں سے روایات لیتا اور دھوکہ بازی سے کام لیتا ہے۔

۳۔ درمیان سے ایک راوی غائب ہے۔ اس طرح یہ روایت منقطع ہے۔ اور منقطع روایت تو کسی کے نزدیک بھی قابل قبول نہیں۔

حضرت عائشہؓ پر ایک الزام: طبری نے سخن فہم کی ایک روایت حضرت عائشہؓ کی جانب بھی منسوب کی ہے جو اس نے اپنی تفسیر میں نقل کی ہے۔

اس کے الفاظ ہیں۔

حدثنا ابن حمید قال حدثنا سلمۃ	ہم سے ابن حمید نے بیان کیا۔ ان سے سلمہ نے
عن محمد قال حدثنی بعض آل ابی	وہ محمد سے نقل کرتے ہیں۔ محمد کہتے ہیں کہ
بکران عائشۃ کانت تقول ما فقد	مجھ سے ابوبکر کی اولاد میں سے کسی نے بیان
جسد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم	کیا کہ عائشہؓ کہا کرتی تھیں کہ حضور کا جسم غائب
ولکن اسری بروحہ۔	نہیں ہوا تھا بلکہ معراج آپ کو آپ کی روح
	کے ذریعہ ہوئی۔

سید سلیمان ندوی اس روایت پر مختصراً کلام کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ اس روایت کے سلسلہ میں محمد بن اسحاق اور حضرت عائشہؓ کے درمیان ایک راوی یعنی خاندان ابی بکر کے ایک شخص کا نام و نشان مذکور نہیں ہے۔ اس لئے یہ روایت بھی پایۂ صحت سے فروتر ہے۔ سیرت النبی ص ۳۲۳ ج ۳

اس کہانی کو درجۂ صحت سے فروتر قرار دینا یہ بھی اس روایت کو ایک گونہ تسلیم کرنا اور اس کی حیثیت کو بڑھانا ہے۔ غالباً سید صاحب مرحوم نے صرف اس چیز کو پیش نظر رکھا کہ درمیان کے ایک راوی کا نام معلوم نہیں یعنی راوی مجہول ہے۔ اس لحاظ سے یہ روایت غریب و مجہول ہے۔ کاش سید صاحب ابن حمید اور سلمہ کے حال پر غور فرما لیتے تو ہمیں یقین ہے کہ وہ اس روایت کے بارے میں کچھ اور ہی رائے قائم فرماتے لہٰذا ہم پہلے سلمہ اور ابن حمید کے سلسلہ میں کچھ عرض کرنا چاہتے ہیں۔

مؤرخ سلمۃ الابرش: محمد بن اسحاق سے اس الزام کو نقل کرنے والا ایک شخص سلمہ نامی ہے۔ اس کا پورا نام سلمۃ بن الفضل ہے۔ ابرش کے لقب سے مشہور تھا۔ یہ رے کا قاضی تھا۔ اسی رے رازی کی نسبت سے مشہور ہے۔ اس کی کنیت ابوعبداللہ تھی۔ اپنے دور کا مؤرخ تھا۔ محمد بن اسحاق کی مغازی کا ایک راوی یہ بھی ہے۔ ہم اس کا حال اور اس کے بارے میں محدثین کے نظریات امام ذہبی

کی زبانی نقل کرتے ہیں۔

امام یحییٰ بن معین فرماتے ہیں مغازی میں اس کی کتاب سے زیادہ اور کوئی کامل کتاب نہیں۔ ہم نے اس سے کچھ روایات لکھی تھیں۔ امام اسحٰق بن راہویہ فرماتے ہیں یہ ضعیف ہے۔ بخاری کہتے ہیں اس کی بعض احادیث منکر ہوتی ہیں۔ نسائی کا قول ہے کہ یہ ضعیف ہے علی بن المدینی کا بیان ہے کہ ہم جس وقت رے سے واپس ہوئے تھے۔ تو ہم نے اُن روایات کو جو اس سے سُن کر لکھی تھیں لغو اور جھوٹ سمجھ کر زمین پر پھینک دیا تھا۔ یحیٰ بن معین کہتے ہیں کہ یہ ابرش رازی شیعہ تھا۔

امام ابوحاتم رازی فرماتے ہیں یہ قابل حجت نہیں۔ امام ابوزرعہ رازی کا ارشاد ہے کہ رے کے باشندے اسے قطعاً پسند نہ کرتے تھے۔ کیونکہ اس کے خیالات بہت گندے تھے۔ اور قاضی ہونے کے لحاظ سے لوگوں پر بہت ظلم ڈھاتا تھا۔ اگرچہ نمازیں بہت خشوع و خضوع سے پڑھتا۔ قاضی بننے سے قبل بچوں کو پڑھایا کرتا تھا۔ ۱۹۱ھ میں اس کا انتقال ہوا۔

اس سلمۃ بن الابرش سے یہ کہانی نقل کرنے والا ابن حمید ہے جو مؤرخ طبری کا استاد ہے۔ اب اس کا حال بھی امام ذہبی کی زبانی سُن لیجئے۔

محمد بن حمید رازی: اس کا پورا نام محمد بن حمید ہے۔ یہ بھی رے کا باشندہ ہے۔ یعقوب قمی (جو شیعہ کتابوں کا مصنف ہے) وغیرہ سے روایات نقل کرتا ہے۔ حافظ الروایات سمجھا جاتا ہے ضعیف ہے۔ یعقوب بن شیبہ کہتے ہیں یہ بہت منکر روایات بیان کرتا ہے۔ بخاری فرماتے ہیں اس پر اعتراض ہے، اس کے ہم وطن امام ابوزرعہ رازی کا فرمان ہے کہ کذاب ہے۔ فضلک الرازی فرماتے ہیں کہ میرے پاس اس کی پچاس ہزار روایات ہیں۔ جن میں سے ایک بھی بیان کرنا میں پسند نہیں کرتا۔

اسحاق الکوسج کا بیان ہے کہ ہمارے سامنے محمد بن حمید نے کتاب المغازی جو وہ سلمہ بن الابرش کے ذریعہ محمد بن اسحاق سے نقل کرتا ہے۔ پڑھ کر سنائی۔ اتفاق سے میں اس کے بعد علی بن مہران کے پاس گیا۔ میں نے اسے سلمہ کی کتاب المغازی پڑھتے دیکھا۔ میں نے علی بن مہران سے سوال کیا کہ کیا تو نے یہ المغازی محمد بن حمید سے سنی ہے۔ وہ یہ سُن کر حیرت میں مبتلا ہو گیا۔ اور بولا کہ ابن حمید نے تو یہ کتاب مجھ سے سُنی ہے۔

یعنی ابن حمید کا یہ دعویٰ کہ ابن اسحاق کی روایات اس نے سلمہ سے سنی تھیں۔ یہ جھوٹ ہے۔ اس نے تو علی بن مہران سے سنی ہیں اور علی بن مہران نے سلمہ سے۔ یہ حقیقت حال معلوم ہونے کے بعد اسحاق کوسج فرماتے ہیں۔ میں شہادت دیتا ہوں کہ محمد بن حمید کذاب ہے۔

صالح جزرہ کا قول ہے کہ ہم لوگ اس محمد بن حمید کو ہر بات میں جھوٹا سمجھتے ہیں۔ میں نے اس شخص سے زیادہ اللہ سے بے خوف کوئی انسان نہیں دیکھا۔ یہ لوگوں سے احادیث و روایات سنتا اور اُن میں ردو بدل کرتا رہتا تھا۔

ابن خراش نے ایک بار اس محمد بن حمید کی روایت بیان کی۔ اور فرمایا۔ اللہ کی قسم وہ جھوٹ بولتا ہے دیگر محدثین کا قول ہے کہ وہ لوگوں کی احادیث لے کر دوسروں کی جانب منسوب کر دیتا۔ نسائی کہتے ہیں ضعیف ہے۔ صالح جزرہ کا قول ہے کہ میں نے اپنی زندگی میں دو شخصوں سے زیادہ جھوٹ کا ماہر کوئی نہیں دیکھا۔ ایک محمد بن حمید مؤرخ اور دوسرا ابن الشاذ کونی۔

امام فضلک الرازی فرماتے ہیں کہ میں اس محمد بن حمید کے پاس گیا تو یہ سُنی سنائی کہانیوں کی سندات وضع کر رہا تھا۔

ذہبی کہتے ہیں کہ اس کے شاگرد مؤرخ طبری نے یہ بات تو یقین و صحت کے ساتھ لکھی ہے کہ اسے قرآن بھی یاد نہ تھا۔ آخر عمر میں اس سے روایات سننے والے دو شخص ہیں۔ ابوالقاسم بغوی اور محمد بن جریر طبری۔ اس ابن حمید کا انتقال ۲۳۰ھ میں ہوا۔ میزان ص۵۳۰ ج ۳

علی بن مہران نے دعویٰ کیا تھا کہ ابن اسحاق کی روایات اس نے سلمہ سے نہیں سنیں، بلکہ اس نے مجھ سے سنی تھیں۔ اور میں نے سلمہ سے سنی تھیں۔ اس نے درمیان سے میرا نام غائب کر دیا۔ اب ذرا علی بن مہران پر بھی ایک طائرانہ سی نظر ڈال لیجئے۔

مؤرخ علی بن مہران : یہ رے کا باشندہ ہے۔ ابن عدی کہتے ہیں۔ یہ سلمۃ الابرش سے ابن اسحاق کی کتاب روایت کرتا ہے۔ ابواسحاق جوزجانی کہتے ہیں یہ ثقہ نہیں ہے۔ اس کا مذہب انتہائی ردی تھا۔ میزان ص۱۵۸ ج ۳ -

اب حقیقت حال کھل کر سامنے آگئی۔ کہ حضرت عائشہؓ کے اس قول کو چار مورخ نقل کر رہے ہیں۔ چاروں ایرانی ہیں۔ چاروں بدمذہب ہیں۔ چاروں سبائی ہیں۔ اور جو عرب ہے اس کا نام غائب ہے۔ ان چاروں میں سے تین رے کے باشندہ ہیں یعنی سلمۃ بن الابرش۔ محمد بن حمید، علی بن مہران۔ اور اتفاق سے رے کے محدثین انہیں کذاب سمجھتے ہیں۔ مثلاً فضلک الرازی، ابوزرعہ رازی۔ اور ابوحاتم رازی۔

پھر ان رازیوں سے نقل کرنے والا محمد بن جریر طبری ہے جو خود شیعہ ہے۔ اور طبرستان کا باشندہ ہے اور رے طبرستان کے علاقہ میں داخل تھا۔ طبری کا انتقال ۳۱۰ھ میں ہوا۔ گویا ۳۱۰ھ تک یہ روایت صرف طبرستان کے علاقہ میں گھومتی رہی۔ اس سے باہر کا کوئی فرد اس روایت سے واقف نہ تھا۔ اور ام المؤمنین عائشہؓ کی وفات ۵۸ھ میں ہوئی۔ گویا ڈھائی سو سال تک اس روایت کا ایک ایک فرد کے علاوہ کسی کو علم نہ ہوا۔ اور یہ علم باطن کی طرح سینہ بسینہ چلتی رہی۔

بظاہر تو یہ ایک معمولی سی بات نظر آتی ہے لیکن اس روایت کے ذریعہ ان کو باطنوں نے حضور کی معراج کی حیثیت پر ایک کاری ضرب لگائی ہے۔ کہ یہ تو صرف ایک خواب تھا اور خواب سچا بھی ہوتا ہے اور جھوٹا بھی۔ اگر صرف یہ خواب تھا۔ تو ان مرتدین سے کوئی پوچھے کہ پھر صحابہ کو مرتد بنانے کی کیا ضرورت تھی۔ اور کس لئے ام ہانیؓ کے گھر کی کہانی وضع کی گئی۔ ہمارے نزدیک اس روایت کا مقصود حضرت عائشہؓ کی ذات کو متہم کرنا تھا۔

ہم شاید اس روایت پر اتنی بحث نہ کرتے، لیکن ہم اپنے بچپن سے یہ دیکھتے چلے آئے ہیں کہ ہر وہ طبقہ جو مذہب کا دشمن ہے، وہ معراج جسمانی کے انکار کے لئے اس روایت کو ضرور پیش کرتا رہا ہے۔ سرسید نے بھی اسی سے استدلال کیا۔ پرویز اور ان کے ہم نوا بھی اسے پیش کرتے رہتے ہیں، اور قادیانی تو خاص طور پر اس روایت کے شیدائی ہیں۔ یہ سب حضرات معراج کو ایک خواب قرار دیتے ہیں اور مزید بدمعاشی یہ کہ نبی کے خواب کو بھی وہ اپنے ہم جنس کا خواب سمجھ بیٹھے ہیں، جو شیطانی گورکھ دھندے کے علاوہ اور کچھ نہیں۔

ہجرت مدینہ

حکیم عبدالرؤف دانا پوری اپنی کتاب اصح السیر میں ص ۱۰۶ پر ہجرت مدینہ کے سلسلہ میں رقم طراز ہیں۔

جب کفار نے دیکھا کہ اصحاب رسول اللہ چلے گئے۔ اپنا مال و متاع اور اپنے ذراری و اطفال کو بھی ساتھ لے گئے، اور اوس و خزرج کے قبیلے جو زبردست اور ذی اثر قبیلے ہیں وہ ان کے ساتھ ہیں۔ تو اُن کو اب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے سخت خطرہ ہوا سب کے سب دارالندوہ میں جمع ہوئے۔ اور یہ ان کا ایسا زبردست اجتماع تھا۔ کہ کوئی اہل الرائے ایسا نہ تھا جو اس مشورہ میں شریک نہ ہوا ہو، اُن کا اصلی سردار ابلیس ایک شیخ کبیر کی شکل میں موجود تھا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو قتل کرنے کی مختلف تدبیریں کی گئیں۔ سب کو اس شیخ کبیر نے ناپسند کیا۔ آخر ابوجہل نے یہ تدبیر پیش کی۔ کہ تمام قبائل سے ایک ایک جوان لیا اور ان سب کو تلوار دی جائے۔ یہ سب مل کر یک ضرب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا خاتمہ کر دیں اس طرح ان کا دم بہت سے قبائل میں تقسیم ہو جائے گا۔ اور تمام قبائل کا بنی عبد مناف مقابلہ نہیں کر سکتے۔ بالفرض اگر انہوں نے دیت چاہی تو ہم سب مل کر دیت ادا کر دیں گے۔ بڈھے شیخ نے اس رائے کو پسند کیا اور یہی رائے طے پائی۔

ہجرت کا حکم اور ہجرت نبوی: حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حضرت جبرئیل تشریف لائے۔ کفار کے مشورے کی خبر دی۔ ہجرت کا حکم ہوا۔ اور فرمایا کہ آج رات کو اپنے بستر پر نہ سوئیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ٹھیک دوپہر کے وقت جاکر حضرت صدیق کو ہجرت کی خبر دیدی تھی۔ شب کے وقت کفار دروازے پر جمع ہو گئے۔ اور مکان گھیر لیا۔ آپ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو اپنے بستر پر سلادیا اور یہ آیت تلاوت فرمائی وجعلنا من بين ايديهم سدا الآیۃ۔ اور ایک مٹھی بطحا کی خاک لے کر پھینکی۔ جو تمام کفار کے سروں پر پڑی۔ اور آپ نکل کر چلے گئے۔ کسی کا نہ

آپ کو نہ دیکھا۔ حضرت صدیقؓ کے دروازے سے ان کے مکان میں گئے۔ اور حضرت صدیقؓ کو ساتھ لے کر دوسری طرف کھڑکی کے راستے روانہ ہو گئے۔ کفار حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے دروازے پر جمع تھے۔ ایک شخص نے آکر کہا کہ اب کیا کر رہے ہو، وہ تو تمہارے سروں پر خاک ڈال کر چلے بھی گئے۔ کفار نے دیکھا تو سب کے سروں پر خاک تھی۔ وہ صاف کرنے لگے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم روانہ ہو کر غار ثور پر پہنچے۔ اور تین دن تک اس میں رہے۔ مکڑی نے جالا تن دیا۔ پرندوں نے اس پر انڈے دیئے۔ کفار تلاش میں غار کے منہ تک پہنچے۔ مگر خدا نے آپ کو اُن کے شر سے محفوظ رکھا۔ اصح السیر ص۱۰۶

یہ ہجرت کے واقعہ کا ابتدائی حصہ ہے۔ جو مکہ سے غار ثور تک کے واقعات پر مبنی ہے۔ اس حصہ میں خاص طور پر چند امور سامنے آتے ہیں۔

۱۔ صحابہ کرام رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے قبل سب مدینہ چلے گئے تھے۔ اور اپنا مال و متاع بھی ساتھ لے گئے تھے۔

۲۔ ہجرت کے روز نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم حضرت ابوبکرؓ کے گھر دوبارہ تشریف لے گئے۔ ایک بار عین دوپہر کے وقت، اور ایک بار رات کے وقت جن میں صرف اطلاع دینے تشریف لے گئے تھے۔

۳۔ آپ نے ہجرت رات کے وقت اپنے گھر سے فرمائی۔

۴۔ اپنے بستر پر حضرت علیؓ کو سلایا۔

۵۔ کفار نے آپ کے خلاف قتل کا منصوبہ تیار کیا جس میں بنو عبد مناف کے علاوہ تمام قریش کے با اثر اشخاص شامل تھے۔

۶۔ سب نے آپ کے مکان کو گھیر لیا۔ لیکن آپ اُنکے سروں پر مٹی ڈال کر چلے آئے۔

۷۔ غار کے منہ پر مکڑی نے جالا تنا۔ اور پرندوں نے انڈے دیئے۔

۸۔ ابوبکرؓ کے گھر سے غار ثور تک کے تمام واقعات کا کوئی ذکر حکیم صاحب نے نہیں کیا۔

یہ تمام واقعات طبری اور ابن سعد میں واقدی اور ابن ہشام میں محمد بن اسحاق سے مروی ہیں۔ جن کا

تفصیلی جلیہ ہم پہلے بیان کر چکے ہیں لیکن عقلی طور پر بھی یہاں چند اعتراضات وارد ہوتے ہیں۔

۱۔ ان تمام واقعات کا مشاہدہ کرنے والا کون تھا؟ ابن اسحاق اور واقدی اس کا کوئی ذکر نہیں کرتے۔

۲۔ ابوبکر کے گھر سے لے کر غارِ ثور تک کے تمام واقعات جن کا تعلق حضرت ابوبکرؓ اور ان کے گھرانے سے ہے۔ انہیں حکیم صاحب نے کیا اس لئے نظر انداز کیا ہے کہ سبائی حضرت ابوبکرؓ اور ان کے خاندان کی حیثیت کو ختم کرنے کے درپے ہیں، اس کی تکمیل کی جا سکے۔

۳۔ حضور کے گھر میں اُس وقت حضرت فاطمہؓ، حضرت ام کلثومؓ۔ آپ کی دائی حضرت ام ایمنؓ، آپ کی زوجۂ محترمہ حضرت سودہؓ اور آپ کے متبنیٰ حضرت اسامہ بن زیدؓ موجود تھے۔ گھر میں تنہا حضرت علیؓ نہ تھے اور اہل عرب زنانہ مکان میں داخل نہ ہوتے تھے۔ ورنہ گھر گھیرنے اور پوری رات باہر کھڑے رہنے کی کوئی ضرورت نہ تھی۔ پھر حضرت علیؓ کو بستر پر لٹانے سے بجز افسانہ تراشی کے اور کیا مقصد ہو سکتا ہے۔ آپ کی روانگی کی اطلاع تو صبح کے وقت کسی نہ کسی سے ہو سکتی تھی۔

۴۔ اس کہانی سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ہجرت رات کے وقت ہوئی۔ حالانکہ اہل مکہ ہمیشہ رات ہی میں سفر کرتے۔ اور رات ہی میں ان کا کاروبار ہوتا۔ جیسا کہ آج تک مکہ معظمہ، مدینہ منورہ اور جدہ میں نظر آتا ہے۔ کہ اہل عرب زیادہ تر رات جاگ کر گزارتے۔ اور دن میں سوتے ہیں۔ اس لحاظ سے رات کا وقت آمد و رفت کا وقت تھا اور ہجرت کے لئے انتہائی خطرناک وقت۔ مناسب تو یہ تھا کہ ہجرت دوپہر کے وقت کی جاتی۔ جب گرمی کی شدت کے باعث لوگ گھروں میں بند ہوتے۔ اور واقعہ بھی ایسا ہی پیش آیا ہے جیسا کہ صحیح بخاری میں آ رہا ہے لیکن اگر ایسا نہ کیا جاتا تو سبائی داستانیں کیسے تیار ہوتیں۔

۵۔ اگر مٹی ڈالنے سے مقصود یہ تھا کہ وہ دیکھ نہ سکیں تو پھر تو مٹی آنکھوں میں ڈالنی چاہیئے تھی۔ سر پر مٹی ڈالنے سے اس کے علاوہ اور کیا فائدہ ہو سکتا ہے کہ دشمن ہوشیار ہو جاتے اور چاروں طرف آنکھیں پھاڑ کر دیکھنے لگے۔

۶۔ حکیم دانا پوری صاحب نے یہ دعویٰ بھی کیا ہے کہ حضور سے قبل تمام صحابہ اپنا مال و متاع لے کر ہجرت کر گئے تھے۔ تو ان کی خدمت میں پہلی عرض تو یہ ہے کہ سب ہی نے ہجرت نہ کی تھی۔ اور متعدد

افراد اور عورتیں کفار کے گھروں میں محصور تھیں۔ جہاں تک اس بات کا تعلق ہے کہ صحابہ اپنا مال و متاع لے کر چلے گئے تھے۔ تو کاش حکیم صاحب قرآن ہی کھول کر دیکھ لیتے۔ وہ مہاجرین کا ذکر ان الفاظ میں کرتا ہے۔

اَلَّذِیْنَ اُخْرِجُوْا مِنْ دِیَارِهِمْ وَ اَمْوَالِهِمْ۔ — وہ لوگ جو اپنے شہروں اور اپنے مالوں سے نکال دیئے گئے۔

اور تاریخ کے ناطے اس پر غور کر لیتے کہ پھر انصار سے ان کے بھائی چارے کی کیا ضرورت تھی۔ اور انصار نے جو اپنے کھجور کے درخت انہیں پیش کئے اس کی کیا ضرورت واقع ہوئی تھی اور ان تمام واقعات کی تفصیل خود حکیم صاحب نے بیان کی ہے۔ یہ تمام امور اس کی تردید کے لئے کافی ہیں۔ تاریخ کا ہر [illegible] یہ نہیں ہوتا کہ آگے پیچھے سے آنکھیں بند کر لی جائیں۔ اور عقل کو بالائے طاق [illegible] یا جائے۔ یہ کام تو وہی شخص کر سکتا ہے جس کے پیش نظر کوئی خاص مخفی منصوبہ ہو۔

اس سے قبل کہ ہم اس واقعہ کی حقیقت پیش کر [illegible] بہتر یہ معلوم ہوتا ہے کہ پاک و ہند کے سب سے بڑے مؤرخ علامہ شبلی مرحوم کا نقطۂ نگاہ بھی پیش کر دیا جائے۔ علامہ شبلی لکھتے ہیں۔

نبوت کا تیرہواں سال شروع ہوا۔ اور اکثر صحابہ مدینہ پہنچ چکے تو وحی الٰہی کے مطابق آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی مدینہ کا عزم فرمایا۔ یہ داستان نہایت پراثر ہے۔ اور اسی وجہ سے امام بخاری نے باوجود اختصار پسندی کے اس کو خوب پھیلا کر لکھا ہے۔ اور حضرت عائشہؓ کی زبانی لکھا ہے۔ حضرت عائشہؓ گو اس وقت آٹھ برس کی تھیں لیکن اُن کا بیان درحقیقت خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابوبکرؓ کا بیان ہے کہ ان ہی سے سُن کر کہا ہوگا۔ اور ابتدائے واقعہ میں وہ خود بھی موجود تھیں۔

قریش نے دیکھا کہ اب مسلمان المدینہ میں جا کر طاقت پکڑتے جا رہے ہیں۔ اور وہاں اسلام پھیلتا جاتا ہے۔ اس بناء پر انہوں نے دارالندوہ میں جو دار الشوریٰ تھا۔ اجلاس عام کیا۔ ہر قبیلہ کے رؤسا یعنی عتبہ، ابوسفیان، جبیر بن مطعم، نضر بن حارث بن کلدہ، ابوالبختری بن ہشام، زمعہ بن اسود بن مطلب، حکیم بن حزام، ابوجہل، نبیہ، منبہ اور امیہ بن خلف وغیرہ سب شریک تھے۔ لوگوں نے مختلف رائیں پیش کیں۔ ایک نے کہا محمد کے پاؤں میں زنجیر ڈال کر مکان میں بند کر دیا جائے۔ دوسرے نے کہا جلاوطن

[illegible] تحقیق سے ثابت ہوگیا ہے کہ آپؓ کی عمر شریف ستر ہ سال ما اس سے زیادہ تھی

کرنا کافی ہے۔ ابوجہل نے کہا ہر قبیلہ سے ایک شخص منتخب ہو، اور پورا مجمع ایک ساتھ مل کر تلواروں سے ان کا خاتمہ کر دے۔ اس صورت میں اُن کا خون تمام قبائل میں بٹ جائے گا۔ اور آلِ ہاشم اکیلے تمام قبائل کا مقابلہ نہ کر سکیں گے۔ اس آخیر رائے پر اتفاق ہو گیا۔

اہلِ عرب زنانہ مکان کے اندر گھسنا معیوب سمجھتے تھے۔ اس لئے باہر ٹھہرے رہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نکلیں تو یہ فرض ادا کیا جائے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے قریش کو اس درجہ عداوت تھی۔ تاہم آپ کی دیانت پر یہ اعتماد تھا کہ جس شخص کو کچھ مال و اسباب امانت رکھنا ہوتا تھا آپ کے پاس لاکر رکھتا تھا۔ اس وقت بھی آپ کے پاس بہت سی امانتیں جمع تھیں۔ آپ کو قریش کے ارادے کی پہلے سے خبر ہو چکی تھی۔ اس بنا پر حضرت علیؓ کو فرمایا کہ مجھے ہجرت کا حکم ہو چکا ہے۔ میں آج مدینہ روانہ ہو جاؤں گا۔ تم میرے پلنگ پر میری چادر اوڑھ کر سو رہو۔ صبح کو سب کی امانتیں جا کر واپس دے آنا۔ یہ سخت خطرہ کا موقعہ تھا حضرت علیؓ کو معلوم ہو چکا تھا۔ کہ قریش آپ کے قتل کا ارادہ کر چکے ہیں۔ اور آج رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا بستر خواب قتل گاہ کی زمین ہے۔ لیکن فاتح خیبر کے لئے قتل گاہ فرش گل تھا۔

شبلی مرحوم نے اوپر یہ دعویٰ کیا تھا کہ چونکہ ہجرت کا واقعہ صحیح بخاری میں بالتفصیل موجود ہے اس واقعہ کو ہم بخاری سے نقل کرتے ہیں۔ تو ہم اللہؓ کو حاضر ناظر مان کر اور اس کی قسم کھا کر کہتے ہیں کہ اب تک جو کچھ بیان کیا گیا ہے۔ اس میں سے ایک لفظ بھی صحیح بخاری میں موجود نہیں۔ ہاں ان کی اس داستاں سرائی سے جس کے اصل بانی ابن اسحاق اور واقدی ہیں چند سوالات ضرور ذہن میں آتے ہیں۔

۱۔ جب اہلِ عرب زنانخانے میں داخل ہونے کو معیوب تصور کرتے تھے۔ تو حضرت علیؓ کو اپنے بستر پر لٹانے اور انہیں چادر اوڑھانے میں کیا حکمت پوشیدہ تھی۔ اور گھر میں اُن کے لئے کیا خطرہ ہو سکتا تھا جو اسے بلاوجہ ہوا بنا کر پیش کیا جا رہا ہے۔ سبائیوں کے پیشِ نظر تو انہیں شکل کشا بنانا تھا لیکن اہلِ سنت کے پیشِ نظر آخر کیا ہے۔ جو انہیں یہ قلابازیاں کھانے کی ضرورت پیش آئی۔

۲۔ حکیم عبدالرؤف نے مجلس شوریٰ کے اجلاس سے بنو عبد مناف کو علیحدہ کیا تھا۔ آپ نے بنو ہاشم کو۔ ان دونوں جملوں سے بہت بڑا فرق واقع ہوتا ہے۔ حکیم عبدالرؤف کے بقول اس اجلاس میں عتبہ، ابوسفیان اور زمعہ بن الاسود بن المطلب شریک ہی نہ تھے کیونکہ ان تینوں کا تعلق بنو عبد مناف سے تھا۔ اور علامہ شبلی نے ان تینوں کا نام فہرست میں شامل کیا ہے۔ اور اتفاق سے دونوں حضرات نے اس فہرست کے لئے کوئی حوالہ پیش نہیں کیا۔ گویا یہ فہرست تو خود ساختہ ہے اُس دور کے جتنے افراد کے نام ذہن میں آتے گئے لکھتے گئے۔ اور اس کا سب سے اہم ثبوت یہ ہے کہ اس فہرست میں حکیم بن حزام کا نام بھی موجود ہے۔ حالانکہ شبلی نے خود مختلف مقامات پر لکھا ہے کہ یہ زید بن عمرو بن نفیل سے متاثر تھے اسی لئے بت پرستی سے نفرت کرتے تھے حضور کے بچپن کے دوست تھے جنگ بدر انہوں نے رکوانے کی کوشش کی تھی اور جب حضور شعب بنی ہاشم میں محصور تھے تو یہ چھپ کر غلہ بھیجا کرتے تھے۔ ایک جانب تو حالت کفر میں بھی ان کی یہ خوبیاں گنوائی جائیں۔ اور انہیں حضور کا دوست ثابت کیا جائے۔ دوسری جانب منصوبہ قتل میں ان کا نام شامل ہو۔ ظاہر ہے کہ یہ کسی خاص مقصد کے تحت ہمارے مؤرخین نے ان کا نام شامل کیا ہے۔

شبلی مرحوم آگے لکھتے ہیں۔

ہجرت سے دو تین دن پہلے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دوپہر کے وقت حضرت ابوبکرؓ کے گھر پہ گئے۔ دستور کے موافق دروازے پر دستک دی۔ اجازت کے بعد گھر میں تشریف لے گئے۔ حضرت ابوبکرؓ سے فرمایا کچھ مشورہ کرنا ہے سب کو ہٹا دو۔ بولے کہ یہاں آپ کی حرم کے سوا کوئی نہیں ہے۔ اس وقت حضرت عائشہؓ سے شادی ہو چکی تھی۔ آپ نے فرمایا مجھ کو ہجرت کی اجازت ہو گئی ہے۔ حضرت ابوبکرؓ نے نہایت بیتابی سے کہا۔ میرے ماں باپ آپ پر فدا ہوں۔ کیا مجھ کو بھی ہمراہی کا شرف حاصل ہوگا۔ ارشاد ہوا۔ ہاں۔ حضرت ابوبکرؓ نے ہجرت کے لئے چار مہینے سے دو اونٹنیاں ببول کی پتیاں کھلا کھلا کر تیار کی تھیں۔ عرض کی کہ ان میں سے ایک آپ پسند فرمائیں۔ محسن عالم کو کسی کا احسان گوارا نہ ہو سکتا تھا۔ ارشاد ہوا اچھا مگر بقیمت۔ حضرت ابوبکرؓ نے مجبوراً قبول کیا۔ حضرت عائشہؓ اس وقت کم سن تھیں۔ ان کی بڑی بہن حضرت اسماءؓ نے جو حضرت عبداللہ بن الزبیرؓ کی والدہ تھیں، سفر کا سامان کیا۔ دو تین دن کا کھانا [illegible]

رکھا۔ نطاق جس کو عورتیں کمر سے لپیٹتی ہیں۔ پھاڑ کر اس سے ناشتہ دان کا منہ باندھا۔ یہ وہ شرف تھا۔ جس کی بنا پر آج تک ان کو ذات النطاقین کے لقب سے یاد کیا جاتا ہے۔

علامہ شبلی نے یہ پیراگراف صحیح بخاری سے نقل کیا ہے لیکن صحیح بخاری کے ابتدائی الفاظ میں برملا تحریف کی کیونکہ بخاری میں تو اسی دن کا واقعہ بیان کیا گیا ہے۔ اور یہ ظاہر کیا گیا ہے کہ اسی وقت ابوبکرؓ کے گھر سے ہجرت شروع ہو گئی۔ شبلی نے ابوبکر کے گھر جانے اور اس تمام گفتگو کو دو تین دن قبل کا واقعہ بیان کیا ہے۔ تاکہ صحیح بخاری کا نام بھی باقی رہے۔ اور واقدی و ابن اسحاق کی داستاں بھی ہاتھ سے نہ جاتے۔ دراصل اس مقام پر علامہ شبلی نے دو کشتیوں میں پاؤں ٹکا رکھے ہیں یعنی حدیث اور تاریخ۔ اور چاہتے یہ ہیں کہ کوئی کشتی قابو سے باہر نہ ہو۔ لیکن اس کام کے لئے تاریخی داستاں کا ساتھ چھوڑنے کے لئے تو وہ ہرگز تیار نہیں۔ بلکہ اس کی بقا کے لئے جابجا حدیث میں ضرور تحریف سے کام لیا ہے۔

ایک جانب تو یہ مسلمہ حقیقت ہے کہ ہجرت کے وقت حضرت ابوبکرؓ آپ کے ساتھ تھے اور راہ کے تمام واقعات حضرت عائشہؓ نے ان ہی سے نقل کئے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ اگر آپؐ نے اپنے گھر سے ہجرت کی تھی۔ تو ابوبکرؓ کس وقت، اور کہاں آپ سے آکر ملے۔ حکیم عبدالروف نے اس کا یہ حل نکالا کہ رات کو دوبارہ حضور کو حضرت ابوبکرؓ کے گھر بھیجا۔ تاکہ آپ وہاں سے زادِ راہ لے سکیں اور سواری پر سوار ہو سکیں۔ لیکن شبلی نے زادِ راہ تین دن قبل بندھوا لیا۔ حالانکہ کھانا تین روز قبل کوئی نہیں بندھواتا۔ اور وہ اشکالات علی حالہ قائم رہے۔ یہ اشکالات اسی صورت میں رفع ہو سکتے تھے۔ جب کہ صحیح بخاری کی روایت کو من و عن قبول کیا جاتا۔ لیکن پھر حضرت علیؓ کے لئے کانٹوں کا بستر کیسے تیار ہوتا۔ اور ان کی یہ فضیلت کیسے ثابت ہوتی۔ حالانکہ نہ ہر فضیلت ہر صحابی کو حاصل ہوتی ہے اور نہ ہر صحابی کو ہر واقعہ میں زبردستی گھسیٹا جا سکتا ہے۔ شبلی آگے لکھتے ہیں۔

کفار نے جب آپ کے گھر کا محاصرہ کر لیا۔ اور رات زیادہ گزر گئی تو قدرت نے اُن کو بے خبر کر دیا۔ اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اُن کو سوتا ہوا چھوڑ کر باہر آ گئے۔

ہم علامہ شبلی کے شکر گزار ہیں کہ انہوں نے کم از کم سروں پر خاک ڈالنے اور پھر ہر ایک کے

سر سے خاک جھڑوانے کے عمل کا تذکرہ نہیں کیا کیونکہ انہیں بھی اس کے مہمل ہونے کا احساس ہو گیا تھا لیکن ہم قسم کھا کر یہ بھی کہتے ہیں کہ بخاری میں گھر کے محاصرہ کرنے اور رات کے نکلنے کا کوئی تذکرہ نہیں۔ شبلی آگے لکھتے ہیں۔

کعبہ کو دیکھا اور فرمایا مجھ کو تمام دنیا سے عزیز ہے۔ لیکن تیرے فرزند مجھ کو رہنے نہیں دیتے۔

حیرت ہے کہ شب کی تاریکی میں کعبہ کیسے نظر آیا کیا وہاں بجلی کے قمقمے جگمگا رہے تھے۔ شبلی آگے لکھتے ہیں۔

حضرت ابوبکرؓ سے پہلے قرارداد ہو چکی تھی (یہ شبلی کے ذہن کی پیداوار ہے) دونوں صاحب پہلے جبل ثور کے غار میں جا کر پوشیدہ ہوئے۔ یہ غار آج بھی موجود ہے اور بوسہ گاہِ خلائق ہے۔ حضرت ابوبکرؓ کے بیٹے عبداللہؓ جو نوخیز جوان تھے۔ شب کو غار میں سوتے۔ صبح منہ اندھیرے شہر چلے جاتے اور پتہ لگاتے کہ قریش کیا مشورے کر رہے ہیں۔ جو کچھ خبر ملتی۔ شام کو آ کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کرتے۔ حضرت ابوبکرؓ کا غلام کچھ رات گئے بکریاں چرا کر لاتا۔ اور آپ اور حضرت ابوبکرؓ ان کا دودھ پی لیتے۔ تین دن تک صرف یہی غذا تھی۔ لیکن ابن ہشام نے لکھا ہے کہ روزانہ شام کو حضرت اسماءؓ گھر سے کھانا پکا کر غار میں پہنچا آتی تھیں۔

اس طرح تین راتیں غار میں گزریں۔

صبح کو قریش کی آنکھیں کھلیں تو پلنگ پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بجائے حضرت علیؓ تھے ظالموں نے آپ کو پکڑا اور تھوڑی دیر حرم میں لے جا کر رکھا۔ اور پھر چھوڑ دیا۔

یہ جملہ شبلی نے طبری کے حوالے سے نقل کیا ہے۔ لیکن جب بقول شبلی عرب زنخانے میں داخل نہ ہوتے تھے تو پھر مکان میں داخل ہوئے بغیر حضرت علیؓ بستر پر کیسے نظر آ گئے اگر یہ کہا جاتا کہ حضرت علیؓ جب ضرورت سے باہر نکلے تو ان سے پوچھ گچھ کی گئی۔ تو اسے عقل سلیم قبول کر لیتی۔ لیکن پھر بستر پر سلانے کا عمل بے کار ہو جاتا۔ ہاں طبری کے بیان سے یہ ضرور ثابت ہو گیا کہ حضرت علیؓ کے لئے کوئی خطرہ نہ تھا یا وہ بستر کو کانٹوں کا بستر بنایا جا رہا تھا اس لئے کہ جس ردعمل کو ثابت کرنے کی کوشش کی جا رہی تھی وہاں وہ ردعمل کچھ بھی ظاہر نہیں ہوا۔ اور چند منٹ حرم میں بٹھانے کے بعد حضرت علیؓ کو چھوڑ [illegible] ات تو [illegible] ہو گئی کہ [illegible] علیؓ [illegible] لئے کسی قسم کا کوئی خطرہ نہ تھا۔ شبلی آگے لکھتے ہیں۔

پھر کفار آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تلاش میں نکلے۔ ڈھونڈتے ڈھونڈتے غار کے دہانے تک آگئے۔ آہٹ پاکر حضرت ابوبکرؓ غمزدہ ہوئے۔ اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کی کہ اب دشمن اس قدر قریب آگئے کہ اگر اپنے قدموں پر ان کی نظر پڑ جائے تو ہم کو دیکھ لیں گے۔ آپ نے فرمایا۔

لَا تَحْزَنْ اِنَّ اللّٰهَ مَعَنَا   غم نہ کر، یقیناً اللہ ہمارے ساتھ ہے۔

مشہور ہے کہ جب کفار غار کے قریب آگئے تو اللہ نے حکم دیا۔ دفعۃً ببول کا درخت اگا۔ اور اس کی ٹہنیوں نے پھیل کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو چھپا لیا۔ ساتھ ہی دو کبوتر آئے۔ اور گھونسلا بنا کر انڈے دیئے۔ حرم کے کبوتر ان ہی کبوتروں کی نسل سے ہیں۔ اس روایت کو مواہب لدنیہ میں تفصیل سے نقل کیا ہے۔ اور زرقانی نے بزاز وغیرہ سے اس کے ماخذ بتلاتے ہیں۔ لیکن یہ تمام روایتیں غلط ہیں۔ اس روایت کا اصل راوی عون بن عمرو ہے۔ اس کی نسبت امام فن رجال یحیٰ بن معین کا قول ہے لَا شَيْءَ یعنی یہ ہیچ ہے۔ امام بخاری نے کہا کہ وہ منکر الحدیث اور مجہول ہے۔ اس روایت کا ایک اور راوی ابو مصعب مکی ہے۔ وہ مجہول الحال ہے۔ چنانچہ علامہ ذہبی نے میزان الاعتدال میں عون بن عمرو کے حال میں یہ تمام اقوال نقل کئے ہیں۔ اور خود اس روایت کا بھی ذکر کیا ہے۔ سیرت النبی ص۲۷۲ ج ۱

اس روایت کے موضوع ہونے میں ہم بھی شبلی نعمانی سے متفق ہیں۔ لیکن کاش وہ ہر روایت کی اسی طرح چھان بین کر لیتے تو کیا اچھا ہوتا۔ ہماری تاریخ کا سب سے بڑا المیہ یہی ہے کہ تاریخ کے معاملہ میں سب نے چشم پوشی اختیار کی۔ اور کسی نے بھی اسے تنقیدی نگاہ سے نہیں دیکھا۔ شیعوں نے اسے اپنے مذہبی اور سیاسی مفاد کے لئے استعمال کیا۔ جس کے نتیجے میں ہم سبائی داستانوں کے پھندے میں ایسے پھنسے کہ گلے تک اس میں دھنستے چلے گئے اور کسی کو احساس بھی نہ ہوا کہ کیا ہو رہا ہے۔ حتیٰ کہ وہی داستانیں اب ہمارے لئے دین و ایمان بن گئیں۔

اب صحیح بخاری کی حدیث کی جانب آئے کہ وہ کیا ثابت کر رہی ہے۔ ہم ہجرت کا پورا تفصیلی واقعہ صحیح بخاری سے پیش کئے دیتے ہیں۔ لیکن امام بخاری نے حضرت عائشہؓ کی زبانی ایک ساتھ دو ہجرتوں کا ذکر کیا ہے۔ ایک حضرت ابوبکرؓ کی ہجرت حبشہ کا اور دوسری ہجرت مدینہ کا۔ ہم ام المؤمنین کی پوری

حدیث پیش کئے دیتے ہیں تاکہ قارئین کے سامنے حضرت ابوبکرؓ اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے باہمی تعلقات اور حضرت ابوبکرؓ کے گھرانے کی حیثیت کھل کر سامنے آجائے اور قارئین کو یہ بھی اندازہ ہوجائے کہ ان سبائیوں نے کیا کیا تحریفیں کی ہیں۔ اور ابوبکرؓ کے مقام کو گرانے کے لئے کیا کیا طریقے اختیار کئے ہیں۔

امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے اس واقعہ کو جس اعلیٰ سند کے ساتھ نقل کیا ہے۔ اس پر کتب تاریخ کی تمام سندات قربان کی جاسکتی ہیں۔ یعنی امام یحییٰ بن بکیر، امام لیث بن سعد، عقیل، امام زہری، عروۃ بن الزبیر، ان میں سے ہر راوی جہاں ثقہ اور مسلم امام ہیں۔ وہاں ان میں سے ہر ایک اپنے استاد کی خدمت میں سالہا سال رہا ہے۔ کوئی راہ چلتے سنی سنائی ہوائی گپ نہیں۔ الغرض امام بخاری حضرت عائشہؓ سے نقل کرتے ہیں۔

حضرت ابوبکرؓ اور ہجرت حبشہ: ام المومنین فرماتی ہیں۔ مجھے جب عقل آئی تو میں نے تو یہی دیکھا کہ میرے ماں باپ دین اسلام پر عامل تھے۔ اور یہ بھی دیکھا کہ کوئی دن ایسا نہ گزرتا تھا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے یہاں صبح شام تشریف نہ لاتے۔ جب مسلمان ایذا میں مبتلا کئے گئے۔ تو حضرت ابوبکرؓ نے بھی ہجرت کا ارادہ کیا۔ حضرت ابوبکرؓ مکہ سے نکل کر حبشہ کی طرف روانہ ہوئے۔ جب وہ برک غماد میں پہنچے۔ تو ان کو ابن دغنہ ملا۔ جو قبیلہ قارہ کا سردار تھا۔ کہنے لگا کہ اے ابوبکرؓ کہاں کا ارادہ ہے؟ حضرت ابوبکرؓ نے فرمایا مجھے میری قوم نے نکال دیا ہے تو میں نے ارادہ کیا ہے کہ زمین میں سفر کروں۔ اور اپنے رب کی عبادت کروں۔ ابن دغنہ نے کہا کہ اے ابوبکرؓ تم جیسا آدمی نہ نکل سکتا ہے۔ نہ نکالا جا سکتا ہے۔ تم ناداروں کے لئے کماتے ہو۔ صلہ رحمی کرتے ہو۔ جو لوگ معاشرہ پر بار ہیں ان کا بوجھ اٹھاتے ہو۔ مہمان کی خاطر تواضع کرتے ہو۔ حق کے کاموں میں مدد کرتے ہو۔ لہٰذا میں تم کو پناہ دیتا ہوں۔ واپس چلو۔ اور اپنے شہر میں اپنے رب کی عبادت کرو۔ حضرت ابوبکرؓ واپس آگئے۔ ابن دغنہ بھی ان کے ساتھ ہی آگیا۔ شام کو ابن دغنہ اشراف قریش کے پاس گیا اور ان سے کہا کہ ابوبکرؓ جیسا آدمی نہ نکل سکتا ہے، نہ نکالا جا سکتا ہے۔ کیا تم لوگ ایسے آدمی کو نکالتے ہو جو ناداروں کے لئے کماتا ہے۔ صلہ رحمی کرتا ہے۔ جو لوگ معاشرہ پر بار ہیں ان کا بوجھ اٹھاتا ہے۔ مہمان کی خاطر تواضع کرتا ہے۔ اور حق

کے کاموں میں مدد کرتا ہے۔ قریش نے ابن دغنہ کی امان کو مسترد نہیں کیا۔ انہوں نے ابن دغنہ سے کہا کہ ابو بکرؓ سے کہو کہ وہ اپنے رب کی عبادت اپنے گھر کے اندر کریں۔ اسی میں نماز پڑھیں اور جو چاہیں پڑھیں۔ لیکن ہمیں اپنی قرارت سے تکلیف نہ دیں۔ بلند آواز سے قرارت نہ کریں۔ کیونکہ ہمیں ڈر ہے کہ کہیں ہماری عورتیں اور ہماری اولاد فتنہ میں مبتلا نہ ہو جائے (یعنی مسلمان نہ ہو جائے) ابن دغنہ نے یہ باتیں حضرت ابوبکرؓ سے کہہ دیں۔ حضرت ابوبکرؓ کچھ عرصہ تک ان شرائط پر قائم رہے۔ اپنے گھر ہی میں عبادت کرتے۔ اپنی نماز میں بلند آواز سے قرارت نہ کرتے۔ اور نہ اپنے گھر کے علاوہ کسی اور مقام پر قرآن مجید کی تلاوت کرتے۔

اسلام میں سب سے پہلی مسجد: پھر ایک دن ان کو یہ سوجھی کہ اپنے گھر کے باہر میدان میں مسجد بنالی۔ اس میں نماز پڑھنے لگے۔ اور قرآن مجید کی تلاوت شروع کر دی۔ مشرکین کی عورتوں اور بچوں کا اُن کے پاس ہجوم ہو جاتا تھا۔ وہ ان کی قرارت کو پسند کرتے۔ اور ان کی طرف دیکھتے رہتے تھے۔ حضرت ابوبکرؓ بہت رونے والے آدمی تھے۔ جب قرآن مجید کی تلاوت کرتے تو انہیں اپنی آنکھوں پر قابو نہ رہتا۔ مشرکین میں سے اشراف قریش اس بات سے خوف زدہ ہوتے۔ انہوں نے ابن دغنہ کو بلوایا۔ ابن دغنہ ان کے پاس گیا۔ اشراف قریش نے اس سے کہا کہ ہم نے تمہاری امان پر ابوبکرؓ کو پناہ دی تھی۔ اس شرط پر کہ وہ اپنے گھر میں اپنے رب کی عبادت کریں۔ لیکن انہوں نے اس شرط کی خلاف ورزی کی۔ باہر میدان میں انہوں نے مسجد بنالی۔ اور علی الاعلان نماز اور قرآن پڑھتے ہیں۔ ہمیں ڈر ہے کہ کہیں ہماری عورتیں اور بچے فتنہ میں مبتلا نہ ہو جائیں۔ لہٰذا تم انہیں منع کرو۔ اگر وہ صرف اپنے گھر کے اندر رہ کر اپنے رب کی عبادت کر سکتے ہیں تو کریں۔ اور اگر وہ نہ کریں اور علی الاعلان نماز اور قرآن پڑھنے پر اصرار کریں تو اُن سے کہو کہ تمہارا ذمہ تمہیں واپس کر دیں۔ کیونکہ ہمیں یہ بات پسند نہیں کہ تمہاری امان کی توہین کریں۔ ہم فیصلہ کر چکے ہیں کہ ابوبکرؓ کے اس اعلان کو برقرار نہ رہنے دیں گے۔ ابن دغنہ حضرت ابوبکرؓ کے پاس آیا۔ اور کہا۔ تمہیں معلوم ہے کہ میں نے کس شرط پر تم سے معاہدہ کیا تھا۔ پس اگر تم اس پر قائم رہو تو ٹھیک ہے۔ ورنہ میرا ذمہ واپس کر دو۔ کیونکہ میں نہیں چاہتا عرب یہ سنیں کہ میں نے ایک شخص کو امان دی تھی۔ لیکن میری امان ضائع کر دی گئی۔ حضرت ابوبکرؓ نے کہا کہ میں تمہاری امان واپس کرتا ہوں۔ اور اللہ عزوجل کی امان

سے راضی ہوں۔ صحیح بخاری ص۵۵۲ ج ۱ تاریخ الاسلام والمسلمین ص۱۳۰

اس سے قبل کہ ہم اس حدیث کا بقیہ حصہ قارئین کے سامنے پیش کریں۔ اس حصہ سے جو امور ثابت ہو رہے ہیں وہ قارئین کے سامنے ترتیب وار پیش کرنا چاہتے ہیں۔

۱۔ اس میں حضرت ابوبکرؓ کی ایک کافر ابن الدغنہ کے ذریعہ جو صفات سامنے آتی ہیں۔ ان کا خاکہ کچھ اس طرح ہے۔ جو لوگ معاشرہ پر بار ہیں۔ اُن کا بار برداشت کرنا صلہ رحمی کرنا۔ ناداروں کے لئے کمانا نہ صرف اپنی ذات کے لئے۔ مہمانوں کی خاطر تواضع کرنا اور حق کے کاموں میں مدد کرنا حضرت ابوبکرؓ کی یہ وہ صفات ہیں جن کا دشمن اقرار کر رہے ہیں۔ ایسی صورت میں دنیاوی لحاظ سے ان کا کوئی دشمن نہیں ہو سکتا تھا۔ بلکہ ہر فرد بشر اُن کا زیر بار احسان ہوا۔ یہ وہ صفات اور خوبیاں ہیں جو کسی دوسرے انسان میں قطعاً نہ پائی جاتی تھیں۔

۲۔ اہل مکہ کو ابوبکرؓ سے اصل تکلیف یہ تھی کہ وہ عبادت گھر سے باہر کرتے اور بلند آواز سے قرآن پڑھتے تھے جس کے باعث مشرکین کی عورتیں اور بچے قرآن سننے کے لئے جمع ہو جاتے۔ اور قرآن سے متاثر ہوتے یہی تمام ایذارسانی کا سبب تھا۔ اور امان کے وقت انہوں نے یہی شرط لگائی تھی کہ ابوبکرؓ گھر میں نماز پڑھیں۔ اور بلند آواز سے قراءت نہ کریں۔

۳۔ وقتی طور پر ابوبکرؓ نے اس شرط کو قبول کیا۔ لیکن زیادہ دن تک دل اسے تسلیم نہ کر سکا۔ اور پھر ابوبکرؓ نے اپنے گھر کے باہر میدان میں مسجد بنالی۔ اور بلند آواز سے قراءت شروع کر دی۔ اور پھر اسی طرح عورتوں اور بچوں کا مجمع جمع ہونے لگا۔ نتیجۃً ابوبکرؓ نے اس امان کو ختم کیا۔ اور اللہ کے بھروسہ پر اس تبلیغ کو جاری رکھا۔ یہ وہ امور ہیں کہ جن میں مکی زندگی میں کوئی ابوبکرؓ کا ثانی نظر نہیں آتا۔

۴۔ ابن الدغنہ جس کا نام حارث بن مالک تھا اور قبیلہ قارہ کا سردار تھا۔ اس کا تعلق قبیلہ قریش سے نہ تھا۔ بلکہ یہ قبیلہ خزیمۃ بن مدرکۃ بن الیاس بن مضر کی اولاد میں سے تھا۔ اور مکہ کے قرب و جوار میں آباد تھا۔ جس سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ حضرت ابوبکرؓ کے احسانات صرف قبیلہ قریش تک محدود نہ تھے۔ بلکہ اس کے اثرات مکہ سے باہر بھی پھیلے ہوئے تھے۔

۵۔ ابوبکرؓ نے مجبور ہو کر حبشہ کی جانب ہجرت کی تھی جو ابن الدغنہ نے ختم کرائی۔ تمام مؤرخین اور تمام اہل سِیَر

اور محدثین اس پر متفق ہیں کہ یہ ہجرت نبوت کے پانچویں سال ہوئی۔ اور ام المؤمنین عائشہؓ یہ تمام واقعہ آنکھوں دیکھا بیان کر رہی ہیں۔ اور یہ بھی ظاہر کر رہی ہیں کہ میں اس وقت صاحب عقل تھی۔ اگر یہ تسلیم کر لیا جائے کہ ام المؤمنین کی عمر رخصتی کے وقت نو سال تھی تو اس لحاظ سے تو یہ واقعہ ان کی پیدائش سے قبل کا ہونا چاہیئے۔ حالانکہ ام المؤمنین اپنا مشاہدہ بیان کر رہی ہیں۔ اور یہ بھی بیان کر رہی ہیں کہ میں اس وقت صاحب عقل تھی۔ لامحالہ یہ تسلیم کرنا ہوگا کہ ہجرت حبشہ کے وقت ان کی عمر دس بارہ سال کی ضرور تھی۔ وہ کمسن بچی نہ تھیں۔ اس لئے ہم یہ ماننے پر مجبور ہیں کہ رخصتی کے وقت ام المؤمنین کی عمر نو سال نہیں بلکہ انیس سال تھی۔

۶۔ ام المؤمنین کا بیان ہے کہ جب سے میں نے ہوش سنبھالا تھا۔ میں نے اپنے والدین کو دینِ اسلام پر پایا تھا۔

۷۔ حضور کا ہجرت حبشہ سے قبل ہی سے یہ معمول تھا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم روزانہ صبح و شام ابوبکر کے گھر تشریف لے جاتے۔ یہ آمد و رفت اس لئے نہیں تھی کہ ام المؤمنین سے آپ کا ازدواجی رشتہ تھا۔ بلکہ یہ آمد و رفت حضرت ابوبکرؓ کی دوستی اور ان کی اسلام کی قربانی کے باعث تھی۔ حضور کا صبح و شام ابوبکرؓ کے گھر جانا ایک ایسا معمول تھا جس کے خلاف کبھی نہ ہوا تھا۔

۸۔ اسلام میں سب سے اول مسجد کی بنیاد حضرت ابوبکرؓ صدیق نے رکھی۔

۹۔ ابوبکرؓ کی تبلیغ ہی کا اثر تھا کہ مکی زندگی میں جتنے افراد ایمان لائے۔ ان میں سے بیشتر افراد نے ابوبکرؓ کی تبلیغ سے ایمان قبول کیا۔

اب اس حدیث کا اگلا حصہ ملاحظہ کیجیے۔

پھر ہجرت مدینہ کے قریب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمانوں سے فرمایا۔ مجھے ہجرت کا مقام دکھایا گیا ہے۔ یہ ایک ایسی سرزمین ہے جس میں کھجوریں ہیں۔ اس کے دو طرف دو پتھریلے میدان ہیں۔ نتیجۃً بہت سے مسلمان مدینہ ہجرت کر کے چلے گئے۔ اور جنہوں نے حبشہ ہجرت کی تھی۔ ان میں سے بہت سے افراد مدینہ ہجرت کر گئے۔ ابوبکرؓ نے بھی مدینہ جانے کی تیاریاں کیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اُن سے ارشاد فرمایا۔ تم ابھی ٹھہرو۔ کیونکہ مجھے امید ہے کہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے مجھے بھی ہجرت کی اجازت مل جائے گی۔

حضرت ابوبکرؓ نے عرض کیا۔ میرے ماں باپ قربان کیا آپ کو بھی عنقریب اجازت ملنے کی امید ہے۔ آپ نے فرمایا ہاں۔ پس ابوبکرؓ حضور کی رفاقت کی خاطر رک گئے۔ ابوبکرؓ کے پاس دو اونٹنیاں تھیں جنہیں وہ چار ماہ تک بیری کے پتے کھلاتے رہے۔ تاریخ الاسلام والمسلمین ص۱۵۱۔ بخاری ص۵۵۳ ج ۱

یعنی ہجرت کے لئے آپ نے جو خواب دیکھا تھا۔ اس کے بعد آپ چار ماہ تک مکہ میں مقیم رہے۔ اور ابوبکرؓ کو بھی روکے رکھا۔ ابوبکرؓ نے اس کام کے لئے اونٹنیوں کو خوب کھلانا شروع کر دیا۔

ام المؤمنین حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں ایک روز ہم سب گھر میں بیٹھے ہوئے تھے۔ عین دوپہر کا وقت تھا۔ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے۔ گھر کے کسی فرد نے دور سے دیکھ کر کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سر مبارک پر کپڑا لپیٹے ہوئے تشریف لا رہے ہیں۔ کہ اس سے پہلے اس وقت کبھی تشریف نہ لائے تھے۔ حضرت ابوبکرؓ نے عرض کیا میرے ماں باپ آپ پر قربان۔ اللہ کی قسم آپ اس وقت (خلاف معمول) جو تشریف لائے ہیں تو ضرور کوئی اہم کام ہے۔ اتنے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ابوبکرؓ کے مکان پر پہنچ گئے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اجازت طلب کی۔ آپ کو اجازت دی گئی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اندر تشریف لے آئے۔ آپ نے حضرت ابوبکرؓ سے فرمایا۔ یہاں جو لوگ موجود ہیں انہیں باہر کر دو ، حضرت ابوبکرؓ نے عرض کیا۔ اے اللہ کے رسول میرے ماں باپ آپ پر قربان یہ تو آپ ہی کے گھر والے ہیں۔ یہ دونوں میری بیٹیاں ہیں۔ عائشہ اور اسماء۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا مجھے یہاں سے جانے کا حکم مل گیا ہے۔ حضرت ابوبکرؓ نے عرض کیا اے اللہ کے رسول میرے ماں باپ آپ پر قربان مجھے بھی اپنی رفاقت میں لے لیجئے۔ آپ نے فرمایا ہاں۔ اس پر ابوبکرؓ نے عرض کیا میرے ماں باپ آپ پر قربان۔ ان دونوں اونٹنیوں میں سے ایک اونٹنی آپ لے لیجئے۔ ان کو سفر ہی کے لئے تیار کیا ہے۔ آپ نے فرمایا قیمتاً لوں گا۔

ام المؤمنین فرماتی ہیں۔ ہم نے جلدی جلدی سامان سفر تیار کیا۔ کچھ کھانا چمڑے کے ایک تھیلے میں رکھ دیا۔ حضرت اسماءؓ نے حضرت ابوبکرؓ سے کہا میرے پاس تھیلا باندھنے کے لئے سوائے میرے ازار بند کے اور کچھ نہیں ہے۔ حضرت ابوبکرؓ نے فرمایا اس کے دو ٹکڑے کر لو۔ حضرت اسماءؓ نے اپنے ازار بند کے دو ٹکڑے کئے۔ ایک سے مشکیزہ اور تھیلے کا منہ باندھ دیا۔ اور دوسرے ٹکڑے سے اپنے ازار بند کو باندھ

لیا۔اسی وجہ سے اُن کا لقب ذات النطاقین (دو کمر بند والی) ہوگیا۔

پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابوبکرؓ اپنی اپنی سواریوں پر روانہ ہوگئے اور غارِ ثور میں جاکر چھپ گئے۔

ان الفاظ کو غور سے پڑھیے اور پوری حدیث پر نظر ڈالیے تو یہ بات واضح طور پر صاف نظر آ رہی ہے کہ ہجرت کے دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خلاف معمول دوپہر کے وقت ابوبکرؓ کے گھر گئے۔ اسی وقت سامان سفر تیار ہوا۔اور اسی وقت ان دونوں حضرات نے ہجرت کی۔اور غارِ ثور میں جاکر چھپ گئے۔

یہ الفاظ اس امر کی شہادت دے رہے ہیں کہ ہجرت کی ابتدا حضرت ابوبکرؓ کے گھر سے ہوئی۔حضور نے ہجرت اپنے گھر سے نہیں فرمائی۔عین دوپہر کے وقت ہوئی۔رات کے وقت نہیں ہوئی۔اور اس راز میں ابوبکرؓ کے گھرانہ کے علاوہ کوئی اور فرد شریک نہیں تھا۔بخاری کے عربی الفاظ بھی ملاحظہ کیجیے۔

ثم لحق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم — پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور ابوبکر

والبوبکر بغار فی جبل ثور۔بخاری ج ۱ ص ۵۵۳ — جبل ثور کے غار میں پہنچ گئے،

بخاری کے محشی مولٰنا احمد علی سہارنپوری نے قسطلانی کے حوالہ سے واقدی کا یہ بیان نقل کیا ہے کہ حضور اور ابوبکرؓ مکان کی پچھلی جانب جو کھڑکی تھی اس سے خاموشی سے نکل کر اپنی اپنی سواری پر سوار ہو گئے۔یہاں تک کی حدیث سے چند امور خود بخود ثابت ہو گئے۔

۱۔ ہجرت ابوبکرؓ کے گھر سے ہوئی۔لہٰذا حضرت علیؓ کو بستر پر لٹانے اور قتل کے خوف کی کہانی سب بے سروپا داستان ہے۔کیونکہ یہ ہجرت عین دوپہر کے وقت ہوئی ہے نہ کہ رات کے وقت۔بلکہ ہوا یہ ہے کہ ادھر حضور کو ہجرت کا حکم ہوا۔اور فوراً آپ ابوبکرؓ کے گھر تشریف لے گئے اور ہجرت فرمائی۔کئی روز قبل سے کوئی منصوبہ بندی نہیں ہوئی تھی۔

۲۔ یہ دعویٰ بھی غلط ہے کہ حضور ابوبکرؓ کے گھر دو دفعہ تشریف لے گئے۔ایک بار دن اور ایک بار شب میں۔اور یہ بھی غلط ہے کہ ابوبکرؓ کے گھر دو تین روز قبل گئے تھے۔اور اسی وقت زادِ راہ لے آئے تھے۔بخاری کے الفاظ کھل کر اس کی تردید کر رہے ہیں۔

۳۔ شبلی کا یہ دعویٰ کہ اسماءؓ نے زادِ راہ تیار کیا۔ کیونکہ ام المومنین کم سن تھیں یہ بھی غلط ہے کیونکہ ام المومنین فرما رہی ہیں۔ ہم نے جلدی سے سامان سفر تیار کیا۔ گویا اس تیاری میں ام المومنینؓ بھی برابر کی شریک تھیں۔

۴۔ ہمارے مؤرخین کا اصل مرض یہی ہے کہ وہ ابن اسحاق، واقدی، طبری، سلمۃ الابرش وغیرہ جیسے لوگوں کے مقابلے میں حدیث صحیح تک کو چھوڑ دیتے ہیں۔ اردو زبان میں کہیں کہیں شبلی نے اس طریقۂ کار کو تبدیل کیا۔ اور سید سلیمان ندوی مرحوم نے اس کام کو مزید آگے بڑھایا۔ لیکن ان کے علاوہ دیگر مصنفین نے وہی اپنی پرانی ڈگر قائم رکھی۔ بلکہ بعض حضرات نے تو ان تاریخی داستانوں کے باعث احادیث کا مذاق اڑایا۔ اور منکرین حدیث نے تو اسے اپنا وطیرہ بنا لیا ہے۔ اب حضرت عائشہ کی بقیہ حدیث ملاحظہ ہو۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابو بکرؓ تین رات اسی غار میں رہے۔ عبداللہؓ بن ابی بکر بھی رات غار ہی میں گزارتے تھے۔ اور وہ اس زمانہ میں ایک سمجھ دار اور ذہین نوجوان تھے۔ صبح کے وقت وہاں سے چلے جاتے تھے اور مکہ میں قریش کے ساتھ اس طرح صبح کرتے تھے۔ گویا رات کو بھی وہیں رہے ہوں۔ پس جو بات ان دونوں کے خلاف وہ مکہ میں سنتے تھے، اس کو محفوظ کر لیتے تھے۔ یہاں تک کہ اندھیرا ہو جانے کے بعد غار میں آکر وہ یہ باتیں ان دونوں کو پہنچایا کرتے تھے۔

حضرت ابو بکرؓ کے غلام حضرت عامرؓ بن فہیرہ غار کے قریب بکریاں چرایا کرتے تھے۔ جب کچھ رات گزر جاتی تو وہ ان بکریوں کو ان دونوں کے پاس لے جاتے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابو بکرؓ رات کو ان ہی بکریوں کا دودھ پی لیا کرتے تھے۔ صبح کو اندھیرے ہی میں عامرؓ بکریوں کو ہانک کر لے جایا کرتے تھے۔ تینوں راتوں میں انہوں نے ایسا ہی کیا۔ ان کی اس بات سے کوئی دوسرا چرواہا واقف نہ تھا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابو بکرؓ نے قبیلہ بنی دیل میں سے ایک شخص کو اپنی اجرت پر ملازم رکھ لیا تھا۔ یہ شخص بنو عبد بن عدی کے گھرانے کا ایک فرد تھا۔ اور راستہ بتانے میں بڑا ماہر تھا۔ یہ شخص عاص بن وائل سہمی کا حلیف تھا۔ اور ابھی تک کفار قریش کے دین پر تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابو بکرؓ نے اسے اپنا امین بنا لیا (غار ثور پہنچ کر) دونوں اونٹنیاں اس کے حوالہ کر دیں۔ اور اس سے تین رات بعد بوقت

صبح اونٹنیاں لانے کا وعدہ لے لیا۔ تیسرے روز یہ دونوں حضرات اور ان کے ساتھ حضرت عامرؓ بن فہیرہ اور راہبر چلے اور ساحل کا رخ اختیار کیا۔

یہاں درمیان میں امام زہری مکہ کے حالات نقل کرتے ہیں۔ کیونکہ یہ حالات انہوں نے عروہ سے نہیں سنے تھے۔ اور نہ ان حالات کا حضرت عائشہ کی حدیث میں ذکر تھا۔ اس لئے اُن واقعات کو امام زہری دوسرے حضرات سے نقل کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

تعاقب: مجھے عبدالرحمان بن مالک بن المدلجی نے جو سراقہؓ بن مالک کے بھتیجے تھے بتایا ہے کہ انہوں نے اپنے والد سے سُنا۔ اور انہوں نے اپنے بھائی سراقہؓ سے۔ وہ فرماتے ہیں کہ ہمارے پاس قریش کے قاصد آئے۔ اور بولے کہ یا تو ان دونوں کو قید کر کے لاؤ۔ اور اگر ان میں کوئی قتل ہو جائے گا تو اس کی دیت ہمارے ذمہ ہوگی۔ قریش نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور ابوبکرؓ کو گرفتار کر کے لانے کا یا قتل کر دینے کی صورت میں ہر ایک کے عوض سو اونٹ دینے کا فیصلہ کیا ہے۔ سراقہؓ اس وقت اپنی قوم بنو مدلج کی ایک مجلس میں بیٹھے ہوتے تھے کہ استے میں ان قاصدوں میں سے ایک شخص آیا۔ اور اس مجلس کے پاس آ کر کھڑا ہو گیا۔ اُس نے کہا اے سراقہؓ بے شک میں نے ابھی چند لوگوں کو ساحل پر دیکھا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ وہ محمدؐ اور اُن کے ساتھی ہیں۔ سراقہؓ کہتے ہیں کہ میں سمجھ تو گیا کہ یہ وہی ہیں۔ لیکن میں نے اس سے کہہ دیا کہ یہ وہ نہیں ہیں بلکہ تم نے فلاں فلاں شخص کو دیکھا ہوگا۔ وہ ابھی ہماری آنکھوں کے سامنے سے گزر رہے ہیں۔

پھر سراقہؓ کچھ دیر اپنی مجلس میں بیٹھے رہے۔ پھر وہاں سے اٹھ کر اپنے مکان میں داخل ہوئے۔ اپنی لونڈی کو حکم دیا کہ گھوڑا لے کر باہر جائے۔ اور ٹیلے کے پیچھے اسے لے کر کھڑی ہو جائے۔ پھر سراقہؓ نے اپنا نیزہ لیا۔ اور گھر کی چھت پر چڑھے۔ نیزے کی نوک زمین پر ٹکائی۔ اور اس کا اوپر کا حصہ جھکایا اور نیچے اتر گئے۔ پھر وہ اپنے گھوڑے کے پاس پہنچے۔ اس پر سوار ہو کر اسے خوب تیز دوڑایا۔ تاکہ وہ جلدی سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس پہنچ جائیں۔ تھوڑی دیر میں وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے ساتھیوں کے پاس پہنچ گئے۔ قریب پہنچے ہی تھے کہ ان کے گھوڑے نے ٹھوکر کھائی۔ اور وہ اس

پر سے گر پڑے۔ پھر اٹھے اور اپنا ہاتھ ترکش کی طرف بڑھایا۔ اُس میں سے تیر نکالے اور ان سے فال نکالی۔ وہ یہ معلوم کرنا چاہتے تھے کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے ساتھیوں کو نقصان پہنچائیں یا نہیں۔ فال میں وہ بات نکلی جس کو انہوں نے پسند نہیں کیا۔ وہ پھر گھوڑے پر سوار ہو گئے۔ اور فال کی پرواہ نہ کی۔ اب ان کا گھوڑا، اُن کو لے کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اتنا قریب پہنچ گیا۔ کہ اُن کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی قرارت سنائی دینے لگی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اِدھر اُدھر نہیں دیکھتے تھے۔ حضرت ابوبکرؓ کثرت سے اِدھر اُدھر دیکھتے جا رہے تھے۔ اتنے میں اُن کو سراقہؓ نظر آئے۔ انہوں نے رسول اللہ صلعم سے عرض کیا کہ اے اللہ کے رسول یہ سوار ہمارے قریب آگیا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ڈرو نہیں۔ اللہ ہمارے ساتھ ہے۔ یہ کہہ کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مڑ کر دیکھا۔ اور دعا کی کہ اے اللہ اسے گرا دے۔ فوراً سراقہؓ کے گھوڑے کے اگلے پاؤں گھٹنوں تک زمین میں دھنس گئے۔ اور سراقہؓ اس پر سے پھر گر پڑے۔ سراقہؓ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا آپ میرے لئے دعا فرمائیں، میں آپ کو نقصان نہیں پہنچاؤں گا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دعا کی۔ آپ کی دعا کی برکت سے انہیں نجات ملی۔ اس کے بعد انہوں نے اپنے گھوڑے کو ڈانٹا تو بڑی مشکل سے اس کے پاؤں باہر نکلے۔ جب گھوڑا سیدھا کھڑا ہوا تو اس کی وجہ سے بہت سا غبار دھوئیں کے مثل آسمان تک بلند ہو گیا۔ گھوڑا ہنہنانے لگا۔ سراقہؓ نے پھر تیروں سے فال نکالی۔ پھر وہی چیز نکلی جس کو وہ پسند نہیں کرتے تھے۔ لہٰذا انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے ساتھیوں کو امان کے ساتھ پکارا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے ساتھی ٹھہر گئے۔ سراقہؓ اپنے گھوڑے پر سوار ہو کر آپ کے پاس پہنچ گئے۔

پہلا امن نامہ: وہ کہتے ہیں کہ مجھے آپ تک پہنچنے میں جو دقت پیش آئی۔ تو میں سمجھ گیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا کام (یعنی دین) غالب ہو کر رہے گا۔ سراقہؓ نے عرض کیا کہ آپ کی قوم نے آپ کے لئے انعام مقرر کیا ہے۔ اور وہ آپ کے ساتھ ایسا ایسا کرنا چاہتے ہیں۔

پھر سراقہؓ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو زادِ راہ اور کچھ سامان پیش کیا لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے قبول نہیں فرمایا۔ اور نہ خود ہی کچھ طلب کیا۔ سراقہؓ نے عرض کیا کہ آپ جو پسند کریں مجھے حکم دیں میں تعمیل کروں گا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ تم ابھی یہیں ٹھہرو۔ اور کسی کو ہم تک نہ آنے دو، ہمارے حال کو کسی پر ظاہر نہ کرو۔ سراقہؓ نے عرض کیا۔ میرے لئے ایک پروانۂ امن لکھ دیا جائے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عامرؓ بن فہیرہ کو حکم دیا۔ انہوں نے چمڑے کے ایک ٹکڑے پر تحریرِ امن لکھ دی۔

غرض یہ کہ سراقہؓ جو دن کے اول حصہ میں دشمن تھے آخر حصہ میں دوست بن گئے۔ جو شخص بھی انہیں ملتا اس سے کہتے کہ میں تمہارے لئے کافی ہوں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ادھر نہیں ہیں۔ اس طرح وہ تمام تلاش کرنے والوں کو واپس کرتے رہے۔

یہاں تک کے واقعات سے جو امور ثابت ہوتے ہیں وہ حسب ذیل ہیں۔

۱۔ حضور کو قتل کے منصوبے کا علم سراقہؓ کی زبانی ہوا۔ جو اس بات کا ثبوت ہے کہ پہلے سے قتل کا کوئی منصوبہ نہ تھا۔ بلکہ جب آپ نے مکہ چھوڑ دیا۔ تو اب آپ کے بارے میں دو فیصلے کئے گئے۔ قتل یا گرفتاری۔

۲۔ یہ فیصلے صرف حضور کی ذات کے لئے نہ تھے۔ بلکہ حضور اور حضرت ابوبکر دونوں کے لئے تھے۔ گویا یہ دونوں حضرات لازم و ملزوم تھے۔ ان دونوں کے علاوہ کسی کے قتل یا گرفتاری کا کوئی فیصلہ نہ تھا جو کسی کے لئے خطرہ کا باعث ہوتا۔

۳۔ یہ تمام سفر اور اس کی تیاری سب کی سب ابوبکرؓ اور ان کے گھرانہ کی مرہون منت تھی۔ اور اس فضیلت میں ابوبکرؓ اور ان کے گھرانہ کے علاوہ کوئی دوسرا فرد ہرگز شریک نہ تھا۔ سبائی اسی خوبی کو برداشت نہ کر سکے۔ اور انہوں نے واقعہ کی نوعیت تبدیل کر دی۔

۴۔ بخاری کی اس روایت میں ایک خوبی یہ بھی ہے کہ اس کی سند میں ایک بھی عجمی نہیں ہے سب عرب

۵۔ یہ پہلا امن نامہ تھا جو حضرت ابوبکرؓ کے غلام حضرت عامرؓ بن فہیرہ نے تحریر کیا۔

اب امام زہری حضرت عائشہؓ کی اصل روایت کی جانب لوٹتے ہیں۔ اور آگے کی تفصیل میں بیان فرماتے ہیں :۔

کہ مجھ سے عروۃ بن الزبیر نے بیان کیا ہے کہ اثنائے راہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو حضرت زبیرؓ معہ چند مسلم تاجروں کے ملک شام سے آتے ہوئے ملے۔ (عروہ ان ہی حضرت زبیرؓ کے صاحبزادے ہیں۔ اور زبیرؓ حضور کے پھوپی زاد بھائی اور ابوبکرؓ کے داماد ہیں۔ ان کے نکاح میں حضرت عائشہؓ کی بڑی بہن حضرت اسماءؓ ہیں۔ اس رشتہ سے ابوبکرؓ عروہ کے نانا اور ام المؤمنین خالہ ہیں) حضرت زبیرؓ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابوبکر کو پہننے کے لئے سفید کپڑے پیش کئے۔ (ان دونوں حضرات نے وہ کپڑے پہن لئے)

مدینہ منورہ کے مسلمانوں کو جب مکہ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی روانگی کی خبر ملی تو وہ ہر روز صبح کو مقام حرۃ تک استقبال کے لئے آتے اور وہاں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا انتظار کرتے تھے۔ یہاں تک کہ انہیں دوپہر کی گرمی واپس کیا کرتی تھی۔

مدینہ آمد

ایک روز وہ کافی دیر انتظار کرنے کے بعد جب لوٹ کر گھر واپس پہنچے۔ تو ایک یہودی مدینہ منورہ کے ٹیلوں میں سے کسی ٹیلہ پر کام کے لئے چڑھا۔ اس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابوبکرؓ کو سفید لباس میں ملبوس مدینہ منورہ کی طرف آتے دیکھا۔ اُن کی (سفیدی اور چمک دمک کی) وجہ سے سراب غائب ہوگیا تھا۔ وہ یہودی بے ساختہ چیخنے لگا۔ کہ اے گروہ عرب تمہارا مقصود آپہنچا۔ جس کا تم انتظار کر رہے تھے۔ یہ سنتے ہی تمام مؤمنین ہتھیار لے کر دوڑ پڑے۔ اور مقام حرہ پہنچ کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا استقبال کیا۔ وہاں سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم داہنی طرف مڑ گئے۔ یہاں تک کہ چلتے چلتے آپ مدینہ کی ایک مرتفع بستی یعنی بنی عمرو بن عوف کے محلہ میں جا اترے۔ وہ ربیع الاول کا مہینہ اور دوشنبہ کا دن تھا۔ حضرت ابوبکرؓ لوگوں سے ملاقات کے لئے کھڑے ہوتے تھے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خاموش بیٹھے ہوئے تھے۔ جن لوگوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

کو نہیں دیکھا تھا۔ وہ حضرت ابوبکرؓ کے پاس آتے تھے۔ اور ان کو اللہ کا رسول سمجھتے تھے۔ یہاں تک کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر دھوپ آگئی۔ تو ابوبکرؓ نے آپ کے پاس کھڑے ہو کر آپ کے اوپر اپنی چادر سے سایہ کر لیا۔ اب لوگوں نے سمجھا کہ اللہ کے رسول یہ ہیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے وہاں چودہ دن قیام فرمایا۔ آپ نے وہاں ایک مسجد کی بنیاد ڈالی۔ جس کی بنیاد تقوے پر ہے (یعنی مسجد قبا) اس مسجد میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نماز پڑھتے رہے حتیٰ کہ ایک دن آپ نے انصار مدینہ کو بلوایا۔ انصار حاضر خدمت ہوئے اور سلام عرض کیا۔ اور درخواست کی کہ آپ دونوں اطمینان کے ساتھ مدینہ چلیے۔ ہم آپ کی اطاعت کریں گے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنی سواری پر سوار ہو گئے۔ اور مدینہ منورہ کی طرف چلے۔ لوگ بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ چل رہے تھے۔ انصار نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابوبکرؓ کو ہتھیاروں سے گھیر رکھا تھا۔ مدینہ منورہ میں ہر طرف یہی چرچا تھا کہ اللہ کے نبی آ رہے ہیں۔ لوگ بلندیوں پر چڑھ کر نظارہ کر رہے تھے۔ بہت سے مرد و عورت گھروں کی چھتوں پر چڑھ گئے۔ لڑکے اور خادم راستوں میں پھیل گئے۔ وہ پکار پکار کر آپ کو مخاطب کر رہے۔ یا محمد یا رسول اللہ۔ یا محمد یا رسول اللہ۔ لوگ بار بار کہہ رہے تھے کہ اللہ کے نبی آ گئے۔ اللہ کے نبی آ گئے۔ اہل مدینہ ایسے خوش تھے کہ اس سے پہلے ایسے خوش کبھی نہ ہوئے تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قیام کے سلسلہ میں باہم جھگڑ رہے تھے۔ ہر شخص یہی چاہتا تھا کہ میرے یہاں قیام فرمائیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ میں عبدالمطلب کی ننھیال یعنی بنو نجار کے یہاں قیام کروں گا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم برابر چلتے رہے۔ یہاں تک کہ اونٹنی اس جگہ جا کر بیٹھ گئی۔ جہاں بعد میں مسجد نبوی تعمیر ہوئی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا انشاء اللہ یہی ہماری منزل ہے۔ الغرض آپ اپنی ننھیال میں حضرت ابو ایوبؓ کے ایک مکان کی جانب اتر گئے۔ اور ان کے گھر والوں سے باتیں کرتے رہے۔ تاریخ الاسلام والمسلمین از ص۱۰۸ تا ص۱۱۲۔ بخاری ج ۱ ص۵۵۳ تا ص۵۵۶

ہم نے پورا تفصیلی واقعہ اس لئے پیش کیا ہے کہ اول آ[illegible] کے سامنے ہجرت رسول [illegible]

صحیح واقعہ آجائے۔ اور قارئین کو یہ بھی معلوم ہو جائے کہ ہجرت کے تمام واقعہ میں از ابتدا تا انتہا کوئی کردار ایسا نہیں جس کا تعلق حضرت ابوبکرؓ کی ذات سے نہ ہو۔ رفیق سفر گر ابوبکرؓ ہیں۔ تو رات کو غار میں ساتھ سونے والے ابوبکرؓ کے بیٹے عبداللہؓ ہیں۔ بکریوں کا دودھ پلانے والے راہ کے ہم سفر اور پہلا پروانہ امن لکھنے والے عامرؓ بن فہیرہ ہیں جو ابوبکرؓ کے غلام ہیں۔ سامان اور زادِ راہ تیار کرنے والیاں ابوبکرؓ کی بیٹیاں عائشہؓ اور اسماءؓ ہیں۔ راہ میں کپڑے پیش کرنے والے زبیرؓ ہیں جو ابوبکرؓ کے داماد ہیں۔ مشورے ہوتے ہیں تو ابوبکرؓ سے۔ ہجرت فرماتے ہیں تو ابوبکرؓ کے گھر سے اور سواری استعمال کرتے ہیں تو ابوبکرؓ کی۔ گویا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اگر اس دنیا میں کسی پر کلی اعتماد تھا تو وہ صرف ابوبکرؓ کی ذات تھی۔ یا اُن کے گھر کے افراد تھے۔

یہی تو وہ خوبیاں ہیں جنہیں سبائی اور مجوسی ذہن برداشت نہیں کر سکتا۔ کیونکہ وہ تو ان دشمنانِ اسلام کے نزدیک سب سے اول غاصب ہیں۔ اس لئے اس طبقہ نے ابوبکرؓ کی اس فضیلت پر ڈاکہ ڈالنے کے لئے منصوبہ قتل اور بستر کی کہانی وضع کی۔ تاکہ وہ تاثر جو ہجرت کے واقعہ سے حضرت ابوبکر کے بارے میں پیدا ہوتا ہے۔ وہ کالعدم ہو کر رہ جائے۔ اور بہ اتفاق سے سبائیوں کو اس منصوبہ کو پھیلانے کے لئے سنیوں میں ایجنٹ بھی مل گئے۔ بلکہ اب ان ایجنٹوں نے ایک نیا روپ دھار لیا ہے کہ تاریخی حقائق کے نام سے احادیث صحیحہ کا رد کیا جائے۔ ان نام نہاد سنیوں کے نزدیک کتب احادیث تو ناقابل اعتبار ہیں۔ کیونکہ ان میں ضعیف روایات پائی جاتی ہیں لیکن تاریخ جو تمام تر یہودیت اور شیعیت کا چربہ ہے۔ وہ ایک یقینی شے ہے۔ حالانکہ احادیث کی تحقیق اور صحت کے لئے متعدد فنون وجود میں آئے۔ لیکن آج تک تاریخ کی تحقیق و تنقید کے لئے کوئی فن تو کجا ایک اصول بھی وضع نہیں ہوا۔ اور جب ہم محدثین کے وضع کردہ اصول کے مطابق تاریخی واقعات کی تحقیق کرتے ہیں تو شیعوں کا یہ ایجنٹ طبقہ چلا اٹھتا ہے کہ ہمارے ہاتھ سے تاریخ گئی۔ اور مودودی صاحب تو یہ فرماتے ہیں کہ اگر ان راویوں کی روایتیں ہم ترک کر دیں گے تو ہمارے پاس تاریخ میں کیا بچے گا۔ لہٰذا ہمیں تحقیق کی کوئی ضرورت نہیں۔ مورخ طبری، مورخ ابن اسحاق اور مورخ واقدی نے ایک مورخ ہونے کے

نا تسے خود ہی تحقیق کرلی ہوگی۔ ان مورخین کی تحقیق کا حال بھی قارئین نے دیکھ لیا۔ بلکہ ان کے چہرے مہرے بھی دیکھ لئے ہیں۔ یہ تو ہم نے قارئین کے سامنے چیدہ چیدہ واقعات پیش کئے ہیں۔ ورنہ یہ تو تمام خانہ سیاہ ہی سیاہ ہے۔ کاش کوئی اللہ کا بندہ ایسا ہو کہ جو کم از کم سیرت رسول ہی صحیح طور پر پیش کردے۔ ورنہ ایک مشہور محدث حافظ عراقی تو بے تاب ہو کر کہہ اٹھے تھے۔

لیعلم الطالب ان السیرا　　ماصح وما قد انکرا

طالب علم کو یہ معلوم ہونا چاہیئے کہ سیرت میں صحیح اور منکر ہمہ قسم کی باتیں ہوتی ہیں۔

اور اسی لئے سید سلیمان ندوی یہ لکھنے پر مجبور ہوئے کہ آج تک سیرت رسول پر کسی زبان میں ایک بھی صحیح کتاب نہیں لکھی گئی۔

غارِ ثور پر کبوتروں کا انڈے دینا

علامہ شبلی سیرت النبی میں لکھتے ہیں۔

مشہور ہے کہ جب کفار مکہ غار کے قریب آگئے تو اللہ نے حکم دیا۔ دفعتًہ ببول کا درخت اُگا اور اس کی ٹہنیوں نے پھیل کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو چھپا لیا۔ ساتھ ہی دو کبوتر آئے۔ اور گھونسلا بنا کر انڈے دیئے۔ حرم کے کبوتر ان ہی کی نسل سے ہیں۔ (گویا اس سے قبل حرم میں کبوتروں کا کوئی وجود نہ تھا)

اس روایت کو مواہب لدنیہ میں تفصیل سے نقل کیا ہے۔ اور زرقانی نے بزاز وغیرہ سے اس کے ماخذ بتائے ہیں۔ لیکن یہ تمام روایتیں غلط ہیں۔ اس روایت کا اصل راوی عون بن عمرو ہے۔ اس کی نسبت امام فن رجال یحیٰی بن معین کا قول ہے لاشیئ یعنی ہیچ ہے۔ امام بخاری نے کہا ہے وہ منکر الحدیث اور مجہول ہے۔ اس روایت کا ایک اور راوی ابو مصعب مکی ہے۔ اور وہ مجہول الحال ہے۔ چنانچہ علامہ ذہبی نے میزان الاعتدال میں عون بن عمرو کے حال میں یہ تمام اقوال نقل کئے ہیں اور خود اس روایت کا بھی ذکر کیا ہے۔ سیرت النبی ص ۱۶۲ ج ۱

سید سلیمان ندوی مرحوم تیسری جلد میں رقم طراز ہیں۔

مشہور ہے کہ ہجرت کے وقت جب آپ نے غارِ ثور میں پناہ لی تو اللہ کے حکم سے فوراً غار کے منہ پر بنولے یا ببول کا درخت اُگ آیا۔ جس کی ڈالیاں پھیل کر غار پر چھا گئیں۔ کبوتر کے ایک جوڑے نے وہاں آکر انڈے دیئے۔ اور مکڑی نے جالے تن دیئے۔ تاکہ مشرکین کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں اس کے اندر ہونے کا گمان نہ ہو۔ درخت کے اُگنے۔ کبوتر کے انڈے دینے اور مکڑی کے جالا تننے ان تینوں کا ذکر ابو مصعب مکی کی روایت میں ہے۔ بقیہ روایتوں میں صرف کبوتروں کے انڈے دینے اور مکڑی کے جالا تننے کا بیان ہے۔ بہرحال یہ واقعہ کتب سیر میں ہے۔ ابن اسحاق، ابن سعد، دلائل بیہقی، ابو نعیم میں اور کتب حدیث میں سے ابن مردویہ اور بزاز میں ہے۔

ابن مردویہ، بزاز اور بیہقی میں جو روایت ہے۔ نیز ابن سعد اور ابو نعیم کی ایک روایت ابو مصعب مکی سے ہے جو متعدد صحابہ سے اس واقعہ کا سننا ظاہر کرتا ہے۔ ابو مصعب سے عون بن عمرو القیسی اس کی روایت کرتا ہے۔ لیکن یہ دونوں پایۂ اعتبار سے گرے ہوئے ہیں۔ ابو مصعب مکی مجہول ہے۔ اور عون بن عمرو کی نسبت یحییٰ بن معین کہتے ہیں کہ وہ کچھ نہیں۔ امام بخاری فرماتے ہیں وہ منکر الحدیث اور مجہول ہے۔

ابو نعیم میں عون بن عمرو کے بجائے عوین بن عمر التیمی لکھا ہے۔ یہ عوین بن عمرو بھی بے اعتبار ہے۔ عقیلی نے اس کا ضعفاء میں شمار کیا ہے۔ اور لکھا ہے کہ اس کی روایتوں کی تصدیق نہیں ہوتی۔ اور اس روایت کو نقل کر کے لکھا ہے کہ ابو مصعب مجہول ہے۔

استاذ مرحوم نے سیرت النبی جلد اول واقعۂ ہجرت میں صرف ابو مصعب کی روایت پر تنقید کی ہے۔ مگر واقعہ یہ ہے کہ ابو مصعب کے علاوہ اور دوسرے سلسلوں سے بھی یہ مروی ہے۔ چنانچہ ابن سعد نے ایک اور طریقہ سے اس واقعہ کی روایت کی ہے۔ مگر اس روایت کا سر سلسلہ واقدی ہے۔ جس نے متعدد روایتوں کو یکجا کر کے ان کی ایک مشترک روایت ہجرت تیار کی ہے۔ اس واقعہ کی بہترین

[illegible] فرماتے ہیں۔

فمروا بالغار فرأوا على بابه	وہ لوگ غار پر سے گزرے تو انہوں نے
نسج العنکبوت فقالوا	غار کے منہ پر مکڑی کا جالا دیکھا تو کہنے
لودخل ھھنا لم یکن نسج	لگے۔ اگر یہ لوگ اس میں داخل ہوتے تو
العنکبوت۔	یہاں یہ مکڑی کا جالا نہ ہوتا۔

لیکن ان الفاظ سے اس واقعہ کا غیر معمولی ہونا ظاہر نہیں ہوتا۔ البتہ اس روایت کی بناء پر اس کو تائیدات میں جگہ دی جا سکتی ہے۔ تاہم یہ روایت بھی قائم نہیں۔ اس کے راوی مقسم ہیں جو اپنے کو مولیٰ ابن عباسؓ کہتے ہیں۔ اور ان سے عثمان الجزری نام ایک شخص روایت کرتا ہے مقسم کی اگرچہ متعدد محدثین نے توثیق کی ہے۔ اور امام بخاری نے صحیح میں ان سے جماعت کی روایت نقل کی ہے مگر انہوں نے خود کتاب الضعفاء میں ان کو ضعیف کہا ہے، ابن سعد نے بھی ان کو ضعیف کہا ہے۔ ساجی نے لکھا ہے کہ محدثین نے ان کی روایت میں کلام کیا ہے۔ ابن حزم نے لکھا ہے کہ وہ قوی نہیں۔

عثمان الجزری جو عثمان بن عمرو بن ساج الجزری ہے۔ اور کہیں عثمان بن ساج کے نام سے مشہور ہے۔ گو ابن حبان نے اپنے مشہور تساہل کی بناء پر اس کو ثقات میں داخل کیا ہے۔ مگر محدث ابو حاتم کہتے ہیں کہ اس کی حدیث لکھی جاتے۔ حجت میں پیش نہ کی جاتے۔ علامہ ذہبی نے میزان میں اور حافظ ابن حجر نے لسان میں صرف ابو حاتم کا قول نقل کیا ہے۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کی نسبت محدثین کا آخری فیصلہ یہی ہے۔ سیرت النبی ص۲۹۶ ج ۳

عثمان ابن ساج کے بارے میں ذہبی نے ابو حاتم کا یہ قول میزان ص۳۹ ج ۳ پر نقل کیا ہے۔ لیکن ص۴۲ پر لکھتے ہیں کہ خصیف کہتے ہیں کہ اس کی روایت کی کوئی تصدیق نہیں کرتا۔ جہاں تک ابومصعب کی روایت کا تعلق ہے تو وہ اس روایت کو حضرت زیدؓ بن ارقم، حضرت انسؓ اور حضرت مغیرہؓ بن شعبہ سے نقل کرتا ہے۔ ذہبی کہتے ہیں یہ مجہول ہے۔ میزان ص۲۰۷ ج ۳ جب تک یہ معلوم نہ ہو کہ یہ ابومصعب کون شخص ہے۔ اس کا نام کیا ہے، یہ کب پیدا ہوا، اور کب مرا؟ تو اس کا یہ دعویٰ کہ اس نے ان تینوں صحابہ سے یہ روایت سنی کیسے قبول کیا جا سکتا ہے؟

پھر ابو مصعب کا یہ دعویٰ اس لحاظ سے بھی جھوٹ ہے کہ ان تینوں صحابہ میں سے کوئی صحابی ایسا نہیں جو اس واقعہ کے وقت موجود ہو، مثلاً حضرت انس رضؓ بن مالک اس وقت دس سال کے بچہ تھے، اور مدینہ میں مقیم تھے زید رضؓ بن ارقم چند سال کے بچہ تھے اور مدینہ میں مقیم تھے۔ اور حضرت مغیرہ رضؓ بن شعبہ سنہ ۶ھ میں اسلام لائے۔ اُس وقت تک کافر تھے اور طائف میں مقیم تھے۔ اور جو حضرات ہجرت کے وقت حضور کے ساتھ تھے یعنی حضرت ابوبکر رضؓ اور حضرت عامر رضؓ بن فہیرہ وہ اس قسم کا کوئی واقعہ بیان نہیں کرتے۔ اور نہ ابوبکر رضؓ کے بیٹے عبداللہ رضؓ جو غار میں رات کو ساتھ سویا کرتے تھے۔ اُن سے بھی اس سلسلہ میں کوئی واقعہ مروی نہیں۔ اسی طرح ابن عباس رضؓ اس وقت مکہ میں تھے اور دو سال کے بچہ تھے۔

پھر ان حضرات کے سن وفات میں بھی زبردست فرق ہے۔ حضرت مغیرہ رضؓ بن شعبہ نے کوفہ میں ۵۰ھ میں انتقال فرمایا۔ جب کہ زید رضؓ بن ارقم کی وفات ۶۸ھ میں ہوئی اور حضرت انس بن مالک کا انتقال بصرہ میں ۹۳ھ میں ہوا۔ اور ابن عباس رضؓ کی وفات طائف میں ۶۵ھ میں ہوئی۔ یہ کوئی ضروری نہیں کہ جس نے حضرت انس رضؓ بن مالک کو دیکھا ہو اُس نے بقیہ صحابہ کو بھی دیکھا ہو۔ مثلاً امام زہری۔ امام ابو حنیفہ اور قتادہ نے حضرت انس رضؓ کو دیکھا ہے۔ لیکن ان حضرات نے بقیہ صحابہ میں سے کسی کو نہیں دیکھا کیونکہ ۵۰ھ تک پیدا ہونے والے اشخاص کے لئے حضرت انس رضؓ کو دیکھنا ممکن تھا۔ لیکن حضرت مغیرہ رضؓ بن شعبہ کو تو وہی شخص دیکھ سکتا ہے جس کی پیدائش ۲۰ھ کے قریب ہوئی ہو۔ اور ان تمام امور کے جوابات اس پر موقوف ہیں کہ یہ ابو مصعب کون ہے کب پیدا ہوا۔ یہ کہاں کا باشندہ تھا اور اس نے کہاں کی سکونت اختیار کی تھی اور کس کس جگہ کا سفر کس کس سن میں کیا اور کس کس سے استفادہ کیا۔ لیکن ان میں سے کسی ایک بات کا بھی کسی کو علم نہیں۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ یہ کوئی فرضی کردار ہے جو اس کہانی کے پلاٹ کے لئے تیار کیا گیا ہے۔ اسی لئے اِس کا وجود کہیں نظر نہیں آتا۔

قصّہ ام معبد

(بے دودھ کی بکری کے تھنوں میں دودھ اتر آنا)

ہجرت کے موقعہ پر بے دودھ والی بکری کے تھنوں میں دودھ پیدا ہو جانے کا مشہور ترین معجزہ ام معبد کے خیمے کا ہے۔ کہتے ہیں کہ مکہ اور مدینہ کی راہ میں قبیلہ خزاعہ کے ایک خاندان کا میدان میں خیمہ تھا۔ ام معبد، اور ابو معبد میاں بیوی اس خیمے میں رہتے تھے۔ اور مسافروں کو آرام پہنچایا کرتے تھے۔ بکریوں کی پرورش پراُن کا گزارہ تھا۔ صبح کو ابو معبد تمام اچھی اور دودھ والی بکریاں لے کر چراگاہ کو نکل گیا تھا۔ صرف بے دودھ والی بکریاں خیمے میں رہ گئی تھیں۔ اتنے میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابو بکرؓ کا ادھر سے گزر ہوا۔ کھانے پینے کی کچھ چیزیں آپ نے بہ قیمت طلب کیں۔ جو نہیں ملیں۔ خیمہ کے ایک گوشہ میں ایک بکری نظر آئی۔ آپ نے پوچھا ام معبد یہ بکری کیسی ہے؟ اس نے کہا یہ لاغری کے سبب بکریوں کے ساتھ نہ جاسکی۔ پھر فرمایا کہ اس کے کچھ دودھ ہے؟ اس نے جواب دیا یہ دودھ سے معذور ہے۔

راوی کا بیان ہے کہ امسال خشک سالی تھی۔ اور لوگ قحط میں مبتلا تھے۔ فرمایا کہ مجھے اس کا دودھ دوہنے کی اجازت ہے۔ عرض کی میرے ماں باپ قربان اگر اس کے دودھ ہو تو دوہ لیجئے۔ آپ نے دُعا فرمائی۔ اور بسم اللہ کہہ کر تھن کو ہاتھ لگایا۔ فوراً اس کے تھنوں میں دودھ اتر آیا۔ دودھ سب نے پی لیا۔ اور کچھ بچ گیا اور قافلہ نبوی آگے روانہ ہوا۔ کچھ دیر کے بعد ابو معبد آیا۔ دیکھا کہ گھر میں دودھ رکھا ہے۔ تعجب سے پوچھا یہ دودھ کہاں سے آیا؟ بکریاں تو سب میرے ساتھ تھیں۔ ام معبد نے سارا قصہ بیان کیا۔ ابو معبد نے کہا ذرا اس شخص کی صورت و شکل بیان کرو؟ ام معبد نے نہایت تفصیل سے آپ کے حسن و جمال اور شکل و شمائل کی تصویر کھینچی۔ جسے سُن کر ابو معبد نے کہا یہ تو اللہ کی قسم قریش والا آدمی معلوم ہوتا ہے۔ جس کا کچھ حال میں سُن چکا ہوں۔ میری آرزو ہے کہ مجھے اس کی صحبت میسر ہوتی۔ اور جب انشاء اللہ موقعہ مل گیا تو میں یہ کروں گا۔

اسی وقت مکہ میں کچھ اشعار سنے گئے۔ اُن اشعار میں اُم معبد کے واقعہ کا بیان تھا۔ حضرت حسانؓ نے جب ہاتف کی یہ آواز سنی تو ان اشعار کے جواب میں یہ اشعار کہے۔ یہ جوابی اشعار بھی روایت میں مذکور ہیں۔

سید سلیمان ندوی مرحوم اس روایت پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

یہ روایت بغوی، ابن شاہین، ابن سکن، ابن مندہ، ابو نعیم، طبرانی، بیہقی اور حاکم میں ام معبد کے بھائی حبیش بن خالد کی زبانی منقول ہے۔ حاکم نے نہ صرف یہ کہ اسے صحیح کہا ہے۔ بلکہ اور دیگر طریقوں سے اسے ثابت کرنے کی کوشش بھی کی ہے۔ مگر حاکم کے صحیح کہنے کی علماء کی نگاہ میں کوئی قدر و قیمت نہیں۔ چنانچہ حافظ ذہبی نے اس روایت پر تنقید کرتے ہوئے تصریح کر دی ہے کہ ان میں سے کوئی طریقہ سند صحیح کی شرائط کے مطابق نہیں۔

حافظ ذہبی نے مجملاً اسی قدر لکھا ہے۔ مگر واقعہ یہ ہے کہ یہ روایت حاکم کے علاوہ اور کتابوں میں بھی اسی سلسلۂ سند سے مذکور ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ حزام اپنے باپ ہشام سے۔ اور ہشام اپنے باپ حبیش بن خالد خزاعی سے ناقل ہیں۔ حزام مجہول ہے۔ حبیش بن خالد سے صرف یہی ایک روایت کتب حدیث میں مذکور ہے۔ حبیش اصل واقعہ کے وقت موجود نہ تھے۔ معلوم نہیں انہوں نے کس سے سُنا۔ اس لئے اگر یہ روایت ثابت بھی ہو تو مرسل ہے۔

حاکم نے دو طریقوں سے اس واقعہ کو نقل کیا ہے۔ ایک ان ہی حزام اور ہشام بن حبیش کے ذریعہ سے اور دوسرے حر بن صباح سے اور وہ ام معبد کے شوہر ابو معبد سے راوی ہیں۔ پہلے طریقہ میں حاکم نے یہ کمال کیا ہے کہ حبیش کے بجائے اس کے بیٹے ہشام بن حبیش کو اصل راوی اور صحابی قرار دے دیا۔ ظاہر ہے کہ اس طریق سے روایت کا ارسال اور بڑھ گیا (یعنی اب درمیان سے دو راوی چھوٹ گئے)۔ ہشام کا صحابی ہونا ثابت نہیں۔

دوسرے طریقہ میں حر بن صباح گو ثقہ ہیں مگر ابو معبد سے ان کی سماعت ثابت نہیں۔ چنانچہ ابن حجر نے تہذیب میں لکھا ہے کہ حر ابو معبد سے مرسل روایتیں کرتے ہیں (یعنی درمیان سے

راوی غائب کردیتے ہیں)

یہ تو ان تمام روایتوں کے اوپر کے راویوں کا حال ہے۔ پیچھے کے راویوں میں اکثر مجہول لوگ ہیں۔ حزین صباح والی روایت میں نیچے ایک شخص محمد بن بشر سکری ہے۔ جس کو ازدی نے منکرالحدیث اور ابن عدی نے واہی کہا ہے۔

ابونعیم نے دلائل میں ایک اور صحابی سلیط ابوسلیمان انصاری بدری سے اس کی روایت کی ہے۔ سلیط سے اُن کے بیٹے سلیمان اور اُن سے اُن کے بیٹے محمد بن سلیمان بن سلیط انصاری روایت کرتے ہیں۔ لیکن ان سلیط کا نام صرف اسی روایت کی رو سے بعض مؤلفین سیر صحابہ نے۔ صحابہ میں داخل کرلیا ہے۔ ورنہ ان کا کوئی حال ہم کو معلوم نہیں۔

سلیط انصاری جو بدری صحابی ہیں۔ وہ سلیط بن قیس انصاری خزرجی ہیں۔ اُن کے بیٹے کا نام عبداللہ تھا۔ جس سے نسل نہیں چلی۔ اُن کی روایت سنن نسائی میں موجود ہے۔ مگر ابوسلیمان سلیط انصاری بدری سے اس کے علاوہ کوئی روایت موجود نہیں۔ اسی لئے اسماء الرجال اور مؤلفین رجال صحابہ میں سے بعض نے ان کو اور سلیط بن قیس انصاری کو ایک سمجھا ہے۔ اگر ایسا ہے تو سلیمان ان کے بیٹے اور محمد اُن کے پوتے کا ہرگز نام نہ تھا۔ اگر یہ دو شخص ہیں تو اصحاب بدر کے نام سب گنے ہوتے ہیں۔ ان میں سلیط بن قیسؓ خزرجی کے سوا کوئی دوسرا سلیط نامی نہیں۔ پھر یہ مدینہ کے باشندہ تھے اور ام معبد قبیلۂ خزاعہ کی تھیں جو مکہ اور مدینہ کے بیچ میں آباد تھا۔ معلوم نہیں کہ سلیط انصاریؓ نے کس سے سنا۔ پھر ان کے بیٹے سلیمان اور پوتے محمد سے کوئی واقف نہیں۔ حافظ ابن حجر لسان المیزان میں محمد بن سلیمان بن سلیط انصاری کے حال میں لکھتے ہیں۔

قال العقیلی مجھول بالنقل	عقیلی کہتے ہیں یہ نقل میں مجہول ہے۔ یہ
روی عن ابیہ عن جدہ	اپنے باپ کے ذریعہ دادا سے نقل کرتا
فذکر قصۃ ام معبد وھو	ہے۔ اس نے ام معبد کا قصہ ذکر کیا ہے
واہ وقال لیس ھذا الطریق	جو واہی ہے۔ اور ام معبد کے قصہ میں

محفوظا فی حدیث ام معبد — یہ سند محفوظ نہیں۔ ابن مندہ کہتے ہیں یہ
قال ابن مندۃ وھو مجھول — مجہول ہے۔

علاوہ ازیں ان روایتوں کے الفاظ، ام معبد اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے باہم طرز تخاطب اور اشعار کی زبان اور ابو معبد کی گفتگو میں ایک خاص قسم کی غرابت ہے۔ جس کو ناقدین حدیث اچھی طرح سمجھ سکتے ہیں۔

یہ بھی عجیب بات ہے کہ ہاتف غیب نے اشعار تو مکہ میں لوگوں کو سنائے۔ اور حسانؓ نے جو ابھی مسلمان نہ ہوئے تھے۔ مدینہ میں بیٹھے بیٹھے اُن کا جواب کہا۔ ہجرت کے سال مکہ کے آس پاس قحط کا پڑنا اور خشک سالی ہونا بھی ثابت نہیں۔

مجھے ہجرت کے موقعہ پران دودھ والی روایتوں کے تسلیم کرنے میں اس لئے بھی پس و پیش ہے۔ کہ ہجرت کے رفیق سفر حضرت ابوبکرؓ سے واقعات ہجرت کی جو روایت صحیح بخاری میں مذکور ہے اس میں ایک جگہ ایک چرواہے سے دودھ مانگ کر پینے کا ذکر موجود ہے۔ مگر اس معجزہ کا مطلق ذکر موجود نہیں۔ چنانچہ صحیح بخاری میں حضرت ابوبکرؓ کی زبانی یہ قصہ ان الفاظ میں مذکور ہے۔

دفعۃً ایک چرواہا نظر آیا۔ جو اپنی بکریوں کو ہانکے لئے جا رہا تھا۔ میں نے اس سے پوچھا تم کس کے غلام ہو؟ اس نے قریش کے ایک آدمی کا نام لیا جس کو میں جانتا تھا۔ پھر میں نے کہا تمہاری بکریوں کے دودھ ہے؟ اس نے کہا ہاں۔ میں نے کہا اپنے ہاتھ اور بکری کے تھن جھاڑ کر پیالہ میں دودھ دوہو۔ اُس نے دوہا۔ تو میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے ایک برتن میں رکھ کر اور تھوڑا پانی ملا کر تاکہ ٹھنڈا ہو جائے آپ کے پاس لایا۔ آپ نے نوش فرمایا۔ سیرت النبی ص۲۸۳ ج ۲

یہ تھا اصل واقعہ جسے بعد کے مصنفین نے رنگ آمیزی کر کے اسے ایک معجزہ بنا کر پیش کر دیا۔ ہمیں حیرت تو اس پر ہے کہ ام معبد آپ سے واقف بھی نہیں۔ اور بات بات پر پھر کہہ رہی ہے کہ میرے ماں باپ آپ پر قربان۔ اور پھر آخر میں اپنے خاوند کے سامنے حضور سے لاعلمیت کا اظہار کر رہی ہے۔

یہ بھی تعجب انگیز ہے کہ بقول راوی ابو معبد دُبلی بکریاں خیمے میں چھوڑ گیا تھا۔ لیکن آگے کہتا ہے کہ حضور کو وہاں ایک دُبلی بکری نظر آئی۔ آخر بقیہ دُبلی بکریاں کہاں غائب ہوگئی تھیں۔ گویا اس راوی کو اپنے جھوٹ میں اتنا بھی ہوش نہیں کہ قصہ جمع سے شروع کیا تھا اور ختم واحد پر ہوا۔ بقیہ بکریوں کا کارنامہ بھی تو سامنے آنا چاہیئے تھا۔

راوی یہ بھی بیان کرتا ہے کہ حضور اور ابو بکر ابو معبد کے خیمے پر پہنچے۔ حالانکہ ان دونوں حضرات کے ساتھ عامرؓ بن فہیرہ اور راہبر بھی تھے۔ وہ دونوں کہاں گئے۔ کیا وہ دودھ کے محتاج نہ تھے۔

ہم جب بخاری کی ہجرت والی حدیث کا مطالعہ کرتے ہیں تو صاف یہ محسوس ہوتا ہے کہ راہ میں تمام گھرانے کے کسی فرد نے انجام دیئے۔ راہ میں چرواہا ملا تو ابو بکرؓ دودھ لے کر آئے۔ خود حضور کسی غرض سے کسی کام کے لئے تشریف نہیں لے گئے۔ ام معبد کی کہانی سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ کھانے پینے کی اشیاء حضور تلاش کرتے پھر رہے تھے۔ یہ وہ متعدد وجوہات ہیں جو اس روایت کے جھوٹا ہونے کا بین ثبوت ہیں۔

مولود کعبہ کون؟

ہمارے ہندوپاک میں یہ کہانی زبان زد عام ہے کہ حضرت علیؓ خانہ کعبہ میں پیدا ہوئے۔ اس کی حقیقت کیا ہے؟ ہمارے سنیوں کی زبان پر صرف اتنی ہی بات عام ہے۔ لیکن اس کہانی کا اصل پس منظر کیا ہے۔ ہم اس کے کچھ حصے ملا باقر مجلسی کی "جلاء العیون" سے پیش کئے دیتے ہیں۔ کچھ حصے اس لئے کہ یہ داستان اتنی طویل ہے کہ صفت میں ہمارے پندرہ بیس صفحات ضائع ہو جائیں گے اس لئے ہم اختصار سے کام لیتے ہوئے اس کے ضروری حصے نقل کر رہے ہیں۔ ملا باقر مجلسی لکھتے ہیں۔

کہ والدہ علیؓ کو وضع حمل کے وقت خانہ کعبہ میں پہنچا دیا گیا۔ انہوں نے دیوار کعبہ سے اپنا شکم ملنا شروع کیا۔ تو دیوار شق ہو گئی اور اس میں سے ایک دروازہ نمودار ہوا جس سے آواز آئی۔

کہ اے مادرِ افضل اوصیاء۔ اندر آجاؤ، اور بچہ جنو۔

الغرض یہ تین روز تک کعبہ میں پوشیدہ رہیں۔ اور تین روز بعد جنتے ہوئے بچہ کو لے کر گھر پہنچیں۔ کعبہ کے اندر جانے، باہر آنے اور گھر پہنچنے کے بعد کیا کیا معجزات حضرت علیؓ اور ان کی والدہ کے ذریعہ ظاہر ہوئے۔ اور کن کن امور کی حضرت فاطمہؓ اور حضرت علیؓ پر وحی کی گئی جسے یہ تفصیلی داستان دیکھنی مطلوب ہو وہ جلاء العیون کا مطالعہ کرے۔ انشاء اللہ سُرمہ نور بصر کی طرح آنکھوں کو ٹھنڈک اور دل کو سرور حاصل ہو گا۔ اور سبائیت کے جو پردے آنکھوں پر پڑے ہوئے ہیں وہ سب اٹھتے چلے جائیں گے اور چودہ طبق روشن ہو جائیں گے۔ ہم اُس داستاں سے جو کچھ ثابت کر رہے ہیں اس کے کچھ حصے اور خاکہ پیش کئے دیتے ہیں۔

۱۔ فاطمہ بنت اسد جب کعبہ کے سامنے پہنچیں تو اوّلاً اللہ پر ایمان لائیں اور اپنی مشکل کے حل ہونے کے لئے اپنے پیٹ کے بچہ کا واسطہ دیا۔ جس کے بعد دیوار کعبہ شق ہو گئی۔ اور فاطمہ اندر داخل ہو گئیں۔ لوگوں نے کعبہ کا دروازہ کھولنا چاہا اور بہت زور لگایا۔ لیکن سب ناکام ہو گئے۔ حتیٰ کہ تمام

اہل مکہ کی زبان پر اس کا چرچا ہونے لگا۔

یہ ضرور ذہن میں رہے کہ حضرت علیؓ کی والدہ کا نام فاطمہ بنت اسد ہے۔ بقول ملا باقر مجلسی وہ حضور کی نبوت سے قبل ہی اللہ پر ایمان لے آئی تھیں۔ حالانکہ قرآن یہ ثابت کر رہا ہے کہ تمام اہل مکہ اللہ ہی کو مانتے تھے۔ لیکن جہاں تک نبوت پر ایمان کا تعلق ہے تو اس کا شرف ان فاطمہ کو فتح مکہ کے بعد نصیب ہوا۔ اسی لئے ملا باقر نے اس بات کو حذف کر دیا۔ فاطمہ بنت اسد نے اللہ کو کسی نبی وغیرہ کا واسطہ نہیں دیا۔ بلکہ پیٹ کے بچہ کا واسطہ دیا۔ اگر وہ ایسا نہ کرتیں تو ہمارے صوفیاء مناجاتوں اور شجروں میں یہ کیسے لکھتے ؛

مولا علی مشکل کشا کے واسطے

انہوں نے سب سے پہلی حاجت برآری اپنی والدہ کی فرمائی۔ اور ان کے پیٹ کی مشکل حل کی اگر مولا علی یہ مشکل حل نہ کرتے تو وہ وجود ظاہری میں کیسے تشریف لاتے۔ اور فاطمہ مدت سے زیادہ ہونے کے باعث مصیبت میں گھری رہتیں۔ اس واقعہ کا چرچا اتنا عام تھا کہ تمام اہل مکہ کی زبان پر ایک مدت تک جاری رہا۔ لیکن جس طرح تمام صحابہ نے حضرت علیؓ کے لئے وصیت اور خلافت کو چھپا لیا تھا۔ اسی طرح تمام اہل عرب نے اس واقعہ کو چھپا لیا اور کسی عرب نے آج تک بھی اشارۃً اس کا تذکرہ نہیں کیا۔ یہ تو ان سبائیوں اور عجمیوں کا کرم ہے جو ہم اس واقعہ سے واقف بھی ہو گئے۔ ورنہ کف افسوس ہی ملتے رہتے۔

۲۔ چوتھے دن دوبارہ کعبہ کی دیوار شق ہوئی۔ فاطمہ بنت اسد باہر نکلیں۔ اور لوگوں کے سامنے ایک خطبہ دیا۔ جس کا ماحصل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے تمام مخلوق پر فضیلت دی ہے۔ اور جتنی عورتیں مجھ سے پہلے گزری ہیں اُن پر بھی مجھے فضیلت دی ہے۔ حتیٰ کہ آسیہ امرأت فرعون اور مریم بنت عمران پر بھی اور اس کی دلیل یہ ہے کہ میرے جو بچہ پیدا ہوا وہ کعبہ میں پیدا ہوا۔ اور میں ان تین روز تک بہشت کے میوے کھاتی رہی۔ ہاتف غیب نے مجھے مخاطب ہو کر کہا کہ اس کا نام علی رکھنا کیونکہ میں خداوند علی اعلیٰ ہوں

کا کلی حصہ اسے بخش دیا۔ اس کا نام اپنے نام پر رکھا۔ اسے اپنے آداب تعلیم دیئے۔ اپنے تمام کام اور احکام اس کے سپرد کر دیئے۔ اس پر اپنے تمام مخفی علوم ظاہر کر دیئے یہ خانۂ محترم میں پیدا ہوا۔ یہ سب سے پہلا شخص ہوگا جو کعبہ میں اذان دے گا۔ بتوں کو توڑے گا اور خانہ کعبہ سے بتوں کو نکال کر باہر پھینکے گا۔ یہ میرے پیغمبر کے بعد امام اور وصی ہوگا۔

اس عبارت میں ملا باقر مجلسی نے اپنے مذہب کی پوری حقیقت بیان کر دی ہے۔ اگر ہم اس کی تفصیل پیش کریں۔ تو اس کے لئے ایک ضخیم کتاب درکار ہوگی۔ لیکن چند امور اہل سنت حضرات ذہن میں رکھیں۔

(ل) فاطمہؓ بنت اسد کو اللہ تعالیٰ نے تمام مخلوق پر فضیلت دی ہے۔ حتیٰ کہ انبیاء و ملائک پر بھی۔ فاطمہ بنت اسد حضرت مریم اور آسیہ سے بھی افضل ہیں۔ لہٰذا سیدہ نساء العالمین اور سیدہ نساء اہل الجنۃ فاطمہؓ بنت اسد ہیں نہ کہ حضرت فاطمہؓ بنت محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے سنیوں نے بے وقوفی سے حضور کی صاحبزادی مراد لے لیا ہے۔

(ب) حضرت علیؓ کو اللہ نے اپنی قدرت و جلال سے پیدا کیا ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ وہ فاطمہؓ کے پیٹ اور عبد مناف کافر کے نطفہ سے ظہور میں آئے۔ اپنے نام پر آپ کا نام علی رکھا۔ اپنے تمام کام اور احکامات ان کے سپرد کئے۔ اب ان کے وجود میں آنے کے بعد اللہ تعالیٰ کے ذمہ کوئی کام باقی نہیں رہا۔ اب تو سب کام حضرت علیؓ انجام دیتے ہیں۔ اس طرح اسلام میں دو خدا ہوئے۔ ایک خدائے معطل اور دوسرا خدائے برسر اقتدار۔ اگرچہ تمام زندگی اس مقتدر خدا پر اس کے ماتحت ہی غالب آتے رہے۔ اللہ نے فاطمہؓ کو یہ بھی حکم دیا تھا کہ اس کا نام علیؓ رکھنا۔ لیکن چونکہ اب وہ خدا معطل ہو چکا تھا۔ اب تو تمام تر خدائیت فاطمہؓ اور ان کے بیٹے کے قبضہ میں آ چکی تھی۔ اس لئے فاطمہؓ نے اس نام کو پسند نہیں کیا۔ اور آپ کا نام حیدرؓ رکھا۔ اور اس کا اقرار خود حضرت علیؓ نے اپنے ایک شعر میں کیا ہے۔

انا الذی سمتنی امی حیدرہ — جس کی ماں نے میرا نام حیدر رکھا ہے۔

ج ۔ یہ سب سے پہلا شخص ہو گا جو کعبہ میں اذان دے گا ۔ بتوں کو توڑے گا ۔ اور کعبہ سے بتوں کو نکال کر باہر پھینکے گا۔

جب کہ کعبہ میں سب سے پہلی اذان حضرت بلال رضؓ نے دی ۔ پھر آپؐ نے حضرت ابو محذورہ رضؓ صحابی کو حرم کعبہ کا مؤذن متعین فرمایا۔ کعبہ کے اندر سے بت حضور کے حکم سے حضرت عمر رضؓ نے باہر پھینکے اور توڑے ۔

د ۔ یہ میرے پیغمبر کے بعد امام اور وصی ہو گا۔

جب خدائیت کا رُتبہ حاصل ہو گیا تو اب اس ادنیٰ سی چیز کی کیا ضرورت تھی ۔ تب بھی پچیس سال تک دیگر صحابہ امام بنتے رہے ۔ اور جب امامت ملی تو کوئی ان کی امامت تسلیم کرنے کے لئے تیار نہ ہوا ۔ اور جو کچھ بھی تھوڑی بہت تھی ۔ وہ اُن کے صاحبزادے حضرت حسن رضؓ نے بنو اُمیہ کے سپرد کر دی ۔ اور چونکہ ہر امام اس کا حق رکھتا ہے کہ وہ خواہ کسی کو بھی اپنا وصی متعین کر دے ۔ خواہ زندگی میں یا مرتے وقت ۔ اس لحاظ سے تیسرے امام و وصی امیر معاویہ رضؓ ہوئے ۔ انہوں نے اپنا یہ حق استعمال کرتے ہوئے ۔ یزید کو اپنا وصی اور امام متعین کیا۔

۴۔ فاطمہ جب بچے کو لے کر گھر پہنچیں ۔ تو جناب امیر نے اپنے والد کو ان الفاظ میں سلام کیا۔

السلام علیك یا ابت و	اے میرے باپ آپ پر اللہ کا سلام
رحمۃ اللّٰہ و برکاتہٗ	اور رحمت و برکت نازل ہو۔

جب حضور تشریف لائے تو جناب امیر کو اپنے دامن میں لے لیا ۔ جناب امیر نے ان کو بھی ان الفاظ میں سلام کیا۔

السلام علیك یا رسول اللّٰہ	یا رسول اللہ آپ پر اللہ سلام اور رحمت
ورحمۃ اللّٰہ و برکاتہٗ	و برکت نازل فرمائے۔

پھر اللہ تعالیٰ کی قدرت کاملہ سے جناب امیر نے سورۃ مؤمنون تلاوت فرمائی ۔ جناب رسولؐ نے فرمایا تیری وجہ سے تمام مؤمنین کو نجات مل گئی ۔ جناب امیر نے ھم فیھا خلدون تک

تک آیات تلاوت کیں۔ حضور نے فرمایا خدا کی قسم تو ان کا بادشاہ اور امیر ہے اور تو ان کو علم و حکمت کی روزی بہم پہنچاتا ہے۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے مہد میں کلام کیا تھا۔ لہٰذا حضرت علیؓ ان سے کیسے پیچھے رہ سکتے تھے۔ انہوں نے بھی کلام کیا۔ اور سورۃ مؤمنون کی ابتدائی آیات اُن پر حضور کی نبوت سے قبل ہی نازل ہو گئیں۔ کیونکہ ان آیات میں مؤمنین کی شان بیان ہو رہی ہے اور تبرائیوں کے علاوہ روئے زمین پر کوئی مؤمن نہیں۔ حضرت علیؓ کے باعث تمام مؤمنین کے لئے روزِ اول ہی نجات لکھ دی گئی۔ لہٰذا اب انہیں کھلی چھٹی حاصل ہے۔ وہ آیات یہ ہیں۔

قَدْ اَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِیْنَ هُمْ	وہ مؤمنین کامیاب ہوئے جو اپنی نمازوں
فِیْ صَلٰوتِهِمْ خٰشِعُوْنَ ہ وَالَّذِیْنَ	میں خشوع سے کام لیتے ہیں۔ جو لغو باتوں
هُمْ عَنِ اللَّغْوِ مُعْرِضُوْنَ ہ وَالَّذِیْنَ	سے احتراز کرتے ہیں۔ زکوٰۃ دیتے ہیں اور
هُمْ لِلزَّكٰوةِ فٰعِلُوْنَ ہ وَالَّذِیْنَ	اپنی پیشاب گاہوں کی حفاظت کرتے
هُمْ لِفُرُوْجِهِمْ حٰفِظُوْنَ ہ اِلَّا	ہیں۔ مگر اپنی بیویوں اور باندیوں سے۔
عَلٰۤى اَزْوَاجِهِمْ اَوْ مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُمْ	اس سلسلہ میں ان پر کوئی ملامت نہیں
فَاِنَّهُمْ غَيْرُ مَلُوْمِيْنَ ہ فَمَنِ	اور جو بیویوں اور باندیوں کے علاوہ
ابْتَغٰى وَرَآءَ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ	کوئی اور راہ تلاش کرے تو ایسے لوگ
هُمُ الْعٰدُوْنَ ہ	سرکش ہیں۔

لیکن چونکہ نجات کا اعلان پہلے ہی ہو چکا تھا۔ اس لئے اب مؤمنین خواہ نماز میں باتیں کریں، خواہ تبرا اور تقیہ کی لغویت کو اپنائیں۔ خواہ زکوٰۃ سے انکار کریں۔ اور خواہ بیوی اور باندی کے علاوہ اپنی خواہشات نفسانی پوری کرنے کے لئے متعہ کریں سب کچھ نہ صرف جائز بلکہ کارِ ثواب ہے لیکن مشکل یہ ہے کہ آخری آیت میں پہلے سے یہ ظاہر کر دیا گیا ہے کہ یہی سرکش لوگ ہیں۔ اب ہم آگے

اس پیرایہ کا آخری جملہ یہ ہے۔ کہ تو ان کو علم و حکمت کی روزی بہم پہنچاتا ہے۔ حالانکہ قرآن نے یہ حضور کی شان بیان کی ہے۔

وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ — اور نبی ان کو کتاب و حکمت کی تعلیم دیتا۔

وَيُزَكِّيهِمْ۔ — اور ان کا تزکیہ کرتا ہے۔

اس طرح حضور کا یہ منصب چھین کر حضرت علیؓ کو دیا گیا۔ اور یہ سب کچھ اس وقت کے بت خانے میں ولادت کے باعث ہو رہا ہے۔

۴۔ اس کے بعد آپؐ فاطمہؓ بنت اسد سے فرماتے ہیں جاؤ اس کے چچا حمزہؓ کو بشارت دو۔ فاطمہؓ نے عرض کیا اگر میں چلی جاؤں گی تو اسے دودھ کون دے گا۔ حضرت رسولؐ نے فرمایا میں اسے سیراب کردوں گا۔ رسولؐ نے اپنی زبان جناب امیر کے منہ میں دیدی جس سے بارہ چشمے جاری ہوئے اس لئے اس روز کو یوم الترویہ کہا جاتا ہے۔

یوم الترویہ ذی الحجہ کی آٹھ تاریخ ہے۔ اس روز اہل مکہ حج کے ارادے سے عرفات کے لئے کوچ کرتے ہیں۔ فاطمہ بنت اسد بچہ کی پیدائش کے فوراً بعد گھر آ گئی تھیں۔ یہ زچگی کا پہلا دن تھا۔ عورت زچگی کے کئی دن بعد تک پلنگ سے نہیں ہلتی۔ لیکن انہیں حمزہؓ کو بلانے کے لئے بھیج دیا گیا۔ ہمیں یہاں سب سے زیادہ حیرت دو باتوں پر ہے کہ ایک روز کی زچہ کو حمزہؓ کے بلانے کے لئے بھیجا گیا۔ اور عبد مناف پڑا اینڈتا رہا۔ پھر چچاؤں میں صرف حمزہؓ ہی تو نہ تھے۔ ابولہب اور عباسؓ بھی تھے۔ عباسؓ سے تو چلئے یہ عداوت تھی کہ ان کی اولاد کو خلافت ملنے والی تھی لیکن ابولہب نے کیا قصور کیا تھا۔

ہاں اہل سنت والجماعت کو یہ بات ضرور یاد رکھنی چاہیئے کہ یہود کے بارہ قبیلے تھے۔ اور مقام تیہ میں ان کے لئے بارہ چشمے پھوٹے تھے۔ کیونکہ وہ سب ایک گھاٹ پانی نہ پی سکتے تھے اور جناب امیر کے منہ میں بھی بارہ چشمے پھوٹے اور بعد بارہ امام ہوئے۔ کیا یہ اس کا ثبوت نہیں ہے کہ شیعیت یہودیت کا چربہ ہے۔ اور جس طرح یہودیوں کے بارہ قبائل ہمیشہ ایک

دوسرے کے رقیب رہے۔ اسی طرح آگے چل کر حضرت علیؓ کی اولاد میں بھی یہ رقابت قائم رہی۔

۵۔ فاطمہؓ جب واپس آئیں۔ تو دیکھا کہ آسمان سے زمین تک ایک نور چھایا ہوا ہے۔ انہوں نے بچے کو ایک کپڑے میں لپیٹا۔ جب امیر نے بقوت ربانی اس کو پھاڑ ڈالا۔ اور اپنے ہاتھ کپڑے سے باہر نکال لئے۔ فاطمہؓ ایک مضبوط کپڑا لائیں۔ جناب امیر کو اس میں لپیٹا۔ جناب امیر نے اسے بھی پھاڑ دیا پھر فاطمہؓ دیبا کے چھ کپڑے لائیں۔ اور اوپر سے چمڑا لپیٹ دیا۔ لیکن جناب امیر نے ان کو بھی پھاڑ دیا اس کے بعد جناب امیر نے فرمایا میرے ہاتھ کھلے رہنے دو۔ تاکہ میں اللہ کے سامنے گڑگڑاؤں اور اس کی تسبیح کروں۔ الغرض انہیں ان کے حال پر چھوڑ دیا گیا۔

عبد مناف کے لئے تو اس دن سے زیادہ کوئی غمناک دن نہ ہوگا۔ جو شخص اپنے فقر کے باعث اپنے بچوں کو کھانا بھی نہ کھلا سکے۔ ایک تو نئے بچے کا بار اور پھر آتے ہی وہ گھر کے تمام کپڑے بھی پھاڑ پھینکے تو وہ بے چارہ سر پکڑے بیٹھا ہوگا۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ اس کا کوئی کردار اس کہانی میں پیش نہیں کیا گیا۔ وہ تو اس قسم کے جناتی بچے سے گھبرا اٹھا ہوگا۔

۶۔ جب دوسرا دن ہوا اور حضورؐ ابو طالب کے گھر تشریف لے گئے۔ تو جناب امیر کو گود میں لے لیا۔ جناب امیر نے سلام کیا۔ اور چشمے پینے کی درخواست کی۔ اس پر فاطمہؓ نے ہنس کر کہا خداوند کعبہ کی قسم۔ جناب امیر نے جناب رسولؐ کو پہچان لیا۔ اسی لئے اس روز کا نام عرفہ ہوگیا۔

۷۔ جب تیسرا دن ہوا تو دس ذی الحجہ تھی۔ ابو طالب نے لوگوں سے کہا میرے بیٹے کے ولیمہ میں حاضر ہو۔ اور تین سو اونٹ، اور ایک ہزار گائیں اور بھیڑیں دعوت کے لئے ذبح کیں، اور تمام اہل مکہ کو دعوت دی۔ اور اعلان کرایا کہ جس شخص کو میرے بچے کے ولیمے میں شرکت کرنی ہو۔ وہ سات بار خانہ کعبہ کا طواف کرے اور آکر میرے بیٹے کو سلام کرے۔ اسی وجہ سے یوم نحر کی تعظیم و تکریم کرتے اور عید کا دن جانتے ہیں اور قربانی اسی دن سے مقرر ہوئی۔

اہل سنت والجماعت کی آنکھیں کھولنے کے لئے کیا یہ کہانی کافی نہیں ہے۔ کہ اس پیرایہ میں حضرت ابراہیمؑ، حضرت اسمٰعیلؑ اور حضرت ہاجرہؑ کے عمل اور ان کی فضیلت پر کس طرح ڈاکہ ڈالا

گیا ہے۔ لیکن ہم ملا باقر مجلسی کے ہم نواؤں سے یہ سوال کرنے کا حق ضرور رکھتے ہیں کہ ولیمہ شادی کے بعد ہوا کرتا ہے۔ یہ تین دن کے بچے کی شادی کس سے ہوئی تھی۔ ذرا اس گڑیا کا حال تو بیان کر دیجئے۔ اور اگر اس سے مراد عقیقہ ہے۔ تو اول تو عقیقہ کو ولیمہ نہیں کہا جاتا۔ اس میں بچہ کے بال اتروائے جاتے ہیں۔ اور وہ ساتویں دن ہوتا ہے۔ دراصل اس کے پیش نظر تو حضرت ابراہیمؑ حضرت اسمٰعیلؑ اور حضرت ہاجرہؑ کی یادگاروں پر پانی پھیرنا تھا۔ اور اس سازش کے تحت وہ اس بات کو بھی بھول گیا کہ ابوطالب تو ایک فقیر تھا۔ اس کے پاس اتنے اونٹ اور گائے بکریاں کہاں سے آگئی تھیں۔ پھر اس سے قبل جلاء العیون ص۲۳۵ ج۱ پر اس مصنف نے یہ تحریر کیا تھا کہ جناب امیر بروز جمعہ تیرھویں رجب کو پیدا ہوئے۔ اس لحاظ سے قربانی پندرھویں رجب کو ہونی چاہیئے اور پندرہ رجب کا نام یوم النحر ۱۴ رجب کا نام یوم عرفہ اور تیرہ رجب کا نام یوم الترویہ ہونا چاہیئے۔ اب یہ سبائی ہی بتا سکتے ہیں کہ ان کے مجتہد کے ان دونوں اقوال میں سے کون سا قول جھوٹا ہے۔ اگر واقعتاً حضرت علیؓ تیرہ رجب کو پیدا ہوئے تو پھر اس کہانی کو خیرباد کہنا ہوگا۔ اب اس کہانی کا اصل مقصد بھی ملاحظہ فرمائیے۔

۸۔ حضور کو جناب امیر سے اتنی محبت تھی کہ ان کا جھولا اپنی خوابگاہ کے قریب رکھتے۔ نہلاتے دھلاتے۔ دودھ پلاتے (چیتے) منہ میں ٹپکاتے۔ سوتے میں جھولا جھلاتے۔ جاگتے میں باتیں کرتے۔ اپنے سینہ سے لگاتے اور فرماتے۔ یہ میرا بھائی۔ میرا ولی۔ میرا پشت پناہ اور میری وصیتوں کا جانشین ہے۔ اس وقت حضور کی عمر تیس سال تھی۔ حضور انہیں لے کر مکہ کے پہاڑوں، جنگلوں اور دروں میں چلے جاتے۔ اور علوم و اسرار الٰہی تعلیم دیتے۔ جلاء العیون ص۲۴۸ ج۱ تا ص۲۵۱

یہ بھی غور کرنے کی بات ہے کہ یہ واقعہ بقول ملا باقر نبوت سے دس سال قبل کا ہے۔ اس وقت وہ کون سے علوم اور اسرار الٰہی تھے جو حضور حضرت علیؓ کو تعلیم دیا کرتے تھے۔ ظاہر ہے کہ اس قرآن و سنت سے ان علوم کا کوئی واسطہ نہ تھا اور غالباً یہی وجہ ہے کہ ہمارے صوفیاء کے نزدیک یہ علوم ظاہرہ ہیں اور ان کی حیثیت چھلکے کی ہے۔ اور اسی لئے وہ ہمیشہ آبادی کے مقابلے میں جنگلوں کو ترجیح دیتے رہے۔

نمبر۹ میں یہ بات بیان کی گئی تھی کہ جب حضور ابوطالب کے گھر تشریف لے گئے۔ یہ الفاظ ثابت کر رہے ہیں کہ حضور علیحدہ رہتے تھے اور رہنا بھی چاہیئے تھا۔ اب تو حضرت خدیجہ آپ کے نکاح میں تھیں تو حضرت علیؓ کے ساتھ یہ سب کام کس طرح انجام دیتے۔ اس کی صرف ایک ہی صورت ممکن ہے۔ اور وہ کہ دوسرے یا تیسرے دن حضور حضرت علیؓ کو اپنے گھر لے گئے ہوں۔ ورنہ اس کے علاوہ اور کوئی صورت ممکن نہیں۔ اس صورت میں یہ تسلیم کرنا ہوگا کہ ابوطالب اپنے فقر و فاقہ کے باعث دودھ پیتے بیٹے کو بھی اپنے پاس نہ رکھ سکا جس سے سارا ڈھول کا پول کھل جاتا ہے۔

ہمارے سنی علماء کو چاہیئے کہ وہ اس روایت پر غور کر کے یا تو اپنے طریقۂ کار میں تبدیلی کریں یا پھر لوگوں کے سامنے پوری کہانی بیان کیا کریں۔ اس سے زیادہ میں ان سے کیا عرض کر سکتا ہوں۔

بالفرض والمحال اگر حضرت علیؓ کعبہ میں پیدا بھی ہوئے۔ تو اس سے کون سا فخر پیدا ہو گیا۔ اس وقت تو یہ بت خانہ تھا۔ اگرچہ نام اس کا کعبہ تھا۔ یہ کوئی فخر کی بات نہیں۔ بلکہ یہ ایک طرح کی بے حیائی اور بے غیرتی ہے کہ عورت وضع حمل کے لئے مجمع میں چلی جائے۔ اُس وقت کعبہ کی جو بھی صورت ہو مکہ کے تمام لوگ اکثر وہیں مجمع لگا کر بیٹھتے اور وہیں مجلسیں لگتیں۔

کیا حضرت علیؓ کے لئے اسلام، صحابیت، ہجرت اور جہاد وغیرہ کے فضائل کافی نہ تھے۔ جو یہ بے سروپا کہانیاں وضع کی گئیں۔ لیکن اس قسم کی کہانیاں وضع نہ کی جاتیں تو حضرت علیؓ امام الاولیاء کیسے بنتے، اور پھر اس ولایت کے ناتے سبائی خلافت کے جھگڑے کیسے کھڑے کرتے۔ فاطمہؓ سیدۃ النساء کیسے بنتیں۔ اُن پر وحی کیسے نازل ہوتی۔ اور یہ سارے گورکھ دھندے کیسے وجود میں آتے۔

اغیار سے ہمیں کیا شکوہ، وہ تو بہر صورت اغیار ہیں۔ گلہ تو ان سے ہے جو خود کو سنی کہتے ہیں۔ اور پروپیگنڈہ شیعہ داستانوں کا کرتے ہیں۔ ان کی مجلسوں میں شریک ہوتے اور اُن کے گن گاتے ہیں۔

یہ سب ڈھکوسلے بازیاں اور سبائی داستانیں ہیں۔ خانہ کعبہ میں دراصل صرف ایک شخص پیدا

ہوا ہے۔ اور اس کا نام حکیمؓ بن حزام ہے۔ یہ حکیمؓ حضور سے عمر میں دو سال بڑے تھے۔ اور زید بن عمرو بن نفیل سے متاثر تھے۔ اس لئے بچپن سے بت پرستی سے متنفر تھے حتی کہ کتاب المحر کا مصنف جو خود تفضیلی شیعہ تھا۔ خانہ کعبہ میں صرف حکیم کی پیدائش کا ذکر کرتا ہے۔

امام نووی شرح مسلم میں فرماتے ہیں۔

حکیم بن حزام الصحابی ومن	حکیم بن حزام صحابی ہیں۔ ان کے مناقب
مناقبۃ انہ ولد فی الکعبۃ	میں یہ بھی ہے کہ وہ کعبہ میں پیدا ہوئے۔
قال بعض العلماء ولا یعرف	بعض علماء کہتے ہیں کہ اس فضیلت میں اُن
احد شارکہ احد قال العلماء	کا کوئی اور شریک نہیں۔ اُن کے حالات میں
ومن طرف اخبارہ انہ عاش	ایک خاص امر یہ ہے کہ انہوں نے ساٹھ
ستین سنۃ فی الجاھلیۃ و	سال جاہلیت میں گزارے اور ساٹھ
ستین فی الاسلام واسلم عام	اسلام میں۔ ۵۴ھ میں مدینہ میں انتقال ہوا۔
الفتح ومات بالمدینۃ سنۃ	
اربع وخمسین۔	

یہ حکیمؓ بن حزام حضرت خدیجہؓ کے چچازاد بھائی تھے اور حضور کے بچپن کے دوستوں میں سے تھے۔ شبلی مرحوم سیرت النبی ص ۱۲۷ ج ا پر لکھتے ہیں۔

حضرت خدیجہؓ کے چچیرے بھائی جو قریش کے نہایت معزز رئیس تھے۔ وہ بھی حضور کے احباب خاص میں تھے۔ حرم کا منصب رفادہ ان ہی کے ہاتھ میں تھا۔ دارالندوہ کے بھی یہی مالک تھے۔

مجوسی طبقہ نے جہاں حضرت علیؓ اور ان کی اولاد کے بارے میں لاکھوں روایات وضع کیں۔ بقول امام حماد بن زید تبع تابعی جن کی تعداد تین لاکھ ہے۔ وہاں ایک کام یہ بھی انجام دیا کہ جہاں کسی واقعہ میں کسی صحابی کی فضیلت نظر آئی۔ اسے حضرت علیؓ کی جانب منسوب کر کے شہرت دیدی۔

اللہ اور اس کے رسول نے حضرت ابوبکرؓ کو صدیق کا خطاب عطا کیا۔ لیکن اس طبقہ نے حضرت علیؓ کی جانب یہ قول منسوب کیا۔

انا الصدیق الاکبر فمن قالہا بعدی فقد کفر۔ — میں صدیق اکبر ہوں۔ میرے علاوہ جو اس کا دعویٰ کرے وہ کافر ہے۔

اس قسم کی خرافات کا نتیجہ یہ نکلا کہ حضرت علیؓ کی شخصیت ان خرافات میں چھپ کر رہ گئی۔ اور یہ پتہ چلانا دشوار ہوگیا کہ کون سی بات ان کی فرمودہ ہے۔ اور کون سی ان کی جانب فرضی طور پر منسوب کی گئی ہے۔ اس طرح امت ان کے صحیح علم سے نہ صرف محروم ہوگئی۔ بلکہ امت کے لئے یہ پہچاننا بھی دشوار ہوگیا کہ ان کا کردار کیا تھا۔ اخلاق کیا تھے۔ عادات کیا تھیں۔ کن صفات کے مالک تھے۔ حتیٰ کہ محدثین تابعین کو یہ فیصلہ دینا پڑا کہ

اصحاب علی کلهم کذابون — کہ حضرت علیؓ کے سب ساتھی جھوٹے ہیں۔

اور امام محمد بن سیرین کو یہ کہنے کی ضرورت پیش آئی۔

کل ما یروی عن علی بن ابی طالب فهو باطل۔ — حضرت علی سے جتنی روایات نقل کی جاتی ہیں وہ سب باطل ہیں۔

تابعین نے یہ فیصلے ان ہی غلط روایات کے باعث دیئے ہیں۔ آج اگر کوئی یہ دعویٰ کرتا ہے کہ وہ حضرت علیؓ کی زندگی یا ان کی احادیث صحیح طور پر پیش کرسکتا ہے۔ تو وہ اس کیچڑ میں ملوث ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ نہ اس میں حضرت علیؓ قصوروار ہیں۔ نہ تابعین کرام اور نہ کوئی اور۔ بلکہ تمام تر ذمہ داری اسی سبائی طبقہ پر ہے۔ جس نے حضرت علیؓ کی ذات و صفات کو مسخ کرکے رکھ دیا ہے۔ اعاذنا اللہ من ذلک۔

حضرت علیؓ کیلئے سورج کا لوٹنا

اس موضوع پر اس سے قبل کہ ہم اپنے خیالات کا اظہار کریں۔ حکیم فیض عالم صدیقی شہید کی تحقیقات پیش کرنا چاہتے ہیں۔ پھر جو امور باقی رہ جائیں گے تو انشاءاللہ ہم اس کی تکمیل قارئین کرام کے سامنے پیش کریں گے۔ حکیم صاحب مرحوم لکھتے ہیں۔

شاہ ولی اللہ نے سورج غروب ہونے کے بعد اس کے لوٹ کر آنے کا واقعہ بھی لکھا ہے کہتے ہیں کہ حضرت علیؓ کی نماز فوت ہو گئی تھی۔ آنحضرت نے دعا کی تو سورج لوٹ آیا۔ حضرت علیؓ نے وضو کر کے نماز پڑھ لی تو سورج پھر غروب ہو گیا۔

قطع نظر دیگر طریق سے دیکھنے کے نماز کے متعلق کِتَابًا مَّوْقُوْتًا ہی پر غور کر لیا ہوتا۔ تو اس روایت کی حقیقت کھل جاتی۔ اصل وقت فوت ہو جانے کے بعد سورج کو واپس لانے سے اس فرض کی ادائیگی جس کا تعلق اصل وقت سے تھا۔ آئین فطرت کے خلاف ہے۔

شیعوں نے اس روایت کو اس لئے وضع کیا تھا کہ اس پر آگے چل کر ایک عمارت کھڑی کرنی مطلوب تھی۔ معلوم ہوتا ہے کہ شاہ صاحب کو وہ عمارت نظر ہی نہیں آئی۔ یا انہوں نے ارادۃً اسے نظر انداز کر دیا۔

آگے شیعہ روایات میں آتا ہے کہ حضرت علیؓ نے سورج کو سلام کیا (ڈنڈوت کی) اور سورج نے سلام کا جواب دیا۔ اور کہا کہ اے علیؓ تم ہی اول ہو اور تم ہی آخر ہو۔ اب یہ دریافت کرنا شیعوں کا کام ہے کہ علیؓ نے زبان سے سلام کیا تھا یا ہاتھ کے اشارے سے۔ اور یہ آتش پرستوں کا شعار تھا یا وصی رسول اللہ کا۔ اور پھر سورج کا جواب حضرت علیؓ نے سنا تھا، یا نبی اکرم نے بھی۔ یا کسی اور صحابی نے بھی، اگر سنا تھا تو اس کا رد عمل کیا ہوا؟

اگر شاہ ولی اللہ جیسے عبقری اس طرح شیعیت کی ہمنوائی کرتے ہوئے پائے جائیں،

تو ماؤشما کا اللہ ہی حافظ ہے۔

چنانچہ ملا علی قاری حنفی لکھتے ہیں کہ امام احمد فرماتے ہیں۔ اس کی کوئی اصل نہیں۔ اور علامہ ابن جوزی لکھتے ہیں یہ من گھڑت ہے۔ موضوعات کبیر ص۱۴۔ دوسرے مقام پر لکھتے ہیں یہ جھوٹ ہے کہ حضرت علیؓ کے لئے سورج لوٹایا گیا۔ موضوعات کبیر ص۱۵۷۔

ابن کثیر لکھتے ہیں کہ آئمہ حدیث مثل امام مالک، مصنفین صحاح ستہ اور اصحاب مسانید و سنن اور حسن احادیث کے جامعین کا اپنی کتابوں میں اسے درج نہ کرنا۔ اس بات کا بڑا ثبوت ہے کہ اُن سب کے نزدیک یہ من گھڑت ہے (البدایہ ص۸۶)

ابن تیمیہ کہتے ہیں کہ اگرچہ امام طحاوی اور قاضی عیاض نے (شفا میں) اسے درج کیا ہے۔ لیکن محققین جانتے ہیں کہ یہ روایت خالص جھوٹ اور موضوع و باطل ہے۔ منہاج السنۃ ج ۴ ص۱۸۶۔ ص۱۹۷

ردِ شمس والی روایت حضرت ابو ہریرہؓ سے بھی مروی ہے۔ لیکن اس کی سند میں یزید بن عبدالملک ہے۔ جسے امام احمد، امام یحیٰ، امام احمد بن صالح، امام ابو زرعہ، امام ابن عدی، امام بخاری، اور امام نسائی نے ضعیف و متروک کہا ہے۔

اس روایت کا دوسرا راوی یحیٰ بن یزید ہے۔ جسے ذہبی حد درجہ کمزور اور ضعیف کہتے ہیں۔ شاہ ولی اللہ کو اتنا بھی خیال نہ آیا کہ اگر حضرت علیؓ کی نماز قضا ہوئی۔ تو نبی علیہ السلام کی کیوں قضا نہیں ہوئی۔ جب کہ آپ سیدنا علیؓ کے زانو پر سر رکھ کر آرام فرما رہے تھے۔ اگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز ادا کر کے آرام فرمایا تھا تو سیدنا علیؓ اُس وقت کیا کر رہے تھے۔ جب نبی کریم علیہ السلام نماز ادا فرما رہے تھے۔

معین کاشانی نے یہاں پندرہ اشعار کی ایک نظم کہی ہے ؎

تا صورت پیوند جہاں بود علی بود ۔۔۔ تا نقش زمیں بود زماں بود علی بود
ہم اول و ہم آخر و ہم ظاہر و ہم باطن ۔۔۔ ہم عابد و ہم معبد و معبود علی بود

عیسٰی بوجود آمد فی الحال سخن گفت   آں نطق فصاحت کہ بد و بود علی بود
موسٰی د عصاید بیضاؤ نبوت   در مصر بہ فرعون کہ نبوت علی بود
ہارون ولایت کہ پس از موسٰی عمران   واللہ کہ علی بود، علی بود علی بود
جبرئیل کہ آمد و بیر خالق بے چون   در پیش محمد شد و مقصود علی بود
ہر چند کہ نظر کردم و دیدم بحقیقت
از ہر دو جہاں مقصد و مقصود علی بود

یہ وہی معین کاشانی ہے۔ جس نے یہ رباعی لکھی ہے ــــ

شاہ است حسین شہنشاہ است حسین   دین است حسین دیں پناہ است حسین
سرداد، نہ داد دست در دست یزید   حقا کہ بنائے لا الہ است حسین!

اور آج زبان زد خاص و عام ہے کہ یہ رباعی خواجہ معین الدین اجمیری کی لکھی ہوئی ہے۔ اور ہر مسجد کے محراب کی دیوار اس رباعی سے مزین نظر آتی ہے۔ اور ہر خطیب اسے اجمیری کی طرف منسوب کرتا ہے۔ حاشیہ حقیقت مذہب شیعہ ص۱۷۹ تا ص۱۸۲

ہم سب سے پہلے۔ قارئین کے سامنے ان اشعار کا ترجمہ پیش کرنا چاہتے ہیں۔ کاشانی کہتا ہے۔

جب تک اس جہاں کی صورت باقی رہے گی علیؓ بھی باقی رہیں گے، جب تک زمین کا نقش باقی رہے گا، زمانہ باقی رہے گا، علیؓ بھی باقی رہیں گے۔ وہی اول ہیں، وہی آخر ہیں، وہی ظاہر ہیں، وہی باطن ہیں، وہ عابد بھی ہیں، عبادت گاہ بھی اور معبود بھی ہیں (اسی کا نام تصوف میں فلسفہ وحدت الوجود ہے) عیسٰیؑ نے جو وجود میں آنے کے بعد اتنا فصیح کلام کیا دراصل وہ علیؓ تھے۔ فرعون کے مقابلہ میں موسٰیؑ ہوں یا ان کا عصا اور ید بیضا یہ کچھ بھی نہ تھے وہ تو علیؓ تھے۔ موسٰی بن عمران نے جو اپنے بعد ہارونؑ کو ولایت سونپی۔ وہ بھی اللہ کی قسم علیؓ تھے، علیؓ تھے، علیؓ تھے۔ جب خالق بے چوں کی جانب سے جبرئیلؑ قاصد بن کر آئے۔ تو ظاہر ہیں تو محمدؐ کے سامنے آئے

تھے لیکن مقصود علیؓ تھے۔ جتنا بھی میں نے غور کیا اور حقیقت سمجھنے کی کوشش کی تو پتہ چلا کہ دونوں جہاں سے مقصد اور مقصود علیؓ ہیں۔

سنی حضرات ذرا غور کریں، اور بتائیں کتاب اللہ اور علیؓ میں کیا فرق ہے؟ اور انبیاء علیہم السلام کی نبوت کی کیا پوزیشن باقی رہی؟ اور ایسی صورت میں یہ بھی سوچ لیں کہ ایسے افراد دائرہ اسلام میں داخل ہیں کیا؟ ہم ان کے جوابات قارئین کرام پر چھوڑتے ہیں..... اب رباعی کا ترجمہ بھی ملاحظہ ہو

شاہ بھی حسینؓ ہیں شہنشاہ بھی حسینؓ ہیں اور دین پناہ بھی حسینؓ ہیں۔ سر دے دیا لیکن یزید کے ہاتھ میں ہاتھ نہیں دیا۔ اس لحاظ سے لاالہٰ کی بنیاد بھی حسینؓ ہیں۔

یعنی حضرت علیؓ تو اللہ کا مقام حاصل کر چکے ہیں۔ اور دین حضرت حسینؓ کا نام ہے۔ اور لاالہٰ کی بنیاد انہی سے قائم ہوئی۔ (یعنی اس کلمہ میں جس الٰہ کی نفی کی گئی تھی وہ یزید تھا)۔ قارئین یہ ضرور سوچ لیں کہ اس مقام پر بھی کاشانی نے الا اللہ کا اقرار نہیں کیا۔ کیونکہ اس کے نزدیک تو سب کچھ علیؓ تھے۔ اور علماء جانتے ہیں کہ کلمۂ توحید کے دو جزء ہیں۔ ایک جزئیہ منفی ہے۔ اور ایک مثبت اور تاوقتیکہ منفی جزئیہ کے ساتھ مثبت یعنی اللہ کے وجود کا اقرار نہ کرے وہ مسلمان نہیں ہو سکتا۔ اور یہاں کاشانی اسے ہضم کر گیا ہے۔

اب اصل موضوع پر آیئے۔

حکیم صاحب مرحوم کو شاہ ولی اللہ سے شکایت ہے کہ انہوں نے یہ روایت نقل کی لیکن ہمیں شکایت امام طحاوی، قاضی عیاض، محب الدین طبری اور ابن سعد جیسے حضرات سے ہے۔ اور علی الخصوص امام طحاوی سے کہ انہوں نے اس روایت کو کیسے نقل کر دیا۔ شاہ صاحب کا معاملہ، اول تو وہ روایت پرست ہیں۔ ثانیاً صوفی ہونے کے ناتے اس روایت کا اپنانا بھی ضروری تھا۔ اور اس روایت کی نقل نے ہمیں یہ سوچنے پر مجبور کیا کہ شاہ صاحب نے موضوعات کی کسی کتاب کا مطالعہ بھی کیا تھا یا نہیں۔ ورنہ ان پر یہ حقیقت کھل جاتی کہ موضوعات پر جتنی بھی آج تک کتابیں لکھی گئی ہیں۔ ان سب کتابوں کے مصنفین نے اسے موضوع قرار دیا ہے۔

حکیم صاحب نے ایک فقہی دلیل بھی پیش کی ہے۔ ہمیں حیرت اس پر ہے کہ یہ دلیل ایک اہل حدیث عالم نے پیش کی اور احناف جن کے شب و روز فقہ میں گزرتے ہیں ان کو اس کا ہوش بھی نہ آیا۔ حکیم صاحب نے جو دلیل اشارۃً پیش کی ہے اس کا مقصود یہ ہے کہ

اس پر تمام امت کا اتفاق ہے کہ نماز وقت معینہ میں فرض کی گئی ہے۔ ارشادِ الٰہی ہے۔

إِنَّ الصَّلٰوةَ كَانَتْ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ كِتَابًا مَّوْقُوْتًا۔ یقیناً نماز مومنین پر وقت معینہ میں فرض کی گئی ہے۔

اور جب وہ وقت گزر گیا تو نماز فوت ہو گئی۔ اب خواہ وہ کسی وقت بھی پڑھی جائے وہ قضا کہلائے گی نہ کہ ادا۔ تو سورج کے لوٹانے سے حاصل کیا ہو گا۔ کیا وہ قضا ادا بن جائے گی؟ حالانکہ کوئی قضا ادا نہیں تھی۔

یہ ہے ہماری روایت پرستی کا حال کہ کسی کو بھی اتنا ہوش نہ آیا۔ کاش شاہ ولی اللہ اسی بات پر غور کر لیتے۔ پھر قیامت کی علامات سے ایک علامت یہ بیان کی گئی ہے کہ سورج مغرب سے نکلے گا اور جب سورج اس صورت میں مغرب سے نکل آیا۔ تو آخر اب تک قیامت کیوں واقع نہیں ہوئی؟ اگر کوئی یہ کہتا ہے کہ وہ دوبار مغرب سے نکلے گا۔ تو نہ تو حدیث میں دوبار کا ذکر ہے۔ اور نہ آج تک کسی نے دعویٰ کیا ہے۔ الغرض آپ اس روایت پر جس اصول سے بھی نظر ڈالیں گے تو یہ صریح بگواس نظر آئے گی۔

یہ روایت چند سلسلوں سے مروی ہے ایک روایت کے آخری راوی حضرت حسینؓ بن علیؓ ہیں۔ وہ فرماتے ہیں کہ حضور حضرت علیؓ کی گود میں سر رکھے آرام فرما رہے تھے۔ اور آپ پر وحی نازل ہو رہی تھی۔ جب وحی ختم ہو گئی تو آپ نے حضرت علیؓ سے دریافت کیا۔ کیا تم نے عصر کی نماز پڑھ لی۔ انہوں نے کہا نہیں۔ حضور نے اللہ سے دعا کی اور سورج لوٹ آیا۔ حضرت علیؓ نے نماز پڑھ لی تو پھر غروب ہو گیا۔

ملا علی قاری حنفی نے امام جزری کا قول نقل کیا ہے۔ کہ علماء فرماتے ہیں یہ حدیث موضوع

ہے۔ سورج آج تک کسی کے لئے نہیں لوٹایا گیا۔ صرف یوشع بن نون کے لئے غروب ہونے سے روک دیا گیا تھا۔ موضوعات کبیر ص۱۵۲

بجائے اس کے کہ خود ہم اپنے الفاظ میں اس پر کلام کریں۔ ہم یہ زیادہ بہتر سمجھتے ہیں کہ امام ابن الجوزی نے اس پر جو کچھ لکھا ہے وہ قارئین کے سامنے پیش کر دیں۔ امام ابن الجوزی فرماتے ہیں۔ یہ روایت اسماءؓ بنت عمیس سے مروی ہے اور بلا شک و شبہ موضوع ہے۔ اس کا ایک راوی احمد بن داؤد ہے۔ جو بے کار محض ہے۔ دار قطنی کہتے ہیں متروک ہے، کذاب ہے۔ ابن حبان کہتے ہیں احادیث وضع کیا کرتا تھا۔ اس کا ایک اور راوی عمار بن مطر ہے۔ عقیلی کہتے ہیں یہ منکر روایتیں ثقہ راویوں کی جانب منسوب کرتا ہے۔ ابن عدی کہتے ہیں متروک الحدیث ہے۔ اس کی سند کا ایک اور راوی فضیل بن مرزوق الکوفی ہے۔ اسے یحیٰی نے ضعیف کہا ہے۔ ابن حبان کہتے ہیں یہ موضوعات روایت کرتا۔ اور ثقہ راویوں کی جانب غلط باتیں منسوب کرتا ہے۔ اس کا ایک اور راوی عبدالرحمان بن شریک ہے۔ ابو حاتم رازی کہتے ہیں اس کی حدیث ردی ہوتی ہے

ہمارے نزدیک یہ عبدالرحمان اپنے باپ شریک سے روایت کرتا ہے اور وہ کوفہ کے شیعوں کا رئیس تھا۔ تمام محدثین نے بھی اسے ناقابل اعتبار قرار دیا ہے۔ ابن جوزی کہتے ہیں اس کا ایک راوی ابن عقدہ ہے۔ وہ رافضی تھا اور صحابہ کی برائیوں میں روایات بیان کرتا میرے نزدیک اسی نے یہ روایت وضع کی ہے۔ حمزۃ بن یوسف کا بیان ہے کہ ابن عقدہ صحابہ کی برائیاں بیان کرتا، خاص طور پر حضرات ابو بکرؓ اور عمرؓ کی۔ اسی لئے میں نے اس کی روایت ترک کر دی۔ دار قطنی کہتے ہیں یہ بہت بُرا آدمی تھا۔ ابن عدی کہتے ہیں یہ حدیث کے معاملہ میں دیندار نہ تھا۔ کوفہ کے علماء کو اس نے جھوٹ بولنا سکھایا۔ یہ خود روایات گھڑ گھڑ کر ان کے پاس لے جاتا۔ اور ان سے کہتا یہ روایات لوگوں سے بیان کرو۔

یہ روایت ابو ہریرہؓ سے بھی مروی ہے اور اُن سے داؤد بن فرابیج نے اسے نقل کیا ہے۔ لیکن اس فرابیج کو شعبہ نے ضعیف قرار دیا ہے۔ الموضوعات ج ۱ ص۳۵۵ اللآلی المصنوعہ فی احادیث

الموضوعہ للسیوطی۔ ص ۳۲۹ ج ۱۔ تذکرہ الموضوعات محمد طاہر پٹنی ص ۹۶۔ المقاصد الحسنہ للسخاوی ص ۲۲۶

محدثین کا ایک اصول یہ ہے کہ اگر کوئی راوی ایسا واقعہ بیان کرے کہ اگر وہ وقوع پذیر ہوتا تو ہزاروں افراد اسے نقل کرتے۔ لیکن پھر بھی اسے ایک دو افراد نقل کرتے ہوں خواہ وہ ثقہ ہوں۔ تب بھی وہ روایت موضوع ہوگی۔

سورج کا ڈوب کر لوٹنا ایک ایسا حادثہ ہے کہ روئے زمین کا کوئی فرد بشر ایسا نہ بچا ہوگا کہ جس نے یہ صورت حال نہ دیکھی ہوگی۔ لیکن تب بھی اسے صرف اسماءؓ بنت عمیس اور ابوہریرہؓ نقل کر رہے ہیں۔ کوئی اور فرد نقل نہیں کرتا۔ اسماءؓ والی روایت کی جتنی بھی سندات ہیں۔ سب میں کئی کئی راوی نامعتبر ہیں۔ پھر ان راویوں میں خود اختلاف ہے۔ کوئی تو کہتا ہے کہ اسماءؓ سے یہ روایت حضرت فاطمہ بنت حسین نے نقل کی ہے۔ اور کوئی کہتا ہے کہ فاطمہؓ بنت علی نے اور ان دونوں نے اسماءؓ کو نہیں دیکھا۔ بعض راویوں نے اسماءؓ کے بجائے اسے حضرت حسینؓ کی جانب منسوب کیا ہے۔ لیکن حضرت حسینؓ تو اس وقت دودھ پیتے بچے تھے۔ آخر یہ ہزارہا صحابہ کہاں چلے گئے تھے۔ جو ان میں سے کوئی بھی روایت نہیں کرتا۔

رہی حدیث ابی ہریرہؓ۔ ابن جوزی، اور سیوطی وغیرہ نے دعوی کیا ہے کہ اس کی سند میں داؤد بن فراہیج کو شعبہ نے ضعیف قرار دیا ہے۔ جس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ یہ روایت ضعیف ہے۔ موضوع نہیں لیکن داؤد سے اسے نقل کرنے والا یزید بن عبدالملک ہے اور اس سے اس کا بیٹا یحییٰ نقل کرتا ہے۔ امام ذہبی یزید بن عبدالملک کے حال میں لکھتے ہیں۔ اسے امام احمد وغیرہ نے ضعیف قرار دیا۔ یحییٰ بن معین کہتے ہیں یہ کچھ نہیں ہے۔ احمد بن صالح کہتے ہیں اس کی حدیث کچھ نہیں ہوتی۔ ابو زرعہ کہتے ہیں ضعیف ہے۔ ابن عدی کہتے ہیں اس کی عام روایات درست نہیں ہوتیں۔ امام بخاری نے امام احمد کا قول نقل کیا ہے کہ اس کی روایات منکر ہوتی ہیں۔ نسائی کہتے ہیں۔ متروک الحدیث ہے۔ ذہبی نے اس روایت کو منکر قرار دیتے ہوئے لکھا ہے کہ اسکا بیٹا یحییٰ بھی واہی ہے۔ گویا ابوہریرہؓ کی روایت کے تین راوی ناقابل اعتبار ہیں۔ میزان ص ۴۳۲ ج ۴۔

حضرت علیؓ کو کاندھوں پر اُٹھانا

عام طور پر یہ واقعہ مشہور ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جب مکہ فتح فرمایا۔ اور آپ خانہ کعبہ میں داخل ہوئے تو جو بت بلندی پر نصب تھے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں گرانے کے لئے حضرت علیؓ بن ابی طالب کو اپنے کاندھوں پر اٹھالیا۔ یہ واقعہ ہماری کتب تاریخ وسیر میں مختلف رنگ آمیزیوں کے ساتھ بیان کیا جاتا ہے۔ اور شیعوں کی تو کوئی مجلس بھی اس ذکر سے خالی نہیں ہوتی۔ حتیٰ کہ ہمارے اہل سنت علماء اور عوام ہر دو طبقے سبائیوں کے اس پروپیگنڈے سے اتنے متاثر ہیں کہ ان کا ذہن اس کے خلاف کچھ سوچنے کے لئے بھی تیار نہیں۔ یہاں تک کہ اس کہانی نے اب ایک قسم کی مذہبی حیثیت اختیار کرلی ہے حالانکہ یہ واقعہ خلاف عقل بھی ہے اور خلاف نقل بھی۔ اس کے خلاف عقل ہونے کی چند وجوہات ہیں۔

۱۔ یہ واقعہ ماہ رمضان ۸ھ میں پیش آیا۔ اُس وقت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی عمر مبارک ساٹھ سال سے متجاوز ہو چکی تھی۔ جب کہ ہماری تحقیق کے مطابق حضرت علی کی عمر ۲۶ سال تھی۔ اگرچہ دیگر لوگوں کے خیال کے مطابق تیس بتیس سال بنتی ہے۔ گویا حضرت علیؓ اس وقت بھرپور جوان تھے۔ اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم بڑھاپے کی حدود میں داخل ہو چکے تھے۔ اور آپ کا جسم مبارک بھاری ہونا شروع ہو گیا تھا۔ اور ساٹھ سال کی عمر ایسی عمر ہوتی ہے کہ اس عمر کا کوئی انسان ایک جوان العمر کو ہرگز اپنے کاندھوں پر نہیں اُٹھا سکتا۔ بلکہ معاملہ اس کے برعکس ہوتا ہے کہ چھبیس ستائیس سالہ جوان ایک ساٹھ سالہ انسان کو ضرورت کے تحت اپنے کاندھوں پر اٹھالے۔ ایسی صورت میں یہ واقعہ خلاف عقل اور ناممکن ہے۔

۲۔ تمام صحابہ کرام میں حضرت علیؓ اور حضرت عبداللہؓ بن مسعود رضی اللہ عنہما سب سے زیادہ پستہ قد تھے۔ لہٰذا بلندی پر سے بتوں کا گرانا جو مقصود اصلی تھا۔ حضرت علیؓ کے کاندھوں

پر اٹھانے سے ہرگز حاصل نہ ہو سکتا تھا کیونکہ کعبہ کافی بلند ہے۔اس کام کے لئے ایسا ہی فرد مناسب تھا۔جس کا قد وقامت بھی مناسب ہو، اور حضور کے لئے اس کے بار اٹھانے میں دقت بھی نہ ہو۔اور حضرت علیؓ کے ساتھ یہ دونوں صورتیں مفقود تھیں۔لہٰذا حضرت علیؓ بن ابی طالب کو کاندھوں پر اُٹھانا ہر صورت میں خلاف عقل ہے۔

۲۔نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے وہ بت جو کعبہ کے باہر مسجد حرام میں تھے۔انہیں اپنی چھڑی سے گرایا۔پھر آپ خانہ کعبہ میں داخل ہوئے۔اور حضرت عمرؓ کو حکم دیا کہ ان بتوں کو باہر اٹھوا کر پھینک دیا جائے۔حضرت عمرؓ ان بتوں کو توڑتے جاتے اور باہر پھکواتے جاتے۔جیساکہ کتب احادیث میں آرہا ہے اور تاریخ و سیر سے یہ ثابت ہے کہ حضرت عمرؓ کافی طویل القامت تھے۔حتیٰ کہ شبلی الفاروق میں لکھتے ہیں کہ آپ گھوڑے پر بغیر رکاب کے سوار ہوتے۔اور جب گھوڑے پر بیٹھتے تو پاؤں زمین پر لگ جاتے۔ظاہر ہے کہ حضور نے بتوں کو گرانے کے لئے کسی بڑے مجسّم کو کاندھوں پر اٹھایا ہوگا۔جن تک حضرت عمرؓ کا ہاتھ نہ پہنچ سکا ہوگا۔اور اس کام کے لئے کسی طویل القامت شخص کا ہونا ضروری تھا۔کسی پستہ قد انسان کے ذریعہ اس کام کا انجام پانا ممکن نہ تھا۔

اسی لئے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علیؓ بن ابی العاص کو اپنے کاندھوں پر اٹھا لیا۔حدیث کی مشہور کتاب سنن ابی داؤد میں ہے۔

فحمل علی بن ابی العاص علی عاتقه	آپ نے علی بن ابی العاص کو اپنے کاندھے پر اٹھالیا۔

العاص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سب سے بڑی صاحبزادی حضرت زینبؓ کے صاحبزادے ہیں اور حضور کے سب سے بڑے نواسے ہیں۔ان کے والد ابوالعاص بنوامیہ خاندان کے ایک بہت سخی، نہایت امانت دار اور انتہائی شجاع فرد تھے۔اور ام المومنین حضرت خدیجہؓ کے بھانجے تھے۔یہ علی ہجرت مدینہ سے سات آٹھ سال قبل پیدا ہوئے تھے۔

عربی دستور کے مطابق دو سال کی دودھ پینے کی مدت بنو غاضرہ میں گزاری۔ اس کے بعد بچپن سے جوانی تک نانا کی آغوش میں پلے اور بڑھے اور تربیت پائی۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس بچہ کو اپنی بیٹی سے مانگ لیا تھا۔ اور انہیں خود پرورش فرمایا تھا۔ (الاصابہ ص۵۰۲ ج ۲)

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے سب سے بڑے نواسے سے بہت محبت تھی اور ہر اہم موقعہ پر آپ انہیں اپنے ساتھ رکھتے۔ فتح مکہ کے وقت یہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ آپ کی اونٹنی پر ..... موجود تھے۔ اصابہ ج ۲ ص۵۰۲ رحمۃ للعالمین ص۹۸ ج ۲

اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم کے مطابق آپ کے کاندھوں پر چڑھ کر بیت اللہ کو بتوں کی آلائش و نجاست سے پاک صاف کیا۔ (الصداقۃ العظمی ص۲۲) اس وقت حضرت علیؓ بن ابی العاص کی عمر چودہ پندرہ سال تھی۔ الاصابہ ص۵۰۳ ج ۲

ان حوالوں سے جہاں یہ امر ثابت ہوا کہ جن کو کاندھوں پر اٹھایا گیا تھا۔ وہ حضرت علیؓ بن ابی العاص تھے، نہ کہ حضرت علیؓ بن ابی طالب، وہاں یہ اعتراض بھی رفع ہو گیا کہ ساٹھ سال کی عمر میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو ایک بھرپور جوان کو اٹھانا خلاف عقل ہے۔ اب یہ اعتراض باقی نہیں رہا۔ قد و قامت کا مسئلہ تو عام دستور یہی ہے کہ جب تک کسی خاص شخص کے بارے میں یہ وضاحت نہ کی جائے کہ فلاں شخص طویل القامت تھا، یا فلاں شخص پستہ قد تھا۔ تب تک اس شخص کو متوسط القامت تصور کیا جاتا ہے۔ کیونکہ عام طور پر انسانوں کی اکثریت متوسط القامت ہوتی ہے۔ اس لحاظ سے حضرت علیؓ زینبی کا قد حضرت علیؓ بن ابی طالب سے زیادہ ہی ہوگا۔

ہمارے مجوسی مؤرخین اور ان کے ہم نواؤں کا ہمیشہ سے یہ دستور رہا ہے کہ جہاں کسی صحابی کی کوئی فضیلت نظر آئی، جھٹ اس واقعہ کی صورت بدل کر حضرت علیؓ کی جانب منسوب کر دیا مثلاً نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جنگ اُحد کے موقعہ پر حضرت حمزہؓ کو سید الشہداء اور اسد اللہ کا خطاب دیا۔ انہوں نے اسد اللہ کے خطاب کو حضرت علیؓ کے ساتھ اور سید الشہداء کے خطاب کو حضرت حسینؓ کے ساتھ چسپاں کر دیا۔ حضرت ابو بکرؓ کو صدیق کا

خطاب دیا گیا۔ ان مجوسیوں نے حضرت علیؓ کی زبانی یہ اعلان کروا دیا۔

انا الصدیق الاکبر فمن قالہا — میں صدیق اکبر ہوں۔ میرے علاوہ دگر
بعدی فقد کفر۔ — کوئی یہ دعویٰ کرے تو وہ کافر ہے۔

حضرت حکیمؓ بن حزام کعبہ میں پیدا ہوئے تھے۔ انہوں نے حضرت علیؓ کو کعبہ میں پیدا کر کے دکھا دیا۔ سینکڑوں اس قسم کی مثالیں دستیاب ہو جائیں گی۔ اس واقعہ میں بھی اسی اصول سے کام لیا گیا۔ اور اس کے پس پردہ یہ خباثت بھی کارفرما تھی کہ تاریخ کے پردے سے حضور کے سب سے بڑے نواسے کو غائب کیا جائے۔ تاکہ آل رسول اور پنج تن کی کہانیاں وضع کی جائیں۔ جیسا کہ سب سے پہلے پنج تن کی بنیاد قوم نوح نے رکھی تھی۔ ان کے بھی پانچ معبود تھے۔ اللہ تعالیٰ نے اس قوم کا یہ قول نقل کیا ہے۔

لَا تَذَرُنَّ وَدًّا وَّلَا سُوَاعًا — اور ود کو چھوڑو، نہ سواع کو، نہ یغوث
وَّلَا یَغُوْثَ وَیَعُوْقَ وَنَسْرًا۔ — کو، نہ یعوق کو اور نہ نسر کو۔

ان میں بھی چار مرد تھے اور ایک عورت تھی یعنی سواع۔ ہمارے پنج تن بھی چار مرد اور ایک عورت ہے۔ ہندوؤں میں بھی پانچ تن موجود ہیں، جن کو پنجا کہا جاتا ہے۔ ان کے ہاں بھی چار مرد اور ایک عورت سیتا نامی ہے۔ الغرض اس سازش کے تحت حضرت علیؓ بن ابی العاص کے اسم گرامی کو تاریخ سے غائب کرنے کی کوشش کی گئی اور کم از کم ہندو پاکستان کے سنیوں کو تو انہوں نے یہ باور کروا ہی دیا کہ حضور کے صرف دو ہی نواسے تھے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس محبوب اور سب سے بڑے نواسے تھے جن کا اسم گرامی علیؓ بن ابی العاص ہے اور ماں کی نسبت سے یہ علیؓ زینبی کہلاتے ہیں۔ رومن ایمپائر کو تباہ کرنے والی اس عظیم جنگ میں حصہ لیا۔ جو آج تاریخ میں جنگ یرموک کے نام سے مشہور ہے۔ یہ جنگ ۱۵ھ میں حضرت عمرؓ فاروق کے زمانہ میں ہوئی۔ یہ اس جنگ میں جہاد کرتے ہوئے، دونوں عالم کی کامرانیوں کا تاج سر پر رکھ کر شہادت سے سرفراز ہوئے

اس وقت ان کی عمر مبارک بائیس سال تھی۔ حضور کے نواسوں میں یہ سب سے اول شہید ہیں۔ جنہوں نے اعلائے کلمۃ اللہ کے لئے کفار کے مقابلہ میں اپنی جان، جان آفریں کے سپرد کی۔ رضی اللہ تعالیٰ عنہٗ

اقبال مرحوم نے بانگ درا میں "جنگ یرموک کا ایک واقعہ" کے تحت ان ہی نواسہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے شوق شہادت کو خراج عقیدت پیش کیا ہے۔ وہ فرماتے ہیں

صف بستہ تھے عرب کے جوانانِ تیغ بند — تھی منتظر حنا کی، عروسِ زمینِ شام
اک نوجوان صورتِ سیماب مضطرب — آکر ہوا امیر عساکر سے ہم کلام
اے ابوعبیدہ رخصتِ پیکار دے مجھے — لبریز ہوگیا مرے صبر و سکوں کا جام
بیتاب ہو رہا ہوں فراقِ رسول میں — اک دم کی زندگی بھی محبت میں ہے حرام
جاتا ہوں میں حضورِ رسالت پناہ میں — لے جاؤں گا خوشی سے اگر ہو کوئی پیام
یہ ذوق و شوق دیکھ کے پرنم ہوئی وہ آنکھ — جس کی نگاہ تھی، صفتِ تیغِ بے نیام
بولا امیر فوج کہ "وہ نوجواں ہے تو — پیروں پہ تیرے عشق کا واجب ہے احترام
پوری کرے خدائے محمد تری مراد — کتنا بلند تیری محبت کا ہے مقام
پہنچے جو بارگاہِ رسولِ امیں میں تو — کرنا یہ عرض میری طرف سے پس از سلام

ہم پر کرم کیا ہے خدائے غیور نے
پورے ہوئے جو وعدے کئے تھے حضور نے

جہاں تاریخ کا یہ ظلم حضرت علیؓ بن ابی العاص پر ہوا ہے وہاں اُن کی بہن اور حضور کی سب سے بڑی نواسی حضرت امامہؓ پر بھی ہوا ہے۔ اللہ بھلا کرے محدثین کرام کا جو اتنی باتیں ہمیں معلوم ہوگئیں۔ اس طرح سبائیت کا پردہ چاک ہوگیا۔ ورنہ ہم بھی اس مرض سبائیت کی بھینٹ چڑھ جاتے۔

امامہؓ حضرت علیؓ بن ابی العاص کی بہن ہیں۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ان سے اتنی محبت

فرماتے کہ جب مسجد میں نماز پڑھانے کے لئے تشریف لاتے تو یہ امامہؓ آپ کے کاندھوں پر ہوتیں۔

حضرت ابوقتادہؓ انصاری کا بیان ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نماز کی حالت میں بھی انہیں اپنی گردن پر بٹھائے ہوتے۔ جب آپ سجدہ میں جانے کا ارادہ فرماتے تو انہیں نیچے اتار دیتے۔ اور جب کھڑے ہوتے تو پھر انہیں گردن پر بٹھا لیتے۔ ابوقتادہؓ کہتے ہیں۔ یہ امامہؓ زینبؓ بنت رسول اللہ کی صاحبزادی تھیں۔ ان کے والد ابوالعاصؓ ابن ربیعۃ بن عبدشمس تھے۔ صحیح بخاری صـ۷۴ ج ۱ مسلم۔ ابوداؤد۔ مسند احمد۔ نسائی۔ ابن ماجہ۔

ایک بار نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس تحفہ میں ایک خوبصورت ہار آیا۔ آپ نے فرمایا یہ ہار میں اپنے عزیزوں میں سے سب سے زیادہ محبوب ہستی کو پہناؤں گا۔ لوگوں نے یہ سمجھا کہ شاید نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم یہ ہار حضرت عائشہؓ کو عطا فرمائیں گے کہ آپ کو سب سے زیادہ وہی محبوب ہیں۔ آپ نے اپنی پیاری نواسی سیدہ امامہؓ کو بلایا۔ اور نہایت شفقت ومحبت سے وہ ہار اپنے ہاتھ سے انہیں پہنایا۔

حضرت فاطمہؓ کے انتقال کے بعد حضرت علیؓ نے ان سے نکاح کیا۔ اور حضرت [illegible] نے انہیں اس کی وصیت کی تھی۔ رحمۃ للعالمین جلد دوئم

حضرت فاطمہؓ کا انتقال حضور کی وفات کے چھ ماہ بعد ہوا ہے۔ گویا یہ امامہؓ حضور کی حیات میں جوان ہوگئی تھیں۔ اس لحاظ سے یہ اپنے بڑے بھائی حضرت علیؓ بن العاص سے زیادہ چھوٹی نہ تھیں۔ حضرت علیؓ بن ابی طالب کی شہادت کے بعد یہ محمد بن جعفر بن ابی طالب کے نکاح میں آئیں۔ جب ان کا انتقال ہوگیا تو کچھ دن بعد ۶۱ھ میں حضرت حسینؓ نے کوفہ جانے کا ارادہ کیا۔ حضرت حسینؓ کی بہن زینب جو حضرت عبداللہ بن جعفرؓ کے نکاح میں تھیں۔ اور یہ عبداللہؓ حضرت علیؓ کے سگے بھتیجے تھے۔ انہوں نے زینبؓ کو بھائی کے ساتھ جانے سے روکا لیکن وہ باز نہ آئیں۔ اس پر حضرت عبداللہ بن جعفرؓ نے زینب بنت علیؓ کو طلاق دیدی اور ان

امامہؓ بنت ابی العاص سے نکاح کر لیا۔

یہ حضرت امامہؓ کا ایک ایسا قصور تھا جو سبائی آج تک معاف نہ کر سکے، اول تو گرد و غبار میں اُن کی ذات کو چھپانے کی کوشش کی۔ اور جب اس میں کامیابی ہوتی نظر نہ آئی تو یہ دعویٰ کر بیٹھے کہ حضور کی صرف ایک صاحبزادی حضرت فاطمہؓ تھیں بقیہ صاحبزادیاں حضرت خدیجہؓ کے پہلے خاوند سے ہیں۔ اس طرح ان سبائیوں نے حضرت علیؓ بن ابی العاص اور امامہؓ بنت ابی العاص کو حضور کی اولاد سے خارج کر دیا۔

ان ہر دو حضرات کے حالات کو ہماری تاریخ نے جس طرح مسخ کرنے کی کوشش کی اسی طرح آپ کے ایک اور نواسے عبداللہؓ بن عثمان کو بھی دنیا سے ناپید بنانے کی سعی کی۔ یہ حضرت عثمانؓ کے صاحبزادے ہیں۔ ان کی والدہ حضرت رقیہؓ بنت رسول اللہ ہیں۔ حضرت رقیہؓ کی وفات رمضان ۲ھ میں ہوئی۔ لازماً یہ اس سے قبل پیدا ہو چکے تھے۔ حضرت رقیہؓ کا حضرت عثمانؓ سے نکاح ہجرت حبشہ سے قبل ہوا۔

طبری کہتا ہے کہ جب یہ سات سال کے تھے تو ان کی آنکھ میں ایک پرندے نے چونچ ماری۔ جس کی تکلیف سے ان کا انتقال ہو گیا۔ لیکن مسعودی جو طبری سے کہیں زیادہ خطرناک شیعہ ہے۔ لکھتا ہے کہ جب ان کی عمر ستر سال ہوئی، اور ان کی آنکھوں کے پپوٹے لٹک آئے۔ تو ایک پرندے نے ان کی آنکھ میں چونچ ماری۔ اور بڑھاپے کی وجہ سے کوئی علاج کارگر نہ ہوا اسی تکلیف میں انتقال کر گئے آگے کہتا ہے کہ ہمارے زمانہ میں (یعنی چوتھی صدی میں) ان کی اولاد سے مکہ میں ایک محلہ آباد ہے۔ اسی طرح ایک محلہ قرطبہ اندلس میں ہے، اور اشبیلیہ میں بھی ان کی اولاد پائی جاتی ہے۔

گویا یہ حضور کے دوسرے نواسے ہیں۔ چونکہ ان کی اولاد چلی۔ اور ان کے والد محترم حضرت عثمانؓ اموی تھے۔ اس طرح ان کی اولاد اموی ہوئی۔ لیکن بنوامیہ میں حضور کی اولاد کا تصور کسی سبائی سے ممکن نہیں۔ اسی لئے اُن کی عمر کو ستر سے گھٹا کر سات بنا یا گیا۔ اس سے دو فائدے

حاصل کئے گئے۔ اول اُن کی اولاد کا سلسلہ باقی نہیں رہا۔ دوئم جب بقول طبری یہ بچپن میں انتقال کر گئے تو سبائیوں کے لئے اس پروپیگنڈے کی راہیں ہموار ہوگئیں کہ حضور کے صرف دو نواسے تھے۔ حالانکہ حضور کے چار نواسے تھے۔ جن میں دو صحابی تھے۔

۱۔ حضرت علی بن ابی العاص صحابی

۲۔ حضرت عبداللہ بن عثمان صحابی

۳۔ حضرت حسن

۴۔ حضرت حسین

اور تین نواسیاں تھیں

۱۔ امامہؓ بنت ابی العاص صحابیہ

۲۔ ام کلثوم بنت علی

۳۔ زینب بنت علی

اللہ کا فضل ہے آپ کے ہر نواسے اور نواسی سے اولاد چلی۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی صاحبزادی حضرت ام کلثومؓ حضرت عمرؓ کے نکاح میں آئیں۔ جن سے حضرت عمرؓ کے دو بچے ہوئے۔ زید بن عمر اور رقیہ بنت عمر

جگر خوارہ

حضرت ہند پر بے بنیاد الزامات

اسلام میں جنگ اُحد کو ایک خاص قسم کی شہرت حاصل ہے۔ اس جنگ میں ابتداء میں مسلمانوں کو کامیابی حاصل ہوئی تھی، لیکن بعد میں مسلمان شکست سے دوچار ہوئے، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے دندان مبارک شہید ہوئے، مغفر کی کڑیاں آپ کے رخسار مبارک میں گھس گئیں۔ گڑھے میں گرنے کے باعث ٹانگوں میں زخم آئے۔ بڑے بڑے صحابہؓ کرام نے جام شہادت نوش کیا۔ جن میں حضرت حمزہؓ بن عبدالمطلب اور حضرت مصعبؓ بن عمیر بھی تھے۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو حضرت حمزہؓ سے بہت ہی قریبی اور خصوصی تعلق تھا جو کسی اور سے پیدا ہونا ممکن نہ تھا۔ اس کی مختلف وجوہات تھیں۔

۱۔ حضرت حمزہؓ آپ کے چچا تھے۔

۲۔ حضرت حمزہؓ نے کچھ دن ثوبیہ کا دودھ پیا تھا۔ اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی سات دن تک ثوبیہ کا دودھ پیا۔ اس رشتہ سے حضرت حمزہؓ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے رضاعی بھائی تھے۔

۳۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی والدہ آمنہ بنت وہب کے چچا اہیب کی ایک لڑکی کا نام ہالہ تھا۔ جو عبدالمطلب کے نکاح میں آئی، جس سے حضرت حمزہؓ پیدا ہوئے۔ اس رشتہ سے حضرت حمزہؓ حضور کے خالہ زاد بھائی تھے۔ جیسا کہ علامہ ابن حزم نے جمہرۃ الانساب میں تحریر کیا ہے۔

۴۔ حضرت حمزہؓ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ہم عمر تھے، وہ آپ سے عمر میں صرف چھ ماہ بڑے تھے۔ اس لحاظ سے وہ آپ کے بچپن کے ساتھی تھے۔

۵۔ اسلام کے ابتدائی دور میں حضرت حمزہؓ ایمان لانے کے بعد نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم

کیلئے ایک ڈھال بن گئے تھے۔ وہ مکہ کے ایک مانے ہوئے بہادر اور شجاع تصور کئے جاتے تھے۔ اس لئے کفار ان کے سامنے آنے سے کتراتے تھے۔

۶۔ اسلام لانے کے بعد اپنی زندگی کا ایک بڑا حصہ یعنی دس سال حضور کے ساتھ گزارا۔ اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی اعانت میں اپنی جان جانِ آفریں کو سُپرد کی۔

یہی وجوہات ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو اُن سے بے پناہ محبت تھی۔ اور آپ کو اُن کی شہادت کا ازحد غم تھا۔ لیکن ہمیں حیرت اس امر پر ہے کہ ہمارے مجوسی اور سبائی مورخین کو آخر کس بات کا غم ہے جو آج تک وہ حضرت حمزہؓ کو نہ بھُلا سکے۔ آخر حضرت حمزہؓ سے وہ کون سی ان کی رشتہ داری ہے جو آج تک ان کی زبان پر حضرت حمزہؓ کی شہادت کا یہ قصہ جاری ہے۔ اگر حضور کی رشتہ داری کا معاملہ ہے تو جنگ بدر میں عبیدہؓ بن حارث شہید ہوتے جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے سگے چچازاد بھائی تھے لیکن کسی انسان کو ان کے حال کی خبر نہیں۔ اور نہ کوئی مورخ اور سیرت نگاراُن کا کوئی تذکرہ کرتا ہے۔ اور نہ ان کے ساتھ کوئی کہانی وابستہ کی جاتی ہے۔ آخر حضرت حمزہؓ کے ساتھ ایسا کون سا نیا شاخصانہ پیش آیا تھا۔ جو آج تک ہمارا ہر مورخ، ہر سیرت نگار اور ہر ملا مسجد کے ممبر پر چڑھ کر یہ واقعۂ شہادت بیان کرتا، اور جگر خوارہ کی کہانی دہراتا رہتا ہے۔

قارئین کرام یہ بھی جانتے ہیں کہ جنگ اُحد، جنگ بدر کی شکست کا ایک انتقامی جذبہ تھا اس لئے تمام اہل مکہ نے اپنے دل گردے نکال کر پھینک دیئے تھے۔ کیونکہ جنگ بدر میں ستر کافر مارے گئے تھے۔ جن میں سے ہر شخص اپنے اپنے قبیلہ کا سربرآوردہ فرد تھا۔ ایسی صورت میں یہ لازمی تھا کہ مکہ کے ہر ہر فرد کے دماغ پر انتقامی جذبہ کارفرما ہو، اس انتقامی جذبہ میں ہر ہر فرد برابر کا شریک تھا۔ مثلاً جنگ بدر میں ابوجہل مارا گیا تھا تو بنو مخزوم کے وہ افراد بھی جنگ اُحد میں شریک تھے۔ جو اس سے قبل نہ حضور کے مدمقابل آئے تھے۔ اور نہ مسلمانوں کے خلاف اپنی زندگی میں کسی قسم کا قدم اُٹھایا تھا، اس سلسلہ میں سب سے اولین مثال حضرت خالد بن الولید کی ہے۔ مکی زندگی میں ہمیں یہ کہیں نظر نہیں آتا کہ انہوں نے کسی وقت بھی اسلام کی مخالفت میں کسی قسم کا

قدم اٹھایا ہو۔

یہی صورت حال بنوامیہ کے ساتھ پیش آئی جنگ بدر میں بنوامیہ کے متعدد افراد مارے گئے۔ مثلاً عتبہ، شیبہ اور ولید۔ ان میں سے عتبہ ابوسفیان کا سسر تھا۔ شیبہ عتبہ کا بھائی تھا اور ولید عتبہ کا بیٹا تھا۔ اس لحاظ سے آپ خود ٹھنڈے دل سے سوچیے کہ ہندؓ جو ابوسفیانؓ کی زوجہ اور عتبہ کی بیٹی تھیں۔ اُن کے دل پر کیا گزری ہوگی، کہ اُن کا باپ، چچا، اور بھائی تینوں مارے گئے تھے۔ اور ان کے مارے جانے کے بعد بنوامیہ کی سیادت ابوسفیانؓ کو حاصل ہوئی تھی۔ یہ تینوں افراد جو مارے گئے وہ ابوسفیانؓ کے خاندان سے تعلق رکھتے تھے ایک سسر تھا۔ ایک چچیا سسر تھا اور ایک سالا تھا۔

اس لئے وہ ابوسفیانؓ جس نے مکی زندگی میں اسلام کے خلاف کوئی اقدام نہ کیا تھا۔ بلکہ ابوجہل وغیرہ جب حضورؐ کو تنگ کرتے تو آپ ابوسفیانؓ ہی کے گھر جا کر پناہ لیتے، اور ابوسفیانؓ آپ کو پناہ دیتا۔ کیونکہ بنو عبدالمطلب اور بنو اُمیہ دونوں ایک ہی دادا کی اولاد تھے۔

لیکن جنگ بدر کے نتیجے نے ہر چیز کی کایا پلٹ دی تھی۔ اب وہ افراد بھی مدمقابل آگئے تھے۔ جنہوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کے خلاف کبھی کسی قسم کا اقدام نہ کیا تھا گویا اس جنگ کے پس پردہ دو عوامل کارفرما تھے۔

۱۔ مخالفت اسلام اور حضورؐ کی عداوت

۲۔ انتقامی جذبہ

چونکہ اس جنگ اُحد کے پس پردہ دونوں قسم کے عوامل تھے۔ لیکن انہیں ایک تصور کر لیا گیا اور ان لوگوں کو بھی دشمن اسلام ثابت کر کے دکھایا گیا جو صرف انتقامی جذبہ کے تحت اس جنگ میں شریک ہوتے تھے اور خاص طور پر ان افراد کو ہدف بنایا گیا جن کا تعلق بنو اُمیہ سے تھا حتیٰ کہ ان میں سے جو افراد بعد میں اسلام بھی لے آئے تھے، لیکن اسلام لانے کے باوجود آج تک ان کی گذشتہ غلطیوں کو معاف نہیں کیا گیا۔ حالانکہ اسلام کا مسلمہ قانون تو یہ تھا۔

ان الاسلام یھدم ما کان قبلہ   اسلام پہلے گناہوں کو منہدم کر دیتا ہے

لیکن خاندان بنو امیہ کو اس اسلامی قانون سے بھی مستثنیٰ سمجھا گیا۔ اور یہ بات ذہنوں میں بٹھا دی گئی کہ ان کی زمانۂ کفر کی برائیاں بھی علیٰ حالہٖ آج تک قائم ہیں۔ ان کا ایمان نفاق پر مبنی تھا۔ اس کی بین مثال۔ حضرت ابو سفیانؓ، حضرت امیر معاویہؓ اور حضرت ہندؓ ہیں۔ یہ وہ حضرات ہیں کہ جن پر آج تک سنی مورخین، مفسرین اور مصنفین مختلف رنگ و انداز میں تبرا کرتے رہتے ہیں۔ ہمارے مضمون کا اس وقت مقصود حضرت ہندؓ کی ذات ہے۔ جو حضرت امیر معاویہؓ کی والدہ حضرت ابو سفیانؓ کی زوجہ اور ام المومنین ام حبیبہؓ کی ماں، اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ساس ہیں۔

یہ جنگ احد میں کفار کی جانب سے شریک ہوئیں۔ کہا یہ جاتا ہے کہ حضرت حمزہؓ کو انہوں نے شہید کرایا۔ پھر حضرت حمزہؓ کا مثلہ کیا۔ اور کلیجہ چبایا۔ اسی لحاظ سے انہیں جگر خوارہ کہا جاتا ہے۔ انہیں جگر خوارہ ثابت کرنے کے لئے ہمارا ہر ایک مولوی، ہر ایک محقق اور ہر ایک مورخ حضرت حمزہؓ کی شہادت کا قصہ بیان کرتا ہے۔ حضرت ہندؓ کے اس کردار کو باقی رکھنے کے لئے داستان امیر حمزہؓ وجود میں لائی گئی۔ اور اسی وجہ سے حضرت حمزہؓ کو میر بنایا گیا۔ حالانکہ یہ لفظ میر ہندوستان کے سادات اور شیعہ اپنے لئے استعمال کرتے تھے۔ مثلاً میر تقی، میر مینائی، میر انیس وغیرہ۔

ساتھ ساتھ یہ تخیل پیدا کیا گیا کہ بنو امیہ کو بنو ہاشم سے پرانی رقابت تھی۔ لہٰذا یہ کاروائیاں اسی رقابت کے نتیجے میں ہوئیں۔ اور اسی لئے بنی امیہ اسلام کی مخالفت میں پیش پیش رہے۔ حالانکہ سابقین اولین میں حضرت عثمانؓ، حضرت ابو حذیفہؓ، حضرت خالدؓ بن ابی العاص اور حضرت سعیدؓ بن ابی العاص وغیرہ سب اموی تھے، حضور نے اپنی تین صاحبزادیوں کا نکاح امویوں سے کیا۔ آپ کی ازواج میں سے ایک زوجہ حضرت ابو سفیانؓ کی صاحبزادی ہیں۔ جبکہ خاندان بنی ہاشم میں سے کسی عورت کو آپ کی زوجیت کا فخر حاصل نہیں ہو سکا۔ اگر اسی کا نام رقابت و

عداوت ہے تو پھر محبت اور تعلق کس شے کا نام ہے۔ عؔ بر عکس نہند نام زنگی کافور

آمدم بر سرِ مطلب۔ یہ وہ انتقامی جذبہ تھا جس کے باعث قریش کی متعدد عورتیں بھی میدانِ کارزار میں ساتھ آئی تھیں۔ طبری جلد دوئم ص۱۹۷ پر لکھتا ہے۔

پس قریش بڑی شان و شوکت اور آب و تاب کے ساتھ جنگ کے لئے نکلے اور قریش کے مختلف قبیلے اور وہ لوگ جو بنو کنانہ اور تہامہ والوں میں سے تھے۔ ان کے ساتھ تھے، اور یہ لوگ اپنی پردہ نشین عورتوں کو بھی ساتھ لے گئے تھے۔ تاکہ وہ عورتوں کی نگہبانی کے احساس سے جنگ سے منہ نہ موڑیں۔

پس ابو سفیانؓ بن حرب بھی نکلے، اور وہ لوگوں کے قائد تھے۔ ان کے ساتھ ہندؓ بنت عتبہ بن ربیعہ بھی تھیں اور عکرمہؓ بن ابی جہل بن ہشام بن المغیرۃ بھی نکلے۔ ان کے ساتھ ام حکیم بنت الحارث بن الہشام بن المغیرۃ بھی تھیں۔ حارث بن ہشام بن المغیرہ نکلے، ان کے ساتھ فاطمہ بنت الولید بن المغیرہ تھیں۔ (حضرت خالدؓ بن الولید کی بہن) صفوان بن امیہ بن خلف نکلے۔ ان کے ساتھ برزہ تھیں۔ اور ایک روایت میں ہے کہ برّہ بنت مسعود بن عمرو بن عمیر الثقفیہ بھی نکلیں۔ اور یہ عبداللہ بن صفوان کی والدہ ہیں، عمروؓ بن العاص بن وائل نکلے، ان کے ساتھ برلطہ بنت منبہ بن الحجاج بھی تھیں، اور یہ حضرت عبداللہ بن عمروؓ بن العاص کی والدہ ہیں، اور طلحہ بن ابی طلحہ اور ابو طلحہ عبداللہ بن عبد عزی بن عثمان بن عبدالدار نکلے، ان کے ساتھ سلافہ بنت سعد تھیں، اور وہ طلحہ کے بیٹے سافعہ، الجلاس، اور کلاب کی والدہ ہیں، اور اس دن یہ تینوں اور ان کے والد قتل ہوئے۔ اور خناس بنت مالک بن المضرب نکلی۔ یہ بنو مالک بن حسل کی عورتوں میں سے ایک ہے۔ اس کے ساتھ اس کا بیٹا ابو عزیز بن عمیر تھا۔ اور یہ حضرت مصعبؓ بن عمیر کی ماں ہے اور عمرہ بنت علقمہ نکلی، یہ بنی حارث بن عبد مناف بن کنانہ کی عورتوں میں سے ایک ہے۔

یہ آٹھ عورتیں تو وہ ہیں جو سردارانِ مکہ کے ساتھ آئی تھیں، اور اُن کے علاوہ جو دیگر

افراد کے ساتھ ہوں گی وہ جداگانہ ہوں گی۔

یہ بھی ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ حضرت حمزہؓ کی شہادت وحشیؓ بن حرب کے نیزے سے ہوئی۔ لیکن سب سے اہم سوال یہ ہے کہ وحشیؓ بن حرب کو حضرت حمزہؓ کے قتل پر کس نے آمادہ کیا۔ اور انہیں اس کام کا کیا صلہ ملا ،؟

تمام مورخین یہ بھی تسلیم کرتے ہیں کہ عرب قبائل میں یہ عام رواج تھا کہ جنگ کے خاتمہ کے بعد فاتح قبیلہ مفتوح قبیلہ کے مقتولین کی لاشوں کا مثلہ کرتے یعنی اس کے ناک ، کان ، کاٹتے اسلام نے اس کی سختی سے ممانعت کی۔ حدیث میں آتا ہے۔

نہی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عن المثلۃ	رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مثلہ سے منع فرمایا۔

کتب احادیث وتاریخ سے یہ امر بھی ثابت ہے کہ جنگ اُحد کے خاتمہ کے بعد کفار مکہ نے مسلمانوں کی لاشوں کا مثلہ کیا۔ حضرت عبداللہؓ بن حرام انصاری کے مثلہ کا ذکر صحیح بخاری اور صحیح مسلم وغیرہ میں مذکور ہے۔ حتیٰ کہ ان کی لاش کو ان کے اقرباء واعزاء بھی نہ پہچان سکے صرف ان کی بہن نے اُن کی انگلیوں کے پوروں سے انہیں پہچانا اور جنگ کے خاتمہ کے بعد جب ابوسفیانؓ نے مسلمانوں کو مخاطب کر کے یہ کہا تھا کہ یہ جنگ بدر کا بدلہ ہے۔ اس وقت یہ بھی اقرار کیا تھا کہ ہمارے کچھ آدمیوں نے مقتولین کی لاشوں کا مثلہ کیا ہے۔ لیکن میں نے نہ تو اس کام کا حکم دیا تھا اور نہ میں اسے بُرا سمجھتا ہوں۔ بخاری ص۵۷۹ ج ۲

ان تمام امور سے یہ بات واضح ہوئی کہ کفار عرب میں مثلہ کا عام رواج تھا اور شہدائے اُحد کی لاشوں کا مثلہ بھی کیا گیا۔ اور یہ مثلہ کسی خاص شخصیت کے ساتھ مخصوص نہ تھا اور بقول ابوسفیانؓ اس مثلہ میں متعدد افراد شریک تھے۔ لیکن یہ کون کون افراد تھے۔ اور انہوں نے کس کس شخص کی لاش کا مثلہ کیا ؟ یہ مثلہ کرنے والے مرد تھے یا عورتیں تھیں ؟ یہ ایسے سوالات ہیں کہ جن کا انفرادی طور پر جائزہ لینا ایک امر محال ہے۔ نہ اس کا جواب کوئی ایسا مسلمان دے سکتا ہے جو شریک

جنگ ہو۔اس لئے کہ مسلمان تو اپنی جان بچانے کے لئے پہاڑی کے اوپر چڑھنے کی کوشش کر رہے تھے۔ اور کفار مکہ میں سے بھی کسی ایسے شخص نے جو بعد میں اسلام لایا ہو، اس کی کوئی تفصیل بیان نہیں کی۔ مثلاً حضرت ابوسفیانؓ، حضرت خالدؓ بن الولید، عکرمہؓ بن ابی جہل، ام حکیمؓ بنت الحارث بن ہشام اور حضرت ہندؓ بنت عتبہ۔ یہ سب فتح مکہ کے دن اسلام لائے۔ یا اس سے قبل اسلام لائے۔

ایسی افراتفری کے عالم میں جب کہ مسلمان اپنی جان بچانے کی فکر میں ہوں، خاص طور پر یہ دیکھنا کہ حضرت ہندؓ بنت عتبہ یعنی امیر معاویہؓ کی والدہ نے کس کی لاش کا مثلہ کیا۔ اور کس کے ناک کان کا ہار بنایا۔ اور کس کا کلیجہ چبایا؟ یہ تمام امور اسی صورت میں محفوظ کئے جاسکتے ہیں کہ باقاعدہ طور پر کچھ افراد اس کام کے لئے مامور کئے گئے ہوں کہ وہ حضرت ہندؓ کی ایک ایک حرکت کا جائزہ لیتے رہیں، اور ان کا جنگ وغیرہ سے کوئی تعلق نہ ہو۔ گویا آج کل کی اصطلاح میں اس کی ذمہ داری صرف رپورٹنگ ہو، اور اس کے ساتھ کوئی پریس فوٹوگرافر بھی ہو، جس نے پوری پوری تفصیل کے ساتھ یہ رپورٹ تیار کر کے ہمارے سبائی مؤرخین کے پاس بھیجی ہو۔ تاکہ وہ بطور ریکارڈ محفوظ رہے۔ اور پھر یہ ثابت کیا جاسکے کہ حضرت حمزہؓ کی لاش کا مثلہ حضرت ہندؓ نے کیا تھا۔ اور ان کا کلیجہ چبایا تھا۔

اس داستان کی حقیقت کیا ہے۔ یہ کہاں سے چلی، کس نے اس کہانی کی ابتدا کی، اور کن لوگوں نے اسے عام کیا؟ قبل اس کے کہ ہم اس پر کچھ تبصرہ کریں۔ پہلے اپنے اردو سیرت نگاروں کے خیالات بھی ملاحظہ فرمالیں۔

قاری احمد پیلی بھیتی تاریخ مسلمانانِ عالم میں لکھتے ہیں۔

کافروں کی عورتیں میدان میں گشت لگا رہی تھیں، مسلمانوں کی لاشوں کے ساتھ بہت نازیبا سلوک کررہی تھیں۔ ابوسفیانؓ کی بیوی ہندہؓ نے اپنے گلے کا ہار اتار کر وحشیؓ کے گلے میں ڈال دیا۔ اور اس کو حضرت امیر حمزہؓ کے قتل پر مبارک باد دی۔ بہت سے شہداء کے ناک کان کاٹ،

ڈالے۔ اور ہار بنا کر ہندہؓ نے اپنے گلے میں پہنا۔ حضرت امیر حمزہؓ کی لاش کے قریب ہندہؓ گئی تو خنجر سے لاش کا سینہ چاک کیا۔ اور کلیجہ نکال کر دانتوں سے چبایا۔ ناک کان کاٹے اور لاش کو اچھی طرح خراب کیا۔ تاریخ مسلمانان عالم ص۳۲۷ ج ۲

عبدالحکیم نشتر جالندھری رقم طراز ہیں۔

کفار نے مقتولین بدر کے جوش انتقام میں بعض شہداء کی لاشوں کے ناک کان کاٹ ڈالے ابوسفیانؓ کی بیوی ہندہؓ نے حضرت حمزہؓ کی لاش کے ساتھ سخت بے حرمتی کی۔ اور اُن کا جگر کاٹ کر چبا گئی تاریخ اسلام ص۶۴۔ از عبدالحکیم نشتر جالندھری۔

پرویز صاحب لکھتے ہیں۔

جب حضرت حمزہؓ کو وحشیؓ غلام نے شہید کیا۔ تو ابوسفیانؓ کی بیوی ہندہؓ نے اُن کا مثلہ کیا۔ اور کلیجہ نکال کر چبا گئی۔ معارف القرآن ص۵۲۱ ج ۴

اسلم جیراجپوری لکھتے ہیں۔

وحشی نامیؓ جبیر ابن مطعم کا غلام تھا۔ جو حربہ (چھوٹا نیزہ) چلانے میں مشہور تھا اور بہت کم خطا کرتا تھا۔ جبیر نے اس سے کہا کہ تم بھی لڑائی میں چلو۔ اگر حمزہؓ کو تم نے قتل کر دیا تو میں تم کو آزاد کر دوں گا۔ تاریخ الامت ص۱۳۰

کافروں نے بدر کے کینہ کے جوش میں شہیدوں کے ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالے تھے۔ ابوسفیانؓ کی بیوی ہندہؓ نے سید الشہداء حضرت حمزہ کی نعش کا مثلہ کیا۔ یعنی ناک کان وغیرہ کاٹ ڈالے آنکھیں نکالیں، اور سینہ چاک کر کے جگر کا ایک ٹکڑا منہ میں ڈال کر چبایا۔ لیکن نگل نہ سکی۔ اُسے اگل دیا۔ اسی وجہ سے اس کا لقب جگر خوارہ رکھا گیا۔ تاریخ الامت ص۱۳۸

علامہ شبلی مرحوم سیرت النبی میں رقم طراز ہیں۔

حضرت حمزہؓ نے ہندؓ کے باپ عتبہ کو بدر میں قتل کیا تھا۔ جبیر بن مطعم کا چچا بھی حضرت حمزہؓ کے ہاتھ سے مارا گیا تھا۔ اس بناء پر ہندؓ نے وحشیؓ کو جو جبیر بن مطعم کا غلام تھا۔ اور حربہ

اندازی میں کمال رکھتا تھا۔حضرت حمزہؓ کے قتل پر آمادہ کیا۔اور یہ اقرار ہوا کہ اس کارگذاری کے صلہ میں وہ آزاد کر دیا جائے گا۔سیرت النبی ص ۳۷۱ ج ۱

آگے چل کر لکھتے ہیں۔

خاتونان قریش نے انتقام بدر کے جوش میں مسلمانوں کی لاشوں سے بھی بدلہ لیا۔ان کے ناک کان کاٹ لئے۔ہندؓ (حضرت امیر معاویہ کی ماں) نے ان کا ہار بنایا۔اور اپنے گلے میں ڈالا۔حضرت حمزہؓ کی لاش پر گئی۔اور ان کا پیٹ چاک کر کے کلیجہ نکالا اور چبا گئی۔لیکن گلے سے نہ اتر سکا۔اس لئے اگل دینا پڑا۔تاریخوں میں ہند کا لقب جو جگر خوارہ لکھا جاتا ہے۔وہ اسی بناء پر لکھا جاتا ہے۔سیرت النبی ص ۳۸۳ ج ۱

ایک اور مقام پر شبلی لکھتے ہیں۔

وحشیؓ جو ایک حبشی غلام تھا۔اور جس سے جبیر بن مطعم اس کے آقا نے وعدہ کیا تھا کہ اگر وہ حضرت حمزہؓ کو قتل کر دے تو آزاد کر دیا جائے گا۔سیرت النبی ص ۳۷۶ ج ۱

حکیم عبدالرؤف داناپوری تحریر کرتے ہیں۔

ابن اسحاقؒ کہتے ہیں کہ ہندہ بنت عتبہ اور اس کے ساتھ کی عورتوں نے شہدائے اُحد کا مثلہ کیا۔اُن کے کان اور ناک کاٹ کر ان کا ہار بنایا۔اور اپنا ہار ہندہؓ نے خوشی میں وحشیؓ حبشی قاتل حمزہؓ کو دے دیا۔حضرت حمزہؓ کا پیٹ چاک کر کے ان کا جگر نکال کر چبایا۔اور بہت سے فخریہ اشعار پڑھے۔اصح السیر ص ۱۵۳

ان تمام تحریرات کا مطالعہ کرنے کے بعد جو امور ہمارے سامنے آتے ہیں۔وہ حسب ذیل ہیں۔

۱۔حضرت حمزہؓ کے قاتل وحشیؓ بن حرب ہیں۔

۲۔یہ جبیر بن مطعم کے غلام تھے۔

۳۔حضرت حمزہؓ کے قتل پر ان کی آزادی موقوف تھی۔

۴۔حضرت حمزہؓ کے قتل پر بقول بعض مورخین اسے جبیر بن مطعم نے آمادہ کیا تھا۔اور

بقول بعض ہندؓ بنت عتبہ نے

۵۔ بقول بعض مؤرخین ہند نے اس سے وعدہ کیا تھا۔ کہ اگر تو حمزہ کو قتل کر دے گا تو میں تجھے آزاد کر دوں گی۔ جب کہ وہ ہندؓ کے غلام نہ تھے۔ بلکہ جبیر بن مطعم کے غلام تھے۔ اور جبیر کے ہوتے ہوئے ہندؓ کو یہ اختیار ہی نہ تھا کہ وہ اسے آزاد کر سکیں یا آزادی کا وعدہ کر سکیں۔

۶۔ بعض مؤرخین اس کے دعویدار ہیں کہ حضرت حمزہؓ کے قتل پر وحشیؓ کو ان کے مالک جبیر بن مطعم نے آمادہ کیا تھا۔ شبلی نے کسی جگہ جبیر کا نام لیا اور کسی جگہ ہند کا۔

۷۔ اس جنگ میں قریش کی متعدد عورتیں شریک تھیں۔

۸۔ سب عورتوں نے لاشوں کا مثلہ کیا تھا۔ اور ناک کان کاٹ کر اُن سے اپنے گلے کے ہار بنائے تھے۔ لیکن ہندؓ کے علاوہ کسی عورت کے بارے میں یہ ذکر نہیں کیا گیا کہ فلاں عورت نے فلاں شخص کا مثلہ کیا تھا۔ آخر تمام مؤرخین کو پورے لشکر میں صرف ایک ہندؓ ہی کیوں نظر آتی رہیں۔ بقیہ عورتوں کے بارے میں تفصیل کیوں بیان نہیں کی گئی۔ حالانکہ بقیہ عورتیں بھی قریش کی متعدد عورتیں تھیں۔ مثلاً اُم الحکیمؓ بنت الحارث بن ہشام اور فاطمہؓ بنت الولید بن المغیرہ۔

۹۔ اس جنگ میں بنو مخزوم کے متعدد مشہور افراد شریک تھے۔ مثلاً عکرمہؓ بن ابی جہل، خالدؓ بن الولید اور حارث بن ہشام۔ ان میں سے عکرمہ اور حارث کی بیویاں بھی ساتھ تھیں، یہ سب ابوجہل کا خاندان تھا۔ لیکن ان میں سے کسی فرد کے بارے میں ہمارے مؤرخین نے یہ تفصیلات بیان نہیں کیں

۱۰۔ ہند کو جگر خوارہ کا لقب دیا گیا۔ یہ لقب کون سے مؤرخین نے دیا ظاہر ہے کہ یہ لقب کسی مجوسی ایرانی کا عطا کردہ ہوگا۔ کیونکہ لفظ جگر خوارہ فارسی زبان کا لفظ ہے۔ یہ عربی زبان کا لفظ نہیں۔ اور نہ آج تک کسی عربی کی کتاب میں اُن کا یہ لقب پایا جاتا ہے۔

۱۱۔ عبدالرؤف دانا پوری نے یہ تصریح کی ہے کہ یہ روایت ابن اسحاق کی ہے۔ اور حقیقت حال بھی یہی ہے کہ ابن اسحاق کے علاوہ اسے کوئی روایت نہیں کرتا۔

۱۲۔ تمام مؤرخین اس بات پر متفق ہیں کہ جب وحشیؓ حضور کی خدمت میں فتح مکہ کے بعد

حاضر ہوا تو آپ نے اس سے فرمایا تھا کہ کیا تو اپنا چہرہ مجھ سے نہیں چھپا سکتا؟ جس کے بعد وحشیؓ کبھی حضور کے سامنے نہیں گئے اور یہ سب کچھ حضرت حمزہؓ کے قتل کے باعث ہوا۔

۳۔ لیکن ہندؓ جنہوں نے وحشیؓ کو قتل پر آمادہ کیا، حضرت حمزہؓ کا مثلہ کیا، اور ان کا جگر چبایا، حضور نے ان کے ساتھ یہ سلوک نہیں فرمایا۔ آخر اس کی وجہ کیا ہے؟

۴۔ جبیرؓ بن مطعم جو وحشیؓ کے مالک تھے اور جس نے حضرت حمزہؓ کے قتل پر اسے آمادہ کیا تھا۔ اور پھر اس خوشی میں اس کو آزاد کیا۔ ان کے ساتھ بھی یہ سلوک نہیں کیا گیا بلکہ انہیں بھی معاف کر دیا گیا۔

ظاہر ہے کہ ان دو مختلف فیصلوں کی اس کے علاوہ کوئی اور وجہ ممکن نہیں کہ یہ سب بعد کی اختراعات ہیں۔ اگر ایسا واقعہ پیش آتا تو حضور کے علم میں ضرور آتا۔ اور حضور قطعاً یہ پسند نہ کرتے کہ ہندہؓ کا چہرہ دیکھ کر بھی نہیں۔ لیکن ان کے برعکس حضور نے ہندہؓ کے ساتھ جو سلوک کیا وہ ہم صحیح بخاری کے حوالے سے پیش کریں گے۔

اس سے قبل کہ ہم اصل حقیقت پر سے پردہ اٹھائیں۔ یہ بتانا بھی ضروری سمجھتے ہیں۔ کہ ہمارے یہ تمام اردو کے سیرت نگار ابھی تو اتنا بھی نہیں جانتے کہ حضرت ابوسفیانؓ کی زوجہ کا صحیح نام کیا ہے؟ ان سب نے ان کا نام ہندہ لکھا ہے۔ حالانکہ ان کا نام ہندؓ ہے۔ یعنی اس کے آخر میں ہ نہیں ہے۔ ہاں شبلی نے نام صحیح لیا ہے۔ جن حضرات کو نام تک کی خبر نہ ہو۔ اور وہ اتنی معمولی سی بات کی بھی تحقیق نہ کر سکیں۔ ان سے کسی تحقیق اور صحیح بات کی امید رکھنا لایعنی سی بات ہے۔

یہ کہانی ابن ہشام نے اپنی سیرت میں اور ابن جریر طبری نے اپنی تاریخ میں محمد بن اسحاق سے نقل کی ہے۔ محمد بن اسحاق کا تفصیلی حال ہم اوپر پیش کر چکے ہیں۔ کہ وہ متعدد ائمہ حدیث کے نزدیک کذاب منکر ابی، مدلس اور مجوسی شیعہ تھا۔ اس سے اس روایت کو نقل کرنے والا مورخ سلمۃ الابرش اور سلمہ سے نقل کرنے والا مورخ محمد بن حمید ہے۔ ان دونوں کا تفصیلی حال

بھی ہم پہلے پیش کر چکے ہیں کہ یہ دونوں افراد قطعاً ناقابل اعتبار ہیں۔

ابن اسحاق نے یہ دعویٰ کیا ہے کہ اس نے یہ روایت صالح بن کیسان سے سُنی۔ صالح چھوٹے درجے کے تابعی ہیں۔ اگرچہ ثقہ ہیں۔ لیکن [illegible]ھ کے بعد پیدا ہوئے۔ اور ۱۴۰ھ میں ان کا انتقال ہوا۔ یہ تقریباً محمد بن اسحاق سے کچھ بڑے ہیں انہوں نے اوپر کی کوئی سند بیان نہیں کی۔ حالانکہ جنگ احد صالح بن کیسان کی پیدائش سے ستر سال قبل واقع ہوئی تھی۔ اُن کا قول اس سلسلہ میں کیا حیثیت رکھتا ہے۔ وہ خود چشم دید گواہ نہیں۔ بلکہ ممکن ہے کہ ابن اسحاق نے یہ کہانی وضع کر کے اُن کی جانب منسوب کی ہو۔ اور اس طرح ان کو بدنام کیا ہو۔ اگر واقعتاً انہوں نے یہ روایت بیان بھی کی تب بھی روایت منقطع ہوئی۔ اور منقطع روایت قابل قبول نہیں ہوتی۔ اور جب ہم اس پر غور کرتے ہیں کہ صالح کے علاوہ بقیہ تمام رواۃ سب ایرانی ہیں۔ اور تمام محدثین کے نزدیک ناقابل اعتبار ہیں تو اس کہانی کی کیا پوزیشن باقی رہتی ہے؟

اس لحاظ سے بھی اگر اس داستان پر غور کیا جائے کہ صالح کے علاوہ اسے کوئی بیان نہیں کرتا۔ پھر صالح سے ابن اسحاق کے علاوہ کوئی نقل نہیں کرتا۔ ابن اسحاق سے سلمۃ الابرش کے علاوہ کسی نے اسے نقل نہیں کیا۔ سلمہ سے محمد بن حمید رازی کے علاوہ اسے کوئی نقل نہیں کرتا۔ اور محمد بن حمید سے ابن جریر کے علاوہ اسے کوئی نقل کرنے والا نہیں۔ اور ابن جریر کا انتقال ۳۱۰ھ میں ہوا۔ گویا [illegible]ھ کے بعد سے اس کہانی کی ابتدا ہوئی اور ۳۱۰ھ تک ہر زمانہ میں صرف ایک فرد واحد کے سینہ میں یہ کہانی محفوظ رہی۔ اور اس فرد واحد کے علاوہ کوئی اس کہانی کو جانتا تک نہ تھا۔ حالانکہ اگر واقعہ پیش آتا تو اول تو اس کے متعدد چشم دید گواہ ہوتے۔ پھر جوں جوں زمانہ بڑھتا جاتا۔ لوگوں کی زبان پر یہ عام ہوتا جاتا۔ یہ اس امر کا ثبوت ہے کہ یہ خالص مجوسی کہانی تھی۔ جسے شروع دور کے لوگوں نے قبول نہیں کیا تھا۔ اسے قبولیت تو اُس وقت حاصل ہوئی جب لوگ آنکھیں بند کر کے ابن اسحاق اور طبری کی روایات پر ایمان لے آئے۔ اور پھر بعد کے لوگوں نے مکھی پر مکھی مارنی شروع کر دی۔ ورنہ [illegible]ھ سے پہلے تو اس داستان سے کوئی

واقف ہی نہ تھا۔ پھر ۳۲۱ تک یہ داستان علم باطن کی طرح ایک راز رہی۔ جسے صرف ایک مجوسی دوسرے مجوسی کو تلقین کرتا رہا۔ چونکہ یہ تمام کام تقیہ بازوں نے انجام دیئے تھے۔ لہٰذا سنّی جو ہمیشہ سے اور ہر معاملہ میں ان سے دھوکہ کھاتا رہا، اس نے اس مقام پر پہنچ کر حضرت ابوسفیانؓ، حضرت ہندؓ اور حضرت امیر معاویہؓ پر کیچڑ اُچھالنی شروع کر دی۔ اور یہ بھی نہ سوچا کہ یہ سب حضرات مشرف با سلام ہو چکے تھے۔ اور یہ سب صحابہ میں داخل ہیں۔ اور تمام اہل سنت والجماعت کا اس پر اتفاق چلا آیا ہے کہ جس شخص نے حالتِ اسلام میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت کی، اور اسلام ہی پر اس کا انتقال ہوا۔ اُس کا یہ دیدار رسول اتنا بڑا عمل ہے کہ پوری اُمت کے تمام اعمال اس کے سامنے ہیچ ہیں۔ پھر حضرت ہندؓ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ساس بھی ہیں، ان کی صاحبزادی ام حبیبہؓ تمام اُمت کی ماں ہیں۔ اور ان کے بھائی امیر معاویہؓ تمام امت کے ماموں ہیں۔ لیکن آج کل کے سنیّوں کو صرف پنج تن یاد ہیں۔ باقی افراد کی انہیں خبر بھی نہیں۔

یہ سب حرکات اس لئے عمل میں لائی گئی کہ حضرت عمرؓ کے زمانہ میں ایران پر لشکرکشی شروع ہوئی۔ اور ایران کا کچھ حصہ فتح ہوا، حضرت عثمانؓ کے زمانہ میں جو اموی تھے، ایران کا بیشتر علاقہ اسلام کے زیرنگیں آیا۔ جو بچا کھچا باقی تھا۔ وہ ولید بن عبدالملک اموی اور سلیمان بن عبدالملک اُموی کے دور میں مفتوح ہوا۔ جس کے نتیجے میں ہزارہا سال پُرانے آتش کدے سرد ہوئے۔ جس سے ایرانیوں کی آتش انتقام بھڑک اُٹھی، اور ان میں سے ایک ایک فرد کے سینہ میں غضب و انتقام کا آتش کدہ سلگ اُٹھا۔ اور بنوامیہ کا کوئی فرد ایسا باقی نہ بچا۔ جس پر الزام تراشی نہ کی گئی ہو، اور جسے کسی نہ کسی واقعہ میں ملوث نہ کیا گیا ہو۔ اسی بے سروپا پروپیگنڈے کے نتیجے میں خلافت بنی امیہ ختم ہوئی۔ اور

یہ ... تہ۔ لیکن یہ صرف اک خود فریبی ہے کہ بنوعباس کو اقتدار حاصل ہوا۔ ورنہ

... عباس کے کاندھوں پر رکھ کر بندوق چلائی۔

در برامکہ کون ہیں۔ ہارون الرشید نے

... فت کو دو بیٹوں پر تقسیم کر کے یعنی مامون

اور امین میں از سرِ نو عربوں اور ایرانیوں کو ٹکرا دیا۔ اور مامون نے ایرانیوں کے بل بوتے پر بغداد پر قبضہ کیا، امین الرشید اور عربوں کا قتل عام کیا۔ جس سے عرب طاقت ہمیشہ کے لئے دفن ہو گئی جب مامون کے مرنے کے بعد معتصم باللہ برسرِ اقتدار آیا۔ تو اس نے ایرانیوں کی قوت ختم کرنے کے لئے ترکوں کا سہارا تلاش کیا۔ اور پھر بغداد کی سرزمین پران دونوں قوتوں کے ٹکراؤ سے اس مشہورِ عام اسلامی خلافت کا جو حال ہوا۔ اسے مختصر الفاظ میں اس طرح بیان کیا جا سکتا ہے کہ بعض اوقات ایک ایک دن میں دو دو خلیفہ بنائے گئے۔ صبح کو ترکوں نے ایک خلیفہ کے ہاتھ پر بیعت کی، اور شام کو ایرانیوں نے اسے قتل کر کے دوسرا خلیفہ بنا دیا۔ دور دراز کے تمام امراء خود آزاد ہو گئے۔ اور اپنی اپنی ڈفلی بجانے لگے۔ آخر یہ غزنہ، غور خوارزم، سلجوقیہ اور ایوبیہ وغیرہ کیسے اقتدار میں آئے۔ یہ سب ایرانی کرشمہ سازیاں ہیں۔ جن کی بنیاد ان بے مروپا پیگنڈے سے پڑی تھی۔ جب تک بنو امیہ اقتدار میں رہے تو خالص عرب حکومت تھی۔ اور کوئی امیر اور کوئی گورنر اور کوئی بڑے سے بڑا سالار نہ آزاد تھا۔ اور نہ اپنی مرضی کا مختار تھا۔ خواہ وہ موسیٰ بن نصیر ہو یا قتیبہ بن مسلم ہو۔ گویا مرکز مضبوط تھا۔ اور وحدتِ ملت قائم تھی لیکن جب بنو عباس کی نام نہاد حکومت قائم ہوئی۔ تو اسلام کی مرکزیت اور وحدتِ ملت کا وجود ہی مٹ گیا۔ اور اس طرح یہ ایرانی سازش کامیاب ہوئی۔

ایران کی اس سازش کے ذریعہ سب سے پہلے امیر المومنین حضرت عمرؓ شہید ہوئے پھر امیر المومنین حضرت عثمانؓ کو شہید کیا گیا۔ یہ ایرانی ہی تھے جنہوں نے جمل و صفین برپا کرائی۔ پھر حضرت حسینؓ کو کھڑا کر کے انہیں خود شہید کیا۔ پھر زید بن علی بن حسین کو بنو امیہ کے مدِ مقابل کھڑا کر کے خود راہِ فرار اختیار کی۔ اسکی تائید اس خط سے بھی ہوتی ہے جو زید بن علی بن حسین سے لکھوایا گیا۔

اقتلوا کل العرب ہر عرب کو قتل کر دو

غور کیجئے کہ ایک عربی النسل خالص قریشی اہل عرب کے قتل کا حکم دے رہا ہے۔

آخراس کے پس پردہ کون سی قوت اور کون سی سازش کارفرما ہے؟ کاش کوئی مورخ اس پر غور کرتا۔ اسی لئے ہم یہ سمجھنے پر مجبور ہیں کہ آج ایران و عراق کی جو جنگ ہے۔ وہ بھی عرب و ایران کی جنگ ہے۔ یا بالفاظ دیگر سنیت اور شیعیت کی جنگ ہے۔ اس جنگ میں ایران کی حمایت اُس پرانی سازش کی حمایت ہے۔ جو حضرت عمرؓ کی شہادت سے وجود میں آئی تھی۔ اور جس نے چودہ سو سال تک ہمیں تباہی کے غار میں دھکیلا ہے۔ وہ تاریخ جسے ہم آج تاریخ اسلام کہتے اور جس پر ہم فخر کرتے ہیں۔ وہ ان ہی سازشیوں کی تیار کردہ ہے۔ اس کے اولین مصنف یا عجمی النسل ہیں یا سبائی ذہن رکھتے ہیں۔ مثلاً محمد بن اسحاق، واقدی، کلبی، سدی، سلمۃ الابرش، حمید رازی، ابو مخنف، سری، ابن جویر طبری اور مسعودی وغیرہ۔ اور جو حضرات سنی ہیں۔ وہ بھی ان ہی کے خوشہ چیں ہیں۔ مثلاً ابن ہشام، ابن سعد اور بلاذری وغیرہ۔ ہمارے لئے یہ تاریخ باعث فخر نہیں، بلکہ باعث افسوس ہے۔

اس تاریخ سے ہمیں سوائے اس کے کیا حاصل ہوا کہ ہم نے اُن صحابہؓ کرام کو اپنا ہدف بنالیا۔ جن کی خوبیوں سے قرآن معمور ہے۔ اور یہ وہی حضرات ہیں۔ جن کے ذریعہ ہم تک قرآن اور سنت رسول پہنچی ہے۔ یہی حضرات ہیں جو ان دونوں امور کے گواہ ہیں۔ اور جب یہ گواہ ناقابل اعتبار قرار پائیں گے۔ تو جس شئے کی یہ گواہی دے رہے ہیں اس کا مقام کیا ہوگا۔ لِلّٰہ کچھ تو سوچئے کہ آپ کے پاس نہ قرآن باقی رہے گا اور نہ سنتِ رسول۔ اور یہی مجوسی برادری کا اصل مقصود ہے۔ کیونکہ ان کے نزدیک اصل قرآن تو امام غائب لے کر ایسے غائب ہوئے کہ ان کا آج تک ہمیں تو کیا پتہ چلتا۔ انہوں نے تو اپنے ہم نواؤں کو بھی خبر نہ ہونے دی۔ اور پوری امت مجوسیہ کو اصل قرآن سے بھی محروم کر گئے۔ کتنی گہری سازش ہے۔ اسے تو سوچنے کے لئے بھی عمر نوح ہونی چاہیئے۔

آمدم بر سر مطلب۔ جنگ اُحد کے واقعات کا جہاں تک تعلق ہے تو وہ صحابہؓ کرام جو اس جنگ میں شریک تھے۔ اُن میں سے کوئی ایک فرد بھی اس واقعہ کی جانب اشارۃً تک نہیں کرتا

رہا فریقِ مخالف کا سوال۔ اُن میں متعدد افراد ایسے پائے جاتے ہیں جو بعد میں مشرف باسلام ہوئے۔ مردوں میں بھی اور عورتوں میں بھی۔ مثلاً حضرت ہندؓ، حضرت ام حکیمؓ بنت الحارث بن ہشام اور فاطمہؓ بنت الولید بن المغیرہ اور مردوں میں حضرت ابوسفیانؓ، حضرت عکرمہؓ بن ابی جہل، حضرت حارثؓ بن ہشام، حضرت خالدؓ بن الولید، حضرت عمروؓ بن العاص، حضرت صفوانؓ بن امیہ اور وحشیؓ بن حرب۔ یہ سب وہ حضرات ہیں جو جنگِ اُحد میں اسلام کے مقابل بن کر آئے تھے۔ اور بعد میں مشرف باسلام ہوئے۔ یہ جنگ اُحد کے چشم دید گواہ ہیں۔ لیکن اُن میں سے کوئی شخص بھی حضرت ہندؓ کی یہ کہانی کہ انہوں نے حضرت حمزہؓ کا جگر چبایا۔ یا انہوں نے حضرت حمزہؓ کے قتل پر وحشی کو آمادہ کیا۔ یہ واقعہ کوئی بیان نہیں کرتا۔ ہاں ابوسفیانؓ نے اس بات کا اقرار ضرور اسی وقت کیا تھا کہ ہمارے کچھ افراد نے لاشوں کا مثلہ کیا ہے۔ لیکن میں نے نہ تو اس کا حکم دیا تھا۔ اور نہ یہ بات مجھے بری معلوم ہوئی۔ یہ اعلان ابوسفیانؓ نے جنگ اُحد کے خاتمہ پر کیا تھا۔ یہ الفاظ تو اس امر کی شہادت دے رہے ہیں کہ مثلہ کرنے والوں میں مرد بھی شامل تھے۔ یہ کام صرف عورتوں نے انجام نہیں دیا تھا۔ لیکن ایسا کرنے والے کون کون افراد تھے، اور کس عورت نے کس کی لاش کے ساتھ یہ نازیبا حرکت کی تھی؟ ان شاہدوں میں سے کوئی کچھ بیان نہیں کرتا۔ ہاں حضرت حمزہؓ کے قتل کا تفصیلی واقعہ خود قاتل نے یعنی وحشیؓ بن حرب نے بیان کیا ہے جو صحیح بخاری میں بالتفصیل موجود ہے۔

امام بخاری نے جعفر بن عمرو بن امیۃ الضمری سے نقل کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ میں عبیداللہ بن عدی بن الخیار کے ساتھ سفر کے لئے چلا۔ جب ہم حمص پہنچے تو مجھ سے عبیداللہ بن عدی نے سوال کیا کیا تو وحشیؓ سے ملاقات کرنا چاہتا ہے؟ ہم اُن سے حضرت حمزہؓ کے قتل کے بارے میں دریافت کریں گے، میں نے جواب دیا ضرور۔

ان دنوں وحشیؓ نے حمص میں سکونت اختیار کر رکھی تھی۔ ہم نے ایک شخص سے وحشیؓ کے مکان کے بارے میں دریافت کیا۔ ہمیں بتایا گیا کہ وہ سامنے اپنے مکان کے سائے میں بیٹھا ہے۔

ہم نے اسے دیکھا تو شکل و صورت سے وہ بغیر بالوں کا ایک مشکیزہ معلوم ہوتا تھا۔ ہم اس کے پاس پہنچ کر تھوڑی دیر کھڑے رہے۔ پھر ہم نے اسے سلام کیا۔ اس نے ہمارے سلام کا جواب دیا۔ راوی کا بیان ہے کہ عبید اللہ بن عدی بن الخیار نے اپنے سر اور چہرے پر عمامہ لپیٹ رکھا تھا۔ کہ اس طرح وحشی رضؓ کو اُن کی دو آنکھوں اور پاؤں کے سوا کچھ نظر نہ آتا تھا۔

عبید اللہ نے وحشی رضؓ سے دریافت کیا کہ تم مجھے پہچانتے ہو؟ وحشی رضؓ نے نظر اُٹھا کر عبید اللہ کی جانب دیکھا۔ پھر کہا واللہ نہیں۔ ہاں میں اتنا جانتا ہوں کہ عدی رضؓ بن الخیار نے ایک عورت سے شادی کی تھی۔ جسے ام القتال بنت ابی العیص کہا جاتا تھا۔ اس کے بطن سے عدی بن الخیار کا ایک لڑکا پیدا ہوا۔ میں نے مکہ میں اس لڑکے کے لئے ایک دائی تلاش کی۔ اور اس کی والدہ کے ساتھ اس بچہ کو لے جا کر اس دایہ کے سپرد کیا۔ میں تیرے قدموں کی جانب دیکھ رہا ہوں، اور میرا اندازہ ہے کہ تو وہی بچہ ہے۔

عبید اللہ نے اپنے چہرے سے کپڑا ہٹا دیا۔ اور وحشی رضؓ سے دریافت کیا کہ کیا آپ ہمیں حضرت حمزہ رضؓ کے قتل کے بارے میں بتائیں گے؟ وحشی رضؓ نے کہا ہاں بلاشبہ۔

بات یہ تھی کہ حضرت حمزہ رضؓ نے بدر میں طعیمہ رضؓ بن عدی بن الخیار کو قتل کر دیا تھا۔ میرے آقا جبیر رضؓ بن مطعم رضؓ نے مجھ سے کہا کہ اگر تو حمزہ رضؓ کو قتل کر دے تو تو آزاد ہے۔

پس جب لوگ عینین کے سال جنگ کے لئے نکلے اور عینین احد کے پہاڑوں میں سے ایک پہاڑ ہے۔ اس کے سامنے احد کی وادی ہے۔ میں بھی لوگوں کے ساتھ جنگ کے لئے نکلا۔ جب لڑنے والوں نے اپنی اپنی صفیں درست کرلیں۔ تو سبا بن عبد العزیٰ صف سے باہر نکلا اور اس نے کہا ہے کوئی مقابلہ کرنے والا؟ وحشی رضؓ کا بیان ہے کہ مد مقابل سے حمزہ رضؓ بن عبد المطلب نکلے اور بولے کہ اے ام انمار کے بیٹے جو عورتوں کی ختنہ کیا کرتی تھی۔ کیا تو اللہ اور اس کے رسول کے ساتھ جنگ کرتا ہے؟ پھر حضرت حمزہ رضؓ نے اس پر حملہ کیا۔ تو

وہ ایسا ہوگیا جیسی گزری ہوئی کل (یعنی گذشتہ کل کی طرح وہ دنیا سے ناپید ہوگیا۔

وحشی رضؓ نے کہا میں ایک چٹان کے نیچے حمزہ رضؓ کی گھات میں چھپا تھا۔ جب وہ میرے قریب سے گزرے تو میں نے اپنا حربہ اُن پر پھینکا۔ وہ حربہ اُن کی ناف میں لگ کر پشت سے باہر نکل گیا۔ پس میری اُن کے ساتھ یہ آخری ملاقات تھی۔

جب لوگ میدان سے واپس آئے تو میں بھی ان کے ساتھ واپس چلا آیا۔ اور مکہ میں ٹھہر گیا (یعنی آزادی کے بعد) یہاں تک کہ مکہ میں اسلام پھیل گیا۔ تو میں طائف کی طرف نکل گیا۔ جب طائف والوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف قاصد روانہ کئے، تو مجھ سے کہا گیا تھا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم قاصدوں سے تعرض نہیں فرماتے، لہٰذا میں بھی ان قاصدوں کے ساتھ مل کر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا۔

آپ نے جب مجھے دیکھا تو فرمایا کیا تو وحشی رضؓ ہے؟ میں نے عرض کیا جی ہاں۔ آپ نے استفسار کیا۔ کہ کیا تو نے ہی حمزہ رضؓ کو قتل کیا تھا؟ میں نے عرض کیا جو خبر آپ تک پہنچی ہے۔ وہ درست ہے۔ آپ نے فرمایا۔ کیا تم اپنے چہرے کو مجھ سے چھپا سکتے ہو؟ (یعنی میرے سامنے نہ آیا کرو)۔ وحشی رضؓ کہتے ہیں پھر میں وہاں سے چلا آیا۔

اس کے بعد جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات ہوئی۔ اور مسیلمۃ الکذاب نے خروج کیا۔ تو میں نے دل میں سوچا۔ میں اب مسیلمہ کے مقابلہ کے لئے ضرور نکلوں گا۔ ہوسکتا ہے کہ میں اسے قتل کر سکوں۔ اور حمزہ رضؓ کے قتل کا اس سے بدلہ ہو جائے۔ یہ سوچ کر میں لوگوں کے ساتھ جنگ کے لئے نکلا۔ اچانک میں نے (میدانِ جنگ) میں ایک آدمی کو دیکھا کہ وہ ایک دیوار کی شق میں کھڑا ہے۔ گویا وہ ایک سیاہی مائل اونٹ ہے۔ اس کے بال بکھرے ہوئے تھے۔ میں نے اسے اپنا حربہ مارا۔ میں نے یہ حربہ اس کے سینہ کے درمیان مارا۔ حتیٰ کہ وہ حربہ اس کے دونوں شانوں کے درمیان سے پشت پر نکل گیا۔ پھر مسیلمہ کی طرف انصار مدینہ میں سے ایک شخص بڑھا اور اس کے سر پر تلوار ماری۔

عبداللہ بن الفضل کا بیان ہے کہ مجھے سلیمان بن لیار نے یہ بات بتائی، اور انہوں نے حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے سُنی۔ انہوں نے فرمایا۔ کہ ایک لڑکی نے جو مکان کی چھت پر کھڑی تھی۔ چلا کر کہا۔ امیرالمؤمنین (مسیلمہ کذاب) کی قسم اُن کو تو ایک حبشی غلام نے قتل کر دیا۔ بخاری ص۵۸۳ ج ۲

یہ ہے وہ اصل واقعہ جو قاتل خود اپنی زبان سے بیان کر رہا ہے۔ جسے اقرارِ جُرم کہا جائے تو بجا ہے۔ اور یہ بیان بھی اس شخص سے کر رہا ہے۔ جس کے بھائی کے قصاص میں حضرت حمزہؓ کی شہادت عمل میں آئی۔ اس واقعہ سے جن جن امور کی نشاندہی ہوتی ہے۔ وہ حسب ذیل ہیں۔

۱۔ وحشیؓ ابن حرب جبیرؓ بن مطعم کا غلام تھا۔ اس نے اسے حضرت حمزہؓ کے قتل پر آمادہ کیا تھا۔ اور اس انعام کا وعدہ کیا تھا کہ اگر یہ انہیں قتل کرے گا تو آزاد کر دیا جائے گا۔ اس سے یہ امر تو واضح ہو گیا کہ اس قتل میں حضرت ہندؓ کا کوئی ہاتھ نہیں۔ نہ انہوں نے وحشیؓ کو قتل پر آمادہ کیا۔ اور نہ وحشیؓ کی آزادی حضرت ہندؓ کے ہاتھ میں تھی۔ اگر ابن اسحاق آزادی کے علاوہ کوئی اور شرط بیان کرتا تو شاید اس پر غور کیا جاتا۔ لیکن اس نے ایک ایسی شرط بیان کی جو حضرت ہندؓ کے قطعاً ہاتھ میں نہ تھی۔ اور وحشیؓ کا یہ اقبالِ جُرم اور اس کی وجہ، کھل کر اس بات کی تردید کر رہی ہے کہ حضرت ہندؓ نے اس سے کوئی بات نہ کی تھی۔

۲۔ اگر آزادی کے علاوہ اسے کوئی اور انعام دیا جاتا تو وحشیؓ اسے ضرور بیان کرتا۔ اس سے اس بات کا بھی رد ہو گیا کہ حضرت ہندؓ نے اپنے گلے کا ہار اتار کر اسے بطور انعام دیا تھا۔ اگر ایسا ہوا تھا تو وحشیؓ کو اس کے چھپانے کی کوئی ضرورت نہ تھی۔

۳۔ وحشیؓ ابتدائے جنگ سے آخر تک کفار کے ساتھ رہا۔ اور ان ہی کے ساتھ مکہ واپس گیا۔ وہ ناک کان کے ہار بنانے اور کلیجہ چبانے کی کوئی کہانی بیان نہیں کرتا۔

۴۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے وحشیؓ کا اپنے سامنے آنا پسند نہیں فرمایا۔

۵۔ قتلِ حمزہؓ میں بقول مورخین تین افراد برابر کے شریک ہیں۔ ایک وحشیؓ جو قاتل ہے۔

دوسرا جبیرؓ بن مطعم جس نے قتل پر آزادی کا وعدہ کیا۔ تیسری ہندؓ بنت عتبہ جنہوں نے ناک کان کاٹے اور کلیجہ چبایا۔

۶۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے وحشیؓ کا سامنا آنا گوارا نہیں کیا۔ جبیرؓ بن مطعم کا جرم وحشیؓ کے مقابلہ پر کمتر تھا۔ لہٰذا فتح مکہ کے بعد نہ اُن سے تعرض کیا گیا۔ اور نہ اس قسم کی کوئی پابندی عائد کی گئی۔ لیکن مورخین نے حضرت ہندؓ پر جو فرد جرم عائد کی ہے۔ وہ تو قتل سے بھی زیادہ سنگین ہے۔ کیونکہ دوران جنگ تو آدمی قتل ہوتے ہی رہتے ہیں۔ اس جرم کی موجودگی میں ہونا تو یہ چاہیئے تھا کہ جب آپ مکہ میں فاتحانہ داخل ہوئے اور امن کا اعلان کیا تو اس صورت میں چند افراد کے قتل کا اعلان کیا گیا لیکن بجائے اس کے کہ ہندؓ کے قتل کا اعلان یا اظہار بیزاری کیا جاتا۔ اُن کے گھر کو دار الامن بنا دیا گیا اور مکہ میں داخلہ سے قبل ہی یہ اعلان کر دیا گیا۔

من دخل فی بیت ابی	جو شخص ابوسفیانؓ کے گھر داخل ہو گا
سفیان فهو امن	وہ مامون ہے۔

یہ اعلان خود اس امر کی شہادت ہے کہ حضرت حمزہؓ کے قتل سے حضرت ہندؓ یا ان کے خاوند ابوسفیانؓ کا کسی قسم کا کوئی تعلق نہیں۔ پھر جب ہندؓ اسلام لاتی ہیں۔ اور حضور عورتوں سے یہ وعدہ لیتے ہیں کہ اپنی اولاد کو قتل نہ کرو گی تو حضرت ہندؓ فرماتی ہیں۔

ربیناهم صغارا	ہم نے تو بچپن میں انہیں پرورش کیا تھا
و قتلتهم کبارا۔	بڑے ہونے کے بعد انہیں آپ ہی نے قتل کیا۔

بیعت کے بعد حضرت ہندؓ صاف اور واضح الفاظ میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے روبرو اپنی گذشتہ اور موجودہ قلبی کیفیت کا برملا اظہار کرتی ہیں اور کہتی ہیں۔

یا رسول اللہ ما کان علی	یا رسول اللہ روئے زمین پر جتنے خیمے
ظهر الارض من	والے بستے ہیں۔ ان میں آپ سے

اهل خباء احب الی ان یذلوا — زیادہ میری نظروں میں کوئی ذلیل نہ تھا

من اهل خبائك ثم ما اصبح — لیکن اب روئے زمین کے تمام بسنے

الیوم علی ظهر الارض اهل خباء — والوں میں مجھے آپ سے زیادہ کوئی

احب الی ان یعزوا من اهل خبائك — عزیز نہیں۔

اس سے زیادہ واضح الفاظ میں اقرار کیا ہو سکتا ہے لیکن نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کا جو جواب عطا فرمایا۔ وہ ان تمام سبائی داستان سرائیوں پر پانی پھیر رہا ہے۔ وہ تو ایسا جواب ہے جس پر ہزاروں زندگیاں قربان کی جاسکتی ہیں۔ حضور ارشاد فرماتے ہیں۔

وایضا والذی نفسی — اُس ذات کی قسم جس کے قبضہ میں میری

بیدہ - بخاری ص۵۳۹ ج۱ — جان ہے، میرا بھی یہی حال ہے۔

یعنی ایسی کوئی سرسری سی محبت نہیں جو کسی عام انسان سے ہو سکتی ہو۔ بلکہ اتنی شدید محبت ہے کہ حضور اس کا ذکر بھی قسم کھا کر کر رہے ہیں۔ انصاف سے سوچئے کہ کیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک جگر خوارہ کے ساتھ یہ سلوک فرما سکتے تھے، جب کہ آپ کو حضرت حمزہؓ سے جو محبت تھی اس کا عالم آپ اوپر دیکھ چکے ہیں۔ اگر ایسا کوئی حادثہ پیش آتا تو کیا آپ حضرت ہندؓ کے ساتھ اسی محبت سے پیش آتے۔ بلکہ کم از کم اُن کے ساتھ وہی سلوک کیا جاتا جو وحشیؓ بن حرب کے ساتھ کیا گیا۔ یہ برعکس سلوک اُس سبائی داستان کی تردید کے لئے کافی ہے۔ اور حضور کے اسی اقرارِ محبت سے حضرت ہندؓ کا جو مقام ظاہر ہوتا ہے۔ وہ عام عورتوں سے بہت بلند ہے۔ آپ نے فتح مکہ کے بعد ایمان لانے والوں میں سے کسی کے لئے یہ الفاظ نہیں فرمائے۔ حالانکہ آپ کے خاندان کے متعدد افراد بھی فتح مکہ کے بعد ایمان لائے تھے۔ مثلاً عقیلؓ بن ابی طالب، ام ہانیؓ، ابو سفیانؓ بن حارث، عتبہؓ بن ابی لہب اور معتبؓ بن ابی لہب وغیرہ لیکن یہ دولت کسی کو حاصل نہیں ہوئی یہ دولت حاصل ہوئی تو حضرت امیر معاویہؓ کی والدہ کو جن کا تعلق بنو امیہ سے ہے۔ اسی لئے امام بخاری نے اس واقعہ پر باب فضل ہند بنت عتبہ کی سرخی قائم کی ہے۔ یہ اللہ

کالاکھ لاکھ شکر ہے کہ امام بخاری رحمہ اللہ کا ذہن کسی مقام پر بھی سبائیت کو قبول نہ کر سکا۔ کاش ہمارے علماء بخاری کا ہی غور سے مطالعہ کر لیتے۔ تو بہت سی سبائی کہانیوں کی حقیقت کھل جاتی۔ لیکن جو لوگ بخاری کی صرف تلاوت کے قائل ہوں۔ وہ بخاری کو کیا سمجھیں گے۔

درِ خیبر اور فاتح خیبر

سب سے اول تو ہمارے قارئین یہ ذہن نشین کر لیں کہ یہ درِ خیبر وہ درۂ خیبر نہیں، جو صوبہ سرحد میں واقع ہے۔ اور جو پاکستان کو افغانستان سے ملاتا ہے۔ بلکہ یہ مدینہ منورہ کے قریب یہودیوں کا ایک علاقہ تھا۔ جس میں متعدد قلعے تھے۔ مثلاً صعب، سالم، قموص، نطاۃ قصارہ، شق اور مرلطہ وغیرہ۔ ان میں بیس ہزار سپاہی تھے۔ اور ان میں سب سے زیادہ محفوظ اور مضبوط قلعہ قموص تھا۔ اس مخصوص واقعہ کا تعلق قلعہ قموص سے ہے، خیبر نامی مکمل علاقے سے نہیں۔

خیبر کے کل دس قلعے تھے۔ سات ایک دائرے کے اندر اور تین الگ الگ تھے۔ نو قلعے مختلف صحابۂ کرام کے ہاتھوں پر فتح ہوئے۔ جن میں سے حضرت ابوبکرؓ، حضرت عمرؓ، حضرت زبیرؓ بن العوام، حضرت محمدؓ بن مسلمہ، حضرت سعدؓ بن عبادہ، اور حضرت خبابؓ بن المنذر خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔

قموص کا جب محاصرہ ہوا۔ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دردِ سر لاحق ہو گیا تھا۔ آپ خود معرکہ میں تشریف نہیں لے جاتے تھے۔ ورنہ بقیہ قلعوں پر جتنے حملے ہوتے، اُن میں اصل کمان نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ میں رہی۔ قلعہ قموص پر حملے کے وقت لشکر کی کمان

حضرت عمرؓ کے ہاتھ میں تھی۔ جیسا کہ ابن سعدؒ نے طبقات میں اس کا ذکر کیا ہے۔

جنگ کا ایک دستور یہ بھی تھا کہ جس غزوہ میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم خود تشریف لے جاتے تو اس کی کمان آپ اپنے ہاتھ میں رکھتے۔ اور علم دوسروں کو دیتے۔ اور جب کوئی سریہ روانہ فرماتے تو کمان کسی کے ہاتھ میں دیتے اور علم کسی اور کے ہاتھ میں سیرت کی تمام کتابوں کو ٹٹول کر دیکھ لیجیے۔ آپ کو ہر جگہ یہی صورت حال نظر آئے گی۔ ہاں غزوۂ موتہ کے وقت اس صورت پر عمل نہیں کیا گیا۔ کیونکہ یہ لشکر ایک دور دراز فاصلے پر شام کی جانب روانہ کیا گیا تھا۔ اور ایک نئی قوم یعنی عیسائیوں سے مقابلہ تھا۔ وہاں کے بارے میں یہ فیصلہ پہلے سے مشکل تھا کہ وہاں کیا صورت حال پیش آئے۔ لہٰذا حضرت زیدؓ بن حارثہ کو اس لشکر کا امیر بنا کر انہیں جھنڈا دے دیا گیا۔ اور ایک امیر ہونے کی حیثیت سے انہیں اختیار تھا کہ وہ خواہ کسی اور کو جھنڈا دیدیں۔ لیکن انہوں نے جھنڈا اپنے پاس رکھا۔ یہ ایک مستثنیٰ صورت تھی۔

غزوۂ موتہ کے علاوہ ہر غزوہ اور ہر سریہ میں اسی اصول پر عمل کیا گیا۔ کہ امیر لشکر کوئی اور ہوتا اور علمبردار کوئی اور۔ کیونکہ علمدار کا کام جنگ کرنا نہیں ہوتا۔ اس کا کام علم بلند رکھنا اور اس کی حفاظت کرنا ہوتا ہے۔ تاکہ لشکر اپنے علم کو دیکھ کر اپنے مقام پر ڈٹا رہے۔ جوں جوں لشکر آگے بڑھتا ہے۔ علم بھی آگے بڑھتا جاتا ہے۔ اُس دور میں خواہ کوئی بھی قوم ہو اسی اصول پر عمل کرتی تھی۔

آپ جنگ احد کا نظارہ کیجیے۔ کفار کی جانب سے سالار لشکر ابوسفیانؓ ہے۔ لیکن علم دوسروں کے پاس ہے۔ اور جب تمام علمبردار قتل ہو گئے تو ایک عورت نے علم سنبھال لیا۔ مسلمانوں کی جانب سے امیر لشکر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ اور علم حضرت مصعبؓ بن عمیر کے پاس ہے۔ یہی صورت حال آپ کو غزوۂ بدر اور فتح مکہ کے وقت نظر آئے گی۔

یہ بھی ساتھ ساتھ ذہن نشین کر لیجیے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جتنے غزوات میں تشریف لے گئے۔ اس میں کبھی بھی صرف ایک علم نہیں رہا ہے۔ بلکہ کم از کم تین علم رہے۔ جن میں سے ایک علم مہاجرین کا اور دو انصار کے۔ یعنی ایک قبیلہ اوس کا اور ایک قبیلہ خزرج کا۔

قارئین یہ بھی یاد رکھیں کہ عربی زبان میں علم بڑے جھنڈے کو کہتے ہیں۔ جو اس جگہ رہتا ہے جہاں سپہ سالار کھڑا ہو، بقیہ دستوں کو جو جھنڈے دیئے جاتے ہیں وہ عربی میں علم نہیں کہلاتے بلکہ انہیں "رایہ" کہتے ہیں۔ اتفاق سے جن احادیث میں حضرت علیؓ کو جھنڈا دینے کا ذکر آرہا ہے سب جگہ لفظ رایہ ہے، کسی جگہ علم نہیں۔ کیونکہ علم تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس تھا۔ ہمارے اُردو مورخین نے رایہ کو اپنی جہالت سے علم بنا دیا ہے۔ اور ہر جگہ علم لکھتے چلے گئے۔

یہ بھی ذہن میں رہے کہ اصول جنگ میں سے ایک اصول یہ ہے کہ ہمیشہ سے فتح و شکست کامیابی اور ناکامی حاکم اعلیٰ یا سالار لشکر کی جانب منسوب ہوتی ہے۔ سپاہی یا معمولی سردار خواہ کتنے ہی کارنامے دکھائیں۔ لیکن فتح سالار اعلیٰ کی جانب منسوب ہوگی۔

خیبر کے معاملہ میں سبائیوں نے حضرت علیؓ کی ذات کو اچھالنے کے لئے تمام اصولوں کو پامال کر دیا۔ نہ تو یہ بیان کیا کہ امیر لشکر کون تھا، نہ اس کی وضاحت کی کہ اوس وخزرج کے جھنڈے کس کے پاس تھے۔ اور نہ فتح خیبر کو سالار لشکر کی جانب منسوب کیا۔ بلکہ اس کے برعکس علم دار کو فاتح بنا کر دکھا دیا۔ ان امور کے علاوہ جو جو گل فشانیاں کی گئیں، وہ جُدا گانہ ہیں۔ ان تمام غلط باتوں سے یہ تاثر پیدا ہوا کہ خیبر صرف ایک قلعہ کا نام تھا جس کو حضرت علیؓ کے علاوہ ہر شخص فتح کرنے سے ناکام رہا تھا۔ یہ ان ہی کی بہادری اور مشکل کشائی تھی جو انہوں نے یہ مشکل حل کر دی۔

دوسرا اثر یہ مرتب ہوا کہ خیبر کے بقیہ قلعہ جات اور ان کے فاتحین نگاہوں سے قطعاً اوجھل ہو گئے، حتیٰ کہ اُن فاتحین کے ناموں تک سے کوئی واقف نہ رہا۔ بلکہ اس واقعہ کو مبالغہ آمیزی کے ساتھ اس کثرت سے دُہرایا گیا کہ اُن فاتحین کے اسمار گرامی بھی تاریکی میں چلے گئے جنہوں نے ہزارہا میل کا رقبہ فتح کیا۔ بلکہ ان سبائی داستانوں کے باعث ان کو اس بہادری کا یہ صلہ ملا کہ تاریخ میں بدنامی کا ٹیکہ اُن کے ماتھے پر سجا دیا گیا۔ مثلاً حضرت عمروؓ بن العاص، حضرت امیر معاویہؓ، حضرت عبداللہؓ بن عمرو بن ابی سرح حضرت عبداللہؓ بن عامر حضرمی، حضرت سعدؓ بن ابی وقاص، حضرت ابو موسیٰؓ اشعری اور حضرت خالدؓ بن الولید وغیرہ۔ اور بہت

سے وہ صحابہ جنہوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ میں بڑے بڑے کارنامے انجام دیئے تھے۔ وہ گوشۂ گمنامی میں چلے گئے۔ یہ ہے ہمارے ان سبائی مؤرخین کی کرشمہ سازی۔

آیئے ہم آپ کو پہلے حکیم عبدالرؤف داناپوری کی زبانی یہ روداد سناتے ہیں حکیم صاحب لکھتے ہیں۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم دردِ سر کی علالت کی وجہ سے خود معرکہ میں نہیں جاتے تھے مہاجر یا انصار میں سے کسی کو سالار فوج متعین کر دیتے تھے۔ یہ قلعہ (قموص) سب سے زیادہ زیادہ مستحکم تھا۔ اس لئے محاصرہ طویل ہوا۔ اور قلعہ فتح نہ ہوتا تھا۔

ایک روز حضرت صدیق گئے اور بڑی کوشش کی مگر فتح نہ ہوا، دوسرے روز حضرت عمر گئے اور بہت کوشش کی مگر کامیابی نہ ہوئی۔ آپ نے فرمایا کہ کل ایسا شخص علم لے گا جو اللہ اور اس کے رسول کو دوست رکھتا ہے۔ اور اللہ و رسول اس کو دوست رکھتے ہیں۔ اسی کے ہاتھ پر اللہ پاک اس قلعہ کی فتح عنایت کرے گا۔

سب صحابہ رات کے وقت آپس میں تذکرہ کرتے تھے۔ کہ دیکھئے کل کس کو علم نصیب ہوتا ہے۔ جب صبح کے وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں صحابہ حاضر ہوئے تو آپ نے پوچھا کہ علی کہاں ہیں؟ صحابہ نے کہا کہ اُن کی آنکھوں میں رمادگی وجہ سے درد ہے وہ آنے کے قابل نہیں۔ آپ نے فرمایا کہ ان کو بلاؤ، وہ آئے تو آپ نے اُن کی آنکھوں میں لعاب دہن ڈالا۔ اور اللہ سے دُعا کی۔ ان کی آنکھیں ایسی اچھی ہوگئیں، جیسے کچھ تھا ہی نہیں۔ پھر فرمایا کہ جاؤ، پہلے اسلام کی دعوت دو، اور اللہ کے حقوق سمجھاؤ۔ اے علیؓ اگر تمہارے ذریعے سے ایک شخص کو بھی ہدایت ہوگئی تو یہ تمہارے لئے سب سے بڑی نعمت ہوگی۔ اصح السیر[۲۳۴]

حکیم صاحب نے واقعہ کے ابتدائی حصہ کی جو نوعیت بیان کی ہے۔ وہ عجیب گول مول ہے۔ حکیم صاحب نے مجوسی اور سبائی اثرات کے تحت یہ تو بیان فرمادیا کہ ابوبکرؓ و عمرؓ ناکام ہو گئے۔ کیونکہ حضرت علیؑ کی فضیلت اس وقت تک ثابت نہ ہوسکتی تھی جب تک حضرت ابوبکرؓ

وعمرؓ کو ناکام ثابت کرکے نہ دکھایا جائے۔ لیکن حکیم صاحب یہ گول کر گئے کہ یہ حضرات کس عہدے پر بھیجے گئے تھے۔ سالار بنا کر بھیجے گئے تھے یا علمدار۔ لیکن چونکہ آگے علم داری کا مسئلہ بیان ہو رہا ہے۔ اس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ حکیم صاحب کے ذہن میں صرف علم داری کا قصہ ہے۔ حالانکہ یہ لشکر دو حصوں پر منقسم تھا۔ میمنہ اور میسرہ۔ ایک حصہ کے امیر حضرت عمرؓ تھے۔ اور دوسرے حصہ کی امارت محمدؓ بن مسلمہ انصاری کے پاس تھی۔ حضرت علیؓ اُس حصہ کے علمدار تھے جس حصہ کے امیر حضرت عمرؓ تھے۔ جیسا کہ ابن سعد نے طبقات میں اس کی وضاحت کی ہے۔ گویا اس دستہ کی سالاری ابتدا سے انتہا تک حضرت عمرؓ کے پاس رہی۔ ظاہر ہے کہ کسی مجوسی مورخ نے واقعہ کی صورت بگاڑ کر حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ کو ناکام بنا کر دکھایا ہے۔

ہاں ہم حکیم صاحب کی خدمت میں یہ بھی ضرور عرض کریں گے، کہ لعاب دہن آنکھوں میں ڈالا نہیں جاتا بلکہ لگایا جاتا ہے، ڈالنے اور لگانے میں بہت بڑا فرق ہے۔ اگر حکیم صاحب نے یہ الفاظ کسی اور سے نقل کئے ہیں تو یقیناً اس نے حضرت علیؓ کی کوئی مدح سرائی نہیں کی۔ بلکہ اُن کے لئے اس میں ایک مذمت کا پہلو نکلتا ہے۔ باقی ہمارا گمان یہ ہے کہ روانی تحریر میں یہ الفاظ نکل گئے ہیں۔ حکیم صاحب آگے تحریر فرماتے ہیں۔

آپ جب قلعہ کے قریب پہنچے تو ایک یہودی نے قلعہ سے سر نکال کر پوچھا کہ تم کون ہو، فرمایا میں علیؓ بن ابی طالب ہوں، اس نے کہا قسم ہے توریت کی کہ تم لوگ غالب ہوئے۔ اصح السیر ص ۲۲۵۔

کاش کوئی حکیم صاحب سے یہ دریافت کرتا کہ جنگ خیبر ۷ھ میں ہوئی خیبر کے باشندے ہمہ وقت مدینہ آتے جاتے رہتے تھے، منافقت کا لبادہ پہن کر کبھی یہی سامنے آتے۔ کیا ان میں سے سات سال تک کوئی شخص حضرت علیؓ کے نام سے واقف نہ ہوا تھا اور اگر یہ لوگ حضرت علیؓ کے نام سے واقف نہ تھے۔ تو کیا آج ہی ایک یہودی پر یہ الہام ہونا

تھا کہ تم غالب ہو گئے اور وہ بھی علیؓ کے نام کے باعث۔ کاش حکیم صاحب یہ تو سوچ لیتے کہ بقیہ تو قلعہ جات تو حضرت علیؓ کے ہاتھ پر ہرگز فتح نہیں ہوئے۔ انہیں تو دیگر صحابہ نے فتح کیا تھا۔ وہ کس کے نام کی برکت سے فتح ہوتے تھے؟ حالانکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات بابرکت کی موجودگی میں کسی اُمتی کی برکت کا اظہار صریح توہین رسول ہے۔ ایسا تو نہیں کہ حکیم صاحب رافضیوں کے اس عقیدے "الغالب علی کل غالب" (حضرت علی ہر غالب پر غالب ہیں) کو تو اپنائے ہوئے نہیں۔ کیونکہ ہمارے دور کا ملا بھی خطبۂ جمعہ میں مزے لے لے کر اس کا پرچار کرتا رہتا ہے۔ اور اس طرح ان الفاظ کے ذریعہ وہ حضرت علیؓ کو اللہ سے بھی بلند مقام دیدیتا ہے۔ جب "معارج النبوت" جیسی کتاب سے جو سراسر رافضیت وشیعیت کا نمونہ ہے سیرت رسول تحریر کی جائے گی۔ تو پھر اس کے علاوہ اور کیا اُمید کی جا سکتی ہے۔

حکیم صاحب آگے لکھتے ہیں۔

اس کے بعد قلعہ سے مرحب نکلا جو یہودیوں میں سب سے دلیر شخص تھا۔ وہ یہ رجز پڑھ رہا تھا۔

انا الذی سمتنی امی مرحب   شاکی السلاح بطل مجرب

میری ماں نے میرا نام مرحب رکھا ہے   میں ہتھیار بند ہوں، اور آزمودہ بہادر ہوں۔

حضرت علیؓ اس کے مقابلہ میں گئے۔ اور فرمایا۔

انا الذی سمتنی امی حیدرہ   کلیث غابات کریہ المنظرہ

میری ماں نے میرا نام حیدر رکھا ہے   میں جنگل کے اس شیر کی طرح ہوں
جو صورت سے ہیبت ناک ہو۔

یہ کہا اور ایک تلوار ماری کہ اس کا سر اڑ گیا۔ اصح السیر ص ۲۳۵

قارئین کرام کو ہم یہ بتانا ضروری سمجھتے ہیں کہ جب جنگ قلعہ بند ہو کر لڑی جاتی ہے۔ تو کوئی مبارز سامنے نہیں آتا۔ بلکہ قلعہ پر ہی سے تیر زنی کی جاتی ہے۔ اور مخالف لشکر کو آگے بڑھنے

سے روکا جاتا ہے۔ مقابلہ کے لئے مبارز اسی وقت نکلتا ہے۔ جب کہ دونوں لشکر میدان کارزار میں آمنے سامنے کھڑے ہوں۔ یہ مقابلہ کی دعوت اس امر کا ثبوت ہے کہ یہودی لشکر قلعہ میں محصور نہ تھا۔ بلکہ سامنے مدمقابل ڈٹا ہوا تھا۔ یہودیوں کا سردار مرحب جو ایک ہزار سواروں کے برابر سمجھا جاتا تھا۔ مقابلہ کے لئے نکلا۔ لیکن افسوس یہ ہے کہ کوئی مقابلہ نہ ہو سکا اور بقول حکیم صاحب ایک تلوار ہی میں اس کا سر اُڑ گیا۔ کیونکہ اس کے بغیر مشکل کشائی اور حضرت علیؓ کی خدائیت کیسے ثابت ہوتی۔ لیکن یہ مشکل خود حکیم صاحب نے حل کر دی ہے۔

وہ فرماتے ہیں۔

ابن قیم کہتے ہیں کہ صحیح مُسلم میں اسی طرح ہے کہ مرحب کو حضرت علیؓ نے قتل کیا۔ مگر موسیٰ بن عقبہ نے امام زہری اور ابوالاسود سے روایت کیا ہے کہ حضرت جابر بن عبداللہؓ فرماتے ہیں کہ مرحب کو محمد بن مسلمہؓ نے قتل کیا۔ جب مرحب نے نکل کر مبارزت طلب کی تو محمدؓ بن مسلمہ نے عرض کیا۔ یا رسول اللہ مجھے اجازت دیجئے۔ اس نے میرے بھائی محمودؓ بن مسلمہ کو قتل کیا ہے۔ یہ گئے۔ دونوں کے بیچ میں ایک درخت پڑ گیا۔ دونوں موقعے تلاش کرتے رہے۔ آخر محمدؓ بن مسلمہ نے اسے قتل کر دیا۔ سلمۃ بن سلامہ اور مجمع بن حارثہ بھی یہی کہتے ہیں کہ مرحب کو محمدؓ بن مسلمہ نے قتل کیا۔

واقدی کا بیان ہے کہ محمدؓ بن مسلمہ کی ضرب سے مرحب کی دونوں ساقیں (پنڈلیاں) کٹ گئی تھیں۔ انہوں نے چھوڑ دیا۔ اور کہا کہ تکلیف کا مزا چکھ جس طرح میرے بھائی نے تکلیف اٹھائی۔ اس کے بعد اس طرف حضرت علیؓ آئے تو انہوں نے اس کی گردن مار دی۔ اور اس کی تلوار اور سامان لے لیا۔ یہ معاملہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے گیا۔ حضرت علیؓ نے فرمایا۔ ہاں میں نے قتل کیا ہے۔ مگر پیر اس کا پہلے سے کٹا ہوا تھا۔ حضور نے اس کی تلوار، مغفر، اور نیزہ وغیرہ سب محمدؓ بن مسلمہ کو دلوا دیا۔ یہ تلوار محمدؓ بن مسلمہ کی اولاد کے پاس موجود تھی۔ اور اس پر مرحب کا نام کھدا ہوا تھا۔ واللہ اعلم۔

مرحب کے بعد اس کا بھائی یاسر نکلا، یہ بھی عظیم الجثہ، طویل القامت اور بڑا شہ زور تھا۔ اس کے مقابل حضرت زبیرؓ بن العوام گئے۔ حضرت صفیہؓ (زبیرؓ کی والدہ) نے کہا کہ یا رسول اللہ یہ میرے لڑکے کو قتل کر دے گا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا نہیں تمہارا لڑکا اسے قتل کرے گا۔ آخر حضرت زبیرؓ نے اسے قتل کر دیا۔

قلعہ قموص پر تقریباً بیس روز محاصرہ رہا۔ یہ سب سے مستحکم قلعہ تھا۔ اور اس قلعہ پر حضرت علیؓ کے کارناموں کے متعلق بہت سی مبالغہ آمیز روایتیں مشہور ہیں۔ اصح السیر ص۲۳۶

اس مضمون کو ایک بار پھر غور سے پڑھئے، اور سوچئے کہ اس سے کیا کیا نتائج اخذ ہوتے ہیں۔

۱۔ اس قلعہ کا محاصرہ بیس دن تک رہا۔ گویا یہ اکیسویں دن فتح ہوا۔ بقول داناپوری ہر روز ایک نئے صحابی کو علم یا کمان دے کر بھیجا گیا۔ اور سب ناکام رہے۔ حضرت علیؓ کے ہاتھوں یہ قلعہ فتح ہوا۔ اس طرح اس قلعہ پر حملہ میں بیس کمانداروں نے حصہ لیا۔ لیکن ناکامی خاص طور پر ابوبکرؓ و عمرؓ کی دکھائی گئی۔ کیونکہ سبائیوں کو اصل بغض تو ان ہی دو سے ہے۔

۲۔ فتح کے روز جھنڈا حضرت علیؓ کو دیا گیا۔ اور اس کی بشارت بھی پہلے سے دیدی گئی۔ گویا اب حضور خواہ کسی کو بھی علم دیتے قلعہ ہر صورت میں فتح ہو کر رہتا۔ کیونکہ بشارت رسول غلط نہیں ہو سکتی۔

۳۔ یہ بھی پہلے سے اعلان کیا گیا کہ جسے جھنڈا دیا جائے گا، اللہ اور اس کا رسول اس سے راضی ہیں، اور وہ اللہ اور اس کے رسول سے راضی ہے۔ اس سے حضرت علیؓ کی فضیلت ثابت ہوئی کہ اُن سے اللہ اور اُس کا رسول راضی ہے۔

۴۔ حضورؐ کا یہ معجزہ بھی سامنے آیا کہ آنکھوں میں لعاب دہن لگانے سے آنکھیں اچھی ہو گئیں۔

۵۔ یاسر کے قاتل بالاتفاق حضرت زبیرؓ ہیں۔

۶۔ مرحب کے سلسلہ میں اختلاف ہے۔ عام مورخین کا دعوی ہے کہ اس کے قاتل حضرت علیؓ ہیں جب کہ حضرت جابرؓ بن عبداللہ صحابی۔ مجمعؓ بن حارثہ، سلمہؓ بن سلامہ، امام زہری،

مورخ موسیٰ بن عقبہ تابعی اور واقدی کا دعوی یہ ہے کہ مرحب کے قاتل محمد بن مسلمہ انصاری ہیں۔ ہے۔ واقدی کی اس صورت سے جو داناپوری نے مرحب کے قتل کے سلسلہ میں بیان کی ہے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اس جنگ میں حضرت علیؓ کا کوئی بھی کارنامہ نہیں۔ بجز اس کے کہ اُن کے ہاتھ میں جھنڈا دیا گیا۔ اور اُن کے لئے رضائے الٰہی کا اعلان کیا گیا۔

اس موقعہ پر ہم اولاً یہ غلط فہمی دور کرنا چاہتے ہیں کہ عام لوگ اور ہمارے اردو مؤرخین اور مقررین حضرات مرحب کا نام غلط بولتے ہیں۔ وہ رے کو ساکن پڑھتے اور ح پر صرف زیر پڑھتے، اور مر کی میم پر زبر پڑھتے ہیں۔ حالانکہ میم پر پیش، رے پر زبر اور حے پر تشدید ہے زبر ہے۔ یعنی اس کے اعراب اس طرح ہوں گے مُرَحَّب۔ اس نام کو ہر خاص و عام غلط بولتا اور پڑھتا ہے۔

حکیم صاحب آگے لکھتے ہیں۔

مدارج النبوت میں روضۃ الاحباب اور معارج النبوت سے منقول ہے کہ حضرت علیؓ کی سپر گر گئی۔ اس کو یہود لے بھاگے۔ حضرت علیؓ نے قلعہ کا دروازہ اکھاڑ کر اسے سپر بنالیا۔ جنگ کے بعد آپ نے اس دروازے کو پھینک دیا۔ تو سات قوی آدمی اس کو پلٹ نہیں سکتے تھے اور چالیس آدمیوں نے مل کر اٹھانا چاہا لیکن نہ اٹھا سکے۔

(جو شخص پیدائش کے پہلے دن دیبا کی چھ چادریں اور چمڑے کی پٹیاں ایک جھٹکے سے پھاڑ دے۔ اُس سے تو یہ بھی بعید نہیں کہ وہ پورا قلعہ مع آبادی کے سر پہ اٹھا لے)

معارج سے نقل کیا ہے کہ اس کا وزن آٹھ سو من تھا۔ اور مواہب لدنیہ سے نقل کیا ہے کہ حضرت علیؓ نے تنہا اس دروازے کو اکھاڑ لیا۔ لیکن اس کے بعد ستر آدمی مل کر بمشکل اس کو حرکت دے سکے۔ اور حاکم و بیہقی نے نقل کیا ہے کہ جس دروازے کو حضرت علیؓ نے تنہا اکھاڑ لیا۔ چالیس آدمیوں نے مل کر تجربہ کیا اسے نہ اٹھا سکے۔ بیہقی نے روایت کیا ہے کہ قلعہ کے دروازے کو حضرت علیؓ نے تنہا اکھاڑ دیا۔ اس کے بعد ہم میں سے ستر آدمیوں نے چاہا کہ اٹھا

کر اس کو اس کی جگہ پر لگا دیں تو اٹھا نہ سکے۔ ان سب روایتوں کو نقل کرنے کے بعد عبدالحق محدث دہلوی لکھتے ہیں کہ مواہب لدنیہ میں ہے کہ ہمارے شیخ نے کہا کہ یہ سب روایات واہیہ ہیں۔ بعض علماء نے اس سے انکار کیا ہے۔ اصح السیر ص۲۳۶

شکر ہے کہ عبدالحق دہلوی اور عبدالرؤف داناپوری نے ان روایات کا خود ہی انکار کر دیا۔ اور ہم اس فضول درد سری سے بچ گئے۔ لیکن ہمارے نزدیک یہ داستان گو چند باتیں بھول گئے تھے۔ وہ پتے کی باتیں ہم بتائے دیتے ہیں۔ تاکہ نئی داستانوں کے لئے کچھ نیا مواد فراہم ہو جائے۔

۱۔ لڑائی کے وقت لڑنے والے کے سیدھے ہاتھ میں ہمیشہ تلوار ہوتی ہے۔ اگر اس کے پاس ڈھال ہوتی ہے تو وہ اسے بائیں ہاتھ میں تھامتا ہے۔ لیکن اس دور میں ہر مسلمان کے پاس ڈھال نہیں تھی اور حضرت علیؓ کے پاس بھی ڈھال نہیں تھی۔ شادی کے موقعہ پر آپکے پاس تلوار، گھوڑا اور زرہ ہونا ثابت ہے۔ البتہ ڈھال کی جگہ اُن کے بائیں ہاتھ میں جھنڈا تھا۔ اب دروازے کو ڈھال اسی وقت بنایا جا سکتا ہے۔ جب کہ جھنڈا نیچے پھینک دیا جائے۔ یا کسی اور کو دے دیا جائے یا تلوار ہاتھ سے گرا دی جائے۔ ہمارے نزدیک ان تمام صورتوں میں یہ حضرت علیؓ کی تعریف نہ ہوگی۔ بلکہ خالص تذلیل ہوگی۔ کیونکہ جب ان کے ہاتھ میں جھنڈا دیا گیا تو کسی اور کو دینا۔ یہ حضور کے حکم اور آپکی عطا کی تذلیل ہے اور تلوار کو خود سے جدا کر دینا بھی موقعہ کی نزاکت کے تحت درست نہ تھا۔ ان روایات سے تو یہ اندازہ ہوتا ہے کہ جن لوگوں نے یہ داستانیں تیار کی ہیں۔ انہوں نے کبھی ہاتھ میں تلوار نہیں اُٹھائی تھی، اور زندگی میں کبھی میدانِ کارزار نہیں دیکھا تھا۔ اگر ایسا نہیں ہے تو یقیناً ان داستان گوؤں کا مقصد توہین اسلام اور حضرت علیؓ کو بدنام کرنا ہے۔ ایسے لوگ حضرت علیؓ کے ناداں دوست ہیں۔ اپنی حماقتوں سے انہیں بدنام کر رہے ہیں۔

۲۔ فضول میں اتنے بڑے دروازے کو سپر بنایا۔ اسے اٹھا کر دشمنوں پر پھینک دیتے۔

ہزاروں کا صفایا ہو جاتا اور زیادہ نام روشن ہوتا۔ اب ان سبائیوں کو اسی قسم کی داستانیں وضع کرنی چاہئیں۔

۳۔ اتنا بڑا دروازہ اٹھانے کے بعد انسان نہ خود لڑ سکتا ہے اور نہ دوسرا اس پر حملہ کر سکتا ہے۔ پھر حضرت علیؓ تو پستہ قد تھے۔ دروازہ اٹھا لینے کے بعد [illegible] نظر بھی نہ آتے ہوں گے۔ کیا ان سبائیوں کا یہ مقصد تو نہیں کہ حضرت علیؓ اپنی جان بچانے کی فکر [illegible] سمک تھے؟

۴۔ جنگ قلعے سے باہر لڑی جا رہی تھی۔ اور ایسی صورت میں جب کوئی لشکر پسپا ہوتا ہے اور قلعہ میں محفوظ ہونا چاہتا ہے تو اس کے لئے قلعہ کے دروازے کھولے جاتے ہیں اور فریق مخالف کی کوشش یہ ہوتی ہے کہ خود دروازے پر قابض ہو جائے۔ تاکہ دشمن قلعہ بند نہ ہو سکے۔ ظاہر ہے یہاں بھی یہی صورت پیش آئی ہوگی۔ اور صحابہ کرامؓ نے دروازے پر حملہ کیا ہوگا۔ رہا حضرت علیؓ کا مسئلہ وہ ہرگز بھی اپنے ہاتھ سے علم یعنی رایہ نہیں چھوڑ سکتے تھے۔ اور نہ تلوار چھوڑنے کی چیز تھی۔ ایسی صورت میں وہ کیا کارنامہ ہے جو حضرت علیؓ نے انجام دیا؟

اب داناپوری صاحب اپنی پوری تحریر کا نتیجہ بیان کرتے ہیں۔ وہ بھی ان ہی کی زبانی سُن لیجئے۔

لیکن اس میں شبہ نہیں کہ اس قلعہ کو حضرت علیؓ نے فتح کیا اور اس کے فتح ہو جانے کے بعد یہودیوں کو جم کر بالمقابل لڑنے کی ہمت نہیں ہوئی۔ اس لئے حضرت علیؓ فاتح خیبر کے نام سے مشہور ہیں۔ اصح السیر ص ۲۳۷

ہمارے سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ کیسے ثابت ہو گیا کہ حضرت علیؓ فاتح خیبر ہیں۔ کیونکہ حکیم صاحب کے نزدیک دروازہ اکھاڑنے کی روایات واہی اور مرحب کے قاتل محمد بن مسلمہؓ ہیں۔ اور ان کے نزدیک یہ آخری قلعہ ہے۔ آخر وہ کون سی دلیل ہے۔ جس سے حضرت علیؓ فاتح خیبر قرار پائیں۔ کیونکہ خیبر کے ۷ قلعے دیگر صحابہ نے فتح کئے تھے۔ انہیں فاتح قموص تو کہا جا سکتا ہے لیکن

فاتح خیبر کہنا ایسی ہی حماقت ہے جیسے کوئی کمانڈر کسی ملک غیر کے صرف کسی قصبہ پر قبضہ کر لے اور اسے اس ملک کا فاتح کہا جانے لگے۔ جب کہ دیگر علاقوں پر دوسرے کمانڈرں نے قبضہ کیا ہو۔ جہاں یہ جھوٹ ہے وہاں دیگر کمانداروں پر ظلم بھی ہے۔ اسی لئے ہمارے نزدیک فاتح خیبر کی اصطلاح ایک مخفی تبرا ہے۔

رہا یہ دعویٰ کہ پھر یہودیوں کو لڑنے کی ہمت نہیں ہوئی۔ تو جناب اس کے بعد تو یہودیوں نے ہتھیار ڈال دیئے تھے اور حضور سے یہ درخواست کی تھی کہ ہمیں ملک بدر نہ کیا جائے۔ ہماری زمینوں پر جتنی پیداوار ہوگی۔ اس کا نصف ہم آپ کو دیا کریں گے۔ اس شرط پر آپ نے یہودیوں کو خیبر میں رہنے کی اجازت دیدی۔ اور ہر سال حضرت عبداللہؓ بن رواحہ اور حضرت بلالؓ خیبر جاتے اور نصف پیداوار وصول کر کے لاتے۔ حضرت عمرؓ کے زمانہ تک۔ اسی اصول پر عمل ہوتا رہا۔

اب ہم علامہ شبلی مرحوم کی سیرت النبی سے فتح خیبر کا حال پیش کرتے ہیں۔ شبلی لکھتے ہیں۔

سب سے پہلے قلعہ ناعم پر فوجیں بڑھیں۔ حضرت محمودؓ بن مسلمہ نے بڑی دلیری سے حملہ کیا۔ اور دیر تک لڑتے رہے۔ لیکن چونکہ سخت گرمی تھی۔ تھک کر دم لینے کے لئے قلعہ کی دیوار کے سائے میں بیٹھ گئے۔ کنانہ بن الربیع نے قلعہ کی فصیل سے چکی کا پاٹ اُن کے سر پر گرایا۔ جس کے صدمہ سے اُن کی وفات ہوئی۔ لیکن قلعہ بہت جلد فتح ہو گیا۔

ناعم کے بعد اور قلعے بآسانی فتح ہوتے گئے۔ لیکن قلعہ قموص مرحب کا تخت گاہ تھا اس مہم پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابوبکرؓ و عمرؓ کو بھی بھیجا۔ لیکن دونوں ناکام واپس آئے۔

طبری میں روایت ہے کہ جب خیبری قلعہ سے نکلے تو حضرت عمرؓ کے پاؤں نہ جم سکے۔ اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر شکایت کی کہ فوج نے نامردی دکھائی لیکن فوج نے خود ان کی نسبت یہی شکایت کی۔

اس روایت کو طبری نے جس سلسلۂ سند سے نقل کیا ہے۔ اس کے راوی عوف ہیں۔ اُن کو بہت سے لوگوں نے ثقہ کہا ہے۔ لیکن بُندار جب ان کی روایت بیان کرتے تھے تو کہتے تھے کہ وہ رافضی اور شیطان تھا۔ یہ لفظ بہت سخت ہے لیکن اُن کی شیعیت سب کو تسلیم ہے۔ گو شیعہ ہونا بے اعتباری کی دلیل نہیں۔ لیکن یہ ظاہر ہے کہ جس روایت میں حضرت عمرؓ کے بھاگنے کا واقعہ بیان کیا جاتے۔ شیعہ کی زبان سے اُس روایت کا کیا رُتبہ رہ جاتا ہے۔ اس کے علاوہ اوپر کے راوی عبداللہ بن بریدہ ہیں جو اپنے والد سے روایت کرتے ہیں۔ لیکن محدثین کو اس بات میں شبہ ہے کہ اُن کی جو روایتیں باپ کے سلسلے سے منقول ہیں۔ صحیح بھی ہیں یا نہیں۔

سیرت النبی ص ۲۸۵ ج ۱

عوف کو اگرچہ محدثین کی ایک جماعت نے ثقہ کہا ہے۔ اور اسی باعث صحاح ستہ کے تمام مصنفین نے اس سے روایات لی ہیں۔ لیکن یہ اعلیٰ درجہ کے ثقہ ہرگز نہیں سمجھے جاتے بلکہ کام چلاؤ آدمی ہیں۔ ان کی روایت بطور شہادت تو پیش کی جا سکتی ہے۔ لیکن حجت ہرگز نہیں ہو سکتی۔ امام مسلم اپنی صحیح کے مقدمہ میں فرماتے ہیں کہ جب ابن عون اور ایوب کا تقابل عوف بن ابی جمیلہ اور اشعث الحرانی کے ساتھ کیا جائے، حالانکہ یہ چاروں حسن بصری کے شاگرد ہیں۔ لیکن ان چاروں میں بین فرق نظر آئے گا۔ عوف اور اشعث کو اگرچہ جھوٹا تو نہیں کہا جا سکتا لیکن روایت کو صحیح طور پر نقل کرنے اور علم و فضل میں ابن عون اور ایوب سے بہت کم ہیں۔

محمد بن عبداللہ الانصاری کا بیان ہے کہ میں نے داؤد بن ابی ہند کو دیکھا کہ وہ اس عوف کو مار رہے تھے اور کہہ رہے تھے اے منکر تقدیر۔

محمد بن عمرو المقدمی کہتے ہیں کہ میرے سامنے ایک روز امام ابن المبارک نے جعفر بن سلیمان سے سوال کیا کہ تو نے ابن عون، ایوب اور یونس کو دیکھا ہے۔ لیکن تو نے انہیں چھوڑ کر عوف کی مجلس اختیار کی۔ اللہ کی قسم وہ صرف ایک بدعت پر راضی نہیں ہوتا۔ اُس میں

تو دو بدعتیں جمع ہیں۔ شیعہ ہے اور منکر تقدیر ہے۔ میزان الاعتدال ص۲۰۵ ج ۳

شبلی آگے لکھتے ہیں۔

تاہم اس قدر ضرور ہے کہ اس مہم پر پہلے اور بڑے بڑے صحابہ بھیجے گئے۔ لیکن فتح کا فخر کسی اور کی قسمت میں نہ تھا۔ جب مہم میں زیادہ دیر ہوئی تو ایک دن شام کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔ کل میں اس شخص کو علم دوں گا جس کے ہاتھ پر اللہ فتح دے گا اور جو اللہ کے رسول کو چاہتا ہے اور اللہ اور اس کا رسول بھی اس کو چاہتے ہیں۔

یہ رات نہایت امید اور انتظار کی رات تھی۔ صحابہ نے تمام رات اس بے قراری میں کاٹی کہ دیکھئے یہ تاج فخر کس کے ہاتھ آتا ہے۔ حضرت عمرؓ نے قناعت پسندی اور بلند نظری کی بنا پر کبھی حکومت اور سرداری کی تمنا نہیں کی تھی۔ لیکن جیسا کہ صحیح مسلم باب فضائل علیؓ میں مذکور ہے، اُن کو خود اعتراف ہے کہ اس موقع کی تمنا میں اُن کی خود داری بھی قائم نہ رہ سکی۔

صبح کو یہ آواز دفعتہً کانوں میں آئی کہ علیؓ کہاں ہیں! یہ بالکل غیر متوقع آواز تھی۔ کیونکہ جناب موصوف کی آنکھوں میں آشوب تھا اور سب کو معلوم تھا کہ وہ جنگ سے معذور ہیں۔ غرض حسب طلب وہ حاضر ہوئے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی آنکھوں میں اپنا لعاب دہن لگایا اور دُعا فرمائی۔ جب ان کو علم عنایت ہوا تو انہوں نے عرض کی کہ کیا یہود کو لڑکر مسلمان بنالوں، ارشاد ہوا کہ بہ نرمی اُن پر اسلام پیش کرو، اگر ایک شخص بھی تمہاری ہدایت سے اسلام لے آئے تو وہ سُرخ اونٹوں سے بہتر ہے۔

لیکن یہود اسلام یا صلح قبول کرنے پر راضی نہ ہو سکتے تھے۔ مرحب قلعہ سے یہ رجز پڑھتا ہوا نکلا۔

قد علمت خیبر انی مرحب   شاکی السلاح بطل مجرب

مرحب کے سر پر یمنی زرد رنگ کا مغفر اور اس کے اوپر سنگی خود تھا۔ قدیم زمانے میں گول پتھر بیچ سے خالی کر لیتے تھے۔ یہی خود کہلاتا تھا۔ غالباً شبلی کو پتھر کا دور یاد آ گیا ہے

مرحب کے جواب میں حضرت علیؓ نے یہ رجز پڑھا۔

انا الذی سمتنی امی حیدرہ　　کلیث غابات کریہ المنظرہ

مرحب بڑے طمطراق سے آیا۔لیکن حضرت علیؓ نے اس زور سے تلوار ماری کہ سر کو کاٹتی ہوئی دانتوں تک اتر آئی اور ضربت کی آواز فوج تک پہنچی۔طبری ص۱۵۷۹۔پہلوان کا مارا جانا عظیم الشان واقعہ تھا۔اس لئے عجائب پسندی نے اس کے متعلق نہایت مبالغہ آمیز افواہیں پھیلا دیں۔معالم التنزیل میں ہے کہ حضرت علیؓ نے جب تلوار ماری تو مرحب نے سپر پر روکا۔لیکن ذوالفقار سپر، خود اور سر کو کاٹتی ہوئی۔دانتوں تک اتر آئی۔(شاید طبری اور بغوی کو اس کا علم نہ تھا کہ تلوار پتھر کو نہیں کاٹ سکتی۔ورنہ شاید کوئی اور ہی داستان بیان کرتے) مرحب کے مارے جانے پر یہود نے جب عام حملہ کیا۔تو اتفاق سے حضرت علیؓ کے ہاتھ سے سپر گر گئی۔آپ نے قلعہ کا در جو سرتاپا سنگ تھا۔اکھاڑ کر اس سے سپر کا کام لیا، اس واقعہ کے بعد ابورافع نے سات آدمیوں کے ساتھ مل کر اس کو اٹھانا چاہا تو اپنی جگہ سے بھی نہ ہل سکا۔یہ روایتیں محمد بن اسحاق اور حاکم نے بیان کی ہیں۔لیکن یہ بازاری قصے ہیں۔ علامہ سخاوی نے مقاصد حسنہ میں تصریح کی ہے کلہا واہیۃ۔یہ سب لغو روایتیں ہیں۔

علامہ ذہبی نے میزان الاعتدال میں علی بن احمد بن فروخ کے حال میں اس روایت کو نقل کر کے لکھا ہے کہ یہ روایت منکر ہے۔سیرت النبی

اس میں صرف یہی ایک کمزوری نہیں۔بلکہ اس کے متعدد راوی ناقابل اعتبار ہیں۔اور اس روایت میں یہ ہے کہ چالیس آدمی بھی اس دروازے کو نہ ہلا سکے تھے۔یہ روایت طبری کی ہے۔اس میں علی بن احمد کے علاوہ بنت بن ابی سلیم ضعیف اور اسمٰعیل بن موسیٰ الفزاری رافضی ہے۔اور سب سے اہم لطیفہ یہ ہے کہ طبری نے یہ روایت ان الفاظ میں نقل کی ہے۔

حدثنی اسمعیل بن موسی الفزاری۔	مجھ سے اسمٰعیل بن موسیٰ الفزاری نے حدیث بیان کی۔

شبلی آگے لکھتے ہیں۔

ابن ہشام نے جن سلسلوں سے یہ روایتیں نقل کی ہیں اُن میں سے ایک روایت میں تو بیچ کے ایک راوی کا نام چھوڑ دیا اور دوسرے میں شترک نقص کے ساتھ بریدۃ بن سفیان بھی ایک راوی ہیں۔ جن کو امام بخاری، ابوداؤد، اور دار قطنی قابل اعتبار نہیں سمجھتے۔ میزان الاعتدال ترجمہ بریدۃ بن سفیان۔

محمد بن اسحاق، موسٰی بن عقبہ اور واقدی کا بیان ہے کہ مرحب کو محمد بن مسلمہ نے مارا تھا۔ مسند احمد بن حنبل اور نووی کی شرح میں بھی ایک روایت یہی ہے لیکن صحیح مسلم اور حاکم ص۲۹ ج ۲ میں حضرت علیؓ ہی کو مرحب کا قاتل اور فاتح خیبر لکھا ہے۔ اور یہی اصح الروایات ہے۔ سیرت النبی ص۴۸۹ ج ۱۔

اس وقت ہمارے رُوبرو صحیح مسلم کھُلی ہوئی موجود ہے۔ لیکن اس میں فاتح خیبر کا کوئی لفظ موجود نہیں۔ بلکہ جس قلعہ کے لیے حضرت علیؓ کو جھنڈا دیا گیا تھا اس کی فتح کا ذکر ہے۔ ہم یہ حدیث خود قارئین کی خدمت میں پیش کریں گے۔

اب آئیے حکیم فیض عالم مرحوم کے خیالات بھی ملاحظہ فرمالیجئے۔ وہ لکھتے ہیں۔

فتح خیبر کے متعلق حضرت علیؓ کا ذکر اس طرح کیا جاتا ہے گویا آپ ہی فاتح خیبر ہیں۔

یہاں اس امر کو ملحوظ رکھیئے کہ خیبر میں اسلامی فوج کے کمانڈر خود نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم تھے اور یہ بات مسلمات میں سے ہے کہ کسی جنگ میں کوئی شخص کتنی ہی بہادری یا جواں مردی کا ثبوت کیوں نہ دے، کامیابی کا سہرا کمانڈر ہی کے سر ہوتا ہے جو جنگ کا نقشہ مرتب کرتا، حملے اور دفاع کا ذمہ دار ہوتا ہے۔ (مثلاً جنگ قادسیہ کہ اس کا سہرا آج تک حضرت سعدؓ کے سر پر بندھا ہوا ہے۔ جسے اپنے اور دشمن سب قبول کرتے ہیں۔ حالانکہ انہوں نے اپنی بیماری کی وجہ سے اس جنگ میں قطعاً حصہ نہ لیا تھا)

اب فتح خیبر کی تفصیل بھی سنئے۔

خیبر کے کل دس قلعے تھے۔ سات ایک دائرہ کے اندر اور تین تین الگ الگ تھے۔ نو قلعے مختلف صحابہ کے ہاتھ پر فتح ہوئے۔ جن میں سے حضرت عمرؓ، حضرت سعدؓ بن عبادہ حضرت محمدؓ بن مسلمہ اور حضرت حبابؓ بن المنذر خصوصیت سے قابل ذکر ہیں۔

محمدؓ بن مسلمہ نے ہی قلعہ قموص کے یہودی پہلوان مرحب کو قتل کیا۔ (طبری ص ۹۲ ج ۲۔ سیرت ابن ہشام ص ۳۶۰) مگر محمد قلعہ فتح نہ کر سکے۔ قلعہ قموص تین قلعہ جات کے سلسلے میں واقع تھا۔ ان میں سے ایک حضرت ابوبکرؓ کے زیر کمان اور دوسرا حضرت عمرؓ کی زیر کمان فتح ہوا۔ (سیرت ابن ہشام عربی ص ۱۷۵)

جس روایت میں قلعہ قموص کا فتح ہونا حضرت علیؓ کی طرف منسوب ہے وہ بریدہ بن سفیان کی روایت ہے۔ اور بریدہ کو امام بخاری نے ساقط الاعتبار کہا ہے۔ اور اس سے کوئی روایت نہیں لی۔

روایات سے قطع نظر درایت کے طور پر بھی جائزہ لیا جائے تو اُس زمانہ کی لڑائیوں کے حالات سے معلوم ہوتا ہے کہ کسی قلعہ کا دروازہ توڑنا ہی قلعہ کو فتح کرنا ہوتا تھا۔ محصورین کسی حملہ آور کو دروازے کے قریب پھٹکنے نہیں دیتے تھے اور جب دروازے کی ڈھال بن گئی تو لڑائی کا کیا سوال۔ حقیقت مذہب شیعہ ص ۱۹۳

ان تمام مصنفین نے یہ بات تسلیم کی ہے کہ جس روایت میں یہ تذکرہ ہے کہ قلعہ قموص کے حضرت علیؓ فاتح ہیں وہ صرف بریدہ سے مروی ہے۔ بخاری کہتے ہیں اس کی روایت پر اعتراض ہے۔ ابوداؤد کہتے ہیں یہ کچھ نہیں۔ یہ حضرت عثمانؓ پر اعتراضات کیا کرتا تھا۔ دار قطنی کہتے ہیں یہ متروک الحدیث ہے۔ اور یہ بھی کہا جاتا ہے کہ یہ شراب پیا کرتا تھا۔ میزان ص ۲۰۶ ج ۱

گویا یہ روایت اس بریدہ دشمن عثمانؓ نے شراب کے نشہ میں تیار کی۔ حضرت ابوبکرؓ و عمرؓ کی ناکامی کا ذکر بھی اسی کی روایت میں ہے۔

اب ہم احادیث کی جانب آتے ہیں، اور وہ احادیث پیش کرنا چاہتے ہیں جو غزوۂ خیبر

کے بارے میں حضرت علیؓ کے سلسلے میں وارد ہوئی ہیں۔ ہم یہ احادیث بخاری و مسلم سے پیش کرتے ہیں۔ سب سے اول حضرت سلمہؓ بن الاکوع کی حدیث ملاحظہ فرمائیں۔ حضرت سلمہؓ کا بیان ہے۔

کہ علیؓ خیبر کے موقع پر پیچھے رہ گئے تھے۔ کیونکہ اُن کی آنکھیں دُکھنے آ رہی تھیں۔ پھر انہوں نے دل میں سوچا کہ میں کیوں حضور سے پیچھے رہوں۔ لہٰذا وہ حضور کے ساتھ اِسی حال میں بھی آ کر لشکر میں شامل ہو گئے۔ جب وہ رات آئی جس کی صبح فتح ہوئی۔ تو حضور نے ارشاد فرمایا کہ میں کل ایسے شخص کو رایہ دوں گا۔ جس سے اللہ اور اس کا رسول محبت کرتا ہو گا۔ ہم اس کی اُمید لئے بیٹھے تھے۔ لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے رایہ حضرت علیؓ کو عنایت فرمایا۔ اور ان ہی کے ہاتھ پر فتح ہوئی۔ بخاری ص۵۲۵ ج ۱۔ ص۶۰۵ ج ۲۔ مسلم ص۲۷۹ ج ۲

اس حدیث میں یہ کہیں تذکرہ نہیں کہ یہ قلعہ کون سا تھا۔ نہ مرحب کے قتل کا ذکر ہے۔ نہ دروازہ اکھاڑنے کا اور نہ حضرت ابوبکرؓ و عمرؓ کے فرار کا۔ ہاں اس سے چند امور ضرور ثابت ہوتے ہیں۔

۱۔ حضرت علیؓ کے بارے میں اللہ اور اس کے رسول کی رضا کا اعلان۔

۲۔ حضرت علیؓ کو رایہ (چھوٹا جھنڈا) دینا۔

۳۔ اس رایہ کے لئے لوگوں کی تمنا کرنا۔

۴۔ اُس روز فتح حضرت علیؓ کی علمبرداری میں حاصل ہوئی۔

۵۔ مدینہ سے حضرت علیؓ آنکھوں کی تکلیف کے باعث ساتھ نہ آئے تھے۔ لیکن بعد میں لشکر گاہ میں پہنچ گئے۔

اب حضرت سہلؓ بن سعد انصاری کی حدیث ملاحظہ ہو۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خیبر کے روز فرمایا۔ میں کل ایک ایسے شخص کو رایہ دوں گا جس کے ہاتھ پر اللہ تعالیٰ فتح عطا فرمائے گا۔ وہ اللہ اور اس کے رسول سے محبت رکھتا ہو گا۔ اور اللہ اور اس کا رسول اس سے محبت رکھتا ہو گا۔ رات بھر لوگ یہ سوچتے رہے کہ نہ

معلوم حضور یہ رایہ کس کو عنایت فرمائیں گے۔ جب صبح ہوئی تو سب کے سب حضور کی خدمت میں اس امید کے ساتھ حاضر ہوئے کہ اسے یہ رایہ عطا کیا جائے گا۔ آپ نے دریافت کیا علیؓ کہاں ہیں۔ لوگوں نے عرض کیا ان کی آنکھیں دکھ رہی ہیں۔ فرمایا ان کو بلاؤ۔ جب وہ آئے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی آنکھ میں لعاب دہن لگایا اور دعا فرمائی۔ جس سے اُن کی آنکھیں بالکل صحیح ہو گئیں۔ اور انہیں کوئی تکلیف باقی نہیں رہی۔ حضور نے انہیں رایہ دیا۔ انہوں نے عرض کیا یا رسول اللہ کیا میں اُن سے اس وقت تک جنگ کروں۔ جب تک وہ ہمارے مثل نہ ہو جائیں (یعنی مسلمان) آپ نے فرمایا۔ آگے بڑھو، جب اُن کی سرزمین میں پہنچو، تو انہیں اسلام کی دعوت دو، اور انہیں بتاؤ کہ ان پر اللہ کا کیا حق ہے۔ اللہ کی قسم اگر تیرے ذریعہ ایک شخص بھی ہدایت پا جائے تو تیرے لئے سرخ اونٹوں سے بہتر ہوگا۔ بخاری صـ۶۰۵ ج ۲۔ صـ۵۲۵ ج ۱۔ مسلم صـ۲۷۹ ج ۲۔

اس حدیث میں صرف چند نئی باتیں سامنے آئی ہیں۔ بقیہ امور وہی ہیں جو پہلی حدیث میں تھے۔

۱۔ حضرت علیؓ کی آنکھوں کا حضور کے لُعاب دہن سے اچھا ہونا۔

۲۔ جنگ کے سلسلے میں ہدایات۔

بقیہ امور سے یہ حدیث بھی خاموش ہے۔

یہ تو وہ احادیث ہیں جو بخاری و مسلم دونوں میں پائی جاتی ہیں۔ اب اُن احادیث کو دیکھیے جو صرف مسلم میں پائی جاتی ہیں۔

تیسری حدیث حضرت ابو ہریرہؓ سے مروی ہے۔ اُن کی حدیث کے الفاظ ہیں۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے خیبر کے روز ارشاد فرمایا۔ میں یہ رایہ ایک ایسے شخص کو دوں گا جو اللہ اور اس کے رسول سے محبت رکھتا ہوگا۔ اور اللہ اور اس کا رسول اس سے محبت رکھتا ہوگا۔ حضرت عمرؓ فرماتے ہیں مجھے کبھی امارت سے محبت نہیں رہی۔ لیکن اُس روز میں بھی آرزو لئے بیٹھا تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علیؓ کو بلوایا۔ اور انہیں

وہ رایہ عطا کیا اور ارشاد فرمایا۔ آگے بڑھتے جاؤ، اور اس وقت تک پیچھے مڑ کر نہ دیکھنا جب تک اللہ فتح عنایت نہ کر دے۔ پھر حضرت علیؓ نے کچھ خاموشی سے گفتگو کی۔ پھر اپنے مقام پر آ کر ٹھہرے اور پیچھے مڑ کر نہیں دیکھا۔ پھر وہیں کھڑے کھڑے چلا کر دریافت کیا

بات پر جنگ کروں۔ آپ نے فرمایا انہیں اللہ کی وحدانیت اور محمد رسول کی رسالت کی دعوت دو۔ اگر وہ اسے قبول کرلیں تو انہوں نے اپنے خونوں اور اپنے مالوں کو محفوظ کر لیا۔ اب یہ چیزیں شرعی حق کے ساتھ ہی حلال ہو سکتی ہیں۔ اور ان کا حساب اللہ کے ذمے ہے۔ مسلم صفحہ ۲۷۹ ج ۲۔

اس حدیث میں متعدد امور ایسے بیان کئے گئے ہیں جو پہلی احادیث میں قطعاً نہ پائے جاتے۔ امام مسلم نے اس روایت کو بطورِ شہادت پیش کیا ہے۔ اور وہ اس روایت سے صرف اتنی بات ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ حضور نے حضرت علیؓ کو خیبر کے روز رایہ عنایت کیا۔ اُن کی آنکھوں میں لعابِ دہن لگایا اور ان کے ہاتھ پر فتح ہوئی۔ وہ اصل روایت ہم بعد میں پیش کریں گے۔ لیکن یہ وہ روایت ہے جس کے باعث شبلی نے یہ لکھا ہے کہ اُس روز حضرت عمرؓ کی خودداری بھی قائم نہیں رہی۔

لیکن ہمارے نزدیک یہ روایت کوئی اعلیٰ پیمانے کی نہیں ہے جس کی تین وجوہات ہیں۔

۱۔ امام مسلم نے مقدمہ میں خود یہ دعویٰ کیا ہے کہ میں بطورِ شہادت ایسے راویوں کی روایات بھی پیش کروں گا۔ جو حفظ حدیث میں اعلیٰ درجہ کے نہ ہوں گے۔

۲۔ اس روایت کا ایک راوی سہیل بن ابی صالح ہے۔ اگرچہ یہ ثقہ ہے۔ لیکن بعض محدثین کو اس کے حافظہ کے باعث اس پر اعتراض ہے۔ اسی لئے بخاری نے ان سے کوئی روایت نہیں لی۔ امام ذہبی اس پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ ان کا شمار ثقہ علماء میں ہوتا ہے۔ لیکن دیگر افراد ان سے بہتر ہیں۔

عباس دوری نے یحییٰ بن معین سے نقل کیا ہے۔ یہ حدیث میں قوی نہیں۔ ایک بار فرمایا اس کی حدیث حجت نہیں۔ امام احمد فرماتے ہیں اس کی حدیث اچھی ہوتی ہے۔ ذہبی کہتے ہیں اس سے امام مالک اور امام شعبہ نے بھی روایات لی ہیں۔ لیکن بعد میں یہ بیمار ہوا۔ جس

کی وجہ سے کچھ احادیث بھول گیا۔ علی بن المدینی کا بیان ہے کہ اس سہیل کا ایک بھائی مرگیا تھا۔ جس کا اس پر اتنا غم پڑا کہ یہ بہت سی احادیث بھول گیا۔ ابن ابی خثیمہ نے یحیٰی بن معین سے یہ نقل کیا ہے کہ محدثین ہمیشہ اس کی حدیث سے بچتے رہے۔ ایک بار فرمایا یہ کچھ نہیں ہے امام مالک نے اس سے جو روایات لی ہیں وہ اس کے مرض سے پہلے لی ہیں۔ حاکم کا بیان ہے کہ امام مسلم نے اس سے بہت سی روایتیں نقل کی ہیں۔ جن میں سے اکثر بطور شہادت ہیں۔

۳۔ حضرت ابو ہریرہؓ جنگ خیبر کے بعد ایمان لائے ہیں۔ وہ اس واقعہ کے شاہد نہیں۔

لہٰذا اس حدیث میں جتنی نئی باتیں آئی ہیں وہ قطعاً قابل قبول نہیں۔ مثلاً حضرت عمرؓ کی علمبرداری کی تمنا۔ پیچھے مڑ کر نہ دیکھنا۔ چلا کر حضور سے گفتگو کرنا اور خاموشی سے راز و نیاز کی باتیں کرنا یہ تمام امور دلیل طلب ہیں اور یہ روایت خود دلیل نہیں بن سکتی۔

اب ایک اور حدیث کی جانب آیئے جو حضرت سعدؓ بن ابی وقاص سے مروی ہے۔

وہ حضرت علیؓ کی فضیلت بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

میں نے خیبر کی جنگ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے سنا کہ میں کل ایک ایسے شخص کو رایہ دوں گا کہ جو اللہ اور اس کے رسول سے محبت کرتا ہوگا۔ اور اللہ اس کے رسول کو بھی اس سے محبت ہوگی۔ سعدؓ کہتے ہیں ہمیں اس رایہ کی آرزو تھی۔ آپ نے فرمایا علیؓ کو بلاؤ۔ انہیں لایا گیا۔ اُن کی آنکھیں دکھ رہی تھیں۔ آپ نے اُن کی آنکھوں میں لعاب دہن لگایا جس سے وہ اچھی ہوگئیں۔ پھر انہیں رایہ دیا۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں فتح عنایت فرمائی۔

مسلم ج ۲ ص ۲۷۸۔

گویا حسب ذیل امور تو متفق علیہ ہوئے۔

۱۔ خیبر کی کسی جنگ میں حضرت علیؓ کو رایہ دیا گیا اور حضرت علیؓ کے ہاتھ پر فتح ہوئی۔

لیکن یہ کسی حدیث میں نہیں کہ یہ کون سا قلعہ تھا۔

۲۔ حضرت علیؓ کو رایہ دیا گیا اور ہونا بھی یہی چاہیئے تھا۔ کیونکہ علم تو حضور کے پاس تھا۔

۳۔ پہلے ہی سے اللہ اور اس کے رسول کی محبت کا اعلان کیا گیا جس کی وجہ سے ہر شخص کو رایہ کی تمنا تھی۔
۴۔ حضرت علیؓ کی آنکھیں دکھ رہی تھیں جو حضور کے لعاب دہن لگانے سے اچھی ہوگئیں۔
۵۔ اس روز دو معجزے ظاہر ہوئے۔ حضرت علیؓ کی نگاہوں کا اچھا ہونا اور فتح حاصل ہونا۔
بقیہ امور کا ان احادیث میں کوئی تذکرہ نہیں۔

اب صرف ایک حدیث باقی رہ گئی ہے۔ جو حضرت سلمہؓ بن الاکوع سے مسلم میں مروی ہے۔ حضرت سلمہؓ کی ایک حدیث تو بخاری و مسلم کے حوالہ سے پہلے گزر چکی ہے۔ جو بہت مختصر تھی۔ جسے حضرت سلمہؓ سے اُن کے شاگرد یزید بن عبید نے نقل کیا تھا۔ لیکن اُن سے اُن کے صاحبزادے ایاس نے ایک تفصیلی روایت نقل کی ہے۔ جس میں حضرت سلمہؓ نے پہلے بنو فزارہ سے اپنی جنگ کا حال بیان کیا ہے۔ پھر عامرؓ بن الاکوع کا مرحب سے مقابلہ کا تذکرہ کیا اور عامر کی شہادت کا تذکرہ کیا ہے۔ پھر اس کے بعد فرماتے ہیں۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علیؓ کو لانے کے لئے مجھے روانہ کیا۔ اور فرمایا میں ایسے شخص کو رایہ دوں گا جو اللہ اور اس کے رسول سے محبت کرتا ہوگا اور اللہ اور اس کے رسول کو بھی اس سے محبت ہوگی۔ سلمہؓ کہتے ہیں میں علیؓ کو لے کر آیا اور میں انہیں سہارا دیتے ہوئے تھا۔ جب میں انہیں لے کر حضور کی خدمت میں پہنچا تو آپ نے ان کی آنکھوں میں لعاب دہن لگایا۔ جس سے ان کی آنکھیں اچھی ہوگئیں۔ آپ نے ان کو رایہ دیا۔ اتنے میں مرحب یہ اشعار پڑھتا ہوا نکلا۔

قد علمت خیبر انی مُرحب   شاکی السلاح بطل مجرب

خیبر جانتا ہے کہ میں مرحب ہوں، ہتھیار بند اور تجربہ کار بہادر ہوں۔
جس کے جواب میں حضرت علیؓ یہ رجز پڑھتے ہوئے نکلے۔

انا الذی سمتنی امی حیدرہ   کلیث غابات کریہ المنظرہ

میری ماں نے میرا نام حیدر رکھا ہے   میں جنگل کے خوفناک شیر کی طرح ہوں

پھر حضرت علیؓ نے مرحب کے سر پر وار کیا۔ اور اسے قتل کر دیا۔ اور ان کے ہاتھ پر فتح حاصل ہوئی۔

اس حدیث میں صرف نئی بات مرحب کا قتل ہے۔ بقیہ امور وہی ہیں۔

ان تمام احادیث پر غور کیجیے ان میں آپ کو کہیں قلعہ کا دروازہ اکھاڑنے اور اسے سپر بنانے کا ذکر نہیں ملے گا۔ نہ آپ کو ابوبکرؓ و عمرؓ کی ناکامی نظر آئے گی۔ صرف حضور کے معجزات نظر آئیں گے۔ اگر انہیں درمیان سے نکال دیا جائے تو حضرت علیؓ کے لئے تین خوبیاں ثابت ہوتی ہیں آپ کی آنکھوں کا اچھا ہونا۔ اللہ اور اس کے رسول کا آپ سے راضی ہونا اور آپ کو رایہ ملنا اور کامیابی حاصل ہونا۔ یہ امور تو متفقہ ہیں۔ رہا مرحب کا قتل تو اس میں اختلاف ہے۔

اس حدیث سے تو یہ ثابت ہوتا ہے کہ مرحب کے قاتل حضرت علیؓ ہیں۔ لیکن دوسری جانب تمام مورخین۔ مثلاً موسیٰ بن عقبہ، محمد بن اسحاق۔ مجمع بن حارثہ، سلمۃ بن سلامہ، واقدی ابن ہشام۔ طبری۔ امام زہری اور حضرت جابر بن عبداللہ انصاری اس کے دعویدار ہیں کہ مرحب کو حضرت محمدؓ بن مسلمہ نے قتل کیا۔

حضرت جابرؓ کی روایت موسیٰ بن عقبہ نے زہری اور ابوالاسود کے ذریعہ حضرت جابرؓ سے نقل کی ہے۔ حضرت جابرؓ خود شریک جنگ تھے۔ بقیہ تمام راوی بھی نہایت معتبر ہیں لیکن ہمارے نزدیک یہاں دو مشکلات درپیش ہیں۔

۱۔ موسیٰ بن عقبہ کی کتاب کا آج دنیا میں کوئی وجود نہیں۔ پہلے علماء نے اُن کی اس روایت کے حوالہ دیئے ہیں۔

۲۔ ان حوالوں پر اس وقت تک اعتماد نہیں کیا جا سکتا۔ جب تک نیچے کی سند بیان نہ کی جائے اور یہ ثابت نہ کیا جائے کہ موسیٰ تک جتنے راوی ہیں سب ثقہ اور معتبر ہیں اور

جب تک اس کا ثبوت دستیاب نہیں ہوتا اُس وقت تک اس روایت کی کوئی پوزیشن نہیں ہے محمد بن اسحاق یا واقدی تو اُن کا تفصیلی حال ہم پہلے بیان کر چکے ہیں۔

رہی یہ حدیث جو حضرت سلمہؓ سے مروی ہے جس میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ مرحب کو حضرت علیؓ نے قتل کیا۔ اس میں بھی کچھ اشکالات ہیں۔

۱۔ بقیہ احادیث جو ہم نے پیش کیں اُن میں اس واقعہ کا کہیں تذکرہ نہیں۔

۲۔ سلمہؓ سے حضرت علیؓ والے معاملے کو دو شخصوں نے نقل کیا ہے۔ ایک یزید بن ابی عبید اور دوسرے ان کے صاحبزادے ایاس نے۔ یزید مرحب کے قتل کا کوئی ذکر نہیں کرتے۔ صرف ایاس ذکر کرتے ہیں۔ ایاس سے اسے نقل کرنے والا عکرمۃ بن عمار ہے۔ کوئی اور نقل نہیں کرتا گویا اس روایت کا تمام دارومدار اس پر موقوف ہے کہ ایاس بن سلمہ اور عکرمۃ بن عمار کس حیثیت کے لوگ ہیں۔ ایاس تو سلمہؓ کے صاحبزادے ہیں اور تمام محدثین نے انہیں ثقہ اور امام مانا ہے۔ اب صرف عکرمۃ بن عمار کی ذات کو دیکھنا ہے۔

۳۔ عکرمۃ بن عمار یمامہ کا باشندہ تھا۔ قبیلہ بنو عجل سے تعلق رکھتا تھا۔ یحییٰ بن معین فرماتے ہیں۔ اگرچہ امی تھا لیکن حافظ الحدیث تھا۔ یعقوب بن شیبہ کا بیان ہے کہ ہم سے متعدد افراد نے یحییٰ بن معین کا یہ قول نقل کیا ہے کہ عکرمہ ثقہ ہے۔ حدیث میں ثابت ہے۔ ابوحاتم کہتے ہیں سچا ہے لیکن کبھی کبھی وہم کا شکار ہو جاتا ہے۔ عاصم بن علی کہتے ہیں یہ مستجاب الدعوات تھا۔ یحییٰ بن سعید القطان فرماتے ہیں۔ اس کی وہ روایات ضعیف ہوتی ہیں جنہیں یہ یحییٰ بن ابی کثیر سے نقل کرتا ہے۔ امام احمد فرماتے ہیں۔ یہ ضعیف الحدیث ہے۔ لیکن اس کی وہ حدیث اچھی ہوتی ہے جو ایاس سے نقل کرتا ہے۔ (یہ حدیث بھی اس نے ایاس ہی سے نقل کی ہے۔) علی بن المدینی فرماتے ہیں عکرمہ تو ہمارے نزدیک ثقہ ہے اور مسلم امام ہے۔ حاکم کہتے ہیں کہ مسلم نے اس سے بطور شہادت متعدد احادیث نقل کی ہیں۔

بخاری کہتے ہیں۔ اس کی وہ روایات ضعیف ہیں جو یہ یحییٰ بن ابی کثیر سے نقل کرتا ہے۔ امام احمد فرماتے ہیں اس کی یحییٰ والی روایات کمزور ہیں۔ میزان الاعتدال ص۹۰ ج ۲

حاصل کلام یہ ہے کہ عکرمہ بن عمار کی صرف وہ روایات ناقابل قبول ہیں جو یہ یحییٰ بن ابی کثیر سے نقل کرتا ہے۔ بقیہ اس کی روایتیں معتبر ہوتی ہیں اور امام احمد کے نزدیک وہ روایت تو بہت عمدہ ہوتی ہے جو یہ ایاس بن سلمہؓ سے نقل کرتا ہے۔ اور اتفاق سے اس حدیث کی روایت عکرمہ نے ایاس بن سلمہؓ سے نقل کی ہے۔ پھر عکرمہ سے متعدد ثقہ راویوں نے نقل کیا ہے۔ لہٰذا مسلم کی اس حدیث کو مورخین کی بلا سند باتوں سے رد نہیں کیا جا سکتا۔ لہٰذا صحیح یہی ہے کہ مرحب کے قاتل حضرت علیؓ ہیں حالانکہ ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ اس جگہ مورخین کی بات قبول کی جاتی۔ کیونکہ وہ شیعہ تھے۔ اور شیعہ مجبور ہو کر ہی ایسی بات کہہ سکتا ہے لیکن محدثین نے عکرمہ کی کئی روایتوں کو منکر قرار دیا ہے۔ اس لحاظ سے یہ روایت مشکوک ہے۔

ان احادیث کے ذریعہ تابعین کے سامنے جواہر آئے ہیں۔ اُن کے علاوہ سب سبائی داستانیں اور سپید جھوٹ ہیں۔ ان احادیث میں کسی صحابی نے یہ الفاظ نہیں کہے کہ آپ فاتح خیبر ہیں۔ اس لئے کہ یہ تو متعدد صحابہ کے حق پر صریح ڈاکہ ہے۔ بلکہ کمانڈر انچیف ہونے کی حیثیت سے یہ لقب تو حضور کو حاصل ہونا چاہیئے۔ نہ کہ صرف ایک قلعہ کے فاتح کو۔ واللہ اعلم

کیا حضرت عمرؓ نے اپنی بیٹی کو زندہ دفن کر دیا تھا؟

اس قسم کی داستانیں عام طور پر سننے میں آتی رہتی ہیں۔ اور ہمارے قصہ گو ملا ان کی تشہیر کرتے رہتے ہیں۔ ان میں سے اکثر داستانیں ایسی ہوتی ہیں جن کا کوئی وجود نہیں ہوتا۔ نہ کسی تاریخ کی کتاب میں وہ نظر آتی ہیں۔ دراصل اُن کی ابتدا تو ایک مخصوص طبقہ کی جانب سے ایک سوچی سمجھی اسکیم کے تحت ہوتی ہے۔ لیکن اس کی تشہیر کا ذریعہ ہمارے اہل سنت حضرات بنتے ہیں، کیوں کہ اب انہوں نے اس نصب العین کو اپنا رکھا ہے کہ جو بات بھی سُنو اس پر بلا تحقیق ایمان لے آؤ، اسی باعث سنی کی تعریف یہ بیان کی جاتی ہے کہ جو سُن کر ایمان لاتے اور اسی لئے کسی کہانی یا داستان کے سلسلے میں ذرا سا بھی غور و فکر نہیں کیا جاتا۔

شاید ہم اس موضوع پر کوئی قلم نہ اٹھاتے لیکن جب ہمارے علم میں یہ بات آئی کہ یہ رام کہانی کراچی کے ایک مشہور مفتی اور شیخ الحدیث نے مسجد کے منبر پہ دوران تقریر بیان کی ہے۔ تو ہم ان سطور کے لکھنے پر مجبور ہوئے۔ حالانکہ علماء کرام کو یہ سوچنا چاہیئے کہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں سنی ہوئی باتوں کے سلسلہ میں یہ حکم دیا ہے۔

يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِنْ جَاءَكُمْ فَاسِقٌ بِنَبَإٍ فَتَبَيَّنُوا۔ — اے ایمان والو۔ اگر تمہارے پاس فاسق خبر لے کر آئے تو تم تحقیق کر لیا کرو۔

یہی وجہ ہے کہ محدثین کرام نے راویوں کے حالات معلوم کرنے اور حقیقت حال معلوم کرنے میں اپنی زندگیاں تج دیں اور ایک ایسے فن کو وجود بخشا جو آج تک دنیا کی کسی قوم میں نہیں پایا گیا یعنی علم الرجال۔ اسی کام کے لئے علم الروایہ، علم الدرایہ اور علم الجرح والتعدیل وجود میں لائے گئے۔

کاش مفتی صاحب یہ بتا دیتے کہ یہ داستان فلاں کتاب میں پائی جاتی ہے تو ہم اس کی تحقیق کرتے ہم نے تو آج تک حضرت عمرؓ کے حالات میں جتنی کتابوں کا مطالعہ کیا۔ ہمیں تو آج تک ایسا کوئی واقعہ نظر نہیں آیا کہ حضرت عمرؓ نے اسلام سے قبل اپنی کسی بیٹی کو دفنایا ہو۔ ہمارے نزدیک نہ صرف یہ خلاف نقل ہے۔ بلکہ خلاف عقل بھی ہے۔ جس کی متعدد وجوہات ہیں۔

۱۔ ہمیں پوری تاریخ میں بھی آج تک یہ کہیں نظر نہیں آیا کہ خاندان قریش کے کسی فرد نے اپنی بیٹی کو کبھی دفن کیا ہو اور نہ اسے دنیا کا کوئی عالم اور مورخ ثابت کر سکتا ہے۔

۲۔ یہ رسم بنو تمیم خاندان میں پائی جاتی تھی، وہیں سے اس کی ابتدا ہوئی۔ حتیٰ کہ جب قیس بن عاصم جو قبیلہ بنی تمیم کے سردار تھے ایمان لائے۔ تو انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے اس کا اقرار کیا کہ انہوں نے اپنی آٹھ لڑکیاں زندہ دفن کی تھیں۔ یہ واقعہ تفسیر ابن جریر میں پایا جاتا ہے۔

۳۔ اسلام سے قبل اس رسم کے انسداد کے لئے ایک دو افراد نے لڑکیوں کی قیمت دکر

ان کے والدین سے خریدا، اور اُن کی پرورش کی۔ اس سلسلہ میں دو افراد نے بہت نام پیدا کیا جن میں سے ایک صعصعہ تھے جو مشہور شاعر فرزدق کے دادا تھے اور دوسری شخصیت زید بن عمرو بن نفیل کی تھی۔

زید بن عمرو بن نفیل بعثت نبوی سے قبل دینِ ابراہیمی کے پیروکار تھے، وہ اس قسم کی لڑکیوں کو اپنی آغوشِ شفقت میں لیتے اور اُن کی پرورش کرتے۔ جب وہ جوان ہو جاتیں تو اُن کے والدین سے جاکر کہتے کہ تم اگر پسند کرو تو اپنی لڑکیاں واپس لے سکتے ہو اور چاہو تو میرے پاس رہنے دو۔ صحیح بخاری ص۵۴۰ ج ۱ باب حدیث زید بن عمرو بن نفیل۔

یہ زید بن عمرو بن نفیل حضرت عمرؓ کے خاندان سے نہ صرف قریبی تعلق رکھتے ہیں۔ بلکہ سگے چچازاد بھائی ہیں۔ حضرت عمرؓ کی بہن ان کے صاحبزادے سعیدؓ کے نکاح میں تھیں۔ اور ان زید کی صاحبزادی حضرت عمرؓ کے نکاح میں آئیں۔

جس خاندان کے افراد دوسروں کی بچیوں کی جان بچانے کے لئے انہیں خریدتے، اُن کی پرورش کرتے اور اُن کی تمام ذمہ داریاں پوری کرتے۔ اُس خاندان کی سب سے مایۂ ناز ہستی خود اپنی بچی کو دفن کرے۔ یہ تاریخ کے ساتھ نہ صرف بدترین مذاق ہے۔ بلکہ حضرت عمرؓ اور ان کے خاندان کو بدنام کرنے کا ایک مضحکہ خیز ذریعہ ہے۔ ایسی بات وہی کینہ پرور افراد کہہ سکتے ہیں جن کا عقیدہ یہ ہو۔

عمر زآل عمر کینہ قدیم است عجم را

۴۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جب فتح مکہ کے روز قریش کی عورتوں سے بیعت لی اور یہ ارشاد فرمایا کہ اپنی اولاد کو قتل نہ کروگی۔ تو حضرت ہندؓ نے عرض کیا تھا۔

ربینا هم صغارا و	ہم نے تو بچپن میں ان کی پرورش کی تھی
قتلتهم کبارا۔	بڑے ہونے کے بعد آپ ہی نے انہیں قتل کیا۔

یہ واقعہ کتب احادیث اور کتب سیر میں بالتفصیل موجود ہے۔ جو اس امر کا بین ثبوت ہے کہ قریشی خاندان اس مرض سے پاک تھا۔ اس کی تائید نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس فرمان سے بھی ہوتی ہے۔

نساء قریش خیر نساء رکبن الابل احناء علی یتیم فی صغرہ وارعاہ علی زوج فی بیدہ ؂ مسلم ج ۲ ص

اونٹوں پر سوار ہونے والی عورتوں میں سب سے بہتر قریش کی عورتیں ہیں۔ جو بچوں پر بچپنے میں بہت مہربان ہوتی ہیں۔ اور خاوند کے مال کا بہت خیال رکھتی ہیں۔

۵۔ جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم مبعوث ہوئے۔ اس وقت حضرت عمرؓ کی عمر ستائیس سال تھی شبلی لکھتے ہیں۔

حضرت عمرؓ کا ستائیسواں سال تھا کہ آفتاب رسالت طلوع ہوا یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مبعوث ہوئے۔ سیرت النبی ص۲۲۳ ج ۱۔ اور حضرت عمرؓ کے اسلام سے قبل ان کی جتنی اولاد ہوئی سب حیات تھی۔ مثلاً ام المؤمنین حفصہؓ اور حضرت عبداللہ بن عمرؓ

۶۔ عرب میں ہمیشہ کنیت پہلی اولاد کے نام پر رکھی جاتی تھی۔ جیسے حضور کی کنیت ابوالقاسم ہے۔ اسی طرح حضرت عمرؓ کی کنیت متفقہ طور پر ابوحفص ہے۔ جو ام المؤمنین حضرت حفصہؓ کی نسبت سے ہے۔ یہ اس امر کا ثبوت ہے کہ حضرت عمرؓ کی پہلی صاحبزادی ام المؤمنین حضرت حفصہؓ تھیں اس قسم کے مفتی صاحبان کہیں یہ تو منصوبہ نہیں بنا رہے ہیں کہ ام المؤمنین حفصہؓ کو حضرت عمرؓ کی اولاد سے خارج کیا جائے۔ اس قسم کی حرکت ایک مجوسی اور سبائی کر سکتا ہے۔ نہ کہ کوئی سنی۔

۷۔ آیئے اب ہم اس واقعہ پر ایک اور لحاظ سے نظر ڈالتے ہیں اور وہ یہ کہ حضرت عمرؓ نے کتنی شادیاں فرمائیں اور کس بیوی سے ان کی کتنی اولاد ہوئی اور سب سے پہلے کس عورت سے شادی ہوئی اور اس سے کتنے بچے پیدا ہوئے۔ تاریخ نے یہ تمام روداد محفوظ رکھی ہے۔ لیکن ہم

یہ تفصیل امام ابن الجوزی کی حیات فاروق اعظم سے نقل کرتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں۔

حضرت عمرؓ نے متعدد شادیاں فرمائیں۔ جن سے متعدد اولاد ہوئی۔ سب سے پہلی شادی حضرت زینبؓ بنت مظعون سے کی۔ یہ مظعون بن حبیب بن منافہ بن حجح کی صاحبزادی اور حضرت عثمانؓ بن مظعون کی بہن ہیں جو سابقین اولین میں سے تھے، اور حضور کے رضاعی بھائی تھے۔ ان زینبؓ سے حضرت عمرؓ کی تین اولادیں ہوئیں۔ حفصہؓ۔ عبداللہؓ اور عبدالرحمانؓ

۲۔ عاتکہؓ بنت زید بن عمرو بن نفیل۔ ان سے ایک لڑکا عیاض نامی پیدا ہوا۔

۳۔ جمیلہ بنت ثابت بن الافلح ان سے ایک لڑکا عاصم پیدا ہوا۔

۴۔ ام حکیمؓ بنت الحارث بن ہشام ان سے ایک لڑکی فاطمہ نامی پیدا ہوئی۔

۵۔ ام کلثوم بنت جرول بن مالک بن حبیب ان سے عبیداللہ اور زید الاکبر پیدا ہوئے۔

۶۔ ام کلثومؓ بنت علی بن ابی طالب ان سے زید الاصغر اور رقیہ پیدا ہوئیں۔

حضرت عمرؓ کی دو باندیوں سے بھی اولاد ہوئی۔ ان باندیوں کے نام فکیہ اور لہیہ تھے۔ فکیہ سے ایک لڑکی زینب پیدا ہوئی اور لہیہ سے عبدالرحمان الاوسط اور عبدالرحمان الاصغر پیدا ہوئے اس طرح حضرت عمرؓ کی اولاد حسب ذیل ہوئی۔

لڑکے۔ عبداللہ، عبدالرحمان الاکبر، عبدالرحمان الاوسط، عبدالرحمان الاصغر۔ زید الاکبر۔ زید الاصغر۔ عبیداللہ۔ عاصم۔ عیاض۔

لڑکیاں۔ حفصہ۔ رقیہ۔ فاطمہ۔ زینب۔

سب سے پہلی زوجہ حضرت زینبؓ بنت مظعون ہیں اور ان سے صرف تین بچے ہوئے ام المومنین حفصہ، حضرت عبداللہ بن عمرؓ اور حضرت عبدالرحمانؓ الاکبر اور ان تینوں میں سب سے بڑی حضرت حفصہؓ تھیں۔ اسی لئے حضرت عمرؓ کی کنیت ابو حفص ہوئی جس وقت حضرت عمرؓ اسلام لائے۔ اس وقت تک اُن کے یہی تین بچے ہوئے۔ اب اگر کوئی احمق اور جاہل مفتی یہ دعویٰ کرتا ہے کہ حضرت عمرؓ نے اپنی ایک یا متعدد لڑکیوں کو دفن کیا تھا۔ اسے سب

سے اول تو یہ ثابت کرنا ہوگا کہ وہ لڑکیاں کس بیوی کے پیٹ سے پیدا ہوئیں، ثانیاً جب انہیں لڑکیوں سے اتنی نفرت تھی تو پھر لڑکی کے نام پر اپنی کنیت کیوں رکھی؟ ظاہر ہے کہ حضرت حفصہؓ پہلی صاحبزادی تھیں اسی مناسبت سے کنیت ان کے نام سے رکھی گئی اور اسی سے مشہور ہوئے۔

ممکن ہے کہ مفتیؔ صاحب وغیرہ کو اس واقعہ سے مغالطہ واقع ہوا ہو جو سنن دارمی میں وضینؔ سے ان الفاظ میں مروی ہے کہ

ایک شخص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا، اور عرض کیا۔ یا رسول اللہ ہم جاہل لوگ تھے۔ بتوں کی پوجا کرتے اور اولاد کو قتل کیا کرتے تھے۔ میری ایک بیٹی تھی، میں جب اس کو بلاتا، تو میرے بلانے پر وہ بھاگی آتی، اور بہت خوش ہوتی ایک روز میں نے اسے جو آواز دی، وہ میرے پیچھے لگی چلی آئی۔ قریب ہی میں ایک کنواں تھا، میں نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے کنویں میں دھکا دے دیا۔ اس کی زبان سے جو آخری آواز نکلی وہ یہ تھی۔ اے میرے ابا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم یہ سن کر رونے لگے۔ حتیٰ کہ آپ کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس بیٹھنے والوں میں سے ایک شخص نے اس سے کہا کہ تو نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو غمگین کر دیا ہے۔ آپ نے ارشاد فرمایا یہ اس سے بھی اہم سوال کرنے کے لئے آیا ہے۔ اس کے بعد آپ اس سے مخاطب ہوئے اور فرمایا۔ یہ واقعہ دوبارہ بیان کرو، اس نے اس کا اعادہ کیا۔ حتیٰ کہ حضور اس واقعہ کو سن کر اتنا رو دیئے کہ آپ کی داڑھی آنسوؤں سے تر ہو گئی۔ پھر ارشاد فرمایا۔ زمانۂ جاہلیت میں ان لوگوں نے جو افعال انجام دیئے۔ وہ اللہ نے اسلام کے ذریعہ مٹا دیئے۔ اب از سر نو عمل کرو۔ سنن دارمی ص۳ ج ا

یہ ایک نامعلوم شخص کا واقعہ ہے۔ یار لوگوں نے اسے حضرت عمرؓ کی جانب منسوب کر دیا۔ حالانکہ یہ واقعہ سرے سے صحت کے ساتھ ثابت نہیں۔ کیونکہ اس واقعہ کا آخری راوی وضینؔ ہے۔ جو ۸۰ھ میں پیدا ہوا۔ اس کی موت ۱۴۹ھ میں ہوئی۔ یہ اوپر کے راوی بیان نہیں کرتا۔ کیا اس نے اپنی پیدائش سے اسی سال قبل ہی اس واقعہ کو سُن اور دیکھ لیا تھا۔ اس لحاظ سے یہ روایت منقطع

ہے اور اوپر کے دو راوی غائب ہیں۔

پھر یہ وضین خود نا قابل اعتبار ہے، بخاری و مسلم اور نسائی نے اس کی روایت نہیں لی۔ ابن سعد کہتے ہیں ضعیف ہے۔ ابو حاتم فرماتے ہیں۔ اس کی کچھ روایات تو اچھی ہوتی ہیں اور کچھ بہت ردی۔ جوزجانی کہتے ہیں اس کی روایت واہی ہوتی ہے۔ میزان الاعتدال ج ۴ ص ۳۳۶
حافظ ابن حجر لکھتے ہیں اس کا حافظہ بہت ردی تھا۔ تقریب ص ۳۶۹

جب یہ واقعہ خود سرے سے ثابت نہیں اور پھر اس میں اس شخص کا نام مذکور نہیں۔ اسے حضرت عمرؓ کی جانب منسوب کرنا۔ ایسی حرکت صرف وہی شخص کر سکتا ہے، جو خالص سبائی ذہن رکھتا ہو، افسوس یہ ہے کہ ہمارے علما شیعہ ذہن اور اُن کی سازشوں کو سمجھنے سے قاصر رہے اور اپنی اس کوتاہی کے باعث سبائی روایات کے پروپیگنڈے میں تن من دھن سے لگ گئے۔ اللہ تعالیٰ انہیں اس سازش کو سمجھنے اور اُن کی پھیلائی ہوئی داستانوں کی تحقیق کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔

حضرت حسنؓ کب پیدا ہوئے؟

ہجرت کے تیسرے سال ماہِ شوال میں جنگ اُحد واقع ہوئی۔ اس کے بعد حضرت فاطمہؓ کی حضرت علیؓ سے شادی ہوئی۔ حاشیہ بخاری میں کرمانی کے حوالہ سے مذکور ہے۔

أنكحها رسول الله صلى الله عليه وسلم عليا بعد وقعة أحد	رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فاطمہؓ کا نکاح علیؓ سے جنگ اُحد کے بعد کیا۔

حاشیہ بخاری ص ۵۳۲ ج ۱

اس طرح یہ شادی ۳ھ کے آخر میں ہوگی یا ۴ھ کی ابتدا میں۔ ملا باقر مجلسی ایرانی لکھتے ہیں۔ یہ مزاوجت با سعادت پنجشنبہ اکیسویں ماہِ محرم کو واقع ہوئی۔ جلاء العیون اردو ص ۱۶۶ ج ۱

جب یہ نکاح جنگ احد کے بعد ہوا تو اب محرم کا مہینہ ۳ھ کا پہلا مہینہ ہوگا۔ لہٰذا مؤرخین کا یہ دعویٰ کہ حضرت حسن ۳ھ میں پیدا ہوئے یہ سوائے ایک بیہودہ مذاق کے اور کچھ نہیں۔ اس لئے کہ جب والد محترم کی شادی محرم ۳ھ میں ہو رہی ہے تو وہ ۳ھ میں کیسے پیدا ہو جائیں گے۔ اس سے زیادہ بیہودہ تبرا حضرت حسنؓ کی ذات پر اور کیا ہو سکتا ہے۔

حضرت فاطمہؓ کے پانچ بچے ہوئے حسن، حسین، محسن، ام کلثوم اور زینب۔ اس پر تو اتفاق ہے کہ محسن بچپن میں انتقال کر گئے تھے اور اس پر بھی اتفاق ہے کہ حضرت حسین حضرت حسن سے چھوٹے تھے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ سب سے پہلے حضرت فاطمہؓ کے جو بچہ پیدا ہوا وہ کونسا بچہ تھا۔ سبائیوں اور مؤرخین کا دعویٰ یہ ہے کہ سب سے اول حضرت حسنؓ پیدا ہوئے۔ لیکن وہ خود ہی اس قسم کے واقعات بیان کرتے ہیں۔ جس سے ان کے اس دعوے کی تردید ہو جاتی ہے۔

ملا باقر مجلسی ایک مقام پر لکھتے ہیں۔

...... یہ سن کر جناب فاطمہؓ کو نہایت صدمہ ہوا، اور متفکر و متردد ہوئیں۔ یہاں تک کہ رات ہو گئی۔ جب رات ہوئی امام حسنؓ کو دائیں اور امام حسینؓ کو بائیں کاندھے پر بٹھایا۔ اور بایاں ہاتھ ام کلثومؓ کا اپنے ہاتھ میں لیا۔ اور اپنے پدر بزرگوار کے گھر تشریف لے گئیں ...... واپسی میں جناب رسول خدا نے امام حسنؓ کو اور فاطمہؓ نے امام حسین کو اٹھایا۔ اور ام کلثومؓ کا ہاتھ پکڑ کر گھر سے مسجد میں تشریف لائے۔ جلاء العیون ج ۱ ص ۲۱۷، ص ۲۱۸

خط کشیدہ الفاظ کو غور سے پڑھئے اور سوچئے کہ ان بچوں کی عمر زیادہ ہوگی جنہیں کاندھوں پر اٹھا کر لے جایا جا رہا ہے یا ام کلثومؓ کی عمر زیادہ ہوگی۔ جو ہاتھ تھام کر پیدل چل رہی ہیں۔ یہ واقعہ خود یہ ثابت کر رہا ہے کہ حضرت ام کلثومؓ حضرت حسنؓ و حسینؓ سے عمر میں بڑی تھیں۔ جب ۲ھ میں حضرت علیؓ کی شادی ہوئی تو پہلے جو بچہ پیدا ہوگا وہ ام کلثومؓ ہوں گی۔ گویا حضرت حسنؓ کی پیدائش ۳ھ سے قبل تو ممکن ہی نہیں اور وہ بھی سال کے آخری مہینوں میں یہی وہ ام کلثومؓ ہیں جو حضرت عمرؓ کے نکاح میں آئیں۔ جن سے حضرت عمرؓ کا ایک لڑکا زید اور ایک لڑکی رقیہ

پیدا ہوئی۔ یہ تمام گُل اس لئے کھلائے گئے کہ تاکہ سبائی یہ ثابت کر سکیں کہ جب ام کلثوم کا حضرت عمرؓ سے نکاح ہوا، تو وہ پانچ سالہ بچی تھیں۔ سبائیوں کے اس دھوکہ میں بڑے بڑے علماء آ گئے حتیٰ کہ حافظ ابن حجر نے اصابہ میں اور ابن حجر ہیثمی نے الصواعق المحرقہ میں پانچ سال والی کہانیاں نقل کر ڈالیں۔ حالانکہ مسئلہ بالکل واضح تھا کہ حضرت ام کلثومؓ سنہ ۶ھ میں پیدا ہوئیں اور سنہ ۱۷ھ میں حضرت عمرؓ کے نکاح میں جب آئیں تو ان کی عمر تیرہ سال سے زیادہ تھی۔ گویا ایک سوچی اور سمجھی سازش کے تحت حضرت ام کلثوم کی عمر گھٹائی گئی اور حضرت حسنؓ کی عمر بڑھائی گئی۔ اس سے حضرت حسنؓ کی ذات پر تو کوئی خاص اثر پیدا نہیں ہوا۔ لیکن ایک تو سبائیوں کو اس طریقہ سے حضرت عمرؓ کی ذات پر کیچڑ اچھالنے کا موقعہ ملا۔ اور دوسرا فائدہ یہ ہوا کہ حضرت حسینؓ کی عمر میں اضافہ ہو گیا۔ جس سے اُن کی صحابیت ثابت کرنے کی راہیں ہموار ہو گئیں۔ تیسرا فائدہ یہ ہوا کہ حضرت حسینؓ کے بارے میں جو فرضی روایات وضع کر کے پھیلائی گئی تھیں۔ وہ سنیوں کے حلق سے آسانی کے ساتھ نیچے اتر گئیں۔ اس طرح مدعی سست اور گواہ چست والا مسئلہ بن گیا۔

ہمارے تمام مؤرخین اور مجوسی اس پر متفق ہیں۔ کہ جب حضرت حسنؓ پیدا ہوئے تو ان کی دایہ گیری کی خدمات حضرت اسماءؓ بنت عمیس نے انجام دیں۔ یہ ایک ایسی اہم بنیاد ہے جس سے تمام مسئلہ خود بخود واضح ہو جاتا ہے۔ ملا باقر مجلسی نے یہ واقعہ تفصیل کے ساتھ لکھا ہے۔ وہ آخر میں لکھتے ہیں۔

حضرت حسنؓ جب سات روز کے ہوئے۔ تو آنحضرت نے دو ابلق گوسفند عقیقہ میں ذبح کئے۔ اور اسماءؓ بنت عمیس دایہ کو ایک ران اور ایک اشرفی عطا فرمائی اور امام حسنؓ کے سر کے بال کٹوا کر برابر چاندی کے تصدق کر دیئے اور امام حسنؓ کے سر مبارک پر خلوق کہ ایک قسم کی خوشبو ہے لگائی اور فرمایا۔ اے اسماءؓ خون عقیقہ بچہ کے سر پر ملنا۔ جلاء العیون ص ۲۰۰ ج ۱

ہم اس واقعہ کو بدل و جان قبول کرتے ہیں۔ لیکن اپنے قارئین کو یہ بتانا ضروری سمجھتے ہیں کہ اسماءؓ بنت عمیس اولاً حضرت جعفرؓ کے نکاح میں تھیں جو حضرت علیؓ کے بڑے بھائی تھے

جب غزوہ موتہ میں حضرت جعفرؓ شہید ہوئے تو حضرت ابوبکرؓ نے ان سے نکاح کرلیا حضرت ابوبکرؓ کی وفات کے بعد یہ حضرت علیؓ کے نکاح میں آئیں۔

یہ حضرت اسمارؓ اور ان کے پہلے خاوند حضرت جعفرؓ نبوت کی ابتداء ہی میں ایمان لے آئے اور اہل مکہ کی ایذا رسانی کے سبب نبوت کے پانچویں سال ہجرت کر کے حبشہ چلے گئے۔ حضرت جعفرؓ ہی کی تبلیغ سے نجاشی شاہ حبش اور دیگر افراد ایمان لائے۔ یہ حضرات کب تک حبشہ میں رہے اور حبشہ سے ان کی کب واپسی ہوئی؟ اسی پر تمام فیصلہ کا دار و مدار ہے۔

تمام علماء اہل سنت، تمام محدثین و مؤرخین اور تمام سبائی اس امر پر متفق ہیں کہ مہاجرین حبش مدینہ اس وقت پہنچے ہیں۔ جب آپؐ خیبر کی جنگ سے فارغ ہوئے۔ ملا باقر مجلسی لکھتے ہیں۔

کلینی، شیخ طبرسی اور ابن بابویہ وغیرہ نے حسن، صحیح اور معتبر سندوں کے ساتھ حضرت صادق سے روایت کیا ہے اور امام حسن عسکری کی تفسیر میں مذکور ہے کہ بروز فتح خیبر آنحضرت نے فرمایا۔ میں نہیں سمجھتا کہ ان دونوں نعمتوں میں سے کس پر زیادہ خوش اور مسرور ہوں۔ خیبر کی فتح پر، یا جعفر کی واپسی پر۔ حیات القلوب ص ۶۲۹ ج ۲۔

یہ توشیعوں کی روایت تھی جو انہوں نے صحیح سند کے ساتھ جعفر اور حسن عسکری اپنے ائمہ سے نقل کی تھی۔ گویا اب اُن کے نزدیک یہ امر شک و شبہ سے بالاتر ہے۔ اور یہ ایک یقینی امر ہے کہ حضرت اسمارؓ بنت عمیس اپنے خاوند حضرت جعفرؓ کے ساتھ خیبر کے موقعہ پر مدینہ پہنچی ہیں۔

اب اہل سنت حضرات صحیح بخاری کی ایک حدیث بھی سُن لیں۔ جو انہوں نے اشعریین کی فضیلت میں نقل کی ہے۔ یہ حدیث حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ سے مروی ہے۔ وہ فرماتے ہیں۔

ہمیں جب یمن میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ہجرت مدینہ کی اطلاع ملی تو ہم لوگ آپ کی جانب (یعنی مدینہ کی طرف) ہجرت کے ارادے سے چلے۔ میرے ساتھ میرے دو بھائی ابو بردہؓ اور ابو رہم بھی تھے اور میں ان دونوں سے چھوٹا تھا۔ ہمارے ساتھ میری قوم (یعنی قبیلہ اشعر)

کے باون یا ترپن افراد تھے۔ ہم کشتی میں سوار ہوئے۔ لیکن مخالف ہواؤں نے ہماری کشتی کو نجاشی کے ملک حبشہ پہنچا دیا۔ وہاں ہم جعفرؓ بن ابی طالب سے ملے اور ان کے ساتھ وہیں مقیم رہے۔ حتیٰ کہ ہم سب مل کر مدینہ آئے۔

ہم حضور کی خدمت میں اس وقت پہنچے جب حضور نے خیبر فتح فرمایا تھا۔ ہم اشعریوں سے مہاجرین مدینہ کہنے لگے کہ ہم نے تم سے پہلے ہجرت کی ہے۔ حضرت ابوموسیٰؓ فرماتے ہیں اسماءؓ بنت عمیس جو ہمارے ساتھ آئی تھیں، ام المؤمنین حضرت حفصہؓ کے پاس چلی گئیں۔ ان اسماءؓ نے دیگر مہاجرین حبشہ کے ساتھ حبشہ کی جانب ہجرت کی تھی۔

حضرت عمرؓ اپنی بیٹی ام المؤمنین حضرت حفصہؓ کے پاس گئے۔ تو وہاں یہ اسماءؓ بنت عمیس موجود تھیں، حضرت عمرؓ نے جب انہیں دیکھا تو پہچانا نہیں۔ اپنی بیٹی سے سوال کیا یہ کون ہیں؟ انہوں نے جواب دیا اسماءؓ بنت عمیس۔ حضرت عمرؓ نے (ازروئے مذاق) فرمایا۔ کیا حبشیہ، کیا بحریہ؟ (سمندر والی) اسماءؓ بولی ہاں۔ اس پر حضرت عمرؓ نے فرمایا۔ ہم نے تم سے قبل ہجرت کی ہے۔ اس لئے ہم تم سے زیادہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حقدار ہیں۔

یہ سُن کر حضرت اسماءؓ غصہ میں بھر گئیں۔ بولیں ہرگز نہیں۔ اللہ کی قسم تم لوگ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تھے۔ تم میں سے کوئی بھوکا ہوتا تو حضور کھانا کھلاتے۔ اور تم میں سے جو جاہل ہوتا اسے حضور نصیحت کرتے۔ ہم تو بہت دور دشمن کی سرزمین حبشہ میں پڑے ہوئے تھے اور ہم نے یہ سب مصائب اللہ اور اس کے رسول کی خاطر اٹھائے تھے۔

اللہ کی قسم ہم ہر وقت خوف میں مبتلا رہتے، اور ہمیں اذیتیں بھی پہنچائی جاتیں۔ اللہ کی قسم میں اس وقت تک کچھ نہ کھاؤں گی، اور نہ پیوں گی۔ جب تک تمہاری یہ بات حضور تک نہ پہنچا دوں اور حضور سے یہ سوال نہ کرلوں۔ اللہ کی قسم میں جھوٹ نہ بولوں گی، نہ غلط بات کہوں گی۔ اور نہ اس بات میں کوئی اضافہ کروں گی۔

جب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے تو اسماءؓ نے عرض کیا یا رسول اللہ عمرؓ نے ایسا

ایسا ایسا کہا ہے۔ آپ نے سوال کیا تم نے کیا جواب دیا؟ انہوں نے جواب سنایا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا عمرؓ تم سے زیادہ میرا حقدار نہیں ہے کیونکہ اس کی اور اس کے ساتھیوں کی (یعنی مہاجرین مدینہ) ایک ہجرت ہے اور اے کشتی والو تمہاری دو ہجرتیں ہیں۔ اسماءؓ کا بیان ہے کہ ابوموسیٰ اشعریؓ اور دیگر کشتی والے گروہ در گروہ میرے پاس یہ (حدیث) دہرانے کے لئے بار بار آدمی بھیجتے رہتے تھے۔ ان کے لئے اس سے زیادہ عظیم اور خوش کن کوئی چیز نہ تھی۔ ابوبردہ کا بیان ہے کہ اسماءؓ کہتی ہیں کہ ابوموسیٰؓ اشعری بار بار میرے پاس آتے تھے اور بار بار مجھ سے یہ حدیث دریافت کرتے تھے۔

ابوموسیٰؓ فرماتے ہیں۔ جب ہم فتح خیبر کے فوراً بعد حضور کی خدمت میں پہنچے تو حضور نے مال غنیمت میں سے ہمارے بھی حصے لگائے۔ حالانکہ آپ نے کسی اور غیر حاضر شخص کو کوئی حصہ نہیں دیا۔ بخاری ج ۲ ص۶۰۷

اب اہل سنت حضرات خود ہی سوچ کر دل سے فیصلہ کرلیں کہ حضرت حسنؓ کب پیدا ہوئے کیونکہ غزوۂ خیبر متفقہ طور پر ۷ھ میں واقع ہوا۔ آپ نے محرم کے آخر میں خیبر کی جانب کوچ کیا تھا۔ لہٰذا حضرت حسنؓ ۷ھ میں پیدا ہوئے۔ اس سے یہ عقدہ بھی حل ہوگیا کہ محسنؓ نامی بچہ حضرت حسنؓ سے پہلے پیدا ہوا تھا۔

اس کی تائید بخاری کی ایک اور حدیث سے بھی ہوتی ہے۔ جس میں حضرت ابوبکرؓ کی خلافت کے زمانہ کا ذکر ہو رہا ہے۔ بخاری کے الفاظ ہیں۔

صلی ابوبکر العصر ثم خرج یمشی	ابوبکرؓ نے عصر کی نماز پڑھائی۔ پھر باہر
فرای الحسن یلعب مع الصبیان	نکلے تو دیکھا کہ حسنؓ بچوں کے ساتھ کھیل
فحملہ علی عاتقہ وقال بابی	رہے ہیں۔ ابوبکرؓ نے انہیں اپنے کاندھے
شبیہ بالنبی صلی اللہ علیہ	پر اٹھالیا۔ اور فرمایا۔ میرے ماں باپ
وسلم لا شبیہ بعلی و علی	قربان یہ تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے

یضحک۔ مشابہ ہے۔ علی کے مشابہ نہیں۔

بخاری ج ۱ ص ۵۰۱ اور علی ہنس رہے تھے۔

گویا حضرت حسنؓ خلافت ابی بکرؓ میں اتنے کم سن بچہ تھے کہ ابوبکرؓ جیسے ضعیف العمر اور لاغر انسان انہیں کاندھوں پر اٹھاتے اور کاندھوں پر زیادہ سے زیادہ چار پانچ سالہ بچے ہی کو اٹھایا جاتا ہے۔ نہ کہ نو دس سالہ بچہ کو اور جب بچہ بات کو سمجھنے لگتا ہے تو عربی میں اسے صبی نہیں کہتے بلکہ غلام کہتے ہیں۔ اس روایت کا یہ جملہ یلعب مع الصبیان اس امر کا ثبوت ہے کہ ان میں ابھی سمجھ بوجھ کا مادہ پیدا نہیں ہوا تھا۔

ان امور سے یہ بات خود بخود ثابت ہو جاتی ہے کہ حضرت حسنؓ صحابی نہ تھے۔ کجا کہ حضرت حسینؓ کی صحابیت۔

یہ امر بھی ذہن میں رہے کہ اگر بچہ سات آٹھ سال کی عمر کا ہو تو اس کے حافظہ میں اپنے قریبی اور چاہنے والوں کا حلیہ پورے طور پر محفوظ رہتا ہے لیکن اگر اس سے کم عمر ہو تو آہستہ آہستہ وہ حلیہ اس کے ذہن سے نکل جاتا ہے۔ چنانچہ حضرت حسنؓ کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا حلیہ یاد نہ تھا۔ لہٰذا انہوں نے آپ کا حلیہ اپنے ماموں ہندؓ بن ابی ہالہ سے معلوم کیا۔ یہ ہندؓ حضرت خدیجہؓ کے پہلے خاوند کی اولاد تھے۔ اس لحاظ سے یہ حضرت فاطمہؓ کے ماں جائے بھائی ہوئے اور حضرت حسنؓ کے ماموں۔ حضور کا تفصیلی حلیہ حضرت حسنؓ نے حضرت ہندؓ سے ہی دریافت کیا جو شمائل ترمذی اور انساب الاشراف میں مذکور ہے۔ انساب الاشراف ج ۲ ص ۳۸۲۔

ان تمام حقائق سے یہ امر واضح ہو گیا کہ حضرت حسنؓ ۳ھ میں نہیں بلکہ ۸ھ میں پیدا ہوئے اور نہ آپ حضرت فاطمہؓ کی پہلی اولاد ہیں اور نہ اصولی طور پر آپ کو شرف صحابیت حاصل ہے۔ ان تمام باتوں کا تصفیہ اگر کمپیوٹر کے ذریعہ بھی کیا جائے تو جواب مختلف برآمد نہ کیا جا سکے گا۔

حضرت حسینؓ کی پیدائش

اس سے قبل کہ ہم اس امر کی وضاحت کریں کہ حضرت حسین کی پیدائش کون سے سن میں ہوئی، ہم اپنے سنی بھائیوں کو وہ رام کہانی بھی سنانا ضروری سمجھتے ہیں جو سبائیوں نے حضرت حسینؓ کی ولادت کے سلسلہ میں بیان کی ہے۔ تاکہ ہمارے سنی بھائیوں کو یہ معلوم ہو جائے کہ غم حسین میں سینہ کوبی کرنے والے حضرت حسین کے بارے میں کیا نظریات رکھتے ہیں۔ اور حضرت حسین پران کے یہاں کس طرح تبرا کیا جاتا ہے۔ اور سنی بھائیوں کو یہ بھی معلوم ہو جائے کہ ہاتھی کے دانت کھانے کے اور ہوتے ہیں، دکھانے کے اور۔ ملا باقر مجلسی لکھتے ہیں۔

ابن بابویہ نے بسند معتبر جناب صادق سے روایت کی ہے کہ جبرائیل خدمت رسول میں قبل ولادت حسین آئے۔ اور کہا کہ آپ کے ہاں ایک فرزند متولد ہو گا کہ آپ کی امت اسے شہید کرے گی۔ حضرت نے فرمایا کہ مجھے ایسے فرزند کی حاجت نہیں، جب تین مرتبہ یہی خطاب ہوا اور تیسری مرتبہ کہا کہ اس فرزند اور اس کی ذریت اور اولاد میں امامت و وراثت اور آثار پیغمبراں ہوں گے اور خازنِ علوم اولین و آخرین ہوں گے۔ یہ سُن کر جناب رسولِ خدا نے فرمایا۔ جناب امیر کو بلاؤ اور ان سے پوچھو۔ جب حضرت علی آئے تو رسولِ خدا نے کہا جبرئیل نے خدا کی جانب سے مجھے یہ خبر دی ہے کہ ایک فرزند تمہارے یہاں متولد ہو گا۔ کہ میری امت میرے بعد اسے شہید کرے گی۔ جناب امیر نے کہا مجھے ایسے فرزند کی حاجت نہیں۔ یہاں تک کہ تین مرتبہ یہ کلام ہوا۔ اور تیسری مرتبہ فرمایا کہ اس فرزند اور اس کے فرزندوں میں امامت و وراثت و آثار پیغمبراں اور خازن علوم اولین و آخرین ہوں گے۔ تو حضرت علیؓ نے فرمایا فاطمہؓ سے پوچھو پھر جناب فاطمہؓ سے کہلا بھیجا کہ خدا تم کو بشارت دیتا ہے کہ تمہارے ایک فرزند ہو گا۔ میری اُمت اس کو بعد میرے شہید کرے گی۔ جناب فاطمہؓ نے عرض کیا بابا مجھے ایسے فرزند کی حاجت نہیں۔ یہاں تک کہ پھر تین مرتبہ

یہ خطاب واقع ہوا۔ اور ہر مرتبہ جناب فاطمہؓ نے یہی جواب دیا۔ حضرت نے فرمایا وہ فرزند اور اسکی اولاد پیشوایان دیندار میرے وارث اور میرے علم کے خازن ہوں گے۔ جب یہ سُنا جناب فاطمہؓ نے کہا میں اپنے خدا سے راضی ہوئی۔ بعد اس کے حاملہ بحمل امام حسین ہوئیں۔ جلاء العیون ج ۲ صـ۹۲۔

ملا باقر آگے چل کر لکھتے ہیں۔

جناب رسول خدا نے جناب فاطمہؓ کو خبر ولادت امام حسین اور خبر شہادت دی اور جناب فاطمہ بکراہت حاملہ ہوئیں۔ حضرت نے فرمایا۔ ہرگز کسی کو تو نے دیکھا ہے کہ اسے ولادت فرزند کی بشارت دیں۔ اور وہ حاملہ بکراہت ہو۔ یعنی اسے خبر ولادت فرزند دیں اور وہ مغموم ہو کر حاملہ ہونے سے کراہت کرے کہ اس وجہ سے کہ حال قتل فرزند معلوم ہو چکا تھا اور وضع حمل بھی بسبب اس سے کراہت کرے۔ جلاء العیون صـ۹۴ ج ۲

ملا باقر مجلسی کی ان عبارات سے جو امور سامنے آتے ہیں وہ حسب ذیل ہیں۔

۱۔ شہادت اتنی بری شے تھی کہ اس کا ذکر سن کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت علیؓ اور حضرت فاطمہؓ کو اولاد بھی قبول نہ تھی۔

۲۔ حضرت علیؓ اور حضرت فاطمہؓ حضرت حسینؓ سے کراہت کرتے تھے۔ حتیٰ کہ دوران حمل حضرت فاطمہؓ اُن سے ہمیشہ کراہت کرتی رہیں۔

۳۔ حضرت علیؓ و فاطمہؓ نے حضرت حسینؓ کی ولادت کو صرف اس لئے برداشت کیا کہ حضرت حسینؓ کی اولاد میں امامت و وراثت چلے گی۔ لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جب ماں باپ کو بیٹے ہی سے کراہت ہے تو بیٹے کی اولاد میں امامت و وراثت سے پیار کیوں پیدا ہو گیا ؟

۴۔ حضرت حسینؓ کی اولاد علوم اولین و آخرین کی وارث ہو گی اور اُن میں آثار پیغمبراں پائے جائیں گے۔ سوچنے کا معاملہ یہ ہے کہ یہ سلسلہ صرف بارہ تک ہی کیوں محدود رہا ؟

۵۔ حضرت حسن تو بکراہت پیدا نہ ہوئے تھے۔ پھر اُن کی اولاد میں امامت و وراثت

کیوں نہ چلی۔ اس سے تو یہ ثابت ہوتا ہے کہ امامت و وراثت اس لڑکے کی اولاد میں چلتی ہے۔ جس سے ماں باپ نفرت کرتے ہوں۔

۶۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم حضرت علیؓ اور حضرت فاطمہؓ برضا و رغبت اللہ کے حکم کو قبول کرنے کے لیے تیار نہیں۔ بحالتِ مجبوری قبول کرتے ہیں اور وہ بھی بکراہت ہم اس کے جواب میں کچھ عرض کرنا نہیں چاہتے لیکن ہاں ہم اپنے سنی بھائیوں سے یہ سوال ضرور کریں گے کہ کیا یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت علیؓ و فاطمہؓ پر تبرا نہیں تو اور کیا ہے؟ اور کیا حضرت حسینؓ کو صریح الفاظ میں ایک مکروہ ہستی نہیں بنا دیا گیا؟ تبرائیوں کو ان حضرات کی ذات سے کوئی تعلق نہیں، انہیں تو صرف وراثت چاہیئے تاکہ اس کے پردے میں وہ اپنی من مانی کارروائی کر سکیں۔

اب ہم اصل موضوع پر گفتگو کرنا چاہتے ہیں کہ حضرت حسینؓ کب پیدا ہوئے۔ اس پر تو ہر فریق اور ہمہ قسم کے لوگوں کا اتفاق ہے کہ حضرت حسینؓ حضرت حسنؓ کے بعد پیدا ہوئے۔ اور جب حضرت حسنؓ کی پیدائش ۳ھ میں ہوئی تو یقینی بات ہے کہ حضرت حسین ۳ھ میں پیدا ہوئے ہوں گے۔

مؤرخین کا دعویٰ یہ ہے کہ حضرت حسینؓ حضرت حسنؓ کے ایک سال یا چودہ ماہ بعد پیدا ہوئے۔ اگرچہ ملا باقر مجلسی نے جلاء العیون میں یہ دعویٰ کیا ہے کہ وہ اپنی والدہ کے پیٹ میں صرف چھ ماہ رہے اور حضرت حسنؓ کی ولادت کے ایک ماہ بعد اُن کا حمل ٹھہرا۔ ساتھ ساتھ مجلسی صاحب نے بھی یہ دعویٰ کیا ہے کہ آج تک روئے زمین پر چھ ماہ کے صرف دو ہی بچے زندہ رہے ہیں۔ ایک حضرت حسینؓ، دوسرے نام کے معاملہ میں مجلسی خود تذبذب کا شکار ہیں۔ کبھی حضرت عیسیٰؑ کا نام لیتے ہیں اور کبھی حضرت یحییٰؑ کا۔ اس لحاظ سے یہ دو بچے نہ ہوں گے بلکہ تین بچے ہوں گے۔

رہا یہ سوال کہ چھ ماہ کا بچہ زندہ رہ سکتا ہے یا نہیں۔ اس کا صحیح جواب ڈاکٹرنیاں یا نرسیں

بھی دے سکتی ہیں اور یہ کوئی دشوار عمل نہیں۔ہسپتالوں کے ذریعہ ایسے بچوں کی رپورٹ معلوم کی جا سکتی ہے۔

حاصل کلام یہ کہ حضرت حسینؓ، حضرت حسنؓ کے بعد پیدا ہوئے۔ان کا سن پیدائش کیا ہے؛ چونکہ ہم سنی ہیں۔ لہذا اہل سنت کی کتابوں کے حوالہ ہی سے حقیقت حال معلوم کرنا چاہتے ہیں۔ مشکوٰۃ المصابیح ابن ماجہ اور طبقات ابن سعد میں حضرت ام الفضلؓ کا یہ بیان مذکور ہے

کہ میں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے جا کر عرض کیا کہ رات میں نے بہت بُرا خواب دیکھا ہے۔آپ کے دریافت کرنے پر میں نے کہا کہ آپ کے جسم کا ایک ٹکڑا کاٹ کر میری گود میں ڈالا گیا۔اس پر حضور نے فرمایا کہ یہ خواب بہت اچھا ہے۔فاطمہؓ کے یہاں لڑکا ہوگا اللہ نے چاہا وہ تیری گود میں رہے گا۔چنانچہ جب فاطمہؓ کے یہاں حسینؓ پیدا ہوئے تو وہ آپ کی دی ہوئی تعبیر کے مطابق میری گود میں رہے۔مشکوٰۃ ج ۲ صـ۵۷۲۔ طبقات ابن سعد ج ۸ صـ۲۵۶۔

یہ خواب سنن ابن ماجہ میں ان الفاظ کے ساتھ مروی ہے۔

حضرت ام الفضلؓ فرماتی ہیں میں نے عرض کیا یا رسول اللہ میں نے خواب دیکھا ہے کہ آپ کے اعضاء جسم میں سے ایک عضو میرے گھر میں ہے۔آپ نے فرمایا اچھا خواب ہے۔فاطمہؓ کے یہاں بچہ ہوگا۔تو اسے دودھ پلائے گی۔جب حسینؓ پیدا ہوئے تو میں نے انہیں دودھ پلایا۔اتفاق سے ایک روز میں حسینؓ کو لے کر حضور کے پاس آئی۔حضور نے انہیں گود میں ڈال لیا۔انہوں نے پیشاب کر دیا۔میں نے بچہ کے مونڈھے پر ہلکے سے ہاتھ مارا۔ اس پر حضور نے فرمایا۔تو نے میرے بچے کو تکلیف پہنچائی۔سنن ابن ماجہ مترجمہ ج ۲ صـ۴۶۹

غرض حسینؓ کو حضرت ام الفضلؓ نے گود لیا اور دودھ پلایا۔سبائی کہتے ہیں کہ چونکہ فاطمہؓ اور علیؓ بچہ سے نفرت کرتے تھے اس لئے انہیں ام الفضلؓ کی گود میں رکھے [illegible] سیدہ کی میں یہاں تک مذکورہ [illegible] حسینؓ [illegible] فطرت [illegible]

دودھ پینا بھی پسند نہیں کیا۔

خیر یہ اس وقت ہمارا موضوع نہیں۔ ہم تو صرف یہ جانتے ہیں کہ حضرت ام الفضلؓ نے حضرت حسینؓ کو ولادت کے بعد گود لیا۔ اور انہوں نے ہی انہیں دودھ پلایا ہے۔ ان ہی ام الفضلؓ پر تمام کہانی کا دار و مدار ہے۔ جیسا کہ حضرت حسنؓ کے معاملہ میں حضرت اسماءؓ بنت عمیس پر دار و مدار تھا۔

حضرت ام الفضلؓ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت علیؓ کی چچی تھیں اور حضرت عباسؓ کی زوجیت میں تھیں۔ ان کا نام لبابہ بنت الحارث ہے۔ ان کے بڑے بیٹے کا نام فضلؓ ہے اسی لئے ام الفضلؓ کہلاتی ہیں۔ یہ ابتدائے نبوت ہی میں ایمان لے آئی تھیں۔ لیکن ان کے خاوند حضرت عباسؓ نے کھل کر اسلام کا اعلان نہیں کیا۔ اسی لئے فتح مکہ کے وقت تک مکہ میں رہے۔ اور حضرت ام الفضلؓ بھی ان کے ساتھ مکہ میں رہیں۔ یہ دونوں حضرات ہجرت نہ کر سکے۔ لیکن چونکہ یہ پہلے سے اسلام لا چکے تھے۔ لہٰذا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فتح مکہ کے بعد ان دونوں حضرات کو مدینہ میں رہنے کی اجازت دیدی۔ اس طرح یہ دونوں مدینہ چلے آئے۔

جب سورۂ نساء میں یہ آیت نازل ہوئی۔

إِنَّ الَّذِينَ تَوَفَّاهُمُ الْمَلَائِكَةُ	یقیناً وہ لوگ جن کی روحیں اس حال
ظَالِمِي أَنفُسِهِمْ قَالُوا فِيمَ	میں قبض کریں کہ وہ اپنی جانوں پر ظلم
كُنتُمْ قَالُوا كُنَّا مُسْتَضْعَفِينَ	کر رہے ہوں (کفار کے علاقہ میں رہکر)
فِي الْأَرْضِ قَالُوا أَلَمْ تَكُنْ أَرْضُ اللَّهِ	تو فرشتے ان سے سوال کریں گے کہ تم
وَاسِعَةً فَتُهَاجِرُوا فِيهَا	کہاں رہتے تھے۔ وہ جواب دیں گے
فَأُولَٰئِكَ مَأْوَاهُمْ جَهَنَّمُ وَ	کہ زمین میں کمزور تھے۔ فرشتے کہیں گے
سَاءَتْ مَصِيرًا إِلَّا الْمُسْتَضْعَفِينَ	کہ اللہ کی زمین وسیع تھی تم ہجرت کر

مِنَ الرِّجَالِ وَالنِّسَآءِ وَالْوِلْدَانِ
لَا يَسْتَطِيْعُوْنَ حِيْلَةً
وَّلَا يَهْتَدُوْنَ سَبِيْلًا ۝

جاتے۔ ایسے لوگوں کا ٹھکانہ جہنم ہے
جو برا مقام ہے۔ مگر وہ مرد جو کمزور ہوں
یا عورتیں اور بچے جو ملک چھوڑنے کا
کوئی حیلہ نہ پاتے ہیں اور نہ انہیں راستہ
کا علم ہو۔

حضرت عبداللہ بن عباسؓ اس کی تفسیر میں فرماتے ہیں۔ میں اور میری والدہ بھی اُن لوگوں میں داخل ہیں جنہیں ہجرت سے معاف قرار دیا گیا۔ تفسیر قرطبی ج ۳ ص ۱۹۱۶

مجبور ہو کر حضرت اُم الفضلؓ فتح مکہ کے وقت تک مکہ میں مقیم رہیں اور مکہ رمضان ۸ھ میں فتح ہوا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم فتح مکہ کے بعد ۶ شوال تک مکہ میں مقیم رہے۔ جیسا کہ بلاذری نے انساب الاشراف میں دعویٰ کیا ہے۔ پھر آپ حنین کی جانب تشریف لے گئے۔ اس کے بعد طائف کا محاصرہ کیا۔ جو ایک ماہ جاری رہا۔ پھر غزوہ ہوازن پیش آیا۔ غزوہ سے فراغت کے بعد تقریباً اُنیس دن تک مقام اوطاس میں مقیم رہے۔ اس طرح حضور مدینہ منورہ تقریباً آخری ذی قعدہ یا ابتدائے ذی الحجہ میں پہنچے ہوں گے۔ اس کے بعد آپ کے سامنے خواب بیان کیا گیا۔ پھر کچھ دن بعد بچہ پیدا ہوا۔ لہٰذا حضرت حسینؓ یقینی طور پر ۹ھ میں پیدا ہوئے۔ اب اگر ہمارے مؤرخین اور علماء کو انہیں جلدی ہی پیدا کرنا اور زبردستی اُن کی عمر بڑھانا مقصود ہے تو سب سے پہلے اُن کے اور حضرت ام الفضلؓ کے تعلق کو ختم کرنا ہوگا۔ جب کہ انہوں نے حضرت حسینؓ کو دودھ پلایا اور اپنی گود میں پرورش کیا۔ اور یہ ایک متفق علیہ مسئلہ ہے۔ اس کا انکار چڑھتے سورج کا انکار ہوگا۔

کراچی کے ایک مشہور مدرسہ کے مشہور مفتی اور شیخ الحدیث نے مجھ سے یہ دلیل سن کر فرمایا تھا کہ یہ بھی تو ممکن ہے کہ ام الفضلؓ فتح مکہ سے قبل مدینہ آئی ہوں اور پھر واپس چلی گئی ہوں۔ گویا تاریخ کی بنیاد مفروضات پر رکھی جا رہی ہے۔ میں نے یہ آیت اور عبداللہ بن عباسؓ

کا قول پیش کیا تاکہ انہیں یہ معلوم ہو جائے کہ عبداللہ بن عباسؓ اور ان کی والدہ ام الفضلؓ ان مجبور لوگوں میں داخل تھیں جو ہجرت کرنے پر قدرت نہ رکھتے تھے اور اس کا اقرار ام الفضلؓ کے صاحبزادے ابن عباسؓ کر رہے ہیں۔

اگر وہ پھر بھی حضرت حسین کو شکّہ یا شبہ میں پیدا کرنے کے لئے مدینہ تشریف لے آئیں تو کیا یہ ممکن تھا کہ وہ ہجرت ترک کر کے مکہ واپس چلی جائیں۔ اور از روئے قرآن جہنم کی مستحق بنیں۔ اگر مفتی صاحب کے نزدیک یہ ممکن ہے تو پھر ان کے دین کا اللہ ہی حافظ ہے..... لیکن امید یہ کہ شاید اللہ تعالیٰ انہیں سبائیت سے نجات عطا فرمائے۔ ہم مزید ایک اور آیت ان کی خدمت میں پیش کئے دیتے ہیں۔ ارشاد الٰہی ہے۔

يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ إِذَا جَاءَكَ	اے نبی جب تمہارے پاس مومنہ عورتیں
الْمُؤْمِنَاتُ مُهَاجِرَاتٍ	مکہ سے ہجرت کر کے آئیں۔ تو تم ان
فَامْتَحِنُوهُنَّ ۖ اللَّهُ أَعْلَمُ	کا امتحان لو، ویسے تو اللہ انکے ایمان کو
بِإِيمَانِهِنَّ ۖ فَإِنْ	خوب جانتا ہے۔ لیکن اگر تم یہ جان لو
عَلِمْتُمُوهُنَّ مُؤْمِنَاتٍ	کہ یہ مومنہ ہیں تو انہیں کافروں کی طرف
فَلَا تَرْجِعُوهُنَّ إِلَى الْكُفَّارِ ۖ	نہ لوٹاؤ۔

یعنی ام الفضلؓ مکہ چھوڑ کر مدینہ آگئی تھیں تو اگر وہ واقعتاً مومنہ تھیں تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کے لئے ہرگز یہ جائز نہ تھا کہ انہیں مکہ واپس جانے دیں، اور اگر انہیں مکہ واپس جانے دیا گیا تو اس کا مقصد یہ ہوا کہ وہ امتحان میں کامیاب نہیں ہوئیں اور ان کا ایمان ایک دھوکہ تھا۔

کاش کوئی مفتی صاحب سے پوچھے کہ آپ کو ان دو صورتوں میں سے کون سی صورت منظور ہے حضرت ام الفضلؓ کو جو حضرت خدیجہؓ کے بعد دوسری ایمان لانے والی ہیں، انہیں ایمان سے

خارج کرنا۔ یا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام کے بارے میں یہ تسلیم کرنا کہ انہوں نے قرآن کی مخالفت کی۔ مفتی صاحب کو جو بھی اپنے لیے پسند ہو وہ فتویٰ صادر فرمالیں۔ فی الوقت ہم توان کی تاویل سے اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ مفتی صاحب جہاں تاریخ سے کوئی تعلق ہی نہیں رکھتے، وہاں انہیں قرآن اور اس کی تفسیر کی خوشبو تک بھی نہیں پہنچی۔ اُن کا دین و ایمان صرف سبائی روایات ہیں اور جب اُن پر اعتراضات ہوتے ہیں تو مفروضات کی دنیا میں جا بسنے ہیں اسی لئے آج کل وہ ہر ایک کو خارجی بنانے کی فکر میں لگے ہوئے ہیں۔

حَوْاَبْ کے کتے

اُمّ المؤمنین حضرت عائشہؓ پر تبرا

حَوْاَبْ کے کتوں کا ذکر زیبِ داستاں کے طور پر ہر تاریخ کی کتاب میں موجود ہے اور سبائیوں کی کوئی محفل اس تبرا سے خالی نہیں ہوتی۔ حتیٰ کہ اہل سنت والجماعت کا وہ تعلیم یافتہ طبقہ جو محرم کی مجلسوں میں شریک ہونا کارِ ثواب اور اپنے لئے باعثِ فخر تصور کرتا ہے۔ یہ طبقہ اس کہانی سے بہت زیادہ متاثر نظر آتا ہے۔

دراصل یہ واقعہ اس لئے وضع کیا گیا کہ ام المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہؓ خونِ عثمانؓ کا جو دعویٰ لے کر کھڑی ہوئیں، اور اہل مکہ نے ان کا ساتھ دیا۔ سبائی طبقہ اس دعوے کو برداشت نہ کر سکا۔ کیونکہ اس دعوے کو قبول کرنے کا مقصد یہ تھا کہ قاتلین عثمانؓ یعنی سبائیوں کو قتل کیا جائے۔ ظاہر ہے کہ یہ ٹولہ اس بات کو کیسے قبول کر سکتا تھا۔ لہٰذا اس نے ام المؤمنینؓ کو گمراہ قرار دینے اور انہیں بدنام کرنے کے لئے ہزارہا جھوٹی کہانیاں پھیلائیں۔ اس طرح اُم المؤمنینؓ کی حیثیت کو گرایا گیا۔ ہمارے مؤرخین جو درپردہ سبائی تھے۔ انہوں نے زیبِ داستاں کے طور پر انہیں اپنی اپنی کتابوں میں جگہ دی اور خاص طور پر ابن جریر طبری نے اس کہانی کو نہایت تفصیل و مبالغہ آرائی کے ساتھ اپنی کتاب میں نقل کیا۔

یہاں یہ بھی ذہن میں رہے کہ مودودی صاحب مرحوم نے خلافت و ملوکیت میں یہ دعویٰ کیا ہے کہ تاریخ کے معاملہ میں جرح و تعدیل اور رجال کی چھان بین کی اجازت نہیں دی جا سکتی، ان فنون کا استعمال احکام شرعیہ میں تو درست ہے لیکن اگر تاریخ میں اس کا استعمال کیا گیا تو تاریخ کے دس حصوں میں سے نو حصے ختم ہو جائیں گے۔ لہٰذا تاریخی واقعات میں سدی، کلبی اور واقدی وغیرہم پر اعتماد کلی کیا جائے گا۔ ظاہر ہے کہ جب تاریخ کے نو حصے ختم ہو جائیں گے

توصحابہ کرام پر کیچڑ اُچھالنے کا موقعہ کیسے دستیاب ہوگا۔ اور پھر کتاب "خلافت وملوکیت" کیسے وجود میں آتی۔ اُس کے تو حصے برباد نہ ہوجاتے؟ اور مودودی صاحب ان چیزوں کی بقاء اپنے لئے لازمۂ دین تصور کرتے ہیں۔ اسی لئے فرماتے ہیں۔

میں نے اپنی کتاب میں قاضی ابوبکر بن العربی، ابن تیمیہ اور شاہ عبدالعزیز دہلوی کی کتابوں سے اس لئے مدد نہیں لی کہ انہوں نے شیعوں کا رد کیا ہے۔ ان حضرات کی حیثیت وکیل صفائی کی ہے اور وکیل صفائی کے پیش نظر صرف وہ مواد ہوتا ہے۔ جس سے اس کا مقدمہ مضبوط ہو اور ابوبکر بن العربی تو اس میں حد سے تجاوز کر گئے۔ خلافت وملوکیت صفحہ ۳۲۱

گویا مودودی صاحب نہ تو اُن اہل سنت علماء کی بات سننا چاہتے ہیں جو شیعوں کا رد کرتے ہیں۔ کیونکہ اُن کی حیثیت بھی وکیل صفائی کی ہے اور نہ کسی ایسے شخص کی بات سننا چاہتے ہیں جو ایسی بات کہے جس سے اہل سنت کا مقدمہ مضبوط ہو، کیونکہ ان کی شریعت میں مقدمہ کے فیصلہ کی صورت یہی ہے کہ صرف مدعی کی بات سنی جائے اور مدعا علیہ اگر کچھ کہے تو اسے وکیل صفائی قرار دے دیا جائے اور اُس کے لئے وہ تمام راہیں بند کر دی جائیں جس سے وہ مدعی کے دعوے کا رد کرسکے جب کہ دنیاوی لحاظ سے وہ ڈکٹیٹر شپ کی مخالفت کے علمبردار بنے ہوئے ہیں۔ یعنی وہ خود یا تو شیعوں کی بات سنتے ہیں یا ان لوگوں کی سنتے ہیں جو شیعوں کی کسی بات کا رد نہ کریں۔ بالفاظ دیگر انہیں شیعوں کی ہر بات قبول ہے۔ لیکن سنیوں کی کوئی بات قبول نہیں۔ سنیوں کی تو صرف وہی بات قبول کی جاسکتی ہے۔ جو شیعوں کی ہم نوائی میں ہو تاکہ صحابہ کرام پر دل کھول کر تبرا کیا جاسکے۔ اس صورت میں مودودی صاحب کا مسلک کیا ہے؟ اس کا فیصلہ قارئین خود کرلیں تو بہتر ہوگا۔

ہم یہ واقعہ طبری کے حوالہ سے بالتفصیل پیش کر رہے ہیں۔ کیونکہ مودودی صاحب کا دعویٰ یہ ہے کہ طبری نے تمام تاریخی مواد تحقیق کے ساتھ چھان پھٹک کر پیش کیا ہے لیکن اپنی کتاب "خلافت وملوکیت" میں ایک بھی ایسا واقعہ نقل نہیں کیا، جس میں حضرت علیؓ یا

ان کی اولاد کی ذات پر اعتراض لازم آتا ہو۔ طبری کی اس روایت میں جو ہم پیش کرنے والے ہیں۔ جہاں ام المؤمنین حضرت عائشہؓ کی ذات کو ہدف بنایا گیا ہے۔ وہاں اس روایت میں مودودی صاحب کے معتمد مؤرخ طبری نے حضرت علیؓ کو سادہ لوح، خود غرض اور خلافت کا بھوکا بھی ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔ اسی لئے ہم معتقدین مودودی صاحب کو ان کا چہرہ طبری کے آئینہ میں دکھانا چاہتے ہیں۔ طبری لکھتا ہے۔

صفوان بن قبیصۃ الاحمسی نے عرنی کا یہ بیان ذکر کیا ہے کہ میں اونٹ پر سوار جا رہا تھا کہ میرے سامنے ایک سوار آیا اور مجھ سے سوال کیا۔ کہ اے اونٹ والے کیا تو اپنا اونٹ بیچتا ہے؟

عرنی: ہاں

سوار: اس کی کیا قیمت ہے؟

عرنی: ایک ہزار درہم

سوار: کیا تو پاگل ہے؟ کہیں اونٹ ایک ہزار میں بکتا ہے۔

عرنی: ہاں، یہ میرا اونٹ ہے

سوار: اس میں کیا خوبی ہے؟

عرنی: میں نے اس پر سوار ہو کر جب بھی کسی کا پیچھا کیا تو اسے پکڑ لیا۔ لیکن مجھے کبھی کوئی نہ پکڑ سکا۔ اور جب بھی میں اس پر سوار ہو کر بھاگا۔ تو پیچھا کرنے والا مجھے نہ پا سکا۔

سوار: تم یہ بھی جانتے ہو کہ ہم یہ اونٹ کس کیلئے خریدنا چاہتے ہیں۔ اگر تمہیں یہ معلوم ہو جائے تو تم کبھی اتنی قیمت طلب نہ کرو۔

عرنی: آخر آپ کس کے لئے اونٹ خریدنا چاہتے ہیں؟

سوار: تیری ماں کے لئے (ام المؤمنین کہنے سے کس طرح گریز کیا گیا)

عرنی: میں اپنی ماں کو تو اپنے گھر بیٹھے چھوڑ آیا ہوں۔ اس کا سفر کا کوئی ارادہ

نہ تھا۔

سوار		ام المؤمنین حضرت عائشہؓ کے لئے۔

عرفی		تو آپ یہ اونٹ لیجائیے۔ اور اب اس کی کوئی قیمت نہیں۔

سوار		میں بلا قیمت نہیں لیتا۔ تم میرے ساتھ قیام گاہ تک چلو، میں تمہیں ایک اونٹنی بھی دوں گا اور کچھ درہم بھی دوں گا۔

عرفی کا بیان ہے کہ میں اس سوار کے ساتھ گیا۔ ان لوگوں نے مجھے ایک مہری اونٹنی دی، اور چار سو یا چھ سو درہم دیئے۔ اس کے بعد اس سوار نے مجھ سے سوال کیا اے عرفی بھائی کیا تم راستوں سے واقف ہو؟

عرفی		ہاں میں اُن لوگوں میں سے ہوں جو دوسروں کو تلاش کر لیتے ہیں۔
(غالباً سراغ رساں)

سوار		تو تم ہمارے ساتھ چلو۔

عرفی کا بیان ہے کہ میں اُنکے ساتھ ہولیا۔ راہ میں جس وادی اور چشمہ سے ہمارا گزر ہوتا تو یہ لوگ مجھ سے اس مقام کا نام دریافت کرتے۔ چلتے چلتے ہم حَوْاَبْ کے چشمے پر پہنچے تو وہاں کے کتے ہمیں دیکھ کر بھونکنے لگے۔ ان لوگوں نے مجھ سے دریافت کیا کہ یہ کونسا چشمہ ہے؟

عرفی		یہ چشمہ حَوْاَبْ کے نام سے مشہور ہے۔

عرفی کا بیان ہے کہ میرا یہ جواب سن کر حضرت عائشہؓ زور سے چیخیں، اور اپنے اونٹ کے بازو پر چابک مار کر اسے بنکایا۔ پھر فرمایا۔ اللہ کی قسم حَوْاُبْ کے کتوں والی میں ہوں، اے لوگو مجھے واپس لے چلو، حضرت عائشہؓ نے یہ بات تین بار فرمائی اور اپنا اونٹ ہنکایا۔

لوگوں نے بھی اپنے اونٹ ہنکائے، اور وہ واپس لوٹیں۔ حتیٰ کہ جب اگلا روز ہوا، اور وہ وقت آیا جس وقت اُن لوگوں کی واپسی شروع ہوئی تھی، تو عبداللہ بن الزبیرؓ گھبرائے ہوئے حضرت عائشہؓ کے پاس پہنچے۔ اور چیخ کر بولے، بچاؤ، بچاؤ یہ علیؓ کا لشکر تمہارے سروں پر پہنچ

گیا ہے۔

عرنی کہتا ہے کہ ان لوگوں نے وہاں سے کوچ کیا۔ اور مجھے بُرا بھلا کہنے لگے۔ میں اُن کے پاس سے واپس چلا آیا۔ تھوڑی دور چلا تھا کہ حضرت علیؓ اور ان کا لشکر مل گیا۔ اُن کے ساتھ تین سو کے قریب افراد تھے۔ حضرت علیؓ نے مجھے آواز دی کہ اے سوار ادھر آؤ، میں اُن کے پاس گیا تو انہوں نے سوال فرمایا۔ یہ لشکر کہاں ہے؟

عرنی — فلاں فلاں مقام پر مقیم ہے اور یہ اُس کی اُونٹنی ہے۔ میں نے ان لوگوں کے ہاتھ اپنا اونٹ فروخت کیا تھا۔

حضرت علیؓ — کیا تم نے بھی اُن کے ساتھ سفر کیا ہے؟

عرنی — ہاں میں نے اُن کے ساتھ سفر کیا ہے۔ لیکن جب ہم حواب کے چشمے پر پہنچے تو اُس عورت پر وہاں کتے بھونکنے لگے۔ جس پر اُس عورت نے ایسی ایسی بات کہی تھی۔ لیکن میں نے جب ان میں اختلاف دیکھا تو میں واپس چلا آیا۔ اور یہ لوگ کوچ کر گئے۔

حضرت علیؓ — کیا تم ذی قار کا راستہ جانتے ہو؟

عرنی — ہاں

حضرت علیؓ — تو تم ہمارے ساتھ چلو۔

عرنی کا بیان ہے کہ میں ان کے ساتھ چلا، حتیٰ کہ ہم ذی قار پہنچ گئے۔ علیؓ نے دو آدمی بلوائے اور ان دونوں کو ایک دوسرے سے ملا کر بٹھا دیا۔ اس کے بعد ایک اور شخص طلب کیا گیا۔ اور اُسے اُن دونوں پر بٹھا دیا گیا۔ پھر حضرت علیؓ اس شخص پر چڑھ کر بیٹھ گئے اور ایک جانب اپنے پاؤں لٹکائے۔ اور اللہ کی حمد و ثنا اور درود و سلام کے بعد فرمایا۔ تم لوگوں نے دیکھ لیا کہ اس عورت نے کیا کیا۔ اور اِس قوم نے اس کا ساتھ دیا۔

علیؓ کی یہ بات سُن کر ان کے صاحبزادے حسنؓ کھڑے ہو گئے۔ اور رونے لگے۔

حضرت علیؓ — یہ تم لڑکیوں کی طرح کیوں رو رہے ہو؟

حضرت حسنؓ — ہاں، میں نے تمہیں ایک بات کا حکم دیا تھا۔ لیکن تم نے میری نافرمانی کی۔ تو تم بھی نہایت مصیبت کے ساتھ قتل کئے جاؤ گے۔ اور تمہارا کوئی حامی و مددگار نہ ہو گا۔

حضرت علیؓ — تو نے مجھے جو حکم دیا تھا۔ وہ لوگوں سے بیان کر دے۔

حضرت حسنؓ — جب لوگوں نے عثمانؓ کو شہید کیا تھا۔ تو میں نے آپ کو حکم دیا تھا۔ کہ آپ اپنی بیعت کے لئے اس وقت تک ہاتھ نہ پھیلایئے۔ جب تک عرب کے تمام علاقوں کے لوگ آپ کو خلافت پر مجبور نہ کریں۔ اور وہ آپ کے علاوہ کسی کو خلیفہ نہ بنائیں گے۔ لیکن تم نے میرا حکم نہ مانا۔ جس وقت اس عورت اور ان لوگوں نے سر اٹھایا۔ میں نے تم سے کہا تھا کہ مدینہ سے نہ جاؤ۔ اور اپنے ان شیعوں کے پاس جو تمہاری بات قبول کرتے ہیں اپنے پیغام بھیج دو۔

حضرت علیؓ — اس نے سچ کہا۔ لیکن اللہ کی قسم میں بچھو کی طرح کمزور بننا نہیں چاہتا۔

...... واقعہ یہ ہے کہ جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات ہوئی۔ تو میں اپنے سے زیادہ کسی کو خلافت کا حقدار نہ سمجھتا تھا۔ لیکن لوگوں نے ابوبکرؓ کی بیعت کر لی۔ تو جیسے لوگوں نے ابوبکرؓ کی بیعت کی تھی تو میں نے بھی ابوبکرؓ کی بیعت کر لی۔ پھر ابوبکرؓ ہلاک ہو گئے۔ اس وقت بھی میں اپنے سے زیادہ کسی کو حقدار نہ سمجھتا تھا۔ لیکن لوگوں نے عمرؓ کی بیعت کر لی۔ پھر عمرؓ بھی ہلاک ہو گئے۔ اور انہوں نے چھ آدمیوں میں سے ایک نمبر مجھے منتخب کیا۔ لیکن اس وقت بھی لوگوں نے عثمانؓ کی بیعت کر لی۔ جس کی وجہ سے میں نے بھی بیعت کر لی۔ پھر لوگوں نے عثمانؓ کے خلاف بغاوت کی، اور اسے قتل کر دیا۔ اور میرے پاس خوشی سے بیعت کے لئے آئے۔ میں نے کسی پر زبردستی نہیں کی .... تو اب جو شخص بھی میری اور ان لوگوں کی مخالفت کرے گا۔ جو میرے متبع ہیں تو میں اس سے جنگ کروں گا۔ یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ میرے اور ان کے درمیان

فیصلہ فرمادے اور وہی بہترین فیصلہ کرنے والا ہے۔ تاریخ طبری مترجم ج ۴ ۔ ص ۲

اس افسانہ کے بارے میں کچھ لکھنے سے قبل ہم یہ بتانا بھی ضروری سمجھتے ہیں کہ طبری کے اس حصہ کا ترجمہ میرا ہی کیا ہوا ہے ۔ جو تقریباً پچیس سال سے نفیس اکیڈمی سے شائع ہو رہا ہے۔ میں نے ترجمہ کرتے وقت حتی الامکان اس امر کی سعی کی تھی کہ طبری کے قلم سے نکلا ہوا کوئی لفظ ایسا نہ بچے۔ جس کا ترجمہ نہ کیا جائے۔ تاکہ کوئی مجھ پر کتر بیونت کا الزام قائم نہ کرے۔ ساتھ ساتھ میں نے ہر ہر روایت کی تحقیق و تنقید بھی کی تھی۔ لیکن نفیس اکیڈمی نے اپنے تجارتی مفادات کو پیش نظر رکھتے ہوئے، اُن تنقیدات کو شائع نہیں کیا۔ جس کی ذمہ داری مجھ پر عائد نہیں ہوتی

یہ بھی ذہن میں رکھیں کہ بقول مودودی صاحب اس پر تنقید بھی جائز نہیں۔ کیونکہ ان کے نزدیک طبری اہل سنت کے ایک مسلمہ امام ہیں۔ اور انہوں نے ہر روایت تحقیق و تنقید کے ساتھ نقل کی ہے اور تاریخی روایات پر تنقید کی اجازت نہیں دی جاسکتی۔ لیکن اس روایت میں جو حضرت علیؓ کا کردار پیش کیا گیا ہے ۔ وہ تو خالص آمرانہ ہے۔ انہیں صرف امیر معاویہؓ کے سلسلہ میں تو اس قسم کی روایات نظر آئیں۔ لیکن اپنے جدا مجد کے بارے میں جو روایات تھیں وہ تمام نظر انداز کر گئے۔ کیا یہی وہ نظامِ عدل ہے جس کا پرچار جماعت ہر وقت کرتی رہتی ہے اگر ہم طبری کی مزید روایات پیش کریں گے تو آپ ہی لوگ گھبرا جائیں گے۔ ہم پر اُن روایات کا کوئی اثر نہ ہوگا۔

اس افسانہ کو ابتدا سے انتہا تک ایک بار پھر پڑھیئے، اور سوچیئے کہ اس قسم کی روایات وضع کرنے والے کس قسم کے افراد ہوں گے۔ جن کے پیش نظر نہ حضرت علیؓ کی عزت ہے اور نہ ام المؤمنینؓ کا احترام۔ ظاہر ہے کہ ان افسانہ طرازوں کی نظر میں اسلام دشمنی کے باعث سب کا ایک مقام ہے اور ان لوگوں کا مقصود صرف اتنا ہے کہ صحابہ کو بدنام کر کے اسلام سے عداوت نکالی جائے۔

[illegible]

عائشہؓ کی ہجو سے متعلق تھا۔ اسے تو ہر جگہ بیان کیا۔ لیکن آخری حصہ جس کا تعلق حضرت علیؓ سے تھا۔ وہ شیر مادر سمجھ کر پی گئے۔

اس روایت میں کیا کیا عیوب پوشیدہ ہیں۔ انہیں ایک ذرا سرسری سی نظر سے ملاحظہ فرمالیں۔

۱۔ اول تو پہلے ہم یہ عرض کر دیں کہ ہمیں النسائی تبرکی تعمیر کا یہ طریقہ بہت پسند آیا۔ اسے ایک تاریخی شاہکار قرار دیا جا سکتا ہے۔ کاش آج کل کوئی مولوی بھی اس طریقہ پر عمل کر کے دکھائے۔

۲۔ ام المومنینؓ کا جہاں بھی تذکرہ کیا گیا۔ وہاں یہ الفاظ استعمال کئے گئے۔ یہ عورت اور وہ عورت۔ جو اس امر کا بین ثبوت ہے کہ طبری اور اس کے راوی نہ صرف سبائی ہیں۔ بلکہ ان کے ذہن خباثتوں سے معمور ہیں۔ جب کہ مودودی صاحب طبری کے بارے میں لکھتے ہیں۔

طبری نہ صرف ثقہ بلکہ وہ اُن ائمہ اسلام اور ائمہ اہل سنت میں شمار ہوتے ہیں۔ جن کی اقتدا کی جاتی ہے۔ اُن کے بارے میں یہ تصور کہ وہ بغیر چھان پھٹک کے کوئی روایت قبول کریں گے۔ یہ ممکن نہیں۔ خلافت و ملوکیت ص ۳۱۳۔

افسوس تو یہی ہے کہ ہمارے علماء نے حسن ظن سے کام لیتے ہوئے ہر کتاب کے بارے میں یہی تصور قائم کر لیا ہے۔ جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ہم داستانوں میں گم ہو کر رہ گئے۔ خیر بقول مودودی صاحب طبری نے یہ روایت بھی چھان پھٹک کر نقل کی ہے۔ لہٰذا ہم کہنے پر مجبور رہوں گے کہ آپ کا ام المومنینؓ کے بارے میں مسلک وہی ہے جو آپ کے آباؤ اجداد کا تھا۔

۳۔ حضرت علیؓ ابتدا ہی سے خلافت کے متمنی تھے۔ لیکن اُن کا بس نہ چل سکا اور جب اُن کو ایک پارٹی مل گئی تو ہر اس ہستی کو خس و خاشاک کی طرح بہانے کے لئے تیار ہو گئے۔ جو اُن کی راہ میں حائل ہو۔ بالفاظ دیگر حضرت علیؓ نے جتنی جنگیں لڑیں۔ وہ اپنے اقتدار کے لئے لڑی ہیں۔

۴۔یہ بھی مودودی صاحب کی فرضی خلافت راشدہ کا اصول ہے کہ باپ کے بجائے بیٹا باپ کو حکم دیتا ہے۔

۵۔اس روایت سے یہ ضرور ثابت ہو گیا کہ حضرت حسنؓ حضرت علیؓ سے نہ صرف زیادہ سمجھ دار تھے بلکہ مخلص بھی تھے۔جب کہ اس روایت کی رو سے حضرت علیؓ ان دونوں نعمتوں سے محروم تھے۔استغفراللہ۔

۶۔اس کہانی سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ مکہ سے ام المومنینؓ بغیر سواری کے چلدی تھیں راہ میں اتفاقاً عرنی مل گیا جس سے اونٹ خریدا گیا۔تب ام المومنینؓ کو سواری میسر آئی اگر یہ عرنی نہ ملتا تو بقول اس داستان گو کے انہیں بصرہ تک پیدل ہی سفر کرنا پڑتا۔جب کہ طبری ص۵۷ پر لکھا ہے کہ جب ام المومنینؓ نے کوچ کا ارادہ کیا تو یعلیٰ بن منیہ نے ایک اونٹ اسی دینار میں خرید کر ام المومنینؓ کو پیش کیا۔اس اونٹ کا نام عسکر تھا اور چھ سو اونٹ لشکر کے لئے ہدیتہً دیئے۔

۷۔اس کہانی سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ام المومنینؓ ایک عام دیہاتی عورت کی طرح خود اونٹ ہنکا رہی تھیں۔حالانکہ ام المومنینؓ کے لئے اُن کے اونٹ پر پردے کا انتظام کیا گیا تھا اور فدا کار اُن کے اونٹ کی مہار پکڑے چل رہے تھے اور کہتے جاتے تھے۔

یا امنا خیر ام نعلم — اے ہماری ماں، ہم جانتے ہیں آپ بہترین ماں ہیں۔

۸۔بقول عرنی اونٹ کے بدلے نقد رقم اور ایک اونٹنی دی گئی۔جب قافلہ میں پہلے سے ایک اونٹنی موجود تھی اس کو اونٹ سے تبدیل کرنا چہ معنی دارد؟

۹۔کتوں کی یہ فطرت ہے کہ وہ اجنبی پر بھونکتے ہیں۔وہ شخصیتیں دیکھ کر نہیں بھونکتے۔لیکن اس روایت کے راوی یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ وہ اپنی فطرت کے خلاف صرف ام المومنینؓ پر بھونکے تھے۔اس سے قبل یا اُس کے بعد تاریخ میں کبھی کتے نہیں بھونکے۔یا حَوْاَبْ کے

کتوں کی یہ صفت خاصہ تھی کہ وہ کسی پر نہ بھونکتے تھے۔ بلکہ انہیں صرف ام المومنین رض کے لئے مامور کیا گیا تھا۔

۱۰۔ ام المومنین رض کو راہبری کے لئے عرنی کے علاوہ کوئی نہ ملا۔ حالانکہ خود طبری یہ بیان کرتا ہے کہ بصرے کے عامل عبداللہ رض بن عامر کی تجویز کے مطابق بصرہ کے بلوائیوں کی سرکوبی کے لئے آپ نے بصرہ کا رُخ کیا۔ آپ کے ساتھ عبداللہ رض بن عامر بھی تھے۔ وہ راستے کی منزلوں سے خوب واقف تھے۔ بلکہ انہوں نے اس راہ میں اپنے زمانۂ گورنری میں حاجیوں اور مسافروں کی سہولت کے لئے جگہ جگہ حوض اور کنویں تعمیر کرائے تھے۔ مقام بستان ابن عامر رض جو آج تک موجود ہے اُن سے منسوب ہے۔ عبداللہ رض بن عامر اور ان کے ساتھیوں کی موجودگی میں ایک مجہول اور نامعلوم شخص کو رہبری کے لئے پکڑنا سراسر فریب ہے۔

۱۱۔ مکہ سے بصرہ تک اکیس منزلیں ہیں۔ قدیم مورخ ابوالفرج قدامہ بن جعفر المتوفی ۳۲۹ھ نے تمام ممالک اسلامیہ کے تمام اہم مرکزی مقامات، راستوں اور منزلوں کے نام درج کئے ہیں۔ مکہ سے بصرہ تک جتنی منزلیں ہیں اس میں کسی منزل کا نام الحواب نہیں۔ اور مورخ قدامہ بن جعفر طبری سے پہلے گزرا ہے۔

۱۲۔ جب راہ میں اکیس منزلیں ہوئیں تو کیا کسی اور منزل پر کتوں کا وجود نہ تھا۔ اور اگر وجود تھا تو کیا انہیں نہ بھونکنے کی تلقین کر دی گئی تھی: تاکہ حواب کی کہانی وضع کی جا سکے۔

یہ تو وہ خامیاں ہیں جو روایت کے الفاظ ہی سے ظاہر ہو رہی ہیں۔ لیکن آیئے اب اس کے راویوں پر بھی کچھ نظر ڈال لیں اور علم الرجال کی رو سے دیکھیں کہ اس روایت کا کیا مقام ہے۔ اگرچہ مودودی صاحب کے نزدیک تاریخ میں یہ شجر ممنوعہ ہے۔ لیکن ہم حکم قرآنی کے آگے مجبور ہیں۔ ہم قرآن کی ہرگز خلاف ورزی نہیں کر سکتے۔ ارشاد الٰہی ہے۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِنْ	اے ایمان والو، اگر تمہارے پاس
جَاءَكُمْ فَاسِقٌ بِنَبَإٍ فَتَبَيَّنُوا	کوئی فاسق خبر لے کر آئے تو اس کی

اَنْ تُصِيْبُوْا قَوْمًا بِجَهَالَةٍ	تحقیق کرلیا کرو، تاکہ تم کہیں جہالت
فَتُصْبِحُوْا عَلٰى مَا فَعَلْتُمْ	میں کسی قوم کو نقصان نہ پہنچاؤ اور پھر
نٰدِمِيْنَ ○	تمہیں اُس پر ندامت اٹھانی پڑے۔

اور چونکہ ہم دنیا و آخرت میں نادم نہیں ہونا چاہتے۔ لہٰذا اس روایت کے ایک ایک راوی کا حال قارئین کے سامنے پیش کرنا چاہتے ہیں۔ اس روایت کا پہلا راوی اسمٰعیل بن موسیٰ الفزاری ہے۔ جس سے طبری یہ روایت نقل کر رہا ہے۔

اسمٰعیل بن موسیٰ الفزاری

امام ذہبی میزان الاعتدال میں لکھتے ہیں۔ یہ کوفہ کا باشندہ ہے۔ سدی کذاب کا بھانجا ہے۔ ترمذیؒ ابوداؤد اور ابن ماجہ نے اس سے روایت لی ہیں لیکن بخاری، مسلم اور نسائی نے اس کی روایت نہیں لی۔ ابوحاتم کہتے ہیں سچا ہے۔ نسائی کہتے ہیں اس میں کوئی حرج نہیں۔ لیکن ابن عدی لکھتے ہیں محدثین کو اس پر سخت اعتراض ہے کیونکہ یہ غالی شیعہ تھا۔ عبدان کا بیان ہے کہ ہم اس کے پاس روایات سننے جایا کرتے تھے۔ تو ہمیں ابوبکر بن ابی شیبہ اور ہناد نے اس سے منع کیا۔ اور فرمایا کہ تم اس فاسق کے پاس جاتے ہو جو صحابہ کو گالیاں دیتا ہے۔ میزان ج ۱ ص ۲۵۱۔ حافظ ابن حجر فرماتے ہیں گو اسے سچا کہا جاتا ہے۔ لیکن اس پر رافضی ہونے کا الزام ہے۔ روایت میں غلطیاں بھی کرتا ہے۔ ۲۴۵ھ میں اس کا انتقال ہوا۔ تقریب ص ۳۵

علی بن عابس الازرق

دوسرا راوی علی بن عابس الازرق ہے۔ حافظ ابن حجر اس کے بارے میں لکھتے ہیں۔ یہ کوفہ کا باشندہ ہے، ضعیف ہے۔ ترمذی نے اس سے روایت لی ہے۔ تقریب ص ۲۴۷

امام ذہبی لکھتے ہیں یحییٰ بن معین کا قول ہے یہ کچھ نہیں۔ جوزجانی، نسائی اور ازدی کہتے ہیں یہ ضعیف ہے ابن حبان کا بیان ہے کہ یہ فحش غلطیاں کرتا ہے۔ اس باعث اس کی روایت ترک کر دی گئی۔ میزان۔

تیسرا راوی ابوالخطاب الہجری ہے۔ حافظ ابن حجر فرماتے ہیں یہ مجہول الانسان ہے۔ تقریب ص ۴۰۲

چوتھا راوی صفوان بن قبیصہ ہے۔ حافظ ابن حجر لکھتے ہیں یہ بھی مجہول ہے۔ لسان المیزان ج ۳ ص ۱۹۲۔

آخری راوی عرنی ہے۔ عرنی کسی کا نام نہیں۔ بلکہ یہ قبیلہ عرینہ کی جانب نسبت ہے۔ اس سے کون شخص مراد ہے۔ اس کا نام و پتہ کیا ہے کس جگہ کا باشندہ ہے، کب پیدا ہوا کب مرا؟ آیا عالم وجود میں بھی آیا تھا یا نہیں؟ تاریخ اور رجال کی کتابیں اس سے خاموش ہیں ہم نے رجال کی جو چھان بین کی تو اس سے پتہ چلا کہ عرنی کی نسبت سے منسوب دو شخص ہیں ایک حسن بن عبداللہ العرنی ہے حضرت عبداللہ بن عباس ؓ سے مرسل روایات نقل کرتا ہے۔ چوتھے طبقہ سے تعلق رکھتا ہے۔ اس نے کسی صحابی کو نہیں دیکھا۔

دوسرا قاسم بن حکیم بن کثیر العرنی ہے۔ یہ بھی ضعیف ہے تقریب ص ۲۷۸۔ اس کا انتقال ۲۰۰ھ میں ہوا۔ اور یہ واقعہ ۳۶ھ کا ہے۔ اور اگر عرنی نسبت رکھنے والا کوئی اور شخص ہے تو وہ امام غائب کی طرح غائب ہے الغرض اس کہانی کے تین راوی مجہول۔ ایک ناقابل اعتبار اور ایک رافضی ہے۔ خود ہی قارئین اندازہ کر سکتے ہیں کہ اس روایت کا کیا حال ہوگا۔

اب اصل حقیقت حکیم فیض عالم شہید کے الفاظ میں سنیئے حکیم صاحب ایک جید اہل حدیث عالم تھے جو ایک عرصہ دراز سے تشیع کے خلاف نبرد آزما رہے۔ اس سلسلہ میں انھوں نے متعدد کتابیں تصنیف فرمائیں۔ اور تاریخی حقائق کا پردہ چاک کیا جنہیں کچھ عرصہ بیشتر عین دوپہر کے وقت محلہ مستریاں شہر جہلم کی مسجد اہلحدیث کی گیلری میں تنہا پاکر گولیوں کی بوچھاڑ سے شہید کر دیا۔ (جنگ لاہور ۸ ستمبر ۱۹۸۳ء) اس طرح حکیم صاحب نے عظمت صحابہ کی خاطر اپنی جان کا نذرانہ پیش کیا حکیم صاحب لکھتے ہیں۔

شیعوں کی وضعی اور من گھڑت روایات میں سے ایک یہ بھی ہے کہ بصرہ کے راستہ میں ایک مقام حواب پر ام المؤمنین حضرت عائشہ پر کتے بھونکے۔ تو آپ نے پوچھا یہ کون

سا مقام ہے؟ جواب ملا کہ حواب۔ آپ نے فرمایا مجھے واپس کر دو۔ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے سنا تھا کہ تم میں سے وہ کون ہوگی جس پر حواب کے کتے بھونکیں گے۔

طبری نے اپنے تقیہ کی آڑ میں اس پر پورا باب باندھا ہے۔ اس روایت کا خالق وہی ابو مخنف (لوط بن یحییٰ) ہے جس نے کربلا کے واقعہ سے ۱۲۵ سال بعد کربلا کے واقعات تراشے اور جس کے متعلق "مجاہد اعظم" کے شیعہ مصنف کو بھی لکھنا پڑا کہ ابو مخنف کا لکھا ہوا کوئی واقعہ صداقت کے معیار پر پورا نہیں اترتا۔

اصل واقعہ یہ ہے کہ ۶ھ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت زید بن حارثہؓ کو ایک سریہ پر متعین کر کے بنو فزارہ کی طرف بھیجا۔ اس سریہ میں ام قرفہ نامی ایک عورت معہ اپنی بیٹی ام زمل سلمیٰ کے ساتھ گرفتار ہو کر آئی۔ ام قرفہ واجب القتل تھی۔ وہ اپنے انجام کو پہنچی۔ مگر ام زمل سلمیٰ لونڈی کی حیثیت سے ام المؤمنین حضرت عائشہؓ کو دی گئی۔ آپ نے اسے آزاد کر کے اپنے پاس رکھ لیا۔ ایک روز چند عورتیں مع ام زمل سلمیٰ کے آپ کی خدمت میں بیٹھی ہوئی تھیں۔ کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے اور آپ نے فرمایا تم میں سے وہ کون ہوگی، جس پر حواب کے کتے بھونکیں گے۔ پھر یہ عورت اپنی قوم میں چلی گئی، اور مرتد ہوگئی۔ یاقوت حموی، معجم البلدان ج ۲ صـ ۳۵۲۔

حضرت صدیق رضی اللہ عنہ کی خلافت کے زمانہ میں جب مختلف قبیلوں نے بغاوت کی، تو چند طالع آزماؤں نے نبوت کا دعویٰ کیا۔ جن میں طلیحہ بن خویلد اسدی بھی تھا۔ غطفان، ہوازن اسد اور طے کے قبائل کے بہت سے لوگ اس کے ساتھ ہوگئے۔ حضرت خالدؓ نے انہیں شکست فاش دی، اور اُن کی قوت کو منتشر کر دیا۔ ام زمل سلمیٰ اس لشکر میں موجود تھی۔ جس کے دل میں اپنی ماں کے قتل کا کینہ بھرا ہوا تھا۔ طلیحہ بھاگ کر یمن چلا گیا۔ غطفان، سلیم اور ہوازن وغیرہ قبائل کے بچے کھچے لوگ حواب کے مقام پر جمع ہوتے۔ اور انہوں نے اسی سلمیٰ بنت مالک کو اپنا سردار بنا لیا۔ حضرت خالدؓ کو معلوم ہوا تو وہ اس طرف روانہ ہوئے۔ سلمیٰ اپنے لشکر کو لے

کر مقابلہ برپا کی۔ تو اس کی ناقہ کی کونچیں کاٹ ڈالی گئیں۔ ناقہ گری اور سلمی مقتول ہوئی۔ تاریخ اسلام اکبر نجیب آبادی ج ا صـ۲۹۲

(یہ بھی غور و فکر کا مقام ہے کہ جنگ جمل میں حضرت علیؓ کے ساتھیوں نے حضرت عائشہؓ کے اونٹ کی کونچیں کاٹیں اور انہیں اونٹ سے گرانے کی کوشش کی۔ لیکن ان کے فرزندوں نے اپنی جانوں کا نذرانہ پیش کر کے ام المؤمنین کی جان کو محفوظ رکھا۔ غالباً یہ سب حرکات اسی لیے انجام دی گئی تھیں کہ اُن پر حوأب کی کہانی چسپاں کی جا سکے یعنی اس کہانی کو ثابت کرنے کے لیے عملی ثبوت بھی فراہم کرنے کی کوشش کی گئی۔)

حوأب کے کتے بھونکنے کا اشارہ اسی ام زمل سلمی کی طرف تھا۔

فکانوا یرون انها التی	مؤرخین کا کہنا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ
غاها النبی صلی اللہ علیه	علیہ وسلم نے حوارب سے اسی عورت
وسلم۔ معجم البلدان للحموی صـ۳۵۲ ج-۲	کو مراد لیا تھا۔

ابو مخنف کی بیان کردہ سند کے علاوہ طبری نے اپنی طرف سے سلسلۂ روایت بیان کر کے اس روایت کو صحیح ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔ یعنی اسمٰعیل بن موسیٰ الفزاری، علی بن عابس، ابو الخطاب الہجری، اور صفوان بن قبیصۃ الاحمسی اس کی سند کے راوی ہیں۔ پہلا راوی اسمٰعیل بن موسیٰ الفزاری ہے۔ جو بقول امام ذہبی غالی شیعہ اور فاسق تھا۔ جو سلف صحابہؓ پر سب کرتا تھا۔ ۱۲۵ھ میں مرا۔ میزان الاعتدال ج ا صـ۱۱۷

مگر طبری ۲۲۴ھ میں طبرستان میں پیدا ہوا۔ یہ طبری ہی کا کمال ہے کہ پیدا ہونے سے تقریباً اسی سال پہلے طبرستان سے کوفہ پہنچا۔ اور مرے ہوئے اسماعیل سے اس روایت کی سماعت کی۔

(ہمارے نزدیک یہاں حکیم صاحب کو مغالطہ ہوا ہے۔ اسمٰعیل کا انتقال ۱۲۵ھ میں نہیں بلکہ ۲۴۵ھ میں ہے۔ ہم نے خود میزان کا مطالعہ کیا ہے۔ اس میں ۲۴۵ھ ہے۔ ابن حجر نے تقریب میں بھی ۲۴۵ھ لکھا ہے۔ پھر یہ امام ترمذی کے استادوں میں شامل ہے۔ اور ترمذی

۱۰۹ھ میں پیدا ہوئے اور ان کا انتقال ۱۷۹ھ میں ہوا۔)

دوسرا راوی علی بن عابس ہے جو بقول نسائی ضعیف ہے۔ تیسرا راوی ابوالخطاب الہجری بقول حافظ ابن حجر مجہول ہے (تہذیب التہذیب)

ان مجہولوں کا سلسلۂ اسناد عرینہ قبیلہ کے کسی نامعلوم الاسم اونٹ والے پر منتہی ہوتا ہے۔ جس سے ام المؤمنینؓ کی سواری کے لئے اونٹ خریدا گیا اور پھر اسے ہی رہبری کے لئے ساتھ رکھا۔

کتنی حیرانی کا مقام ہے کہ ام المؤمنینؓ جیسی بلند مرتبہ ہستی ایک عظیم ترین سفر پر روانہ ہو رہی ہیں۔ اور اُن کے پاس سواری ہے نہ راہبر۔ وہ سواری کے لئے اونٹ خریدتی ہیں اور اونٹ والے ہی کو اپنا بدرقہ بنا لیتی ہیں۔ اللہ تعالیٰ ایسی بے سروپا ہانکنے والوں کو ہدایت دے۔

اصل واقعہ یہ ہے کہ آپ کے ساتھ ہزاروں کی جمعیت تھی۔ جن میں سے اکثر اسی علاقے کے رہنے والے تھے اور ملک کے چپہ چپہ سے واقف تھے۔ مگر شیعہ بزرگ یہ ظاہر کر رہے ہیں کہ گویا ایک معمولی قسم کی عورت گھر سے نکلتی ہے اور دوران سفر اونٹ خریدتی ہے۔ اسی اونٹ والے کو راستہ بتانے کیلئے ساتھ لیتی ہے۔ اصل واقعات کو اس طرح سوقیانہ انداز میں بیان کرنا شیعوں کے لئے نہ صرف جائز بلکہ باعث ثواب ہے۔ مگر اہل سنت عالموں کی عقل وخرد، علم وفضل اور سوجھ بوجھ کو کسی مخبوط الحواس کے گدھے چر گئے ہیں۔ جو آئے دن نہایت دل سوزی، دردمندی اور مایوسانہ سے انداز میں محراب ومنبر سے یہ کہتے نظر آتے ہیں کہ کاش حضرت عائشہؓ بصرہ کا سفر نہ کرتیں اور آپ پر حوأب کے کتے نہ بھونکتے۔ کوئی ان عقلوں کے کودنوں سے پوچھے کہ اگر تمہیں اصل واقعہ کا پتہ نہیں تو اس دردمندی کے ہلکان میں مبتلا ہونے کے لئے تمہیں کس حکیم نے مشورہ دیا ہے کہ جب تک تم اس واقعہ سے اپنے مواعظ حسنہ کو زینت نہ دو گے تو تمہیں کھایا پیا ہی ہضم نہ ہوگا۔

اصل بات یہ ہے کہ بصرے کے عامل عبداللہؓ بن عامر کی تجویز سے ام المؤمنینؓ اس سفر

پر روانہ ہوئی تھیں، عامل موصوف کی فوج کا ایک دستہ آپ کے ہمراہ تھا۔ اور یہ راستہ کوئی نامعلوم راستہ نہ تھا۔ بلکہ ایک شاہراہ تھی، جس پر دن رات قافلے چلتے رہتے تھے۔ اور تمام راستے میں حاجیوں اور مسافروں کی سہولت کیلئے حوض اور کنویں تعمیر کرائے گئے تھے۔ مقام بستان ابن عامرؓ آج تک ابن عامرؓ کی جانب منسوب ہے۔

ام المؤمنینؓ کی سواری کے لئے کس صحرا میں، کس بدو سے کس شخص نے اونٹ خریدا؟ کیا ام المؤمنینؓ گھر سے پیدل ہی عازم سفر ہوئی تھیں؟ ایک معمولی آدمی تو گھر سے پورا ساز و سامان لے کر نکلے مگر ام المؤمنینؓ کی سواری کے لئے راستہ میں سواری خریدی جائے۔ اُن کی سواری میں عسکر نام کا بہترین اونٹ تھا۔ جو حضرت یعلیٰؓ بن منیہ نے پیش کیا تھا۔ معارف ابن قتیبہ صفحہ ۱۲۰ مکہ سے بصرہ تک اکیس منزلیں تھیں۔ مؤلف قدامہ بن جعفر المتوفی ۲۹۰ھ نے کتاب الخراج و صنعۃ الکتابۃ میں اس دور کے تمام اہم راستوں کی منازل لکھی ہیں۔ مگر ان منازل میں حوأب نام کی کوئی بستی سرے سے نہیں۔

کُتے اکثر قافلوں اور مُسافروں پر بھونکتے رہتے ہیں۔ اگر کتے کہیں بھونک بھی گئے تو صرف طبری اور اس کے مجہول راویوں کو نظر آئے کہ یہ حوأب کا مقام ہے۔ اور حضرت عائشہؓ پر کتے بھونک رہے ہیں اور بعد میں آنے والے مؤرخ طبری کی اس ہرزہ سرائی اور یاوہ گوئی کو نقل کرتے چلے گئے۔ انہیں وہ تمام احادیث بھول گئیں جو ام المؤمنینؓ کے لئے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہیں۔

چاہیے تو یہ تھا کہ علمائے اہل سنت شیعوں کی اس بدگوئی سے حرم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم آپ کی محبوب زوجہ، حقیقی اہل بیت جن کے لحاف میں آرام فرمانے کی حالت میں بھی حضور پر وحی نازل ہوتی رہی، جن کو یا حمیرا کہہ کر مخاطب کیا جاتا رہا۔ اُن کا دفاع کرتے۔ مگر آج اس واقعہ پر معذرت خواہانہ انداز میں گفتگو کی جاتی ہے اور یہ نہیں کہا جاتا کہ یہ واقعہ سرے سے ہی غلط ہے۔ شیعیت کی سازش نے بڑی بڑی جلیل القدر ہستیوں کے دماغوں میں غلط سلط نظریات ٹھونس دا نہیں

کسی امر کی حقیقت سمجھنے سے دور پہنچا دیا ہے۔

حکیم صاحب آگے تحریر فرماتے ہیں۔

عوام کا تو گلہ ہی بے سود ہے۔ اہل سنت کے تمام فرقوں کے مسلمہ بزرگ حضرت شاہ ولی اللہ بھی اس تسامح کا شکار ہو گئے۔ چنانچہ ازالۃ الخفا میں انہوں نے بھی ابو یعلی کے حوالہ سے حَوْاَبْ کے کتے بھونکنے کی جھوٹی روایت کو قیس بن ابی حازم المتوفی ۹۸ھ کی سند سے نقل کر دیا ہے۔ جسے یحییٰ بن سعید نے منکر الحدیث کہا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ اسرائیلیات کی طرح شیعی تحریک کی وضع کردہ روایات آج اس طرح اصل میں غلط ملط ہو کر رہ گئی ہیں۔ جس طرح انگلیوں کے گوشت میں ناخن پیوست ہیں حقیقت مذہب شیعہ۔ از ص ۱۷۵ تا ص ۱۷۹

شاہ ولی اللہ نے قیس بن ابی حازم والی جو روایت نقل کی ہے تو امام ذہبی نے میزان میں اسے منکر قرار دیتے ہوئے لکھا ہے کہ محدثین کو قیس پر جو اعتراض ہے وہ اسی بیہودہ روایت کے باعث ہے۔ امام یحییٰ بن سعید نے اس کی متعدد روایات کو منکر قرار دیا ہے۔ اسمٰعیل بن ابی خالد کا بیان ہے کہ ان کی عمر سو سال سے زیادہ ہو گئی تھی۔ اور بڑھاپے کے باعث دماغ سٹھیا گیا تھا۔ یہ حضرت علیؓ پر سخت اعتراضات کیا کرتا تھا۔ میزان ج ۳ ص ۳۹۲

غالباً اسی لئے کہ اس روایت کا آخری حصہ حضرت علیؓ سے متعلق ہے۔

آخر میں یہ بات بتانی بھی ضروری ہے کہ ام المومنینؓ نے یہ سفر مکہ سے فرمایا ہے ظاہر ہے کہ مدینہ سے مکہ حج کے وقت کسی سواری ہی پر تشریف لے گئی ہوں گی۔ انہیں راہوں میں اونٹ خریدنے کی کوئی ضرورت نہ تھی۔ حضرت یعلیؓ بن منیہ نے ام المومنینؓ سے اظہار محبت کی خاطر عسکر نامی اونٹ خرید کر پیش کیا۔

طبری نے اس سلسلہ میں جو متضاد روایات پیش کی ہیں۔ اگر انہیں پیش کیا جائے تو مضمون بہت طویل ہو جائے گا۔ وہ اسی قسم کی متضاد روایات پیش کرنے کے عادی ہیں تاکہ اہل

سنت بھی خوش رہیں اور سبائی برادری بھی۔ اور کسی مقام پر بھی اپنی رائے کا اظہار نہیں کرتے اور بہت سے صوفیاء نے بھی یہی طریقہ اختیار کیا۔

عمر با مسلماں اللہ اللہ بابرہمن رام رام

حضرت عمرؓ کا اپنے بیٹے کو کوڑے مارنا

یہ داستان بھی ہر شخص کی زبان پر جاری ہے بلکہ اچھے اچھے لوگ حضرت عمرؓ کا عدل و انصاف ثابت کرنے کے لئے برسرمنبر اس کہانی کو پیش کیا کرتے ہیں۔ لیکن اس داستاں میں جو زہر بھرا ہوا ہے۔ اس سے عوام تو کیا واقف ہوتے، ہمارے علماء کی بھی اس پر نظر نہیں جاتی۔ یہ داستاں ایک فریب اور غلاظت کا ڈھیر ہے۔ جس پر سونے کا ورق چڑھا دیا گیا ہے اور ہر شخص صرف اس سونے کے ورق کو دیکھ رہا ہے۔ کوئی اس غلاظت کو کرید کر دیکھنے کے لئے تیار نہیں۔

اس عدل و انصاف کے پردے میں جہاں حضرت عمرؓ کے صاحبزادے کو بدکار ثابت کیا گیا ہے، وہاں ساتھ ساتھ حضرت عمرؓ کو احکامِ شریعت سے جاہل اور ظالم و جابر بنا کر دکھایا گیا ہے۔ اس کے علاوہ اس رام کہانی میں اتنا زبردست اختلاف اور تضاد ہے کہ جس کا رفع ہونا قیامت تک ممکن نہیں۔ کسی فریب کار نے اسے مختصراً بیان کیا ہے اور کسی نے تفصیلاً۔ ہم یہ تمام کہانیاں ہدیۂ ناظرین کرتے ہیں۔

پہلی روایت سعید بن مسروق کی جانب منسوب ہے۔

سعید کا بیان ہے کہ ایک عورت حضرت عمرؓ کے گھر میں آتی جاتی تھی، اس کے ساتھ ایک بچہ بھی ہوتا۔ ایک روز حضرت عمرؓ نے اس سے اچانک سوال کیا کہ یہ تیرے ساتھ کس کا بچہ ہے؟ بولی یہ آپ کے لڑکے ابو شحمہ کا بیٹا ہے۔ جس نے میرے ساتھ غلط حرکت کی تھی۔ حضرت عمرؓ نے اپنے بیٹے ابو شحمہؓ کو طلب کیا۔ اس نے اقرار کیا۔ حضرت عمرؓ نے حضرت علیؓ سے فرمایا اس کے کوڑے مارو، الغرض پچاس کوڑے حضرت علیؓ نے لگائے اور پچاس کوڑے خود حضرت عمرؓ نے مارے۔ اس کے بعد اس لڑکے کو حضرت عمرؓ کے سامنے لایا گیا۔ وہ دم توڑ رہا تھا کہنے لگا۔ اے میرے باپ آپ نے مجھے قتل کر دیا ہے۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا جب تو اللہ عزوجل سے ملاقات کرے تو بارگاہِ الٰہی میں عرض کرنا کہ تیرا باپ حدودِ الٰہی کو قائم رکھتا ہے۔

یہ واقعہ مختلف صورتوں میں مروی ہے اور ہر ایک قصہ گو نے اپنے اپنے تخیل کے مطابق اس میں رنگ آمیزی کی ہے۔ جس کی تفصیل آئندہ سطور میں پیش کی جائے گی۔ لیکن اس مختصر سی روایت سے جو جو امور سامنے آرہے ہیں پہلے وہ سن لیجئے۔

۱۔ یہ گمنام عورت ایک عرصہ تک اپنے بچہ کو لے کر حضرت عمرؓ کے گھر آتی جاتی رہی۔ اور حضرت عمرؓ کے سوال کرنے سے قبل اتنے عرصہ تک اس نے کسی پر یہ ظاہر نہیں کیا کہ یہ بچہ کس کا ہے؟

۲۔ یہ عورت شادی شدہ تھی، اگر کنواری ہوتی تو بچہ پیدا ہوتے ہی لوگ اس سے پوچھ گچھ شروع کر دیتے۔ لیکن یہاں معاملہ ایسا نہیں ہے۔

۳۔ عورت کا بچہ کو لئے پھرنا اور پھر خاموش رہنا اس امر کا ثبوت ہے کہ وہ جرم میں برابر کی شریک تھی۔ لہٰذا فردِ جرم اس پر بھی عائد ہوتی ہے۔ اگر وہ کنواری تھی تو اس کے بھی سو کوڑے لگنے چاہئیں تھے۔ اور اگر وہ شادی شدہ تھی تو اسے سنگسار کرنا چاہئے تھا اور یہاں ان میں سے کوئی صورت عمل میں نہیں آئی۔ گویا راوی یہ ثابت کرنا چاہتا ہے کہ حضرت

عمر رضی اللہ عنہ اور دیگر صحابہ کرام اتنے لاعلم لوگ تھے کہ ایسے معمولی دینی مسائل سے بھی واقف نہ تھے۔ اسی لئے سب صحابہ خاموش رہے۔

۴۔ اگر اس عورت کے ساتھ زبردستی کی گئی تھی تو اسی وقت اس عورت نے حضرت عمرؓ کے سامنے پیش ہو کر دعوی کیوں نہیں کیا۔ پہلے تو نو ماہ تک یہ گناہ پیٹ میں چھپائے بیٹھی رہی۔ پھر بچہ پیدا ہونے کے بعد یہ گناہ کی پوٹلی لئے پھرتی رہی۔

۵۔ یہ عورت کون تھی۔ اس کا نام کیا تھا۔ کس خاندان سے تعلق رکھتی تھی اور کہاں کی رہنے والی تھی؟ یہ امور کوئی راوی بیان نہیں کرتا۔ ہمارے خیال میں یہ کوئی ایرانی النسل ہوگی جو حضرت عمرؓ کے صاحبزادے پر حد جاری کرانے کے لئے وجود میں لائی گئی ہوگی۔

۶۔ حضرت ماعز اسلمیؓ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات میں غلطی سے زنا کر بیٹھے۔ بعد میں شرمندہ ہوئے۔ حضور کے روبرو پیش ہو کر اقرار جرم کیا۔ حضور نے منہ پھیر لیا۔ انہوں نے تین بار اسی طرح اقرار کیا۔ آپ ہر بار منہ پھیرتے رہے۔ آخر میں حضور نے اُن سے فرمایا کیا تو پاگل تو نہیں ہے؟ انہوں نے عرض کیا نہیں۔ آپ نے فرمایا تو نے ایسے ہی چپٹا لیا ہوگا۔ الغرض آپ آخر تک یہ کوشش کرتے رہے کہ ماعزؓ اپنے اقرار سے منحرف ہو جائیں۔

اس سے یہ مسئلہ ثابت ہوتا ہے کہ حتی الامکان اس کی سعی کرنی چاہیئے کہ کسی پر حد جاری نہ ہو، اسی لئے یہ حکم دیا گیا۔

ادرأوا الحدود ما استطعتم ۔ جہاں تک ہو سکے حد سے درگزر کرو۔

لیکن یہاں حضرت عمرؓ بیٹے سے زبردستی اقرار کرا رہے ہیں جو سراسر خلاف شریعت ہے۔

۷۔ حد جاری کرنے کا مقصد جان سے مارنا نہیں۔ بلکہ سزا دینا اور ذلت و رسوائی مقصود ہے۔ سورۃ نور میں جہاں زنا کی سزا بیان کی گئی ہے۔ وہاں ساتھ ساتھ فرمایا گیا ہے۔

نَكَالًا مِّنَ اللّٰهِ ۔ یہ اللہ کی جانب سے رسوائی ہے۔

الغرض ہم جس پہلو سے اس روایت کو دیکھتے ہیں۔ ہمیں یہ روایت عدل و انصاف کے

پوشیدہ اوراق میں حضرت عمرؓ اور صحابہ کرام پر تبرا نظر آتی ہے۔ اسی لئے تمام ناقدین حدیث اس روایت کو موضوع قرار دیتے ہیں۔ امام ابن الجوزی فرماتے ہیں۔

هذا حديث موضوع وضعه	یہ روایت موضوع ہے۔ اسے قصہ گوؤں
القصاص وقد شرح فيه	نے وضع کیا۔ اس میں فضولیات کو داخل
واعادوا وقد شرحوا واطالوا	کیا۔ بعض باتوں کی تکرار کی۔ کہیں تشریح
موضوعات ج ۳ ص۲۷۹	کی۔ اور کہیں بلاوجہ طویل کیا۔

علامہ محمد طاہر پٹنی اور جلال الدین سیوطی لکھتے ہیں۔

حديث ابى شحمة ولد عمر	ابو شحمہ حضرت عمر کے بیٹے کے سلسلہ
رضى الله عنه وزناه واقامة	میں یہ روایت کہ انہوں نے زنا کیا پھر
عمر عليه الحد وموته بطلہ	حضرت عمر نے ان پر حد قائم کی جس
ليصح بل وضعه القصاص	سے ان کی موت واقع ہوئی۔ یہ صحیح
تذکرہ الموضوعات ص۱۸۰۔ اللآلی	نہیں۔ بلکہ قصہ گوؤں نے اسے وضع
المصنوعہ فی احادیث الموضوعہ	کیا ہے۔
ج ۲ ص۱۹۴۔	

اس روایت کے کئی راوی مثلاً محمد بن عبید الاسدی، اور ابو عبداللہ حسن بن علی مجہول ہیں۔ اور آخری راوی سعید بن مسروق ہیں جن کا انتقال ۱۲۶ھ میں ہوا۔ یہ تبع تابعی ہیں۔ امام اعمش کے شاگرد ہیں۔ اور امام سفیان ثوری کے والد ہیں۔ انہوں نے اپنی زندگی میں کسی صحابی کو نہیں دیکھا اس لحاظ سے اوپر کے راوی غائب ہیں، اور روایت منقطع ہے اور چونکہ امام سفیان ثوری کونہ کے مشہور اہل سنت محدث و فقیہ اور ماہر رجال تھے۔ وہ خود نامعتبر راویوں پر جرح کرتے رہتے تھے۔ لہٰذا اس روایت کو ان کے والد کی جانب منسوب کر کے سبائی برادری نے اپنا کلیجہ ٹھنڈا کیا ہے۔ جہاں تک حضرت عمرؓ اور ان کی اولاد کا سوال ہے تو سبائیوں کا دین و مذہب

تو یہ ہے ۔

ع ۔ زآلِ عمر کینہ قدیم است عجم را

تفصیلی روایت حضرت عبداللہ بن عباسؓ کی جانب منسوب کی گئی ہے ۔ جو کسی صورت میں بھی داستانِ ہوشربا سے کم نہیں ہے ۔ آپ حضرات بھی پڑھیں ۔ اور لطف اندوز ہوں ۔

امام مجاہد کا بیان ہے کہ کچھ لوگ ایک دن حضرت عبداللہ بن عباسؓ کی خدمت میں بیٹھے مصروفِ گفتگو تھے ۔ اتفاق سے حضرت ابوبکرؓ کے فضائل کا بیان شروع ہوا ۔ اس کے بعد حضرت عمرؓ کی فضیلت کا ذکر چل نکلا ۔ حضرت عبداللہ بن عباسؓ نے جب حضرت عمرؓ کا ذکر سنا تو اتنے روئے کہ بے ہوش ہو کر گر گئے ۔ پھر جب ہوش آیا تو فرمانے لگے ۔ اللہ اُس شخص (حضرت عمرؓ) پر رحمت نازل فرمائے ۔ جس نے اللہ کے معاملہ میں کبھی کسی ملامت کرنے والے کا خوف نہیں کیا ۔ اللہ اس شخص پر رحمت نازل فرمائے ۔ جس نے قرآن کو پڑھ کر اس پر عمل کیا ۔ اور اللہ کی حدود کو اسی طرح قائم کیا ۔ جس طرح اللہ نے حکم دیا تھا اور اس معاملہ میں انہوں نے کبھی اپنی قرابت داری کا خیال نہیں کیا اور نہ کبھی کسی کی دشمنی سے خوف کھایا ۔

اللہ کی قسم عمرؓ نے اپنے بیٹے پر حد قائم کی ۔ اور اس حد میں اسے قتل کر دیا ۔ پھر ابن عباسؓ رونے لگے ۔ انہیں دیکھ کر لوگ بھی رونے لگے ۔ ہم نے عرض کیا ۔ اے رسول اللہ کے چچا کے بیٹے ۔ ہم سے آپ وہ واقعہ بیان کیجئے کہ عمرؓ نے اپنے بیٹے پر کس طرح حد قائم کی تھی ۔ ابن عباسؓ نے فرمایا تم نے مجھے وہ بات یاد دلا دی جو میں بھول گیا تھا ۔

مجاہد کہتے ہیں میں نے عرض کیا ۔ آپ کو مصطفیٰ کا واسطہ ۔ ہم آپ کو قسم دیتے ہیں کہ آپ ہم سے اس واقعہ کی تفصیل بیان کریں ۔

انہوں نے فرمایا ۔ اے لوگو ۔ میں ایک روز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مسجد میں بیٹھا ہوا تھا ۔ حضرت عمرؓ بھی بیٹھے ہوئے تھے ۔ اور ہجوم بھی ان کے ارد گرد جمع تھا ۔ امیر المومنینؓ لوگوں کو نصیحت کر رہے تھے اور لوگوں کے معاملات کے فیصلے کر رہے تھے ۔ اتنے میں

مسجد کے دروازے سے ایک لڑکی داخل ہوئی اور مہاجرین و انصار کی گردنوں کو پھلانگتی ہوئی حضرت عمرؓ کے روبرو جاکر کھڑی ہوئی۔ اور بولی۔ السلام علیک یا امیرالمؤمنین ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ۔
حضرت عمرؓ نے جواب دیا وعلیک اسلام، اے اللہ کی بندی کیا مجھ سے کچھ کام ہے؟
وہ بولی سب سے بڑا کام تو آپ ہی سے ہے۔ یہ اپنا لڑکا آپ مجھ سے لے لیجئے۔ کیونکہ اس کے آپ مجھ سے زیادہ حقدار ہیں۔ پھر اس لڑکی نے نقاب اٹھادی۔ اس کے ہاتھ میں چند روز کا بچہ تھا۔ حضرت عمرؓ نے اس لڑکی کو دیکھا اور فرمایا۔ نقاب ڈال لو، پھر حضرت عمرؓ لاحول پڑھنے لگے۔ پھر بولے میں تجھے نہیں پہچانتا۔ تو یہ میرا لڑکا کیسے بن گیا۔
اس بات پر وہ رونے لگی۔ حتیٰ کہ اس کی اوڑھنی آنسوؤں سے تر ہوگئی۔ پھر بولی، اے امیرالمؤمنینؓ اگر یہ آپ کا بیٹا نہیں تو بیٹے کا تو بیٹا ہے۔ حضرت عمرؓ نے دریافت کیا۔ کون سے بیٹے کا؟ اس نے جواب دیا ابوشحمہ کا۔ حضرت عمرؓ نے دریافت کیا یہ بیٹا حلال سے ہے یا حرام سے۔ بولی میری جانب سے حلال کا ہے۔ اور اس کی جانب سے حرام کا۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا۔ یہ کیسے ممکن ہے۔ وہ کہنے لگی۔ اے امیرالمؤمنینؓ میری بات غور سے سنئے۔ اللہ کی قسم میں ایک حرف بھی کمی بیشی نہ کروں گی۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا۔ اللہ سے ڈر اور سچ بول۔
وہ بولی سچ بات تو یہ ہے کہ میں ایک روز بنو بخار کے ایک احاطہ سے گزر رہی تھی کہ میں نے اچانک اپنے پیچھے سے ایک چیخ سنی دیکھا تو آپ کا بیٹا ابوشحمہؓ نشہ میں جھوم رہا تھا۔ اور اس نے ایک یہودی کی بھٹی سے شراب پی تھی۔ جب وہ جھومتا ہوا میرے قریب آیا تو مجھے ڈرایا دھمکایا اور احاطہ میں کھینچ کر لے گیا۔ میں گر پڑی اور بے ہوش ہوگئی۔ مجھے جب ہوش آیا تو وہ میرا سب کچھ لوٹ چکا تھا۔ میں نے اس بات کو اپنے چچا اور پڑوسیوں سے چھپایا جب حمل کے دن مکمل ہوگئے۔ اور مدت پوری ہوگئی اور مجھے زچگی کا احساس ہونے لگا۔ تو میں فلاں جگہ چلی گئی۔ اور اس غلام (بچہ) کو جنم دیا۔ پہلے تو میں نے اسے مار ڈالنے کا ارادہ کیا۔ لیکن میں اس پر نادم ہوئی۔ اب میرے اور اپنے بیٹے کے درمیان حکم الٰہی کے مطابق

فیصلہ کیجئے۔

عبداللہ بن عباسؓ فرماتے ہیں۔حضرت عمرؓ نے منادی کو حکم دیا۔کہ لوگوں کو اعلان کر کے جمع کرے۔لوگ دوڑ دوڑ کر مسجد میں جمع ہونے لگے۔لوگوں کے جمع ہونے کے بعد حضرت عمرؓ اپنی جگہ سے اٹھے۔اور لوگوں سے فرمایا۔اے مہاجرین و انصار یہاں سے نہ ہٹنا جب تک میں خبر لے کر نہ آؤں،پھر مسجد سے نکلے،اور میں آپ کے ساتھ تھا۔پھر میری طرف دیکھ کر فرمایا۔اے ابن عباسؓ میرے ساتھ جلدی چل۔حضرت عمرؓ تیزی سے گھر کے دروازے تک گئے۔دروازہ کھٹکھٹایا۔ایک خادمہ نکل کر آئی۔جب اُس نے آپ کے چہرے کو غضبناک دیکھا۔تو بولی۔اے امیر المؤمنینؓ کیا معاملہ ہے۔امیر المؤمنینؓ نے دریافت کیا۔کیا میرا بیٹا ابو شحمہ ہے؟ بولی ہاں کھانا کھا رہا ہے۔حضرت عمرؓ گھر میں داخل ہوئے اور بیٹے سے مخاطب ہو کر کہنے لگے۔اے میرے بیٹے کھالے۔شاید یہ تیرا دنیا میں آخری کھانا ہو۔

ابن عباس کہتے ہیں میں نے غلام (لڑکے) کو دیکھا کہ اُس کا رنگ اُڑ گیا تھا۔اور وہ کپکپا رہا تھا اور لقمہ اس کے ہاتھ سے گر گیا تھا۔حضرت عمرؓ نے اس سے سوال کیا۔اے میرے بیٹے میں کون ہوں؟

ابو شحمہ آپ میرے والد اور امیر المؤمنینؓ ہیں۔

حضرت عمرؓ کیا تجھ پر میری اطاعت کا حق نہیں؟

ابو شحمہ جی ہاں۔دو حق فرض ہیں۔اول یہ کہ آپ میرے والد ہیں۔دوئم آپ امیر المؤمنینؓ ہیں۔

حضرت عمرؓ تجھے تیرے نبی اور تیرے باپ کا واسطہ۔میں تجھ سے ایک سوال کروں گا۔تو درست جواب دینا۔

ابو شحمہ ہاں۔میں بالکل صحیح جواب دوں گا۔

حضرت عمرؓ کیا تو یہودی کی بھٹی پر مہمان بن کر نہیں گیا تھا؟تو نے وہاں شراب پی

اور نشہ میں مست ہوا ؟

ابوشحمہ: جی ہاں۔ واقعتاً ایسا ہی ہوا تھا۔ لیکن اب میں نے توبہ کرلی ہے۔

حضرت عمرؓ: گناہگاروں کا اصل سرمایہ توبہ ہی ہے۔ لیکن میں تجھے اللہ کی قسم دے کر سوال کرتا ہوں، کیا تو اُس روز بنوالنجار کے احاطہ میں گیا تھا۔ اور پھر تو نے ایک عورت دیکھی۔ اور اس کے ساتھ غلط حرکت کی ؟

اس پر وہ لڑکا خاموش ہوگیا۔ اور رونے لگا اور اپنے چہرے کو طمانچوں سے پیٹ رہا تھا۔

حضرت عمرؓ: سچ بتا۔ کیونکہ اللہ سچ بولنے والوں کو پسند کرتا ہے۔

ابوشحمہ: ہاں میرے باپ۔ مجھ سے ایسی حرکت ہوئی تھی۔ شیطان نے مجھے ورغلا دیا تھا۔ جس پر میں اب تائب اور نادم ہوں۔

حضرت عمرؓ نے جب یہ الفاظ سنے تو اس کا ہاتھ پکڑا۔ گردن دبوچی، اور کھینچ کر مسجد لے جانے لگے۔ جس پر وہ بولا۔

اے میرے باپ مجھے دنیا کے سامنے رسوا نہ کیجئے۔ یہیں میرا ایک ایک جوڑ کاٹ دیجئے۔

حضرت عمرؓ: کیا تو نے اللہ عزوجل کا فرمان نہیں سُنا۔

وَلْيَشْهَدْ عَذَابَهُمَا طَائِفَةٌ مِّنَ الْمُؤْمِنِينَ ۝

ان کی سزا کے وقت مؤمنین کی ایک جماعت موجود رہنی چاہیئے

پھر اسے کھینچ کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کے صحابہ کے سامنے لے گئے اور فرمایا عورت سچ کہتی ہے۔ ابوشحمہ نے اقرار کرلیا ہے۔ حضرت عمرؓ کا ایک غلام تھا جس کا نام افلح تھا۔ اس سے مخاطب ہو کر فرمایا۔

حضرت عمرؓ: اے افلح میرا تجھ سے ایک کام ہے۔ اگر تو وہ انجام دیدے تو تو اللہ کے

لئے آزاد ہے۔

افلح — امیرالمومنینؓ حکم دیجئے۔

حضرت عمرؓ — اس کے سو کوڑے مار۔ اور اس مار میں کوئی کوتاہی نہ کر۔

افلح — میں یہ کام انجام نہیں دے سکتا۔ پھر افلح رونے لگا اور بولا کاش میری ماں نے مجھے اس دن کے لئے نہ جنا ہوتا۔ کہ میں اپنے مالک کے بیٹے کے کوڑے ماروں۔

حضرت عمرؓ — میری اطاعت رسول کی اطاعت ہے۔ لہٰذا اس کے کپڑے اتار۔ اور میرے حکم پر عمل کر۔

ابن عباسؓ کہتے ہیں اس پر لوگوں نے چیخنا اور رونا شروع کر دیا۔ غلام لڑکا اپنی انگلی سے اپنے والد کی جانب اشارہ کر رہا تھا۔ اور کہہ رہا تھا اے میرے باپ مجھ پر رحم کیجئے۔

حضرت عمرؓ — اللہ تجھ پر رحم کرے۔ اور خود حضرت عمرؓ بھی رو رہے تھے پھر افلح سے فرمایا کوڑا مار۔ اُس نے پہلا کوڑا مارا۔

ابوشحمہ — بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔

حضرت عمرؓ — اے میرے بیٹے تجھ نے اچھا نام لیا۔

جب دوسرا کوڑا پڑا تو ابوشحمہ کہنے لگا۔ اے ابا معاف کر دیجئے۔

حضرت عمرؓ — جس طرح تو نے گناہ کیا تھا۔ اسی طرح صبر کر۔ جب تیسرا کوڑا لگا تو اس کی زبان سے نکلا امان۔

حضرت عمرؓ — تیرا رب تجھے امان دے گا۔

جب چوتھا کوڑا پڑا۔ تو اس کی زبان سے بے ساختہ نکلا۔ واغوثاہ

حضرت عمرؓ — مدد تو مصیبت کے وقت ہوتی ہے۔

پانچویں کوڑے پر اس نے اللہ کی حمد کی۔

حضرت عمرؓ ہاں حمد کے لائق اللہ ہی کی ذات ہے۔

جب دسواں کوڑا لگا۔ تو کہنے لگا اے میرے باپ آپ نے مجھے قتل کر دیا ہے۔

حضرت عمرؓ تجھے تیرے گناہ نے قتل کیا ہے۔ جب تیسواں کوڑا پڑا۔ تو کہنے لگا اللہ کی قسم۔ آپ نے تو میرا دل جلا دیا۔

حضرت عمرؓ دوزخ کی گرمی اس سے زیادہ ہوگی۔ جب چالیسواں کوڑا پڑا۔ تو وہ کہنے لگا۔ اے میرے باپ مجھے اجازت دیجئے کہ میں اپنے منہ کے بل واپس چلا جاؤں۔

حضرت عمرؓ جب تجھ پر حد پوری ہو جائے تو تیرا جہاں جی چاہے جا۔ جب پچاسویں کوڑے کی نوبت آئی۔ تو وہ حضرت عمرؓ کو قرآن کی قسم دے کر بولا مجھے چھوڑ دیجئے۔

حضرت عمرؓ کیوں نہ تو نے قرآن سے نصیحت حاصل کی اور کیوں نہ تو اللہ کی نافرمانی سے محفوظ رہا۔ اس کے بعد حضرت عمرؓ نے افلح سے فرمایا اے غلام کوڑے مار۔

جب اس نے ساٹھواں کوڑا مارا۔ تو ابو شحمہ کہنے لگا۔ اے میرے باپ میری مدد کیجئے۔

حضرت عمرؓ اے میرے بیٹے جب اہل جہنم دہائی دیں گے۔ تو اُن کی دہائی کی کوئی شنوائی نہ ہوگی۔ جب سترواں کوڑا پڑا تو اس نے پانی مانگا۔

حضرت عمرؓ اگر اللہ تعالیٰ تجھے پاک کر دے گا تو تجھے محمد صلی اللہ علیہ وسلم ایسا پانی پلائیں گے کہ اس کے بعد تجھے کبھی پیاس نہ لگے گی۔ اے غلام

کوڑے [illegible] جب [illegible] ڑا پڑا۔ تو وہ بولا۔ اے میرے باپ
آپ پر سلام ہو۔

حضرت عمرؓ: تجھ پر بھی سلام ہو۔ اگر تو محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے ملے تو میرا سلام عرض کرنا اور کہنا میں نے عمرؓ کو قرآن پڑھتے اور حدود الٰہی قائم کرتے چھوڑا ہے۔ اے غلام کوڑے مار۔ جب نوے کوڑے لگے تو اس کی زبان بند ہو گئی۔

اس پر تمام صحابہ اس کی جانب دوڑے۔ اور بولے۔ اے امیرالمومنینؓ بقیہ حد کو موخر کر دیجئے۔

حضرت عمرؓ: جس طرح گناہ میں تاخیر نہیں کی گئی۔ اسی طرح سزا میں بھی تاخیر نہیں کی جا سکتی۔ اس چیخ و پکار کی آواز ابو شحمہ کی ماں تک پہنچی۔ وہ روتی چیختی باہر آئی۔ اور کہنے لگی۔ اے عمرؓ میں ہر کوڑے کے بدلے پیدل حج کروں گی۔ اور اتنا اتنا صدقہ دوں گی۔

حضرت عمرؓ: حج اور صدقہ حد کا کفارہ نہیں بن سکتے۔ اے غلام حد پوری کر۔ جب آخری کوڑا پڑا تو غلام (لڑکا) مرکر گر گیا۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا۔ اے لڑکے اللہ نے تجھ سے گناہ مٹا دیا۔ پھر اس کا سر اپنی گود میں رکھ کر رونے لگے۔ اور بولے میرا باپ اُس پر قربان جو حق کی خاطر قتل ہو جائے میرا باپ اس پر قربان جو حد کو پورا کرنے میں جان دیدے۔ میرا باپ اُس پر قربان جس پر نہ باپ رحم کھائے اور نہ اعزا و اقارب

لوگوں نے لڑکے کی جانب نگاہ اُٹھا کر دیکھی تو لڑکا مرچکا تھا۔ اس دن سے زیادہ کوئی غمگین دن نہ تھا۔ لوگ رو رہے تھے اور اُن کی چیخیں نکل رہی تھیں۔

جب اس واقعے کو چالیس دن گزر گئے۔ تو جمعہ کا دن تھا تو حذیفہؓ بن الیمان [illegible] اور

کہنے لگے۔ امیرالمومنینؓ میں رات جب اپنا وظیفہ ختم کر کے لیٹا۔ تو میں نے خواب میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا۔ آپ کے ساتھ ایک جوان تھا۔ جو دو سبز حلے پہنے ہوئے تھا۔ حضور نے مجھ سے ارشاد فرمایا۔ میرا عمرؓ سے سلام کہنا اور اس سے کہنا۔ اللہ نے تجھے اسی طرح قرآن پڑھنے اور حد قائم کرنے کا حکم دیا ہے۔ اس کے بعد لڑکا بولا۔ میرا بھی میرے والد کو سلام کہنا اور اُن سے کہنا۔ اللہ آپ کو اسی طرح پاک کرے۔ جس طرح آپ نے مجھے پاک کیا تھا والسلام۔ الموضوعات ج ۳ ص ۲۶۹

امام ابن الجوزی اس روایت کو نقل کرنے کے بعد فرماتے ہیں۔ یہ روایت موضوع ہے۔ خواہ کسی طرح اور کسی سند سے بھی مروی ہو۔ اسے جاہل قصہ گوؤں نے عوام الناس اور عورتوں کو رُلانے کے لئے وضع کیا ہے۔ متعدد باتیں اپنے دل سے گھڑ کر حضرت عمرؓ اور صحابہ کرام کی جانب منسوب کی ہیں۔ حالانکہ اس واقعہ کے الفاظ اور جملے اتنے بیہودہ اور رکیک ہیں۔ جو اس واقعہ کے موضوع ہونے کا کھلا ثبوت ہیں۔ اور اس امر کا ثبوت ہے کہ اس قصہ کا گھڑنے والا اول درجہ کا جاہل ہے۔ جو معمولی سے فقہی مسائل سے بھی واقفیت نہیں رکھتا۔

اس راوی نے حضرت عمرؓ کی جانب یہ منسوب کیا ہے کہ انہوں نے قسم دے کر بیٹے سے اقرارِ جُرم کرایا۔ جو حضرت عمرؓ کی شان سے بہت بعید ہے۔ کیونکہ حضرت ماعزؓ اسلمی نے جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے اقرار کیا۔ تو آپ نے اُن سے اعراض فرمایا۔ وہ بار بار اقرار کرتے رہے اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اعراض کرتے رہے۔ حتیٰ کہ آپ نے ماعزؓ سے مخاطب ہو کر فرمایا۔ کیا تو پاگل تو نہیں ہے؟

یہ بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے کہ جہاں تک ہو سکے حد جاری کرنے سے گریز کرو۔ اور خود حضرت عمرؓ نے ایک ایسے شخص سے جس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے خود اقرارِ جُرم کیا تھا۔ فرمایا تھا۔ جب اللہ نے تیری پردہ پوشی کی تھی تو تو نے اپنی پردہ پوشی کیوں نہیں کی۔ ایسی صورت میں حضرت عمرؓ اپنے بیٹے کو اقرارِ زنا کے لئے کیسے قسم دے

سکتے ہیں۔

پھر ہر کوڑے پر یہ مکالمات اس کا ثبوت ہیں کہ یہ روایت کسی جاہل بازاری شخص نے وضع کی ہے۔ پھر ان جاہل راویوں نے یہ بھی بیان کیا کہ صحابۂ کرام نے حد روکنے کا مشورہ دیا۔ اسی طرح لڑکے کی ماں کا قول یہ کہ میں ہر کوڑے کے بدلہ پیدل حج کروں گی۔ اس قسم کی لغویات صحابۂ کرام کی ذات سے بہت بعید ہیں۔ اسی طرح حضرت حذیفہؓ کا خواب نہایت مہمل ہے۔ الموضوعات ج ۳ ص ۲۷۱۔

سیوطی لکھتے ہیں کہ یہ روایت موضوع ہے۔ اس کے کئی راوی مجہول ہیں۔ دارقطنی کہتے ہیں مجاہد والی روایت صحیح نہیں اللآلی المصنوعہ فی احادیث الموضوعہ ج ۲ ص ۱۹۸

اس قصہ میں جو خامیاں ہیں۔ اُن میں سے کچھ کی جانب پہلی روایت میں اشارہ کر چکے ہیں۔ کچھ کی امام ابن الجوزی نے وضاحت فرما دی۔ اب ہم مزید اور چند عیوب جو اس روایت میں پائے جاتے ہیں۔ پیش کئے دیتے ہیں۔

۱۔ اس کہانی کے راوی نے لفظ غلام جگہ جگہ استعمال کیا ہے اور یہ بھی مختلف معنی میں۔ کسی جگہ یہ لفظ خادم کے معنیٰ میں استعمال کیا۔ اور کسی جگہ لڑکے کے معنیٰ میں۔ جو اس امر کا ثبوت ہے کہ اسے وضع کرنے والا کوئی ایرانی ہے۔ جس کی مادری زبان عربی نہیں۔ لہٰذا وہ اس لفظ کو کبھی عربی معنیٰ میں استعمال کرتا ہے۔ اور کبھی فارسی معنیٰ میں۔ فارسی میں غلام بمعنیٰ خادم آتا ہے۔ افلح کے لئے اس راوی نے ہر جگہ اسی معنیٰ میں استعمال کیا۔ لیکن عربی میں غلام نابالغ لڑکے کو کہتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ ابوشحمہ کے لئے لفظ غلام کا استعمال خادم کے معنیٰ میں نہیں ہو سکتا۔ لہٰذا جہاں جہاں ابوشحمہ کے ساتھ یہ لفظ آیا ہے اس سے عربی معنی مراد ہیں۔ یعنی لڑکا۔ یہ ہر عمر کے لئے اس کا استعمال نہیں ہوتا۔ صرف نابالغ لڑکے کے لئے اس کا استعمال ہوتا ہے۔

اس سے بھی یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اس روایت کو وضع کرنے والا کوئی ایرانی ہے جو عربی زبان سے بہت معمولی سی شُدبُد رکھتا ہے۔

۱۔ جب ابوشحمہ نابالغ ہوا تو یہ تمام کہانی خود بخود باطل ہوگئی۔

۲۔ حضرت عمرؓ کے کسی غلام کا نام افلح نہیں۔ بلکہ اُن کے غلام کا نام اسلم ہے۔ افلح تو مسجد نبوی کے موذن کا نام تھا۔ ان کو حضرت عمرؓ نے مسجد نبوی میں اذان دینے پر مامور کیا تھا۔

۳۔ پہلی روایت میں یہ ذکر تھا کہ یہ عورت تھی اور امیرالمومنین کے یہاں بچہ کو لے کر آتی جاتی رہتی تھی۔ جب کہ اس روایت سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ وہ کنواری لڑکی تھی۔ اور امیرالمومنین اسے جانتے بھی نہ تھے اور پہلی مرتبہ مسجد نبوی میں آمنا سامنا ہوا۔

۵۔ دونوں روایتیں اس پر متفق ہیں کہ خواہ وہ عورت ہو یا لڑکی، دونوں نے بچہ پیدا ہونے تک اس امر کا کوئی تذکرہ نہیں کیا۔ جو اس بات کی دلیل ہے کہ یہ کام برضا و رغبت ہوا۔ لہٰذا سزا دونوں کو ملنی چاہیئے تھی۔ صرف لڑکے کو اس صورت میں سزا دی جاتی ہے۔ جب کہ زنا بالجبر ثابت ہو جائے۔ یا یہ بہتان ہو۔

۶۔ ابوشحمہ کنیت ہے۔ نام نہیں۔ اور ان دونوں روایتوں میں یہ بیان نہیں کیا گیا کہ اس کا نام کیا تھا۔

۷۔ پہلے قصہ میں مذکور تھا کہ حد حضرت عمرؓ اور حضرت علیؓ نے جاری کی۔ اس میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ یہ حد افلح نامی غلام نے جاری کی تھی۔ جس کا کوئی وجود نہیں۔

۸۔ پہلی روایت میں شراب کا کوئی تذکرہ نہ تھا۔ اس روایت میں یہ ایک نیا الزام وارد کر دیا گیا۔

۹۔ پہلی روایت میں نہ خواب کا ذکر تھا۔ نہ مکالمات کا وجود تھا اور نہ ابوشحمہ کی ماں کی منت کا ذکر تھا۔ لیکن اس کہانی میں کچھ مزید اضافات کیئے گئے۔ اس سے یہ محسوس ہوتا ہے کہ کہانی کسی نے وضع کی تھی اور بعد میں آنے والے لوگوں نے مزید حاشیہ آرائی کی۔ جس طرح آج کا مولوی یہ کہتا ہے کہ ابوشحمہ اسی کوڑوں میں مرگئے تھے اور بیس کوڑے اُن کی لاش پر لگائے گئے۔ آگے آگے دیکھئے کہ یہ جاہل ملا کیا کیا تماشے دکھاتے ہیں۔

۱۰۔ اس روایت کو پڑھ کر اور سُن کر قاری اور سامع کے ذہن پر یہ تاثر پیدا ہوتا ہے کہ حضرت عمرؓ کے دورِ خلافت میں مدینہ منورہ میں شراب عام تھی۔ جگہ جگہ بھٹیاں قائم تھیں۔ اور صحابہ کی اولاد بھی اس ام الخبائث سے محفوظ نہ تھی۔ یہ امیر المومنین حضرت عمرؓ کی خلافت کا کتنا گھناؤنا تصور ہے۔

۱۱۔ حضرت عمرؓ نے یہود کو سرزمین عرب سے ملک بدر کر دیا تھا۔ تو اب یہودیوں نے وہاں شراب کی بھٹیاں کیسے قائم کریں۔ کہیں یہ قصہ کسی یہودی نے تو وضع نہیں کیا؟

۱۲۔ ابو شحمہ نے جو یہ حرکت کی۔ تو یہ بنو النجار کے علاقے میں کی تھی۔ غالباً شراب بھی اسی کے قرب وجوار میں پی گئی۔ ہمارے مولوی کو تو یہ بھی خبر نہیں کہ اس احاطہ سے کون سا احاطہ مراد ہے۔ قبیلہ بنو النجار اسلام سے پہلے سے اُس جگہ آباد تھا۔ جو آج مسجد نبوی کا علاقہ سمجھا جاتا ہے۔ حضرت ابو ایوبؓ انصاری یہیں رہائش پذیر تھے۔ اسی علاقہ میں مسجد نبوی کی تعمیر ہوئی۔ ظاہر ہے کہ مسجد کے قرب وجوار کی آبادی بنو نجار پر مشتمل تھی۔ گویا ساری حرکات مسجد نبوی کے قرب وجوار میں ہوئیں۔ چنانچہ اس قسم کی بات وہی کہہ سکتا ہے جو اسلام کا بدترین دشمن ہو۔ ہمارے ملاؤں کی آنکھوں پر اگر نذر دنیاز کے پردے پڑ گئے ہیں۔ اور عقلیں ماری گئی ہیں تو ہمارے پاس اس کا کوئی علاج نہیں لیکن ہم اپنے عوام سے نااُمید نہیں ہیں۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ وہ ناواقف ہیں۔

۱۳۔ شروع کہانی میں بیان کیا گیا ہے کہ حضرت عمرؓ ابن عباسؓ کو اپنے ساتھ لے کر گئے۔ اور پھر گھر میں داخل ہوئے۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ابن عباسؓ بھی گھر میں داخل ہوئے یا نہیں۔ اگر داخل ہوئے تھے تو وہ نامحرم تھے گھر میں کیسے گئے۔ اور حضرت عمرؓ نے اسے کیسے گوارا کیا۔ اگر اندر نہیں گئے تھے تو اندر کی رام کہانی کس نے بیان کی۔ اور ابن عباسؓ نے کس سے سنی۔ ہے کوئی مائی کا لال ہے جو اس کا اتہ پتہ بتلائے؟

۱۴۔ یہ بھی عجیب معمہ ہے کہ حضرت عمرؓ نے بیٹے سے پوچھ گچھ سے پہلے ہی تمام اہل مدینہ کو جمع کر لیا۔ گویا وہ اپنے بیٹے کو قتل کرنے کے لئے ادھار کھائے بیٹھے تھے۔

اس روایت میں اور بھی بہت سے عیوب بھرے ہوئے ہیں۔ لیکن یہ داستان ایک اور

شخص کی زبانی سنئے۔ جس کا نام عبدالقدوس ہے۔ وہ اس کہانی کو صفوان کے ذریعہ نقل کر رہا ہے

کہ حضرت عمرؓ کے دو بیٹے تھے۔ ایک کا نام عبداللہؓ اور دوسرے کا نام عبیداللہؓ تھا۔ اسی کو ابو شحمہ کہا جاتا تھا۔ راوی کا بیان ہے کہ یہ ابو شحمہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مشابہ تھا۔ اور ہر وقت تلاوت قرآن میں مشغول رہتا۔

ایک بار شدید بیمار ہوا اس کی عیادت کے لئے امہات المؤمنین آیا کرتی تھیں۔ ایک روز جب وہ اس کی عیادت کے لئے آئیں، توانہوں نے حضرت عمرؓ سے کہا اے عمرؓ تو بھی ایسی ہی نظر مان لے، جس طرح علیؓ نے حسنؓ وحسینؓ کے لئے نظر مانی تھی۔ تو اللہ نے انہیں صحت دی۔ چنانچہ حضرت عمرؓ نے یہ نذر مانی کہ اگر اللہ نے میرے اس بیٹے کو صحت دیدی تو میں تین روزے رکھوں گا۔ یہی نظر ابو شحمہ کی والدہ نے مانگی۔ نتیجۃً یہ لڑکا اچھا ہو گیا اور صحت پانے کے بعد ایک یہودی کی بھٹی میں جا گھسا اور وہاں نبیذ پی کر نشہ میں مست ہو گیا۔ پھر تو نجار کے احاطہ میں گھسا۔ تو وہاں ایک عورت سو رہی تھی۔ یہ اسے چپٹ گیا۔ اور اپنے نفس کی آگ بجھائی۔ جب کھڑا ہوا تو اس عورت نے اسے گالیاں دیں۔ اور اس کے کپڑے پھاڑ ڈالے۔ اس راوی نے پھر آگے پورا پہلا والا واقعہ نقل کیا۔

امام ابن الجوزی فرماتے ہیں، اول تو ان لوگوں نے ابو شحمہ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مشابہ قرار دیا۔ پھر بدکاری کا الزام بھی عائد کیا۔ اس کا راوی عبدالقدوس بن الحجاج ہے جو کذاب ہے۔ ابن حبان کہتے ہیں اس کی روایت بیان کرنا بھی حلال نہیں۔ الموضوعات ج ۳ ص ۲۷۵

اس تیسری روایت سے یہ حقیقت کھل کر سامنے آگئی کہ اس کے واضعین کس قسم کے لوگ ہیں۔ اُن کا مقصود نہ صرف حضرت عمرؓ اور اُن کی اولاد پر تبرا ہے۔ بلکہ انہوں نے چند الفاظ کے ذریعہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات اقدس پر حملہ کیا۔ اور چونکہ سبائی طبقہ اس قرآن کو تسلیم نہیں کرتا۔ اس لئے قرآن پڑھنے والوں کا بھی مذاق اڑایا گیا کہ یہ ابو شحمہ ہر وقت تلاوت کیا

کرتا تھا۔ گویا یہ اس تلاوت کا نتیجہ تھا۔ عیاذاً باللہ۔

۲۔ لیکن ان بدطینتوں کو یہ معلوم نہیں کہ ابو شحمہ عبید اللہ کی کنیت نہیں۔ اور اگر واقعتاً ایسا ہے تو یہ ان کے اول درجہ کے جھوٹے ہونے کی دلیل ہے۔ اس لئے کہ عبید اللہ بن عمرؓ۔ جنگ صفین تک زندہ رہے۔ اور میدان صفین میں امیر معاویہؓ کی طرف سے لڑتے ہوئے شہید ہوئے۔ پھر ہمارے یہ سبائی مورخین یہ بھی تسلیم کرتے ہیں کہ جب حضرت عمرؓ شہید کئے گئے۔ تو عبید اللہ بن عمرؓ نے ہرمزان کو حضرت عمرؓ کے قتل کی سازش میں قتل کردیا اور حضرت عثمانؓ کے سامنے سب سے پہلا مقدمہ اسی قتل کا پیش ہوا۔ کیا یہ عبید اللہؓ مرکر دوبارہ زندہ ہوتے تھے۔ دراصل اس طبقہ کو بغض عمرؓ میں یہ بھی نظر نہیں آتا کہ کون مرا، اور کون زندہ رہا؟ انہیں تو بدنام کرنے سے غرض ہے۔

۳۔ سبائی مذہب کے مطابق دس گھونٹ شراب جائز ہے۔ کیا یہ اسی کے جواز کے راستے تو تلاش نہیں کئے جارہے ہیں۔ کیونکہ ہمیشہ سے یہ دستور چلا آرہا ہے کہ نکٹے ہمیشہ ناک والوں کو نکو بنایا کرتے ہیں۔

۴۔ نبیذ بالذات حرام نہیں۔ تا وقتیکہ اس میں نشہ پیدا نہ ہو۔ اور نبیذ میں نشہ دو تین روز بعد پیدا ہوتا ہے۔ ان احمقوں نے یہ کیوں تصور کرلیا کہ ہر نبیذ میں نشہ ہوتا ہے۔ جب کہ پہلی روایت میں شراب کا الزام قائم کیا گیا تھا۔

۵۔ یہ روایت ثابت کررہی ہے کہ جس کے ساتھ یہ حرکت کی گئی وہ امراۃ تھی۔ یعنی شادی شدہ عورت۔ وہ آخر بچہ پیدا ہونے تک اتنی بڑی حرکت کو کیوں چھپائے بیٹھی رہی، اور شادی شدہ عورت کے بچہ پیدا ہوتا ہی ہے۔ اس بات کا کیا ثبوت ہے کہ یہ بچہ اس کے خاوند کا نہ تھا۔ اس کا دعویٰ خود ثبوت نہیں بن سکتا۔ اس لئے کہ ثبوت اور دلیل دعوے سے جداگانہ ہوتی ہے۔ خود دعویٰ ثبوت نہیں ہوتا۔ ہمارے نزدیک نو ماہ تک اس کا خاموش بیٹھے رہنا اس کے جھوٹے ہونے کا کھلا ثبوت ہے۔

۶- یہ کہانی تین طریقوں سے مروی تھی جو ہم نے قارئین کے سامنے پیش کر دیئے۔ لیکن کسی طریقہ میں کسی جگہ اور کسی راوی نے یہ بیان نہیں کیا کہ وہ عورت کون ذاتِ شریف تھی؛ اُس کا تعلق یہودیوں سے تھا۔ یا یہ کہانی تیار کرنے کے لئے اسے ایران سے درآمد کیا گیا تھا۔

دراصل ابو شحمہ عبدالرحمان الاوسط کی کنیت ہے۔ اور وقوعہ کی اصل صورت یہ ہے کہ عبدالرحمان الاوسط حضرت عمروؓ بن العاص کے ساتھ مصر کے جہاد میں شریک تھے۔ ایک روز انہوں نے نبیذ پی۔ اتفاق سے انہیں نشہ پیدا ہو گیا۔ یہ صبح کو حضرت عمروؓ بن العاص کے پاس گئے۔ اور ان سے عرض کیا مجھ پر شراب کی حد جاری کیجئے۔ انہوں نے انکار کر دیا۔ کیونکہ اس وقت نہ نشہ کا اثر تھا اور نہ گواہ موجود تھے۔ اس پر عبدالرحمان بولے کہ اگر تم نے مجھ پر حد نہ لگائی تو میں اپنے والد کو تمہاری اس حرکت سے مطلع کر دوں گا۔ مجبور ہو کر حضرت عمروؓ بن العاص نے اپنے خیمہ میں اُن پر حد جاری کر دی۔ اور کسی کو خبر بھی نہ ہونے دی۔

جب حضرت عمرؓ کو اس کی اطلاع ملی تو انہوں نے عمروؓ بن العاص کو تنبیہ کی تم نے حد سب کے روبرو کیوں جاری نہیں کی۔ اور اخفا سے کیوں کام لیا۔ جب عبدالرحمان فتح مصر کے بعد مدینہ پہنچے۔ تو حضرت عمرؓ نے تربیت کی غرض سے ان کے چند کوڑے مارے۔ اتفاق سے کچھ دن بعد وہ بیمار ہو گئے۔ اور اسی بیماری میں اُن کا انتقال ہو گیا۔ امام ابن الجوزی اور سیوطی لکھتے ہیں۔ یہ ہے اصل واقعہ جسے قصہ گوؤں نے کچھ کا کچھ بنا کر پیش کر دیا ہے۔

الموضوعات ج ۳ ص ۲۷۵۔

ہمارے نزدیک یہ سب مجوسیت اور سبائیت کی کارفرمائیاں ہیں۔ قصہ گو۔ اور صوفیاء تو صرف ٹیپ کا کام انجام دیتے رہے ہیں۔ یہ ہاتھ کی صفائی ان ہی کا کارنامہ ہے کہ اس ایک داستان کے ذریعہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور قرآن پر بھی تبرا کیا گیا۔ آلِ عمرؓ کو بھی بدنام کیا گیا۔ اور ساتھ ساتھ حضرت علیؓ کے نقشِ قدم پر چلنے کی تلقین بھی کی گئی۔

لیکن چونکہ یہ سب افراد ایک ذہن کے مالک نہ تھے۔ اس لئے اس داستان میں اختلاف

پیدا ہوا۔کسی نے ابو شحمہ کو افلج کے ذریعہ پٹوایا۔اور کسی نے حضرت علیؓ کے ہاتھوں۔کسی نے اس نامعلوم فاحشہ کو کنواری بیان کیا۔اور کسی نے شادی شدہ عورت۔لیکن ہر ایک کے پیش نظر عمرؓ اور ان کی اولاد کو بدنام کرنا تھا۔اور خاص طور پر عبیداللہ بن عمرؓ کو۔لیکن اُن سے غلطی یہ سرزد ہوئی کہ انہوں نے عبیداللہ کو ابو شحمہ قرار دے دیا۔یا یہ کہئے کہ عمداً ایسا کیا گیا تاکہ کوئی اُن پر اُلٹا یہ الزام ثابت نہ کر سکے۔کہ عبیداللہ جنگ صفین تک حیات تھے۔اس لئے اتنی قلابازیاں کھانے کی ضرورت پیش آئی۔

قصہ شہربانو

آج کے دور کے تمام لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ یزدگرد شاہ ایران کی بیٹی حضرت حسینؓ کے نکاح میں آئی۔جس سے امام زین العابدین پیدا ہوئے۔اور اسی لئے شیعہ انہیں فخر العرب والعجم کہتے ہیں۔سبائیوں کا اولاد حسینؓ سے جو تعلق ہے اور جس ناتے یہ بارہ امام وجود میں آئے۔اس کی وجہ یہ بیان کی جاتی ہے کہ حضرت حسینؓ کی اولاد ننھیالی رشتہ سے یزدگرد سے تعلق رکھتی ہے اور چونکہ ایران میں حکومت ایک خاندان کے ساتھ مخصوص تھی جو نسلاً چلی آ رہی تھی۔یزدگرد کے خاتمہ سے ساسانی خاندان کے افراد ختم ہو گئے۔لیکن چونکہ حضرت حسینؓ کی اولاد میں وہ خون گردش کر رہا ہے۔اس لئے خلافت و امامت کے وہی مستحق ہیں۔اور اسی لئے حضرت علیؓ کی خلافت کے چکر چلائے گئے۔تاکہ اندرونی سازش پر پردہ پڑا رہے۔گویا مجوسیت پر پردہ ڈالنے کے لئے حضرت علیؓ کی خلافت کے جھگڑے کھڑے کئے۔ اور چونکہ حضرت عمرؓ نے ایران کو تباہ کیا تھا۔اس لئے اُن سے بغض بھی لازمہ مجوسیت رہا۔اسی لئے اس قسم کی کہانیاں وضع کی گئیں۔حتیٰ کہ کردی نے اس بات کو قبول بھی کیا ہے وہ کہتا ہے ؎

بشکست پشت ہژبران عجم را — برباد وفنا داد تخت جم را

ایں عربدہ زغصب خلافت علی نیست — زآں عمر کینہ قدیم است عجم را

جس نے عجم کے بہادروں کی کمر توڑ دی۔ جس نے جمشید کے تخت کو برباد و فنا کر دیا۔ یہ ہمارا جھگڑا علی کی خلافت کا جھگڑا نہیں ہے۔ بات یہ ہے کہ عجم کو عمر کے خاندان سے پرانا کینہ ہے۔ جو کبھی حضرت عمرؓ کے بیٹے پر بدکاری کا الزام قائم کر کے اور کبھی شہربانو کا واویلا مچا کر انہیں بدنام کیا جاتا ہے۔ یہ شہربانو کون تھیں اور کب مدینہ پہنچیں اور پھر زین العابدین کو پیدا کر کے تاریخ سے کہاں غائب ہو گئیں۔ عنقا کی طرح آج تک یہ تاریخ سے عنقا ہیں۔

زین العابدین کی والدہ کا نام سلافہ تھا جو ایک باندی تھیں۔ ہاں اس میں ضرور اختلاف ہے کہ یہ کہاں کی باشندہ تھیں اور اس پر اتفاق ہے کہ یہ افریقہ سے گرفتار ہو کر آئی تھیں۔ اسی لئے انہیں کوئی بربری اور کوئی سوڈانی قرار دیتا ہے۔ ابن حزم نے جمہرہ میں ایک قول یہ نقل کیا ہے کہ عبداللہؓ بن ابی سرح اموی نے جب حضرت عثمانؓ کے زمانہ میں افریقہ پر حملہ کیا تو یہ سوڈان سے گرفتار ہو کر آئیں۔ لیکن نسلاً یہ سندھی تھیں۔ خیر پہلے ہم حکیم فیض عالم شہید کی تحقیق پر نظر ڈال لیں۔ پھر اس کے بعد ہم مجوسی طبقہ کی داستانیں پیش کریں گے۔ حکیم صاحب نے بھی ان داستانوں کی جانب کچھ اشارات کئے ہیں۔ بقیہ کی ہم خود وضاحت کر دیں گے حکیم صاحب مرحوم لکھتے ہیں۔

نا معلوم اس داستان کو کس نے جنم دیا کس نے پروان چڑھایا اور ابتدائی طور پر کن لوگوں نے اسے شہرت دی۔

حسین کاظم زادہ نے بھی اس داستان سے اپنی مایۂ ناز تصنیف کو زینت دیتے ہوئے خامہ فرسائی کی ہے کہ یزدگرد آخری ساسانی بادشاہ کی دختر شہربانو ایرانی قیدیوں کے ساتھ عمرؓ بن الخطاب کے سامنے پیش ہوئی۔ انہوں نے دوسرے قیدیوں کے ساتھ اسے بھی بازار میں فروخت کئے جانے کا حکم دیا۔ حضرت علیؓ مانع ہوئے۔ اور کہا شاہزادگاں اور نجباء

کو ننگے سر بازار میں لے جانا خلاف ادب ہے۔ بالآخر شہر بانو حضرت حسینؓ فرزند علیؓ کے حصہ میں آئی۔

اس داستاں سرائی کے بعد مصنف لکھتا ہے کہ اس سبب سے خاندان علی، ایرانیوں کی نظر میں اصل نسب کے اعتبار سے ساسانی نسب رکھتا تھا۔ (لاحول ولا قوۃ) اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے رشتہ کی بنا پر شرافت اور امتیاز سے بھی مخصوص تھا تنہا اسی سبب سے یہ خاندان جائز طور پر تخت وتاج کیانی کا وارث ہو سکتا تھا نیز اسی بنا پر علی (زین العابدین) جو امام حسینؓ کے فرزند ارجمند شہر بانو کے بطن سے تھے۔ فخر العرب والعجم کہلاتے تھے۔ کیونکہ باپ کی طرف سے اُن کا سلسلۂ نسب بزرگ ترین عرب حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور ماں کی طرف سے روئے زمین کے عجیب ترین سلاطین یعنی عجم کے بادشاہوں پر منتہی ہوتا ہے۔

یہی داستاں جب کربلا تک پہنچتی ہے تو اس پر جو مزید حاشیہ آرائیاں ہوتی ہیں۔ وہ بھی حیران کُن ہی نہیں، بلکہ پریشان کُن بھی ہیں۔ ایک صاحب فرماتے ہیں۔

شہادت حسینؓ کے بعد اُن کا گھوڑا خیمہ کے دروازے پر آ کر کھڑا ہو گیا۔ اور حضرت شہر بانو اُس پر سوار ہو کر ایران کی طرف چل نکلیں۔ رستہ میں انہیں اپنا بھائی مل گیا جو حضرت حسینؓ کی مدد کے لئے آ رہا تھا۔ وہ حضرت شہر بانو کو ہمراہ لے کر واپس چلا گیا.... ایک اور صاحب فرماتے ہیں کہ آپ دریائے فرات میں ڈوب کر مر گئیں۔ گویا خودکشی کی حرام موت مریں۔

میں سخت حیران ہوں کہ شیعہ تو رہے در کنار۔ اہل سنت والجماعت کا سمجھ دار طبقہ بھی اپنے مواعظ حسنہ میں شہر بانو کے حالات کو اس طرح بیان کر کے سامعین کو رُلاتا ہے۔ گویا یہ بھی دین کا ایک اہم حصہ یا جزو ہے۔ حالانکہ تاریخی نقطۂ نظر سے شہر بانو کا وجود محل نظر ہی نہیں۔ بلکہ بالکل عنقا ہے۔ شہر بانو نام کی کوئی بیوی حضرت حسینؓ کے حرم میں سرے سے تھی ہی نہیں۔ چہ جائیکہ وہ یزدگرد کی لڑکی ہو۔ دراصل یہودی ٹیکنیک اور مجوسی عصبیت سے مل کر شیعیت

کا جو ہیولیٰ کھڑا کیا گیا اس میں نہایت چابکدستی سے اس قسم کی روایات کو اس طرح سمویا کہ آج بڑے سا بڑا مورخ اور محقق بھی جھوٹ اور سچ کی تمیز میں اپنے آپ کو معذور پاتا ہے۔

اب آیئے ذرا چند لمحات کے لئے ہم تاریخ ایران کا مطالعہ کر کے شہربانو کو تلاش کریں کہ یہ کون تھی۔ کہاں سے آئی تھی۔ کس کی بیٹی تھی، یا سرے سے تھی ہی نہیں؟

شہریار کا بیٹا یزدگرد سنہ ۱۳ھ میں تخت نشین ہوا۔ اس کی عمر اس وقت سولہ سال تھی (اخبار الطوال ص ۱۲۵) گبن نے پندرہ سال لکھی ہے۔ یہی سال فاروق اعظم کی خلافت کا پہلا سال ہے۔ جب سنہ ۱۵ھ میں اس کی عمر اٹھارہ سال تھی۔ قادسیہ کا معرکہ لڑا گیا۔ یزدگرد یہ سنتے ہی مدائن چھوڑ کر بھاگ نکلا اور حلوان پہنچ گیا۔ (ملخص فتوح البلدان بلاذری ص ۲۵۔ اخبار الطوال ص ۱۳۴)

اسلامی لشکر نے جب حلوان کا رُخ کیا۔ تو وہ مع اپنے اہل و عیال کے۔ خانقان، قُم اور قاشان بھاگتا پھرا۔ آخر سنہ ۲۹ھ میں جب اس کی عمر ستیس سال تھی خراسان پہنچا اور سنہ ۳۰ھ میں بعہد خلافت عثمانی اس کا خاتمہ ہو گیا۔

غرضیکہ یزدگرد پر اسلامی لشکر نے کہیں بھی قابو نہیں پایا۔ پھر شہربانو کہاں گرفتار ہوئی اور کس نے گرفتار کیا؟ اصل میں اس قصہ کا خالق زمخشری معتزلی جیسا تاریخ سے ناواقف انسان ہے۔ ابن خلکان بھی زمخشری کے چکر میں آگیا۔

زمخشری کے سوا طبری، ابن الاثیر، یعقوبی، بلاذری اور ابن قتیبہ وغیرہ کسی نے اس واقعہ کو نہیں لکھا (گویا یہ چھٹی صدی کی پیداوار ہے)۔ اور لکھتے بھی کیسے، جب کہ یزدگرد مع اہل و عیال آگے آگے بھاگتا رہا۔ اور کسی مقام پر مسلمانوں کے قابو میں نہیں آیا۔ اگر اس کے عیال میں سے کوئی گرفتار ہو کر آیا ہوگا تو وہ زمانہ خلافت عثمانی کا تھا۔ نہ کہ خلافت فاروقیہ کا۔

مگر مجوسیوں نے خود ایک داستان تصنیف کی۔ اور اسے حضرت علیؓ کے نام سے جہلاء کی ہمدردیاں حاصل کرنے کے لئے پھیلایا۔ تاکہ عوام حضرت علیؓ کے ہم نوا بن کر آپ کے نام کی آڑ میں اسلام دشمنی پر ہر معرکہ سر کرنے کے لئے تیار ہو جائیں۔ حضرت عمرؓ کی خلافت کے پہلے

سال یعنی سنہ ۱۳ھ میں یزدگرد کی عمر چودہ یا پندرہ سال ہے۔ محرم سنہ ۱۴ھ میں قادسیہ کا معرکہ لڑا گیا۔ اور اس کے بعد مسلمان آگے بڑھنے شروع ہوئے۔ مگر یزدگرد آگے آگے بھاگتا رہا۔ سترہ اٹھارہ سال کی عمر میں اس کے گھر لڑکی پیدا کر کے جوان کرنا۔ اسے گرفتار کر کے مدینہ لانا اور حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے نکاح میں دینا یہ معجزہ شیعوں ہی کا کام ہے۔ حقیقت مذہب شیعہ ص۲۶۷۔

یزدگرد کی اولاد میں سے خواہ وہ اس کی پوتی ہو یا نواسی ایک لڑکی کا پتہ چلتا ہے جس کا نام شیریں دخت ہے۔ یہ خلافت بنی امیہ کے دور میں ولید بن عبدالملک بن مروان کی خلافت کے زمانہ میں ترکستان سے گرفتار ہو کر آئی۔ اور خلیفہ ولید بن عبدالملک کے حرم میں داخل ہوئی۔ جس سے ولید کا بیٹا یزید بن ولید بن عبدالملک بن مروان پیدا ہوا۔ جو بعد میں ایک عرصہ بعد سنہ ۱۲۶ھ میں خلیفہ ہوا۔ علامہ ابن حزم نے اپنی جمہرۃ الانساب میں اس کی وضاحت کی ہے۔

یہ لڑکی اس لحاظ سے یکتائے زمانہ ہے کہ یہ کسی اموی کے حرم میں داخل ہوئی۔ اس لڑکی کے علاوہ کوئی اور ایسی ایرانی لڑکی نظر نہیں آتی جو کسی اموی کے حرم میں رہی ہو۔ کہیں ایسا تو نہیں ہے کہ اس لڑکی شیریں دخت کو شہربانو بنا کر پیش کر دیا گیا ہو۔

مجوسی طبقہ داستانیں وضع کرنے میں خود تو ماہر فن تھے ہی۔ لیکن انہوں نے ہند و پاکستان کے سنی ذہنوں کو بھی اس طرح تربیت دی کہ وہ اُن سے بھی آگے نکل گئے۔ انہوں نے تو شہربانو کو پیدا کر کے، پھر اُن سے زین العابدین کی پیدائش کا کام لے کر میدان کربلا سے غائب کیا تھا۔ لیکن ہمارے سنی داستان سراؤں نے کربلا سے چار بیٹیوں کو غائب کروا دیا۔ جس کی صورت حال کچھ اس طرح بیان کی جاتی ہے کہ حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی چار صاحبزادیاں حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی شہادت کے بعد میدان کربلا سے فرار ہو گئیں۔ اور کسی نہ کسی طرح سرزمین پنجاب پہنچ گئیں۔ اتفاق سے وہاں کا راجہ چاروں پر عاشق ہو گیا۔ اور اُس نے اُن کے ساتھ دست درازی کرنی چاہی۔ انہوں نے زمین کو حکم دیا کہ ہمیں نگل لے۔ زمین نے ان چاروں بہنوں کو

ایک ساتھ نگل لیا۔ لیکن ان کی اوڑھنیوں کے کنارے باہر رہ گئے۔ جس پر راجہ نے ان کا مقبرہ بنایا۔ اور راج پاٹ چھوڑ کر خود مجاور بن بیٹھا۔ آج تک ان کے مزارات نیک بی بیوں کے مزار کے نام سے مشہور ہیں۔ جو لاہور سے قصور جاتے ہوئے راہ میں پڑتے ہیں اور لوگ ان کی زیارت کو جاتے ہیں۔ یہ واقعہ کچھ عرصہ قبل اخبار جنگ کے جمعہ ایڈیشن میں شائع ہوا تھا۔

قطع نظر اس امر کے کہ وہ کس طرح یہاں پہنچیں۔ کیسے ابن زیاد کے ساتھیوں کی نگاہوں سے غائب ہوئیں۔ یہ سفر پیدل طے کیا یا سواری پر سوار ہو کر۔ ہم تو یہ جانتے ہیں کہ ملا باقر مجلسی جلاء العیون میں اور دیگر شیعہ اور سنی مورخین لکھتے ہیں کہ حضرت حسین رضؓ کی صرف دو صاحبزادیاں تھیں۔ ایک سکینہ اور ایک فاطمہ۔ اور ان دونوں کا انتقال مدینہ منورہ میں ہوا۔ یہ چاروں لڑکیاں کسی حسین خاں کی اولاد ہوں گی۔ لیکن حسین بن علیؓ کی اولاد ہرگز نہ تھیں۔ ممکن ہے کہ یہ شوشہ بھی سبائی برادری کا چھوڑا ہوا ہو۔ یا یہ لڑکیاں ساسانی خاندان سے تعلق رکھتی ہوں۔

آمدم برسر مطلب۔ رہا یہ سوال کہ شہر بانو کا قصہ سب سے اول زمخشری نے ذکر کیا زمخشری مشہور مفسر ہیں۔ ادب و لغت اور صرف و نحو کے امام ہیں۔ لیکن جہاں تک احادیث و روایات کا تعلق ہے تو وہ بے پر کی اڑانے میں مشہور ہیں۔ ان کی کتاب میں کسی صحیح حدیث یا تاریخ کے کسی صحیح واقعہ کا تلاش کرنا۔ ایسا ہی ہے جیسا کوئی تاریک رات میں سوئی تلاش کرے۔ اور ان کی پیش کردہ کہانی کو کسی چیز کے ثبوت میں پیش کرنا۔ اسی قسم کی حماقت ہے۔ جیسے کوئی بیمار ڈاکٹر کو چھوڑ کر وکیل کے دروازے پر حاضری دے۔ اس کے قول کو لغت و ادب اور صرف و نحو میں پیش کیا جا سکتا ہے۔ نہ کہ حدیث و تاریخ میں۔ ہر کارے و ہر مردے۔

ویسے بھی ماشاء اللہ وہ شیعہ ہونے کے ساتھ ساتھ معتزلی بھی ہیں۔ مجھے تو ابن خلکان پر حیرت ہے کہ انہوں نے ان کی روایت کیسے نقل کر دی۔

آئیے۔ اب اس شہر بانو کی داستان کو ملا باقر مجلسی اور محمد بن یعقوب کلینی کے الفاظ میں ملاحظہ کیجئے۔

شیخ کلینی نے بسند معتبر امام محمد باقرؑ سے روایت کی ہے کہ جب دختر یزدگرد کو عمرؓ بن الخطاب کے پاس لائے۔ دختران مدینہ اُن کے جمال کے مشاہدے کے لیے کوٹھے پر دیکھنے آئیں۔ جب اُن کو مسجد میں لائے۔ اُن کے چہرہ نورانی سے مسجد روشن ہوگئی عمرؓ بن الخطاب نے چاہا اُن کے چہرے پر نظر کرے۔ اس شہزادی نے اپنا چہرہ چھپا لیا۔ اور کہا ہرمز اُف ہو کہ اس کے فرزند کے سبب اسیر ہوں۔ عمرؓ بن الخطاب نے کہا۔ اے گبر زادی مجھے دشنام دیتی ہے۔ اور چاہا ایذا رسانی کرے جناب امیرؑ نے فرمایا یہ شہزادی بزرگ زادی ہے۔ تجھے سزاوار نہیں ہے کہ اس سے بدسلوکی کرے۔

اور بروایت دیگر فرمایا۔ جناب رسول خدا نے فرمایا ہے۔ لازم ہے کہ ہر قوم کے بزرگ کو بزرگ جانو۔ اور تعظیم کرو۔ ہر چند کافر ہو۔ اور فرمایا جناب امیرؑ نے اسے اختیار دیدو کہ مسلمانوں میں سے جسے چاہے اختیار کرے اور جسے چاہے پسند کرے۔ اس کے حصّہ غنیمت میں محسوب کر دے۔ جب اس سعادت مند شہزادی نے ان سب لوگوں کو دیکھا اپنا ہاتھ امام حسینؑ کے سر پر رکھ دیا۔ اُس وقت جناب امیرؑ نے پوچھا تمہارا نام کیا ہے؟ کہا جہاں شاہ۔ جناب امیرؑ نے فرمایا۔ بلکہ چاہیئے کہ تمہارا نام شہربانو ہو۔ پھر امام حسینؑ سے فرمایا۔ اے ابوعبداللہ (عبداللہ کے باپ) اس دختر سے تمہارے یہاں ایک ایسا فرزند پیدا ہوگا کہ وہ بہترین اہل زمیں ہوگا۔ پس امام زین العابدین اس سے متولد ہوتے اسی وجہ سے حضرت کو ابن الخیرتین کہتے ہیں۔ اس لئے کہ تمام عرب میں برگزیدۂ خدا حضرت ہاشم تھے۔ اور برگزیدۂ عجم بادشاہ فارس تھا۔ اور نسب شریف آنحضرت (زین العابدین) دونوں سے متصل ہے۔ جلاءالعیون ج ۲ ص۲۵۹۔ اصول کافی ج ۱ ص۵۳

اس روایت کے خط کشیدہ الفاظ پر غور کیجئے کہ حضرت عمرؓ کو کس طرح تو اور تیرا سے مخاطب کیا جارہا ہے اور اس کا فر کی تعریفوں کے پل باندھے جارہے ہیں۔ کیونکہ یہ ایرانی تھی۔ اور حضرت عمرؓ عرب تھے لیکن ان باتوں پر تو بعد میں گفتگو کریں گے ہمیں تو

ملا باقر مجلسی کا ایک جملہ بہت پسند آیا ہے۔ انہوں نے ہماری دل لگتی بات کہہ دی ہے کیونکہ روانی تحریر میں وہ سب اپنا اگلا پچھلا بھول گئے۔ کہتے ہیں اس کے حصہ غنیمت میں اسے محسوب کر دے۔ یعنی جس پر بھی یہ لڑکی ہاتھ رکھے۔ اسی کی باندی سمجھی جائے گی اور بقیہ مال غنیمت میں سے اسے کچھ نہ ملے گا۔ اس نے حضرت حسینؓ کے سر پر ہاتھ رکھ دیا۔ اس طرح یہ حضرت حسینؓ کی باندی ہوئی۔ گویا ملا باقر کو یہ تسلیم ہے کہ زین العابدین ایک باندی کی اولاد ہیں۔ کسی آزاد عورت کی اولاد نہیں۔

ہمارے اس دعوے پر کسی کو اعتراض کرنے کا حق حاصل نہیں۔ سبائیوں کو تو اس لئے کہ یہ ان کے امام کا فرمودہ ہے۔ اور ان کے خلاف زبان سے کچھ نکالنا کفر ہے۔ اور سنیوں کو اس لئے اعتراض کا حق نہیں کہ امام باقر اپنی دادی کے حال کو ان لوگوں سے زیادہ جانتے ہوں گے۔ کیونکہ یہ ان کا گھریلو معاملہ ہے۔ لیکن ذرا یہ تو بتا دیجئے کہ آج کل کے سید زادے نجیب الطرفین کیسے بن گئے۔ کیونکہ ان کا اصول تو یہ ہے کہ سید زادی سید زادے کے ہی نکاح میں جا سکتی ہے۔ اور غیر سید سے نکاح جائز نہیں۔ یہاں تو پہلی بنیاد ہی غلط ہے۔ پھر اتفاق سے جعفر بن محمد کی ماں بھی غیر سید ہے۔ کیونکہ وہ ابو بکر صدیقؓ کی پوتی ہے۔ اور ان کے بعد تمام ائمہ کی مائیں ایرانی باندیاں ہیں۔

بقول ملا باقر یہ لونڈیا اتنی خوبصورت تھی کہ دختران مدینہ اس کے مشاہدے کے لئے کوٹھے پر چڑھ آئیں۔ اور اس کے چہرے کی روشنی سے مسجد منور ہو گئی۔ تو ممکن ہے کہ دختران مدینہ اس لئے کوٹھے پر چڑھی ہوں، تاکہ اس سیاہ فام سوڈانی عورت کا مشاہدہ کر سکیں جو افریقہ سے پکڑ کر لائی گئی تھی۔ کیونکہ ایرانی لڑکیوں کا تو وہ مشاہدہ کرتی آئی تھیں۔ بقول ملا باقر مدینہ میں ان کی ایک باقاعدہ منڈی تھی۔ جس میں دختران ایران فروخت ہوتی تھیں۔ لیکن یہ سب خاندان بنی ہاشم کے حصہ میں آتی تھیں۔

اس لڑکی نے ایران سے مدینہ تک بے پردہ سفر کیا۔ لیکن حضرت عمرؓ کو دیکھ کر منہ

چھپالیا۔کیونکہ روئے زمین پر اُن کے علاوہ کوئی اس لڑکی کا نامحرم نہ تھا۔ واہ رے بےحیائی تیرا کرشمہ۔

جناب امیر اسے بزرگ اور بزرگ زادی بتاتے ہیں۔حالانکہ لفظ بزرگ فارسی ہے اور فارسی میں اس کا استعمال بوڑھے کے لئے ہوتا ہے۔اگرچہ مجازاً صاحب علم اور صاحب تقویٰ پر بھی بول دیا جاتا ہے۔لیکن ہم تو یہ سمجھتے ہیں کہ اس جگہ یہ لفظ بوڑھے کے معنٰی میں استعمال ہوا ہے۔کیونکہ سر پر ہاتھ ایک بوڑھا ہی رکھتا ہے۔اور بقول ملا باقر اس نے حضرت حسینؓ کے سر پر ہاتھ رکھ دیا۔گویا وہ حضرت حسینؓ سے عمر میں بہت بڑی تھیں۔اور حضرت حسینؓ ہنوز بچہ تھے۔لیکن ملا باقر اور ان سے قبل زمخشری نے یہ قلابازی کھائی کہ جھٹ جناب امیر کی زبانی حضرت حسینؓ کو ابوعبداللہ کہلوایا۔یعنی عبداللہ کا باپ۔گویا حضرت حسینؓ اُس وقت صاحب اولاد تھے۔اور اُن کے ایک لڑکا عبداللہ نامی پیدا ہو چکا تھا۔جب کہ ان مجوسیوں کا دعویٰ یہ ہے کہ حضرت حسینؓ ۳ھ یا ۵ھ میں پیدا ہوئے اور ہماری تحقیق کے بقول ۹ھ میں۔خیر ملا باقر ۴ھ کے مدعی ہیں اور یہ واقعہ ۱۴ھ کا ہے۔گویا دس سال کی عمر میں حضرت حسینؓ کے لڑکا پیدا ہو چکا تھا۔جس طرح یزدگرد کے ۱۰، ۱۴ سال کی عمر میں لڑکی پیدا ہو کر جوان ہو گئی تھی۔لیکن ان تمام معجزات سے بڑھ کر ہمارے نزدیک سب سے بڑا معجزہ یہ ہے کہ دروغ گورا حافظہ نباشد کے مصداق مُلا باقر ایک صفحہ قبل لکھتے ہیں کہ حضرت حسینؓ کا ایک لڑکا عبداللہ تھا۔جو حالت طفولیت میں اپنے پدر عالی مقام کے دامن میں تیر سے شہید ہوئے۔جن کو لوگ علی اصغر کہتے ہیں۔جلاء العیون ج ۲ صفحہ ۵۶۔یعنی جو لڑکا ۱۴ھ سے قبل پیدا ہو چکا تھا۔وہ ۶۱ھ میں دودھ پی رہا تھا۔اور میدان جنگ میں والد کی گود میں تھا۔یہ چھیالیس سال کا دودھ پیتا بچہ ہمیں تاریخ میں کربلا ہی میں نظر آیا۔یہ کتنا بڑا معجزہ ہے۔جو چاہے تیرا حسن کرشمہ ساز کرے۔ ہمیں اس معجزے کے وجود میں کوئی شک نہیں اس لئے کہ یہ امام باقر کا ارشاد ہے۔اور

بقول ملا مجوسی بسند معتبر مروی ہے۔ اگرچہ ہمارے نزدیک ۱۲ سال میں اس بچہ کی پیدائش ہی ایک معجزہ ہے۔ اس لئے کہ حضرت حسین رضؓ کی عمر اس وقت چھ سال تھی۔ اور مؤرخین کے نزدیک دس سال تھی۔

اس لڑکی کا نام جہاں شاہ تھا۔ لیکن حضرت علی رضؓ نے تبدیل کر کے شہربانو رکھا۔ غالباً حضرت علی رضؓ نے فارسی کی تعلیم سلمان رضؓ فارسی سے حاصل کی ہوگی۔ اس لئے کہ وہ علوم اولین و آخرین کے مالک تھے۔ کیونکہ یہ مجوسی اس کے دعویدار ہیں کہ حضور کی وفات کے بعد پانچ افراد کے علاوہ بقیہ تمام صحابہ مرتد ہو گئے تھے اور ان پانچوں کا بھی یہ حال تھا کہ اگر سلمان کے سامنے بقیہ چار کا علم پیش کیا جاتا تو بقیہ چار بھی کافر قرار پاتے۔ گویا قابل اقتدا صرف سلمان رضؓ ہیں۔ کیونکہ وہ ایرانی ہیں۔ اور وہی علوم اولین و آخرین کا خزانہ ہیں۔ اسی لئے اُن کی عمر کبھی ڈھائی سو سال، کبھی پانچ سو سال اور کبھی سات سو سال بیان کی جاتی ہے۔ حتیٰ کہ بار لوگوں نے ان کا شمار حواریین عیسیٰ تک میں کر ڈالا ہے۔

خیر یہ تو اتنے اہم امور نہ تھے۔ سب سے اہم اور خطرناک بات تو یہ ہے کہ حسین کاظم زادہ نے یہ دعویٰ کیا تھا۔ کہ علی بن الحسین کو فخر العرب والعجم اس لئے کہا جاتا ہے کہ وہ دو بہترین ہستیوں کی اولاد تھے۔ ایک نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور ایک شاہ ایران۔ لیکن ملا باقر مجلسی کو حضور سے یہ تعلق گوارا نہیں ہوا۔ وہ کہتے ہیں کہ انہیں ابن الخیرتین دو بہترین انسانوں کی اولاد اس لئے کہا جاتا ہے کہ تمام عرب میں برگزیدۂ خدا حضرت ہاشم تھے۔ اور برگزیدۂ عجم یا شاہ فارس تھا۔ ہاشم، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت علی رضؓ کا پڑدادا تھا۔ اس لئے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بجائے ہاشم کا نام لیا گیا۔ گویا کہ مجوسیوں کے نزدیک یہ دونوں کافر برگزیدہ نہ تھے۔ اور برگزیدۂ عرب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نہیں بلکہ ہاشم تھا۔

ملا باقر کا یہ دعویٰ بلا وجہ نہیں ہے۔ اس کے پیچھے مزید دو سازشیں کارفرما ہیں۔ امام جیسا کوئی سرپھرا یہ کہہ سکتا تھا کہ زین العابدین کا حضور سے دودھیالی تعلق ہے

پیدا ہوا، اگر کہتے ہو کہ حضرت فاطمہؓ کے واسطہ سے پیدا ہوا۔ تو پھر وہ ننھیالی ہوا، ددھیالی کیسے ہوا۔ اور چونکہ اہل تشیع ایرانی قومیت کے باعث اپنی ننھیال ایران کے ساسانی خاندان کو قرار دے چکے تھے۔ اور ایرانی قومیت کے ناتے اس سے انحراف ممکن نہ تھا۔ اسی لئے ملا باقر نے حضور سے رشتہ نہیں جوڑا۔ بلکہ ہاشم سے ناتہ پیدا کیا۔

۲۔ ہاشم سے ناتہ پیدا کرنے میں فائدہ یہ ہوا کہ ایک جانب تو عبد مناف یعنی ابوطالب جو بارہ اماموں کا باپ تھا۔ اس سے رشتہ باقی رہا۔ اور دوسرا فائدہ یہ ہوا کہ حضرت علیؓ کی والدہ فاطمہ بھی ہاشم کی اولاد میں سے تھیں اور ملا باقر ان فاطمہؓ کو سیدہ النساء اہل الجنۃ قرار دیتا ہے۔ لہٰذا وہ بھی ہاتھ سے نہ گئیں۔ اس طرح حضور سے تعلق کی کوئی ضرورت باقی نہیں رہی۔ حتیٰ کہ تاریخ یہ ثابت کرتی ہے کہ جب نفس ذکیہ نے منصور عباسی کے خلاف خروج کیا۔ اور پھر باہم افہام و تفہیم کے لئے خط و کتابت ہوئی تو نفس ذکیہ نے اپنے ایک خط میں جواب میں لکھا تھا کہ میں باپ کی جانب سے بھی ہاشمی ہوں، اور ماں کی جانب سے بھی ہاشمی ہوں۔ مجھے دو فاطماؤں نے جنا ہے۔ اس لحاظ سے میں فخر بنی ہاشم ہوں، اور منصور نے جواب دیا تھا کہ اپنے کا نر باپ دادوں پر فخر نہ کرو۔ گویا حضرت حسنؓ اور حضرت حسینؓ اور اُن کی اولاد ماں اور باپ دونوں کی جانب سے ہاشمی ہیں۔ لیکن نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم صرف باپ کی جانب سے ہاشمی ہیں۔ کیونکہ آپ کی والدہ بنو زہرہ خاندان سے تعلق رکھتی ہیں۔ اور ماں کی جانب سے ہاشمی ہونا اس لئے ضروری ہے کہ سبائیوں کے نزدیک فاطمہ بنت اسد جو حضرت علیؓ کی والدہ تھیں سیدۃ النساء تھیں۔ جب ہی تو کعبہ میں جاکر انہوں نے بچہ کو جنا تھا۔ اور اُن پر باقاعدہ وحی نازل ہوئی تھی۔ جیسا کہ مولود کعبہ کے ذیل میں آپ پڑھ چکے ہیں۔ اور مزید تفصیل سیدۃ النساء کے تحت گزر چکی ہے۔ ان تمام امور کو پیش نظر رکھتے ہوئے۔ یہ تعلق حضور کے بجائے ہاشم سے جوڑا گیا ہے۔

اتفاق سے جلاء العیون ترجمہ مطبوعہ لاہور پر حواشی بھی چڑھے ہوئے ہیں۔ جس کے

حاشیہ نگار بقول خود سید الواعظین، رئیس المتکلمین، زبدۃ العلماء، جناب ابوالبیان، مولانا السید ظہور الحسن صاحب قبلہ کوثر بھرملوی خطیب شیعہ ملتان جیسی یگانہ روزگار ہستی ہے۔ یگانہ روزگار اس لئے کہ جس کے القاب ہی چھ فٹ لمبے ہوں۔ وہ خود کتنے لمبے تڑنگے ہوں گے اور ان کی عقل کتنی لمبی چوڑی ہو گی۔ ہم تو ان چھ فٹے القابات ہی سے متاثر ہو گئے ہیں کیونکہ سبائی برادری ہمیشہ القاب ہی کے ذریعہ لوگوں کو شخصیت پرستی کے مرض میں مبتلا کرتی رہی ہے۔ یہ کوئی نیا حربہ نہیں ہے۔ بلکہ ہندو پاکستان میں سکہ رائج الوقت کی طرح یہ طریقہ کار عام طور پر رائج ہے۔ ان بھرملوی صاحب کو یہ خطرہ محسوس ہوا۔ کہ اگر کسی سنی نے عقل سے کام لے کر اس واقعہ کی پول کھول دی تو ہماری تمام سیاست پر پانی پھر جائے گا۔ بلکہ خطرہ نہیں۔ یہ چیز حقیقت بن کر ان کے سامنے آ گئی تھی۔ یعنی علامہ شبلی مرحوم نے الفاروق میں اس واقعہ کی مختصراً تردید کر ڈالی تھی۔ لہٰذا ان بھرملوی صاحب نے حاشیہ میں اس واقعہ کا رد کرتے ہوئے اپنی برادری کے لئے ایک نیا لائحہ عمل بھی پیش کیا ہے۔ لہٰذا ہمارے قارئین بھی اسے ملاحظہ کر لیں۔

حضرت شہربانو کا دور عمرؓ میں آنا غلط ہے۔ جس کی تردید علمائے اہل سنت نے بھی کی ہے۔ نیز مندرجہ بالا شیعی روایت کے حضرت شہربانو کی عمر تین چار سال دور از قیاس ہے۔ یہ روایت درایت و روایت دونوں اعتبار سے غلط ہے۔ اور علمائے امامیہ نے اُس نازک دور میں نزاکت وقت کے پیش نظر ہر طرح کی احادیث و روایات ذکر اہل بیت کو محفوظ کرنے کے لئے نقل فرما دیں۔ تاکہ آئندہ آنے والی نسل ان کتب سے صحیح روایات لے کر معرفت اہل بیت حاصل کریں۔ لہٰذا آنے والی نسلوں کا فریضہ ہے کہ کتب رجال اصول روایت و درایت سے احادیث و روایات لے کر عمل کریں۔ اس لئے بندے نے اس کتاب مستطاب کا حاشیہ دیدیا تاکہ مخالفین ان مقامات کو لے کر امامیہ پر اعتراض کی جسارت نہ کریں۔ حاشیہ جلاء العیون ج ۲ صـ ۳۵۸

ملا باقر مجلسی صـ ۳۵۷ پر زین العابدین کی پیدائش کا حال بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

کہ ولادت آنحضرت ۳۸ھ دو سال قبل شہادت جناب امیر (حضرت علیؓ) واقع ہوئی۔ دس سال امام حسنؑ کی وفات تک اور دس سال اپنے پدر بزرگوار کی شہادت تک رہے اور زمانۂ امامت آنحضرت ۳۵ سال اور عمر شریف آنحضرت ستاون سال تھی۔ اور مادرِ آنحضرت موافق مشہور بانو دختر یزدجرد بادشاہِ عجم تھیں۔ اور بعضوں نے شاہ زناں لکھا ہے۔

ملا باقر مجلسی کی اس عبارت سے ایک مسئلہ تو حل ہو گیا۔ کہ کربلا کے موقعہ پر زین العابدین کے بارے میں جو یہ بیان کیا جاتا ہے کہ ہنوز وہ بچہ تھے اور بیمار تھے۔ تو اس عبارت سے یہ ثابت ہوا کہ کربلا کے موقعہ کے وقت ان کی عمر تیئیس سال تھی۔ جب کہ ان کے بیٹے باقر کی عمر چار سال تھی۔ کیونکہ ملا مجوسی امام باقر کے حالات میں لکھتا ہے کہ وہ ۵۷ھ میں پیدا ہوئے۔

یہاں جو بات بیان کرنی مقصود ہے۔ وہ یہ ہے کہ اس مفروضہ لڑکی کے نام ہی کا مسئلہ کھٹائی میں پڑ گیا ہے۔ شہربانو۔ جہاں شاہ۔ اور شاہ زناں۔ ہم حیران ہیں کہ اس فرضی لونڈی کو کس نام سے یاد کریں۔ جب کہ اس کے پجاری بھی اس کا صحیح نام بتلانے سے معذور ہیں۔

ایسا محسوس ہوتا ہے کہ کوثر بھریلوی صاحب کا کسی سنی نے ناطقہ بند کر دیا ہے اس لئے وہ یہاں مزید ایک حاشیہ لکھنے پر مجبور ہوئے۔ اور ملا باقر کی اس کہانی سے نجات حاصل کرنے کا ایک ذریعہ پیدا کیا۔ اور وہ اس طرح کہ اعتراضات بھی رفع ہو جائیں۔ اور اس دیوی جی کی پوجا بھی ان کے ہاتھ سے نہ جائے اور الٹا چور کوتوال کو ڈانٹے، کو پیش نظر رکھتے ہوئے انہوں نے فرمایا یہ کہانی ہم لوگوں نے وضع نہیں کی۔ بلکہ اہل سنت نے وضع کر کے ہماری کتابوں میں شامل کر دی ہے۔ اگرچہ آج تک کسی سبائی نے یہ دعویٰ نہیں کیا تھا کہ ہماری کتابوں میں فلاں بات سنیوں نے شامل کی ہے۔

ہم تو چودہ سو سال سے یہ دعویٰ کرتے آئے تھے کہ سبائی برادری نے ہماری کتابوں میں ہزاروں روایات گھڑ کر شامل کر دی ہیں۔ لیکن فریق مخالف کی جانب سے یہ نیا دعویٰ ہے۔ جو اس امر کی دلیل ہے کہ اب یہ سبائی اتنے عاجز آ چکے ہیں کہ انہیں اب اس کے علاوہ

فرار کی کوئی راہ نظر نہیں آتی لیکن اب دیکھنا یہ ہے کہ یہ اب بچ بچا کر کون سا ٹھکانہ تلاش کرتے ہیں۔ آیئے اُن کا ٹھکانا اُن ہی کے ذریعہ معلوم کیجئے۔ بھرلوی صاحب اپنا ٹھکانہ خود ہی بتاتے اور فرار کی وجہ بھی بیان کرتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں۔

یہ روایت مخالفین اہل بیت کی تیار کردہ ہے۔ یہ صرف اہل بیت کی تذلیل اور عمرؓ بن الخطاب کی افضلیت کے لئے وضع کی گئی۔ خود اس واقعہ کے متعلق مورخ اہل سنت علامہ شبلی، الفاروق ص۲۹ میں اس طرح رقم طراز ہیں۔

حضرت شہربانو کا قصہ جو غلط طور پر مشہور ہو گیا ہے۔ اس کا ذکر کرنا ضروری ہے۔ عام طور پر مشہور ہے۔ جب فارس فتح ہوا۔ تو یزدجرد کی بیٹیاں گرفتار ہو کر مدینہ آئیں۔ حضرت عمرؓ نے لونڈیوں کی طرح بازار میں بیچنے کا حکم دیا لیکن حضرت علیؓ نے منع کیا کہ شاہی خاندان کے ساتھ ایسا سلوک جائز نہیں۔ ان لڑکیوں کی قیمت کا اندازہ کر لیا جائے۔ پھر یہ لڑکیاں کسی کے اہتمام اور سپردگی میں دیدی جائیں۔ اور اُن سے اُن کی قیمت اعلیٰ سے اعلیٰ شرح پر لی جائے۔ چنانچہ حضرت علیؓ نے خود اُن کو اپنے اہتمام میں لیا۔ ایک امام حسینؓ کو، ایک محمدؓ بن ابی بکر کو اور ایک عبداللہ بن عمرؓ کو عنایت کی۔ اس غلط قصہ کی حقیقت یہ ہے کہ زمخشری نے جس کو فن تاریخ سے کچھ بھی واسطہ نہیں ربیع الابرار میں لکھا ہے۔ ابن طولون نے امام زین العابدین کے حالات میں یہ روایت اس کے حوالہ سے نقل کر دی۔ لیکن یہ محض غلط ہے۔

اولاً تو زمخشری کے سوا طبری، ابن الاثیر، یعقوبی، بلاذری اور ابن قتیبہ وغیرہ نے اس کو نقل نہیں کیا۔ اور زمخشری کا فن تاریخ میں جو پایہ ہے وہ ظاہر ہے۔ اس کے علاوہ تاریخی قرائن بالکل اس کے خلاف ہیں۔ حضرت عمرؓ کے عہد میں یزدجرد اور خاندان شاہی پر مسلمانوں کو مطلق تسلط حاصل نہیں ہوا۔ نیز مجھے یہ بھی شبہ ہے کہ زمخشری کو یہ معلوم تھا یا نہیں کہ یزدجرد کا قتل کس کے عہد میں ہوا ہے۔ اس کے علاوہ جس وقت کا یہ واقعہ ہے حضرت حسینؓ کی عمر دس برس تھی۔ کیونکہ جناب ممدوح ہجرت کے پانچویں سال پیدا ہوئے اور

فارس ۲۱ھ میں فتح ہوا۔ اس سے یہ امر مستبعد ہے کہ حضرت علیؓ نے نابالغی میں اُن پر ایسی عنایتیں کیوں کی۔

شبلی کا یہ بیان بھریلوی صاحب نے خود جلاء العیون کے حاشیہ میں نقل کیا ہے۔ جس کے باعث بھریلوی جہاں بے بس ہوئے۔ وہاں علامہ شبلی کی ایک غلطی کے باعث انہیں راہ فرار مل گئی۔ اور انہوں نے سنیوں پر یہ الزام قائم کر دیا کہ سنیوں نے یہ روایت وضع کر کے شیعوں کی کتابوں میں شامل کر دی۔ دراصل علامہ شبلی سے غلطی یہ ہوئی کہ انہوں نے یہ کہہ دیا کہ زمخشری کے علاوہ اسے کسی اور نے بیان نہیں کیا۔ زمخشری کا نام محمود بن عمر اور جاراللہ لقب ہے۔ اس کا انتقال ۵۳۸ھ میں ہوا۔ اور ظاہر وہ سنی تھا۔ لہٰذا بھریلوی کو یہ حیلہ ہاتھ آگیا۔ کاش علامہ شبلی شیعہ مذہب کی کتابوں کا مطالعہ کر لیتے تو اُن پر یہ عقدہ کھل جاتا کہ زمخشری نے یہ کہانی کلینی سے نقل کی ہے۔ اس کا نام محمد بن یعقوب ہے۔ جو ۲۵۰ھ میں پیدا ہوا۔ اصول کافی کا مصنف یہی ہے۔ جس نے سب سے اول اپنی کتاب میں یہ روایت نقل کی وہیں سے ملا باقر مجلسی نے اسے نقل کیا اور وہیں سے زمخشری نے۔ زمخشری تو صرف نقل کے گناہ گار ہیں۔ یہ کرشمہ سازی تو سبائیوں کے سب سے بڑے محدث کلینی نے دکھائی ہے۔ سنیوں نے آپ کی کتاب میں کوئی روایت شامل نہیں کی۔ بلکہ آپ لوگوں کی کتابوں سے سنیوں نے لے لی ہیں۔

بھریلوی صاحب لکھتے ہیں۔

نیز علامہ قطب راوندی کی حضرت امام باقر علیہ السلام کی بیان کردہ روایت کہ جب یزدجرد بن شہریار آخر بادشاہان عجم کی دختر کو عمرؓ کے پاس لائے۔ یہ روایت اصول کافی سے ہے۔ علمائے شیعہ خواہ مجلسی ہوں، یا محمد بن یعقوب صاحب اصول کافی کے ماننے والے۔ تمام نے اس وقت جب کہ زمانہ دشمنی اہل بیت پر تلا ہوا تھا شیعیت نازک دور سے گزر رہی تھی۔ ان کتب کو مرتب کیا۔ اور وہ ہر روایت جو ملی خواہ کہیں سے ملی ہو تحریر فرما دی

اب اس کے صحیح، ضعیف یا موضوع کو دیکھنے کے لئے عقل اور علم الرجال سے دیکھنا پڑتا ہے۔ کیونکہ اہل اسلام کے نزدیک یہ دونوں طریقے مستند ہیں۔ لہٰذا پہلے اس حدیث پر عقلی تبصرہ کرتے ہیں۔

ولادت شہربانو ۱۳ھ اور ۱۵ھ کے درمیان ہوتی ہے۔ اگر ۱۳ھ میں فرض کی جائے تو عہد عمرؓ میں مدائن ۱۶ھ میں فتح ہوا۔ تو شہربانو کی عمر چار یا ساڑھے چار سال ہوگی اور یہ بعید از عقل ہے کہ ایک چھوٹی سی نابالغ بچی عمرؓ سے منہ چھپائے۔ (لیکن نکاح ام کلثوم میں یہ منطق ضرور ہر سبائی کو یاد آتی ہے) اور پانچویں پشت میں اپنے جد ہرمز کا نام لے کر فریاد کرے۔ اور عمرؓ دشنام سمجھ کر سزا دینے پر تیار ہوں، جب کہ نابالغوں کو شرعاً سزا دینا درست نہیں حضرت علیؓ اس بچی کو شوہر منتخب کرنے کا اختیار دلوائیں۔ اور وہ اختیار کرے۔ اور حضرت علیؓ نابالغی میں چھوٹی بچی کا امام حسینؓ سے نکاح کریں۔ (نکاح کیسا؟ ان کی تو قیمت لگائی گئی تھی) عقلاً یہ روایت بالکل غلط اور ناقابل اعتماد ہے

نیز اصول کافی میں اس روایت کے چار راوی ہیں۔ ابراہیم بن اسحاق الاحمر، عبدالرحمان بن عبداللہ خزاعی۔ عمرو بن شمر۔ نصر بن مزاحم۔ ابراہیم بن اسحاق کے متعلق شیخ طوسی نے لکھا ہے کہ وہ علم حدیث میں ضعیف اور دین کے لحاظ سے متہم تھا (یعنی شیعہ نہ تھا) رجال کشی میں شیخ نے اس کا شمار ان لوگوں میں کیا۔ جنہوں نے اہل بیت سے روایت نہیں کی۔ ابن عضایری نے لکھا ہے کہ اس کی احادیث میں ضعف اور دین میں غلو پایا جاتا ہے۔

عبدالرحمان بن عبداللہ خزاعی بالکل مجہول الحال ہیں۔ نہ شیعہ کتب میں ان کا تذکرہ نہ اہل سنت کے کتب رجال میں اس کا کوئی ذکر ہے۔

عمر بن شمر، علامہ نجاشی تنقیح المقال میں فرماتے ہیں یہ امام صادق سے روایت کرتا ہے۔ مگر بہت ضعیف ہے۔ ابن عضایری نے بھی اس کو ضعیف اور نا قابل اعتماد کہا ہے۔ نیز صاحب مرآۃ العقول بھی اس کی تضعیف کے قائل ہیں۔

نصر بن مزاحم: تنقیح المقال نے علامہ نجاشی کا یہ قول نقل کیا ہے کہ یہ راہ راست پر تھا (یعنی کٹر سبائی تھا) مگر اس میں خرابی یہ تھی کہ ضعیف روات (یعنی سنیوں) سے بھی روایت کرتا تھا۔ نیز خود علامہ مجلسی نے اپنی کتاب مرآۃ العقول شرح اصول کافی میں اس روایت کو ضعیف قرار دیا ہے۔ پس جو روایت درایتہً و روایتاً ناقابل اعتبار ہو اس کا سہارا لینا جائز نہیں۔

دوسری روایت یہ کہ دور عثمان میں عرب آئی ہوں۔ جو کہ بحار الانوار سے پیش کی جاتی ہے۔ جس کے راوی محمد بن یحییٰ صولی، اور عون بن محمد الکندی ہیں۔ یہ روایت بھی رواۃ کے اعتبار سے ناقابل اعتبار ہے۔ ان راویوں کا شیعہ کتب رجال میں کہیں تذکرہ نہیں۔ اہل سنت کتب میں جو تذکرہ ہے وہ یہ ہے ابو احمد بن عشار کے ذریعہ یہ خبر ملی ہے کہ ابو احمد عسکری کی طرف غلط روایات منسوب کرتا تھا جس طرح صولی خود غلابی کی طرف اغلاط کو نسبت دیتا تھا اور جس طرح غلابی تمام محدثین کی طرف سے خود غلط روایتیں بیان کرتا تھا۔ لسان المیزان ج ۲ ص ۵۲۷)

عون بن محمد یہ صاحب اخباری تھے۔ یعنی مؤرخ۔ ان سے سوائے صولی کے اور کسی نے روایت نہیں لی۔ لسان المیزان ج ۴ ص ۴۸۸۔ جلاء العیون ج ۲ ص ۲۵۹۔

اس تحریر سے ہمارے قارئین یہ تصور نہ کرلیں کہ شہر بانو کی کہانی سے خود سبائی نالاں یا اس کے منکر ہیں۔ حاشا و کلاّ۔ یہ تصور تو ایک امر محال ہے کہ جس کہانی کو وہ وجود میں لے آئیں۔ اور وہ کہانی اُن کی ایرانیت کی آئینہ دار ہو تو وہ اس سے کلیتہً منحرف ہو جائیں۔ بلکہ یہ ہوتا ہے کہ جب اعتراضات کی بوچھاڑ ہوتی ہے اور اس کا جواب ملنا شروع ہو جاتا ہے تو کہانی کا رنگ و روپ بدل دیا جاتا ہے اور اصل پلاٹ باقی رہتا ہے۔

بھریلوی صاحب نے اپنے پیش رووں کا یہ قول تو ضرور رد کر دیا کہ یزدگرد کی بیٹی نہ تو دور عمرؓ میں آئی اور نہ دور عثمانؓ میں لیکن انہوں نے ہرگز اس کا اقرار نہیں کیا کہ اس کا کوئی وجود نہ تھا۔ اور وہ سرے سے مدینہ آئی ہی نہیں۔ یا وہ زین العابدین کی ماں نہ تھی۔ وہ ان تمام باتوں کو نظر انداز کر گئے۔ اور شبلی مرحوم نے دور عمرؓ والے واقعات پر الفاروق میں جو اعتراضات کئے

تھے اُس سے گھبرا کر دورِ عمرؓ کی کہانی سے منکر بن گئے۔

ہاں انہوں نے ہمارے کام کی یہ بات ضرور کہدی ہے کہ شیعہ مذہب کی روایات کو بھی عقل اور اسماء الرجال کی کسوٹی پر پرکھنا چاہیئے۔ اِن کے پہلوں نے بلا سوچے سمجھے روایات نقل کر دی تھیں۔ جو اِن کی غلطی تھی۔ ورنہ اعتراضات واقع نہ ہوتے۔ اسی لئے ہم روایت و درایت دونوں اصول سے اس کہانی پر بحث کر رہے ہیں۔ اور غالباً مودودی صاحب نے تاریخ میں راویوں پر جرح کو اسی لئے ممنوع قرار دیا ہے۔ کیونکہ وہ محمود احمد عباسی کی جرح سے گھبرا اٹھے تھے۔

کوثر بھرملوی صاحب نے ایک اور روایت کی جانب بھی اشارہ کیا ہے اور خود ہی اس کی تردید بھی کر دی ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ شہربانو دورِ عثمانؓ میں مدینہ پہنچی۔ ہم یہ روایت ملا باقر مجلسی کی زبانی جلاء العیون سے پیش کرتے ہیں۔ مجلسی لکھتے ہیں۔

ابن بابویہ نے بسند معتبر حضرت امام رضا سے روایت کی ہے کہ جب عبداللہ بن عامرؓ (اموی) نے خراسان فتح کیا۔ یزدجرد بادشاہ عجم سے دو بیٹیاں لے کر عثمانؓ کے واسطے بھیجیں۔ اُس نے اُن میں سے ایک حضرت حسنؓ اور دوسری حضرت حسینؓ کو دیدی۔ اور جو حضرت امام حسینؓ کے پاس تھیں اُن سے زین العابدین پیدا ہوئے اور جب حضرت اُن سے پیدا ہوئے۔ اُس وقت حالتِ زچگی میں انہوں نے انتقال کیا۔ اور دوسری دختر نے بھی فرزند کی ولادت کے وقت انتقال کیا۔ حضرت امام حسینؓ کی ایک کنیز نے حضرت امام زین العابدین کی پرورش کی حضرت اس کو مادر کہتے تھے۔ جب امام حسینؓ شہید ہوئے۔ امام زین العابدین نے اس کنیز کا کسی شیعہ مؤمن سے عقد کر دیا۔ اس اشتباہ سے مشہور ہو گیا۔ کہ حضرت امام زین العابدین نے اپنی مادر کا ایک شیعہ سے عقد کر دیا۔

مؤلف (مجلسی) فرماتے ہیں کہ یہ حدیث اس سے مخالفت رکھتی ہے جو کچھ احوال داولادِ امام حسین میں گزری۔ کہ حضرت شہربانو عہدِ عمرؓ بن الخطاب میں لائی گئی۔ اور شاید کسی راوی نے

اس روایت میں شبہ کیا ہو۔ اور وہ روایت جس کا یہاں ذکر ہوا ہے اشہر و اقوی ہے۔

چنانچہ قطب راوندی نے بسند معتبر امام محمد باقرؑ سے روایت کی ہے کہ جب یزدجرد بن شہریار آخر بادشاہان عجم کی دختر کو عمرؓ کے پاس لائے۔ جمیع دختران مدینہ اس کے تماشائے حسن و جمال کو دیکھنے کے لئے آئیں۔ اور جب عمرؓ نے قصد اس کے دیکھنے کا کیا۔ وہ مانع ہوئی اور کہا ہرمز کا منہ سیاہ ہو کہ تو اس کی اولاد کی طرف ہاتھ بڑھائے۔ عمرؓ نے کہا اے گبرزادی تو مجھے دشنام دیتی ہے۔ اور چاہا کہ اسے ایذا پہنچائیں۔ جناب امیرؑ نے فرمایا۔ اس کی بات تم کیوں کر سمجھے کہ یہ تم کو دشنام دیتی ہے۔ پھر عمرؓ نے حکم دیا۔ کہ اس کے فروخت کرنے کی سب کو اطلاع کر دو، حضرت نے فرمایا۔ دختران سلاطین کا بیع کرنا ہر چند کہ کافر ہوں جائز نہیں۔ لیکن اس سے کہو کہ ان مسلمانوں میں سے کسی کو قبول کرے۔ اور کہا کہ کس کو اہل مجلس میں سے اختیار کرتی ہے۔ اس سعادت مند نے دوش مبارک امام حسینؑ پر رکھ دیا۔ جناب امیرؑ نے بزبان فارسی اس سے پوچھا کہ تمہارا نام کیا ہے؟ اُس نے کہا جہاں شاہ، حضرت نے فرمایا میں نے تمہارا نام شہربانو رکھا۔ اس شہزادی نے کہا یہ نام میری خواہر کا ہے۔ حضرت نے بزبان فارسی فرمایا۔ تم سچ کہتی ہو، پھر حضرت امام حسینؑ سے مخاطب ہو کر فرمایا کہ اس سعادت مند سے بہ نیکی سلوک کرنا اور اس کی حفاظت کرنا۔ کیونکہ اس سے ایک ایسا فرزند پیدا ہوگا جو بعد تمہارے بہترین اہل زمین ہوگا۔ اور یہ میرے اوصیاء و ذریت طیب کی ماں ہے۔ چنانچہ زین العابدین اُن سے پیدا ہوئے۔

اور منقول ہے کہ قبل اس کے کہ مسلمانوں کا لشکر اُن کی طرف جائے۔ شہربانو نے یہ خواب ایک شب دیکھا۔ کہ حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مع حضرت امام حسینؑ اُن کے گھر آئے۔ اور اُن کو اُن سے تزویج کی۔ شہربانو کہتی ہیں جب صبح ہوئی۔ اس خورشید فلک امامت کی محبت میرے دل میں مستحکم ہوگئی۔ اور مجھے ہر وقت ہمیشہ آنحضرت کا خیال رہتا تھا۔ جب دوسری شب میں سوئی فاطمہ صلوات اللہ علیہا کو میں نے خواب میں دیکھا کہ میرے پاس تشریف

لائیں۔ اور اسلام کی مجھے ہدایت و دعوت کی۔ میں نے خواب ہی میں اسلام قبول کر لیا۔ بعد اس کے فرمایا کہ لشکر اسلام تمہارے پدر پر غالب ہوگا۔ اور تم اسیر ہو کے بہت جلد میرے فرزند حسینؓ کے پاس پہنچوگی۔ اور خدا یہ امر ناگوار کرے گا۔ کہ تم تک کسی غیر کا ہاتھ پہنچے۔ یہاں تک کہ میرے فرزند تک پہنچو۔ پس حق تعالیٰ نے میری حفاظت کی کہ کسی غیر شخص کا ہاتھ مجھ تک نہ پہونچا۔ یہاں تک کہ مجھے مدینہ میں لائے۔ اور جب میں نے امام حسینؓ کو دیکھا تو پہچان لیا۔ کہ یہ وہی ہیں جو حضرت رسول کے ہمراہ خواب میں میرے پاس آئے تھے اور حضرت نے انہیں مجھ سے تزویج کیا تھا۔ اسی سبب سے میں نے ان کو قبول کیا۔ جلاء العیون ج ۲ صفحہ ۳۶

ہم اپنی رائے ابھی محفوظ رکھنا چاہتے ہیں۔ ویسے کوثر بھریلوی صاحب اس روایت کا بھی انکار کر چکے ہیں۔ اب ان مجوسیوں کا آخری حربہ بھی ملاحظہ ہو۔ ملا مجلسی لکھتے ہیں۔

شیخ مفید نے روایت کی ہے کہ جناب امیر (حضرت علیؓ) صلوات اللہ علیہ نے حریث بن جابر کو بعض بلاد مشرق کا عامل کیا۔ اس نے یزدجرد بادشاہ کی دو لڑکیاں حضرت (علیؓ) کے واسطے بھیجیں۔ جناب امیر نے ایک اُن میں سے کہ شاہ زناں نام تھا حضرت امام حسینؓ کے لئے تجویز فرمائیں اور اُن سے حضرت امام زین العابدین پیدا ہوئے۔ دوسری محمد بن ابی بکر کو دی۔ جس سے قاسم پیدا ہوئے۔ حضرت قاسم اور حضرت امام زین العابدین خالہ زاد بھائی تھے۔

بھریلوی لکھتے ہیں۔

حضرت شہربانو کا نمک خواران سقیفہ نے افسانہ بنادیا۔ عزت رئیس سقیفہ بلند کرنے کے لئے شبلی جیسے مورخ نے الفاروق میں اس قصہ کو غلط قرار دیا ہے۔ خلافت علی ۳۶ھ میں ہوئی۔ امام حسینؓ اس وقت تیس سال کے تھے۔ آپ نے حریث بن جابر حنفی کو خراسان کا گورنر بنا کر روانہ کیا۔ حریث نے یزدجرد کی دو بیٹیاں شہربانو اور گیہان بانو حضرت علیؓ کے پاس بھیجیں آپ نے شہربانو امام حسینؓ کو اور گیہان بانو محمد بن ابی بکر کو دیدیں۔ شہربانو سے امام زین العابدین پیدا ہوئے۔ اور گیہان بانو سے قاسم بن محمد پیدا ہوئے۔ (روضۃ الصفاج ۲ ص ۵ جامع التواریخ

ص۱۲۱ کشف الغمہ ص۳۰۱) نیز عقل بھی اس روایت کو تسلیم کرتی ہے۔ لہٰذا صحت کا گمان اسی پر ہوتا ہے۔ بلکہ ہوتا کیا صحیح یہی ہے۔ حاشیہ جلاء العیون ج ۲ ص۳۶۳

اب آخر میں شیخ کلینی کا ایک فیصلہ بھی سن لیجئے جو اس نے اصول کافی میں بیان کیا ہے کلینی لکھتے ہیں۔

علی بن الحسین ۳۸ھ میں پیدا ہوئے اور ۹۵ھ میں ان کا انتقال ہوا۔ اُن کی عمر ستاون سال ہوئی۔ اُن کی والدہ سلامہ بنت یزدجرد شہریار بن شیرویہ بن کسریٰ پرویز ہے۔ اصول کافی مترجمہ ج ۱ ص۵۷۲

ان تمام روایات کو پیش نظر رکھتے ہوئے جو خاکہ سامنے آتا ہے۔ وہ خاصا طویل ہے۔ اس لئے ہم اس کے ضروری اجزا بیان کئے دیتے ہیں۔ لیکن اُس سے قبل شریعت کے ایک اصول کو ملحوظ خاطر رکھیے۔ ورنہ قدم قدم پر آپ لوگ ڈگمگاتے رہیں گے۔

شرعی اصول یہ ہے کہ صرف اُن لوگوں کو گرفتار کیا جاتا ہے جو میدانِ جنگ میں ہاتھ آتے ہیں۔ اگر عورتیں بھی فوج کے ساتھ ہیں تو وہ بھی گرفتار ہوتی ہیں۔ یہ سب جنگی قیدی متصور ہوتے ہیں۔ ان کے علاوہ کسی پر ہاتھ نہیں ڈالا جاتا۔

اُس دور میں ہر لشکر کے ساتھ کچھ عورتیں ضرور ہوتی تھیں کچھ تو زخمیوں کی مرہم پٹی اور بالائی کاموں کے لئے اور کچھ کو بعض کفار اپنی عیاشی کے لئے ساتھ لے کر آیا کرتے تھے۔ گرفتاری کے بعد تمام مرد اور عورتوں کو خلیفہ وقت کی خدمت میں بھیج دیا جاتا تھا۔ خلیفۂ وقت کو از روئے شریعت یہ اختیار دیا گیا ہے کہ ان جنگی قیدیوں کو اگر زیادہ خطرناک ہیں تو ان میں سے مردوں کو قتل کر دیا جائے اور عورتوں کو چونکہ وہ بے سہارا ہو چکی ہیں۔ مجاہدین پر تقسیم کر دیا جائے اگر خلیفہ مناسب سمجھے تو سب کو آزاد کر سکتا ہے یا سب کو دوسروں کی غلامی میں دے سکتا ہے۔ اور مناسب سمجھے تو فدیہ لے کر رہا کر دے۔ لیکن کسی ایسے شخص کو جس نے جنگ میں حصہ نہ لیا ہو، گرفتار نہیں کیا جا سکتا تھا۔ اسی طرح اگر گرفتاری کے بعد تقسیم سے قبل وہ ایمان لے آیا۔ اب وہ

زاد ہو گیا۔ اس امور کو سمجھ لینے کے بعد کچھ ہماری معروضات بھی ملاحظہ کر لیجئے۔

۱۔ یہ لڑکیاں کس جنگ میں ہاتھ آئی تھیں اور میدانِ جنگ میں یہ کس حیثیت سے آئی تھیں۔ حضرت عمرؓ کے زمانہ میں کم سن ہونے کے باعث ان کا میدانِ جنگ میں آنے کا سوال پیدا نہیں ہوتا۔ رہا حضرت عثمانؓ کا زمانہ تو جب تک ان کا باپ زندہ رہا۔ تو اس وقت تک شہزادیوں کے آنے کا سوال پیدا نہیں ہوتا کیونکہ شہزادیاں خدمت کے لئے نہیں ہوتیں، وہ دوسروں سے خدمت لیتی ہیں۔ جب ۳۲ھ میں یزدجرد مر گیا تو اب ان کا میدانِ جنگ میں آنے کا امکان پیدا ہوتا ہے۔ کہ ممکن ہے کسی مقام پر انہوں نے جنگ کی کمان اپنے ہاتھ میں لے لی ہو۔ اور اس طرح جنگی قیدی بن کر آئی ہوں۔ لیکن اول تو یہ صورت آج تک کسی نے بیان نہیں کی۔ دوئم بھر بلوی صاحب اس سے انکار کر چکے ہیں کہ ایسا واقعہ حضرت عثمانؓ کے زمانہ میں پیش آیا ہو۔ اب رہا حضرت علیؓ کے زمانہ کا مسئلہ تو جب خراسان ۲۹ھ میں فتح ہو چکا تھا۔ اور وہاں اسلامی حکومت قائم تھی اور ایرانیوں کی حیثیت ذمیوں کی تھی۔ ایسی صورت میں انہیں ۳۶ھ میں گرفتار کر کے بھیجنا اور پھر حضرت علیؓ کا انہیں تقسیم کرنا ہر دو امور حرام تھے۔ ہم اہل سنت حضرت علیؓ کے بارے میں اس قسم کا تصور بھی کرنے کے لئے تیار نہیں کہ جن ذمیوں کی حفاظت اسلام نے ان کے سر ڈالی ہو، وہ اس ذمہ داری کو پس پشت ڈال کر حریت کے ذریعہ ان لڑکیوں کو گرفتار کرائیں۔ جو حکومت اسلامیہ کی پناہ میں ہیں اور پھر انہیں تقسیم کریں۔ ہم تو ایسی سوچ رکھنے والوں پر بھی لعنت بھیجتے ہیں۔

۲۔ سب سے اول فیصلہ یہ ہونا چاہیئے کہ یہ لڑکی کس زمانہ میں گرفتار ہو کر آئی ۲۱ھ میں حضرت عمرؓ کے زمانہ میں یا ۲۹ھ میں فتح خراسان کے بعد یا ۳۲ھ میں یزدگرد کے مرنے کے بعد یا ۳۶ھ میں حضرت علیؓ کے زمانہ میں۔

۳۔ یزدگرد کی ایک لڑکی گرفتار ہو کر آئی۔ یا دو لڑکیاں گرفتار ہو کر آئیں یا تین لڑکیاں۔ یہ سوال اس لئے انتہائی اہم ہے۔ تاکہ یہ معلوم کیا جا سکے کہ بقیہ لڑکیوں کی اولاد کون کون ہیں۔

تاکہ شہنشاہانِ ایران سے اُن کا بھی رشتہ جوڑا جا سکے۔

۴۔ سبائی یہ تو تسلیم کر چکے ہیں کہ قاسم بن محمد بن ابی بکر اور ان کی اولاد میں شہنشاہانِ فارس کا خون دوڑ رہا ہے۔ کیوں نہ ابوبکر صدیقؓ کی اس اولاد کو جو قاسم بن محمد کی نسل سے ہو، امامت و ولایت سپرد کی جائے۔ آخر انہیں کب تک محروم رکھا جائیگا۔ ہم ایسے بہت سے حضرات سے واقف ہیں جو اُن کی نسل سے تعلق رکھتے ہیں اور اس سے ایک فائدہ یہ بھی ہوگا کہ شیعہ سنی اتحاد کی راہ بھی کچھ ہموار ہو گی۔ کہیں نہ سمجھ لیجئے گا کہ ہم اپنا نام پیش کرنا چاہتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کے فضل سے ہم عبدالرحمان بن ابی بکر کی اولاد سے تعلق رکھتے ہیں۔

۵۔ زین العابدین کی ماں کا آخر کیا نام تھا۔ شاہ جہاں۔ شاہ زماں یا سلامہ۔ اس لئے کہ شہربانو تو بقول ان کے حضرت علیؓ نے رکھا۔ اور اس لڑکی کے بقول وہ اس کی بہن کا نام تھا جو دوسرے کے حصہ میں آئی۔

۶۔ دوسری لڑکی اور جس روایت میں تین کا ذکر ہے۔ آخر وہ کس کے حصہ میں آئیں اس کا فیصلہ درکار ہے۔ اس لئے کہ مرد بہرصورت تین ہیں۔ اور سبائی چار مردوں میں ایک یا دو عورتیں یا تین تقسیم کرنا چاہتے ہیں۔ اس لئے کہ آنے والی ایک ہے۔ دو ہیں۔ یا تین ہیں اور جن مردوں کے درمیان ان کا بٹوارہ ہو رہا ہے وہ چار ہیں یعنی حضرت حسینؓ، حضرت حسنؓ، محمدؓ بن ابی بکر اور حضرت عبداللہ بن عمرؓ۔ ہمارے لئے تو یہ عیسائیوں کی تثلیث سے بھی زیادہ دشوار مسئلہ ہے۔ للہ اس مسئلہ کو حل فرما دیجئے۔

۷۔ شہربانو تو بقول آپ کے دریا میں ڈوب کر مریں، بچہ کی پیدائش کے وقت مریں یا خاوند کی لاش میدان میں چھوڑ کر بھاگ کھڑی ہوئیں۔ بقیہ دو کا حال معلوم نہیں ہوتا کہ وہ کہاں گئیں۔

۸۔ حضرت عبداللہ بن عمرؓ کے یہاں اس شہزادی سے کون سی اولاد ہوئی۔ تاکہ قارئین

۹۔ایک لڑکی حضرت حسنؓ کو دی گئی۔جس سے ایک لڑکا پیدا ہوا۔لیکن نہ تو اس لڑکے کا نام بیان کیا گیا۔اور نہ اُن سے سلسلۂ امامت چلایا گیا۔

۱۰۔یہ لڑکیاں بطور مالِ غنیمت تقسیم ہوئیں۔یا اُن کا نکاح ہوا۔پھر یہ نکاح عام لوگوں کے رُوبرو ہوا یا عالم خواب میں ہوا۔

۱۱۔کیا عالم خواب میں نکاح درست ہو سکتا ہے؟

۱۲۔کیا خواب میں ایمان قبول کرنے سے کوئی مومن بن جائے گا۔اگر اس کا جواب اثبات میں ہے تو پھر گرفتار کرنا،اور مدینہ یا کوفہ سے جانا ایک لغو حرکت ہوئی۔

۱۳۔کلینی نے علی بن حسین کی ماں کا نام سلامہ بتایا ہے۔سبائیوں کے نزدیک اس روایت کی کیا پوزیشن ہے؟کہیں یہ سلافہ کی ف کو میم سے تو نہیں بدلا گیا۔

۱۴۔جب علی بن حسین اس لڑکی کی اولاد تھے۔تو وہ اپنے والد کی باندی سلافہ کو کیسے ماں کہہ کر پکارتے رہے۔جیسے خود سبائیوں نے قبول کیا ہے۔یہ صورت کم عمری میں تو ممکن ہے۔لیکن بڑے ہونے کے بعد ممکن نہیں۔

۱۵۔حضرت حسینؓ کی شہادت کے بعد زین العابدین نے اپنی والدہ کا نکاح ایک شیعہ مومن سے کر دیا تھا۔لیکن ان لوگوں نے آج تک اُس شیعہ مومن کا اتا پتا تک نہیں بتایا پھر اُس دور تک شیعہ مومن صرف کوفہ میں بستے تھے۔یہ مدینہ میں کون سا مومن پیدا ہوا تھا جس کا یہ لوگ نام تک لینا پسند نہیں کرتے۔

۱۶۔حضرت علیؓ بقول ان کے نہایت شستہ فارسی بولتے تھے۔یہ فارسی انہوں نے کس سے سیکھی تھی۔یا بطور معجزہ انہیں حاصل ہو گئی تھی۔یا امام کے لئے فارسی جاننا ضروری ہے۔

۱۷۔مدینہ منورہ میں وہ منڈی کس جگہ واقع تھی جہاں لڑکیاں فروخت ہوتی تھیں۔یا صرف اس واقعہ کو وجود میں لانے کے لئے یہ منڈی وضع کی گئی۔

۱۸۔ایرانیوں کے سلسلہ میں جتنی سفارشات ہوتی ہیں۔وہ سب حضرت علیؓ کے حصہ

میں کیوں آتی ہیں۔

۱۹۔ یہ واقعات صرف اس لئے وضع کئے گئے کہ اسلام اور عربوں میں ایرانیت کو پھیلایا جائے۔ اور حضرت علیؓ اور اُن کی اولاد کا نام لے کر یا اُن سے کام لے کر اسلامی حکومت کا تختہ الٹا جائے۔ جیسا کہ بعد کے واقعات اسے ثابت بھی کرتے ہیں۔

۲۰۔ حضرت عمرؓ اتنے ظالم تھے کہ باوجودیکہ فارسی نہ جانتے تھے۔ چار سالہ بچی کو ایذا پہنچانے کے لئے تیار ہو گئے۔

۲۱۔ حضرت علیؓ اتنے بداخلاق تھے کہ امیرالمؤمنینؓ سے تو تیرا سے باتیں کر رہے ہیں اور ہر منزل پر انہیں ٹوکتے رہتے ہیں۔ وہ ایسا اگر عداوت کے باعث انجام دے رہے تھے۔ تو پھر امیرالمؤمنین اس لڑکی کو حضرت حسینؓ کو نہ دیتے۔ یا یہ حرکات کسی تعلق خاطر کے باعث کی جارہی تھیں؟

۲۲۔ یہ واقعہ خواہ حضرت عمرؓ کے زمانہ میں پیش آیا ہو یا حضرت عثمانؓ کے زمانہ میں بہرصورت جب حضرت عمرؓ نے ایک لڑکی حضرت حسینؓ، اور حضرت عثمانؓ نے ایک لڑکی حضرت حسنؓ اور ایک حضرت حسینؓ کو دی۔ اس عطا سے تو یہ ثابت ہوتا ہے کہ ان دونوں حضرات کو حضرت علیؓ اور ان کی اولاد سے بہت زیادہ اُنسیت تھی۔ کہ انہوں نے اپنے بیٹوں کو چھوڑ کر یہ لڑکیاں حضرت علیؓ کے بیٹوں کو دیدیں۔

۲۳۔ خراسان کے فاتح حضرت عبداللہؓ بن عامر اموی ہیں۔ یہ وہی صحابی ہیں جن کے باعث یہ سبائی اور ان کے ہم نوا حضرت عثمانؓ پر قرابت داری کے الزام قائم کرتے ہیں۔ حتیٰ کہ مودودی صاحب نے بھی سبائی کہانیاں نقل کر کے انہیں بدنام کرنے کی کوشش کی ہے۔ کیا اس کے پس پردہ یہ کینہ تو نہیں ہے کہ انہوں نے خراسان فتح کیا۔ اور اسی کینہ کے نتیجے میں پورے سو سال بعد ابومسلم خراسانی نے خلافت بنی امیہ کو ختم کیا۔ لیکن ہونا تو یہ چاہئے تھا کہ یہ سبائی برادری عبداللہؓ بن عامر کے گیت گاتے۔ نہ وہ ان لڑکیوں کو گرفتار کر کے بھیجتے اور

نہ علی بن الحسین کا ایرانیوں سے کوئی رشتہ پیدا ہوتا۔ یہ تو احسان فراموشی کی بدترین مثال ہے۔

۲۴۔ حضرت عبداللہؓ بن عامر نے یہ لڑکیاں حضرت عثمانؓ کے لئے بھیجی تھیں لیکن انہوں نے حسنؓ و حسینؓ کو دے کر اپنی محبت کا ثبوت پیش کیا۔ لیکن اس کے باوجود ان کی موت تک کی خوشی منائی جاتی ہے۔

۲۵۔ بھیرلوی صاحب اور شیخ مفید نے اس امر کو صحیح تسلیم کیا ہے کہ یہ دونوں لڑکیاں حضرت علیؓ کے زمانہ میں ۳۶ھ میں آئیں لیکن انہوں نے ان دونوں لڑکیوں کا انجام بیان نہیں کیا کہ وہ کہاں گئیں یا کیسے مریں۔ آخر اس میں کیا راز ہے؟

۲۶۔ حضرت علی نے ایک لڑکی ۳۶ھ میں محمد بن ابی بکر کو دی۔ ۳۷ھ میں اُن کا لڑکا قاسم پیدا ہوا۔ اور ۳۸ھ میں محمد بن ابی بکر قتل کر دیئے گئے۔ ان کے قتل کے بعد قاسم کی پرورش ان کی پھوپی ام المؤمنین حضرت عائشہؓ ہی نے فرمائی۔ آخر ان کی ماں یعنی گیہان بانو کہاں غائب ہو گئی تھیں۔ کیا ایرانی لڑکیوں کا یہی دستور رہا ہے کہ پہلوٹا بچہ پیدا کر کے گھر سے فرار ہو جائیں؟

۲۷۔ گیہان بانو محمد بن ابی بکر کو کس صلہ میں دی گئیں۔ یا سبائیوں نے اس خوشی میں اُن کے ہاتھ میں تھمائی کہ حضرت عثمانؓ کے خلاف جو سازش تیار ہوئی تھی اس کے ایک سرغنہ یہ بھی تھے۔ رہا قاسم سے پیار کا مسئلہ تو کیا وہ اس مجبوری کے باعث تو نہیں ہے کہ اُن کی لڑکی جعفر کی ماں تھیں۔

۲۸۔ کیا سبائی مسلک میں چار سال کی بچی بھی کسی پر عاشق ہو سکتی ہے۔ اس کا جواب اثبات و نفی میں سوچ سمجھ کر دیجئے۔

۲۹۔ بھیرلوی صاحب نے اپنی تحریر میں ایک مقام پر دو نئے جملے بطور تبرا استعمال کئے۔ لیکن ہمیں یقین ہے کہ ہمارے سنی بھائی ان جملوں کو سمجھ بھی نہ سکے ہوں گے۔ آیئے ہم ان دونوں جملوں کی ذرا وضاحت کر دیں کیونکہ یہ خالص سبائی جملے ہیں۔ یہ جملے یہ ہیں۔ نمک خوران

۱۔ خوت رئیس سقیفہ۔ ان جملوں کو سمجھنے کے لئے آپ تاریخ کے اس موڑ پر پہنچئے۔

کہ جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات ہوئی۔
اُس وقت اکثر اہل عرب مرتد ہو گئے تھے۔ خاندان بنی ہاشم حضرت علیؓ کی خلافت کے لئے حضرت فاطمہؓ کے گھر جمع تھا اور انصار مدینہ میں محلہ بنی ساعدہ کے ایک احاطہ میں جمع تھے اور اپنی خلافت کے مدعی تھے۔ حضرت ابوبکرؓ کو اس کی اطلاع ملی۔ وہ حضرت ابو عبیدہؓ حضرت عمرؓ اور حضرت عبداللہؓ بن مسعود کو ساتھ لے کر انصار کے پاس پہنچے۔ اور اُن سے گفتگو شروع کی۔ اور ان کے سامنے یہ بات بیان کی کہ چونکہ حضور بھی قریش سے تھے۔ لہٰذا خلافت قریش کا حق ہے۔ انصار نے اس بات کو قبول کر لیا۔ حضرت ابوبکرؓ نے اُن سے فرمایا۔ یہ ابو عبیدہؓ اور عمرؓ موجود ہیں۔ ان میں جس کی چاہو بیعت کر لو۔ لیکن عمرؓ نے آگے بڑھ کر ابوبکرؓ کی بیعت کر لی۔
اس واقعہ کو ذہن میں رکھے۔ اور پھر سوچئے یہ جملے کیسے ہیں۔ سبائیوں کے نزدیک حضرت علیؓ کو جو خلافت نہ مل سکی۔ اس کا سبب حضرت عمرؓ ہیں کہ نہ وہ ابوبکرؓ کی بیعت کرتے۔ اور نہ یہ خلافت علیؓ کے ہاتھ سے جاتی۔ لہٰذا رئیس سقیفہ سے مراد حضرت عمرؓ ہیں جن سنیوں نے یہ واقعہ وضع کر کے سبائیوں کی کتابوں میں شامل کیا ہے، وہ صرف رئیس سقیفہ یعنی حضرت عمرؓ کی عزت بڑھانے کے لئے کیا ہے۔ ورنہ ان سبائیوں کی تو اس واقعہ سے کوئی غرض و غایت نہ تھی۔ اور جو لوگ اس خلافت کو درست تسلیم کرتے ہیں۔ وہ نمک خواران سقیفہ ہیں۔ یعنی اہل سنت۔ اتنی دور کی کوڑی لانا یہ سبائیوں کا ہی کمال ہے۔ ہمارے سنی بھائی تو اپنی لاعلمی کے باعث ان باتوں کو سمجھنے پر بھی قدرت نہیں رکھتے۔ اور پھر بھی بھاگے بھاگے ان کی محفلوں میں پہنچ جاتے ہیں۔ اس طرح ان کے ذہنوں میں تشیع کا زہر مزید بھرتا رہتا ہے۔
الغرض اعتراضات کا ایک سیلاب ہے جو رکنے میں نہیں آتا۔ لیکن ہم سمجھتے ہیں کہ ہمارے قارئین کے لئے یہ بھی بہت ہے۔ اگر ہمارے لوگوں نے اتنی باتیں بھی ہضم کر لیں تو سمجھ لیجئے کہ ہماری محنت کارگر ہو گئی۔ اور ہم بھی آئندہ مزید کچھ لکھ سکیں گے۔

حضرت حسنؓ کی زہر خورانی کا قصہ

حضرت حسن رضی اللہ عنہ کے متعلق تمام کتب شیعہ اور کتب اہل سنت میں یہ واقعہ بڑی اندوہگیں داستاں کے طور پر بیان کیا گیا ہے کہ معاویہؓ اور یزید نے آپ کی زوجہ جعدہ بنت اشعث کے ذریعہ آپ کو زہر دلوادیا تھا۔ اور اسے لالچ یہ دیا تھا کہ یزید جعدہ سے شادی کرلے گا۔ لیکن زہر دینے کے بعد یزید نے صاف انکار کردیا۔

جن لوگوں نے یہ خرافات وضع کی ہیں۔ وہ سب اس پر تو متفق ہیں کہ حضرت حسنؓ نے مرتے وقت یہ فرمایا تھا کہ مجھے زہر دیا گیا۔ بلکہ ایک روایت میں فرمایا کہ مجھے بار بار زہر دیا گیا ہے۔ لیکن حضرت حسینؓ اور اُن کے خاندان کے اصرار کے باوجود یہ بتانے پر راضی نہیں ہوئے کہ انہیں کس نے زہر دیا۔ اور انہوں نے اس کا فیصلہ اللہ پر چھوڑ دیا۔ بلکہ حضرت حسینؓ کو یہ وصیت فرمائی۔

فانا اخاصمه الی اللہ تعالی	میں اس سے اللہ کے رُوبرو جھگڑوں
فبحقی علیك لا تکلمت فی	گا۔ میرا تجھ پر حق یہ ہے کہ تو اس سلسلہ
ذلك بشئ۔ الصواعق المحرقہ[1]	میں کوئی بات نہ کرے۔

لیکن کاش کوئی ابن حجر ہیتمی جیسے اشخاص سے یہ پوچھتا کہ حضرت حسنؓ نے جب خود یہ نہیں بتایا۔ اور اُن کے چھوٹے بھائی حضرت حسینؓ اور ان کے اہل خاندان کو زہر دینے والے کا علم نہیں تو کیا آپ کے پاس اس سلسلہ میں کوئی وحی آئی تھی جو آپ نے یہ فیصلہ دیدیا۔ بعینہ یہی کام سیوطی نے تاریخ الخلفاء میں کیا ہے۔ ان حضرات نے جو بلا سوچے سمجھے اور بلا ثبوت یہ فیصلے دیئے ہیں کیا یہ عند اللہ مقبول ہوسکتے ہیں۔ اور کیا دنیا کی کوئی عدالت اس طرح سُنی

سُنائی باتوں پر فیصلہ دے سکتی ہے کہ خاندان کا کوئی فرد نہ دعویٰ کرتا ہے۔ اور نہ کسی کا نام لیتا ہے۔ لیکن صدیوں بعد فیصلہ کرنے والے پیدا ہو جاتے ہیں۔ پھر یہ فیصلہ ہر تاریخی کتاب کی زینت بن جاتا ہے۔

اس سے قبل کہ ہم اس واقعہ پر کچھ تبصرہ کریں۔ سبائیوں کا یہ اصول ذہن میں رکھئے۔ کہ انہیں آل عمر اور خاندان بنی امیہ سے دلی بغض ہے۔ جس کی جانب ہم متعدد مقامات پر اشارے بھی کر چکے ہیں۔ اور ان حضرات کو بدنام کرنے کے لئے سبائیوں نے کوئی موقعہ ہاتھ سے نہیں گنوایا۔

ساتھ ساتھ یہ ذہن میں رہے کہ سبائیوں کے ہاں یہ ایک اصولی شے ہے کہ ان کے امام کو یا تلوار سے قتل ہونا ہے۔ یا زہر سے مرنا ہے۔ لہٰذا جو قتل ہو کر نہیں مرا۔ لازماً اس کی موت زہر سے واقع ہو گی۔ غالباً اسی لئے ان کے بارھویں امام بچپنے ہی میں بھاگ کھڑے ہوئے۔ کہ اگر میں قتل نہ کیا گیا تو مجھے زہر سے مارا جائے گا۔ اس کا ثبوت کہ ان کے امام ہمیشہ تلوار یا زہر سے مریں گے۔ ملا باقر مجلسی کی یہ روایت پیش خدمت ہے۔

اور فرمایا مجھے جناب رسول نے خبر دی ہے کہ بعد ان کے بارہ خلیفہ اور امام ہوں گے گیارہ امام فرزندان علیؓ و فاطمہؓ ہیں۔ اور یہ سب تیغ یا زہر سے شہید ہوں گے جلاء العیون ج ۲ ص ۲۹۸

ظاہر ہے کہ ان کے نزدیک اس روایت کی موجودگی میں یہ ممکن ہی نہیں کہ کوئی امام ان دو حال سے خالی ہو۔ لہٰذا جو امام تلوار سے قتل نہیں ہوا۔ وہ یقیناً زہر سے مرا ہے۔ تلوار سے قتل ہونے والے صرف دو امام ہیں۔ یعنی حضرت علی اور حضرت حسین۔ ایک امام زہر سے بچ کر بھاگ گئے۔ گویا کہ بقیہ نو اماموں کو زہر دیا گیا۔

لہٰذا جب یہ اصول طے پا گیا تو اب تو زبردستی بھی اس کے لئے زہر خورانی کی داستان تیار کرنا ہو گی۔ اتفاق سے جن اماموں نے دور اموی میں انتقال کیا۔ انہیں بنو امیہ نے زہر دیا۔ اور جنہوں نے دور عباسی میں انتقال کیا۔ انہیں بنو عباس نے زہر دیا۔ مثلاً موسیٰ کاظم اور

علی رضا کو مامون نے زہر دیا۔ حالانکہ علی رضا کے نکاح میں مامون کی بیٹی تھی۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ زہر کس نے دیا۔ اور کیوں دیا؛ ہمارے سنی حضرات تو ابھی تک یہ فیصلہ نہیں کر سکے کہ زہر دلوانے والا کون ہے۔ کچھ مؤرخین امیر معاویہؓ کا نام لیتے ہیں اور کچھ یزید کا۔ لیکن سبائی یہ جرم امیر معاویہؓ پر قائم کرتے ہیں۔ انہوں نے اس سلسلہ میں یزید کا قطعاً نام نہیں لیا۔ غالباً اس کی وجہ یہ ہے کہ حضرت حسنؓ کا انتقال امیر معاویہؓ کے زمانہ میں ۴۹ھ یا ۵۰ھ میں ہوا۔ یزید اُن کی وفات کے دس سال بعد اقتدار میں آیا۔ لہٰذا یزید پر اس لحاظ سے کوئی الزام قائم نہیں ہوتا۔ ہمارے سنیوں کا وہ طبقہ جو اس واقعہ کو تسلیم کرتا ہے لیکن اس کو منسوب یزید کی جانب کرتا ہے۔ اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ اس کا ذہن قبول کرنے کے لئے تیار نہیں کہ ایک صحابی رسول اس قسم کی حرکت کر سکتا ہے اور دوسری جانب اس نے شیعہ روایتوں کو وحی الٰہی تصور کر لیا ہے۔ لہٰذا انہوں نے واقعہ کو تو قبول کیا لیکن مجرم یزید کو گردانا۔

آیئے ہم سب سے پہلے اپنے قارئین کے سامنے ملا باقر مجلسی کے ذریعہ اس زہر خورانی کا تفصیلی واقعہ پیش کرتے ہیں۔ مجلسی صاحب لکھتے ہیں۔

ابن شہر آشوب نے جناب صادق سے روایت کی ہے۔ امام حسنؓ نے اپنے اہل بیت سے فرمایا۔ واضح ہو کہ میں زہر سے شہید ہوں گا۔ جس طرح جناب رسول خدا زہر سے شہید ہوئے۔ اہل بیت نے کہا کون آپ کو زہر دے گا۔ کہا میری کنیز یا میری زوجہ مجھے زہر دے گی۔ اہل بیت نے کہا اس ملعونہ کو اپنے ملک سے باہر کر دیجئے۔ حضرت نے فرمایا اسے کیوں کر باہر کر دوں، حالانکہ میری موت اسی کے ہاتھ سے ہوگی۔ اور اس سے چارہ نہیں، اور اگر اسے باہر کر دوں، بجز اس کے مجھے اور کوئی زہر نہ دے گا۔ ایسا ہی مقدر ہوا ہے۔

پس بعد تھوڑے زمانہ کے معاویہؓ نے زوجہ آنحضرت کے پاس زہر بھیجا۔ امام حسنؓ نے اپنی زوجہ سے پوچھا، تھوڑا دودھ کا شربت ہے۔ اس نے کہا ہاں ہے۔ پس وہ زہر جو

معاویہؓ نے بھیجا تھا دودھ میں ملا کر امام حسنؓ کو دیا جب حضرت نے نوش کیا۔ اپنے بدن میں اسی وقت زہر کا اثر دیکھا۔ فرمایا اے دشمن خدا تو نے مجھے مارا۔ قسم بخدا تجھے میرے مارنے کا عوض نہ ملے گا۔ اور تو معاویہؓ دشمن خدا سے ہرگز نفع نہ پائے گی۔ جلاء العیون ج ۱ ص ۳۶۶

اس روایت سے چند امور ظاہر ہوتے ہیں۔

۱۔ زہر دینے والی کا اس میں کوئی نام نہیں۔

۲۔ زہر دینے والی کوئی بیوی ہے یا کوئی باندی اس کا بھی کچھ علم نہیں۔

۳۔ یہ روایت جناب جعفر صادق سے مروی ہے۔ جو انہی خاندان کے ایک فرد ہیں۔ اور وہ زہر دینے والی کا نام بیان نہیں کرتے۔ لہٰذا یہ دعویٰ کہ جعدہ نے آپ کو زہر دیا تھا۔ یہ غلط ہوا۔

۴۔ حضرت حسن نے پہلے ہی دعویٰ کیا تھا کہ میں زہر سے شہید ہوں گا اور میری کنیز یا میری بیوی مجھے زہر دے گی اور اسے اپنے سے اس لئے جدا نہیں کر سکتا کہ میری موت زہر سے اسی کے ہاتھوں مقدر ہے۔ اور اس عورت سے بچنے کا کوئی ذریعہ نہیں۔ اور اگر میں اسے جُدا کر دوں گا تو مجھے زہر کون دے گا۔

لہٰذا زہر پلانے کے لئے اُس عورت کا میرا پاس رہنا ضروری ہے۔ کیونکہ کوئی اور مجھے زہر دے نہیں سکتا۔ اور میری موت زہر سے مقدر ہے۔ لہٰذا میرے لئے زہر پینا ضروری ہے۔ کیونکہ اگر میں نے زہر نہ پیا تو میں ہمیشہ زندہ رہوں گا۔ اور میری موت واقع نہ ہو سکے گی۔ تو پھر بقیہ دس امام کیسے ظہور میں آئیں گے۔ اور جب وہ ظہور میں نہ آئیں گے تو امام غائب کیسے غائب ہوں گے۔ اور پھر اس کے سلسلہ میں داستانیں کیسے وضع ہوں گی۔ لہٰذا میرا زہر پینا از بس ضروری ہے۔ اور تلوار کے ذریعہ میرا قتل نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ میں نے خود صلح کی ہے۔ اور خود تلوار کو ہاتھ سے رکھا ہے۔ قارئین کرام خط کشیدہ الفاظ کو ایک بار پھر غور سے پڑھئے۔ اور سوچئے کہ اسکے علاوہ کوئی اور نتیجہ اس عبارت کا نکل سکتا ہے اگر نکل سکتا ہو تو ہمیں ضرور آگاہ کر دیجئے گا ہم قارئین کے شکر گزار ہونگے۔

اب ایک اور روایت ملاحظہ کیجیے جو کلینی نے جناب صادق سے روایت کی ہے۔

کہ اشعث بن قیس جناب امیر (حضرت علیؓ) کے خون میں شریک تھا۔ اور اس کی دختر ابوجعدہ نے امام حسنؓ کو زہر دیا۔ اور بیٹا محمد خون حسینؓ میں شریک ہوا۔ جلاء العیون ج ۱ ص۳۶۰

پہلی روایت میں جناب صادق نے کسی مجرم کا نام نہیں بتایا تھا۔ اس روایت میں تین مجرم گنا دیے گئے۔ کہ جعدہ نے حضرت حسنؓ کو زہر دیا۔ اس کے باپ اشعث بن قیس حضرت علیؓ کے قتل میں شریک ہوئے۔ اور جعدہ کا بیٹا محمد خون حسینؓ میں شریک ہوا۔

اس روایت میں یہ عجیب لطیفہ پایا جاتا ہے کہ کلینی نے جعدہ کے بجائے اشعث کی بیٹی کا نام ابوجعدہ بیان کیا ہے۔ حالانکہ ابو کے معنیٰ باپ کے آتے ہیں۔ یعنی جعدہ کا باپ۔ پھر یہ دختر کیسے ہوئی۔ یعنی ان کی لغت میں باپ اور بیٹی ہم معنیٰ ہیں۔

اب جناب صادق کی ایک اور روایت بھی ملاحظہ کیجیے۔ جو قطب راوندی نے نقل کی ہے۔

امام حسنؓ نے اپنے اہل بیت سے فرمایا۔ میں مثل رسول خدا زہر سے شہید ہوں گا۔ اہل بیت نے کہا کون شہید کرے گا۔ امام حسنؓ نے فرمایا۔ میری زوجہ جعدہ بنت اشعث بن قیس مجھے زہر دے گی۔ اور معاویہؓ اس کے پاس پوشیدہ زہر بھیجے گا۔ اور حکم دے گا وہ مجھے زہر پلا دے۔ اہل بیت نے کہا اس کو اپنے گھر سے نکال دیجیے۔ اور اپنے پاس سے علیحدہ کر دیجیے۔ حضرت نے فرمایا کیوں کر اسے گھر سے نکال دوں۔ حالانکہ ابھی کوئی فعل واقع نہیں ہوا۔ اور اگر اسے نکال بھی دوں، تو بغیر اس کے مجھے اور کوئی زہر نہ دے گا۔

پس بعد ایک مدت کے معاویہؓ نے زہر ہلاہل اور بہت سا مال جعدہ پاس بھیجا۔ اور کہا کہ اگر یہ زہر امام حسن کو پلا دے گی۔ تو میں تجھ کو سو ہزار درہم دوں گا۔ اور اپنے فرزند یزید سے تیرا عقد کروں گا۔

ایک روز امام حسنؓ روزے سے تھے۔ اور گرمی بشدت تھی، اور وقت افطار آنحضرت بہت پیاسے تھے۔ جعدہ ملعونہ حضرت کے لئے دودھ کا شربت لائی۔ اور وہ زہر اس میں

ملا دیا تھا۔ جب امام حسن نے وہ شربت نوش فرمایا۔ اور فرمایا اے دشمن خدا تو نے مجھے مارا۔ خدا تجھے مارے۔ قسم بخدا خلق میں کسی کو مجھ سے بہتر نہ پائے گی۔ معاویہ نے تجھے فریب دیا۔ خدا تجھے اور معاویہ کو اپنے عذاب سے معذب کرے۔ پس دو روز امام حسن درد و الم میں زندہ رہے۔ اور بعد اس کے اپنے جد بزرگوار اور پدر عالی مقدار سے ملے۔ اور معاویہؓ نے اس ملعونہ سے اس عہد پر وفا نہ کی۔ بروایت دیگر انعام اس ملعونہ کو نہ دیا اور یزید سے تزویج نہ کیا۔ اور کہا جس نے امام حسنؓ سے بھی وفا نہ کی وہ میرے فرزند سے بھی وفا نہ کرے گی۔

جلاء العیون ج ۱ ص ۳۶۷

یہ تینوں روایتیں جناب صادق سے مروی ہیں اور تینوں میں زبردست تضاد ہے جن کا رفع ہونا بھی ممکن نہیں۔ ہاں ان روایات سے یہ بات ضرور سامنے آتی ہے کہ حضرت حسن کو پہلے سے یہ علم تھا کہ مجھے زہر دیا جائے گا۔ وہ زہر دینے والے سے بھی واقف تھے، اور دلوانے والے سے بھی۔ لیکن اس کے باوجود وہ جعدہ کو اپنے سے جدا کرنے کے لئے تیار نہ تھے کیونکہ جعدہ کے بغیر ان کی موت ممکن نہ تھی۔ اور اس ناممکن کو ممکن ہر صورت میں بنانا تھا۔ ورنہ وہ ہمیشہ کے لئے دنیا میں باقی رہتے۔ لہٰذا اس لئے اسے پاس رکھنا ضروری تھا۔ بالفاظ دیگر آپ خود اس بات کے خواہاں تھے کہ جعدہ آپ کو زہر دے۔ ورنہ تقاضائے عقل تو یہ تھا کہ جہاں آپ تین سو عورتوں کو طلاق دے سکتے تھے۔ وہاں اسے بھی طلاق دے کر علیحدہ کر دیتے۔ تاکہ یہ خطرہ ٹل جاتا۔ یہ تو ایک قسم کی خودکشی ہوئی۔

ہم تو ان روایات کو پڑھنے کے بعد اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ حضرت حسن کو جعدہ بنت اشعث سے انتہا سے زیادہ پیار تھا۔ انہوں نے دنیا جہاں کی عورتوں کو طلاق دی۔ لیکن اگر طلاق نہیں دی تو جعدہ کو نہیں دی۔ سبائیوں کو یہ کیسے گوارا ہو سکتا تھا کہ ابوبکر صدیق کی بھانجی سے اس پیار و محبت کا اظہار ہو۔ لہٰذا اس طبقہ نے انہیں بدنام کرنے کی ٹھان لی۔ اور ان کے ساتھ امیر معاویہؓ سے بھی اپنا دیرینہ بغض نکال لیا۔

یہ روایتیں جناب جعفر بن محمد پر جا کر ختم ہو جاتی ہیں۔ جب کہ جناب جعفر ۸۳ھ میں پیدا ہوئے۔ اور یہ واقعہ ۵۰ھ کا ہے۔ یعنی ان کی پیدائش سے تیس سال قبل کا۔ اوپر کے راوی کہاں غائب ہیں۔ اور جناب جعفر سے نقل کرنے والے، ابن شہر آشوب اور راوندی وغیرہ ان کی وفات کے صدیوں سال بعد وجود میں آئے۔ اور کلینی تیسری صدی میں پیدا ہوا۔ جب کہ جناب جعفر ۱۴۸ھ میں انتقال کر چکے تھے۔

جب حضرت حسنؓ یہ بات جانتے تھے کہ اُن کی موت زہر کے بغیر نہ ہوگی۔ جو ایک سبائی اصول ہے۔ ایسی صورت میں سبائیوں کا امیر معاویہؓ اور جعدہ کا احسان مند ہونا چاہیئے کہ انہوں نے اس اصول کو عمل میں لانے کے لئے راہ ہموار کی۔ اگر وہ ایسا نہ کرتے تو حضرت حسنؓ ہمیشہ زندہ رہتے اور یہ طبقہ نہ صرف دس اماموں سے محروم رہ جاتا بلکہ کربلا کی کہانی بھی وجود میں نہ آتی کیونکہ حضرت حسنؓ ہرگز بھی حضرت حسینؓ کو اس بات کی اجازت نہ دیتے۔ کہ وہ امام وقت کے خلاف کوئی اقدام کریں۔ لہٰذا یہ لازم تھا کہ وہ زہر پیئیں۔ اور وہ بھی جعدہ بنت اشعث کے ہاتھوں۔ اور بقیہ اماموں کے لئے راہ ہموار کریں۔

یہ بھی ذہن نشین رہے کہ ان روایات کو نقل کرنے والے سب ایران اور عراق وغیرہ کے باشندہ ہیں۔ انہیں گھر بیٹھے ساری روداد کا علم ہو جاتا ہے۔ لیکن مدینہ کا کوئی باشندہ اس قسم کی کوئی کہانی نقل نہیں کرتا، اس لئے کہ واقف ہی نہیں ہوتا۔

اب کلینی کی ایک اور روایت ملاحظہ ہو۔

کلینی نے بسند معتبر روایت کی ہے کہ جعدہ دختر اشعث نے امام حسنؓ کو زہر دیا۔ اور کنیزان آنحضرت میں سے ایک کنیز کو بھی زہر دیا۔ اس کنیز نے قے کی اور اچھی ہو گئی۔ اور امام حسنؓ کے شکم میں وہ زہر رہ گیا۔ اور جگر کو پارہ پارہ کر ڈالا۔

کتاب احتجاج میں روایت کی ہے کہ ایک شخص امام حسنؓ کی خدمت میں آیا اور کہا

...... ہماری گردنوں کو آپ نے ذلیل کیا۔ اور ہم شیعوں کو غلام بنی امیہ بنایا۔ حضرت نے فرمایا کیوں کر۔ اُس نے کہا اس وجہ سے کہ خلافت آپ نے معاویہ کو دیدی۔ حضرت نے فرمایا۔ قسم بخدا میں نے کوئی ناصر دیاور نہ پایا۔ اگر میں ناصر ویاور پاتا رات دن معاویہ سے جنگ کرتا۔ یہاں تک کہ خدا میرے اور اس کے درمیان حکم کرتا۔ لیکن میں نے اہل کوفہ کو پہچانا اور امتحان کیا۔ اور جان لیا کہ یہ لوگ میرے کام نہ آئیں گے۔ اور ان کے عہد و پیمان پر وفا اور ان کے گفتار و رفتار پر اعتماد نہیں۔ ان کی زبانیں میرے ہمراہ اور ان کے دل بنی امیہ کے ساتھ ہیں۔

یہ باتیں حضرت کر ہی رہے تھے۔ ناگاہ خون حلق مبارک سے جاری ہوا۔ پس آپ نے طشت منگایا۔ وہ طشت خون سے بھر گیا۔ راوی نے کہا یا ابن رسول اللہ یہ خون کیسا ہے۔ حضرت نے فرمایا معاویہؓ نے زہر بھیجا تھا۔ اور وہ مجھے کھلا دیا ہے۔ وہ زہر میرے جگر میں پہنچا۔ اور یہ ٹکڑے میرے جگر کے ہیں۔ جو طشت میں گرے ہیں۔ میں نے کہا یا حضرت کچھ دوا کیجیئے۔ امام حسنؓ نے فرمایا۔ اس سے قبل مجھے دو مرتبہ زہر دیا تھا۔ اور یہ تیسری دفعہ زہر دیا ہے۔ اس دفعہ قابل دوا نہیں۔

معاویہؓ نے بادشاہ روم کو لکھا تھا کہ زہر کشندہ بھیج دے۔ بادشاہ روم نے اسے لکھا کہ ہمارے مذہب میں جائز نہیں۔ کہ جو ہم سے نہ لڑیں۔ ہم اس کے قتل پر اعانت کریں۔ معاویہؓ نے لکھا میں جس شخص کو اس زہر سے مارنا چاہتا ہوں۔ وہ اُس شخص کا فرزند ہے جو مکہ میں ظاہر ہوا۔ اور دعویٰ پیغمبری کیا۔ اب اُس نے خروج کیا ہے۔ اور اپنے پدر کی بادشاہی طلب کرتا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ یہ زہر اسے کھلا دوں اور خلائق کو راحت پہنچاؤں۔ اور ہدایا و تحائف اس کے لئے بھیجے۔ پس بادشاہ روم نے یہ زہر بھیجا۔ اور اس زہر کے عوض میں عہد و شرائط اس سے لئے۔ جلاء العیون ج ۱ ص ۳۶۷۔

اس روایت کو پڑھنے کے چند نئے پہلو سامنے آتے ہیں۔

۱۔اس داستان کے آخری حصہ کا ابتدائی حصہ سے کوئی تعلق نہیں۔

۲۔شیعان علی اور اہل کوفہ حضرت امیر معاویہؓ اور حضرت حسنؓ ہر دو سے بغض رکھتے تھے۔حضرت حسنؓ سے اس لئے کہ انہوں نے امیر معاویہؓ سے صلح کی۔اور اس اختلاف کو جو پانچ سال سے چلا آرہا تھا ختم کیا۔اور ملتِ اسلامیہ کو از سرِنو ایک پلیٹ فارم پر جمع کیا۔جس کے نتیجہ میں سبائی اور ایرانی سازش ناکام ہوئی۔اسی ناکامی کو دیکھتے ہوئے شیعان علیؓ نے حضرت حسنؓ کو تخت پر سے دھکا دیا۔اُن کی ران میں نیزہ مارا۔اُن کے خیمے کو آگ لگائی۔انہیں ذلیل و رسوا کیا۔انہیں مُسَوِّدُ وجوہ المؤمنین (مؤمنوں کے چہروں کا سیاہ کرنے والا) اور مذل المؤمنین (مؤمنوں کو ذلیل کرنے والا) جیسے ذلیل کن خطابات دیئے۔

۳۔حضرت حسنؓ کے نزدیک یہ تمام لوگ بے ایمان، دھوکہ باز اور غدار تھے، ان کے عہد و پیمان پر کسی قسم کا اعتبار نہیں کیا جا سکتا تھا۔بظاہر تو یہ حب اہلِ بیت کے دعویدار تھے۔لیکن بباطن بنی امیہ کے ساتھ تھے۔گویا یہ حافظ شیرازی کے بقول۔با مسلماں اللہ اللہ با برہمن رام رام کے قائل تھے۔جب کہ اس کے برعکس حضرت حسنؓ کو امیر معاویہؓ پر اعتماد تھا۔اگر اُن پر اعتماد نہ ہوتا تو ہرگز بھی صلح نہ کرتے۔

۴۔یہ کہانی بیان کرنے والا بھی ایک عراقی ہے۔جس کا نام و پتہ کچھ معلوم نہیں۔ہاں یہ اپنی زباں سے دعویٰ ضرور کر رہا ہے کہ وہ حضرت حسنؓ کے اس فعل سے ناراض ہے۔حتیٰ کہ آپ کے مرض الموت میں اپنی طعن و تشنیع سے باز نہیں آرہا ہے۔ہم تو ایسی صورت میں یہ سمجھتے ہیں کہ حضرت حسنؓ کو اگر زہر دیا گیا۔تو لازماً وہ اُن غداروں نے دیا ہوگا جو حضرت حسنؓ کے دشمن تھے۔جنہوں نے انہیں زخمی کیا۔اور موت کی کشمکش کے وقت بھی انہیں ذلیل کرنے پر تلے ہوئے ہیں۔

۵۔یہ طبقہ امیر معاویہ کو کافر و بے دین تصور کرتا ہے اور اس روایت کے ذریعے یہ ثابت کیا گیا ہے کہ امیر معاویہؓ حضورؐ کے دشمن تھے۔اسی لئے آپ کی اولاد کو زہر دیا۔لیکن اپنی

حماقت سے یہ بھی ظاہر کر رہا ہے کہ حضرت حسنؓ نے امیر معاویہ کے خلاف بغاوت کی۔ اور اپنی کھوئی ہوئی سلطنت واپس لینی چاہی۔ اس لئے یہ زہر دیا گیا۔ حالانکہ اگر وہ بغاوت کرتے یا خلافت کے خواہاں ہوتے تو انہیں صلح کرنے کی کیا ضرورت پیش آئی تھی۔ اور ان سے ناراضگی کی وجہ بھی یہی ہے۔ اسی لئے ان کی اولاد سے امامت چھینی گئی۔ اور دنیا کے کسی فرد واحد نے آج تک یہ دعوی نہیں کیا کہ حضرت حسنؓ نے صلح کے بعد کوئی بغاوت کی ہو۔

۶۔ بقول راوی زہر قیصر روم سے طلب کیا گیا جس کے نتیجے میں باہم خط و کتابت ہوئی اور عہد و پیمان ہوئے۔ اور اُس زہر نے قسطنطنیہ سے دمشق تک اور دمشق سے مدینہ تک مہینوں کا سفر طے کیا۔ اور سبائیوں کے علاوہ کسی کو پتہ نہ چل سکا۔ نہ کسی شامی کو اس کی خبر ہوئی اور نہ کسی اہل مدینہ کو۔ حالانکہ اتنے عرصہ میں یہ بات پر لگا کر پوری مملکت اسلامیہ میں پھیل جاتی۔ لیکن حیرت یہ ہے کہ حضرت حسنؓ کے خاندان اور اہل مدینہ تک کو خبر نہ ہوئی۔ ہوئی تو ایک ایسے عراقی کو ہوئی جو حضرت حسنؓ کا دشمن تھا۔ لیکن اس کا نام و پتہ کسی کو معلوم نہیں۔

۷۔ قیصر روم سے زہر منگانے کا مقصد یہ ہے کہ راوی یہ دعوی کرنا چاہتا ہے کہ مملکت اسلامیہ میں زہر کا کہیں وجود نہ تھا۔ حالانکہ اس وقت مملکتِ اسلامیہ کابل و مکران تک پھیلی ہوئی تھی۔ اور ساسانی دورِ حکومت میں زہر خورانی کے قصے عام تھے اور سبائیوں کے لئے ایران سے زہر منگا لینا کوئی دشوار نہ تھا۔ اس کے لئے قیصر روم سے خط و کتابت کی کیا ضرورت تھی۔ اس کام کے لئے تو یہودی بھی کافی تھے جو عراق میں بستے تھے۔ اور جنہوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی زہر دیا تھا۔ گویا سبائیوں کے لئے اس کا حصول بہت آسان اور امیر معاویہؓ کے لئے دشوار تھا۔ ہمارے نزدیک یہ قیصر کی کہانی اس لئے وجود میں لائی گئی کہ امیر المؤمنین امیر معاویہؓ نے قسطنطنیہ پر حملے کے لئے اپنے بیٹے یزید کو لشکر دے کر بھیجا تھا۔ اور اس جہاد میں حضرت حسینؓ نے یزید کی ماتحتی میں شرکت کی تھی۔ اس کے پیچھے نماز پڑھتے رہے۔ سبائی اس بھائی چارے اور محبت کو کیسے برداشت کرتے۔ لہٰذا انہوں

نے بیہ معاویہؓ کے ساتھ قیصر کو بھی گھسیٹ لیا۔

۸۔ یہ زہر خورانی کا واقعہ صرف ایک بار نہیں۔ بلکہ اس روایت کی رُو سے تین بار، اور ایک روایت کی رُو سے چھ بار، اور ظہور الحسن صاحب بھربلوی کے بقول۔ حضرت حسنؓ نے حضرت علیؓ کی شہادت کے بعد تین سو نکاح کئے۔ لیکن ہر ایک کو اس لئے طلاق دینی پڑی کہ معاویہؓ نے بہکا کر ان عورتوں کو زہر دینے پر آمادہ کر لیا تھا۔ اس طرح تین سو بار زہر دینے کی کوشش کی گئی۔ سبحان اللہ آخر اس کی وجہ کیا ہے کہ کوئی عورت حضرت حسنؓ سے نکاح کرنے کے باوجود اُن کی جانب راغب نہیں ہوتی۔ بلکہ دوسروں کے اشارے پر انہیں زہر دینے پر آمادہ ہو جاتی ہے۔ کیا امیر معاویہؓ ان تین سو عورتوں کو یزید کے نکاح میں دینا چاہتے تھے؟ یا کوئی زنانہ فورس تیار کرنی تھی اور اتنے تجربات کے باوجود حضرت حسنؓ جعدہ کو چھوڑنے پر رضا مند نہ تھے۔ بلکہ اس کے ہاتھ سے برضا و رغبت زہر کھانے کے لئے تیار تھے۔ کیونکہ اس کے بغیر ان کی موت واقع نہ ہوتی۔ اور جب اُن کی موت واقع نہ ہوتی تو بارہ اماموں کا فارمولا کیسے وجود میں آتا۔ لہٰذا ضروری تھا کہ انہیں زہر دیا جائے خواہ وہ زہر ایک داستان کے طور پر ہی سہی۔ دراصل یہ طبقہ اس کا قائل ہے کہ جھوٹ اس حد تک بولو کہ لوگ اسے سچ ماننے پر مجبور ہو جائیں۔

اب ایک اور روایت کتاب کفایہ سے ملاحظہ کر لیجئے۔ ملا باقر مجلسی لکھتے ہیں۔

کتاب کفایہ میں بسند معتبر جنادۃ بن ابی امیہ سے مروی ہے کہ جس مرض میں امام حسنؓ نے دنیا سے رحلت کی میں حضرت کی خدمت میں گیا۔ دیکھا کہ سامنے طشت رکھا ہے۔ اور حضرت جگر کے ٹکڑے اس میں اگل رہے ہیں۔ میں نے کہا اے میرے مولا۔ آپ اس کا کیوں علاج نہیں کرتے۔ حضرت نے فرمایا۔ اے بندۂ خدا موت کا علاج کس چیز سے کر سکتے ہیں۔ جلاء العیون ج ۱ ص ۳۶۸

یہ کافی طویل داستان ہے۔ اس میں حضرت حسنؓ کے پند و نصائح بیان کئے گئے ہیں

لیکن اس روایت میں زہر دینے کے سلسلے میں ایک لفظ بھی موجود نہیں۔ امیر معاویہؓ یا جعدہ کا کیا تذکرہ ہوتا۔ یہ روایت اس کا ثبوت ہے کہ حضرت حسنؓ کا انتقال مرض سے ہوا۔ نہ کہ زہر سے اور بقول ملا باقر یہ بسند معتبر مروی ہے۔ اگرچہ سبائیوں کے ہاں ہر روایت بسند معتبر ہوتی ہے کوئی غیر معتبر سند سے مروی نہیں ہوتی۔ پہلی روایات بھی بسند معتبر مروی تھیں۔ اور یہ بھی بسند معتبر مروی ہے۔ لیکن اس روایت سے یہ ضرور ثابت ہو گیا کہ حضرت حسنؓ کا انتقال کسی مرض میں ہوا۔ اور ایسا مرض جس میں منہ سے خون آتا ہو اور وہ مرض سل ہے اور مرض بھی کافی عرصہ رہا۔ جس کی خبر شام تک پہنچی۔ اور وہاں سے جنادۃ بن ابی امیہ عیادت کے لئے آئے۔ یعنی یہ مرض کئی ماہ تک قائم رہا۔ کیوں کہ شام تک خبر پہنچنے کے لئے بھی ایک عرصہ چاہیئے اور پھر دمشق سے مدینہ آنے تک۔ ہم یہ بات اس لئے کہہ رہے ہیں کہ سبائی راوی نے اپنی نادانی سے جنادۃ بن ابی امیہ کا نام لیا ہے۔ جنادۃ بن ابی امیہ نام کے دو شخص ہیں اور دونوں شام میں سکونت پذیر تھے۔ جن میں سے ایک صحابی رسول تھے۔ اور ایک تابعی تھے اور دونوں امیر معاویہؓ کے ساتھی تھے۔ گویا شامیوں اور صحابہ و تابعین کے نزدیک حضرت حسنؓ کا انتقال مرض سل میں ہوا۔ زہر خورانی کے قصے تو صرف سبائی داستانیں ہیں۔

اب ایک اور روایت ملاحظہ کیجیے جو کتاب کشف الغمہ میں عمرو بن اسحاق سے مروی ہے۔ کہ میں ایک شخص کے ہمراہ عیادت امام حسنؓ کو گیا۔ حضرت نے فرمایا جو چاہو مجھ سے سوال کرو۔ میں نے کہا قسم بخدا سوال نہ کروں گا جب تک خدا آپ کو صحت نہ عطا فرمائے۔ حالت صحت میں آپ سے سوال کروں گا۔ پس اٹھ کر میں کسی کام کو چلا گیا اور پھر حاضر ہوا۔ حضرت نے فرمایا مجھ سے سوال کرو۔ قبل اس کے کہ سوال کا موقعہ نہ پاؤ۔ میں نے عرض کی۔ خدا جب آپ کو صحت عطا کرے گا۔ اس وقت میں سوال کروں گا۔ حضرت نے فرمایا اس وقت میرے جگر کا ٹکڑا کٹ کر گر پڑا۔ مجھے کئی مرتبہ زہر دیا تھا اور کسی دفعہ کا زہر ایسا نہ تھا۔ جب دوسرے روز میں حضرت کی خدمت میں گیا۔ دیکھا حضرت کا وقت آخری

ہے۔امام حسینؓ سرہانے بیٹھے ہیں۔امام حسینؓ نے پوچھا اے برادر بزرگوار آپ کا گمان اس زہر دینے میں کس کی طرف ہے۔امام نے فرمایا کیوں پوچھتے ہو۔آیا منظور ہے کہ اسے قتل کرو۔کہا ہاں یہی غرض ہے۔امام حسن نے کہا اگر وہ ہے جس کی طرف میرا گمان ہے۔پس عذاب خدا اس کے لئے عقوبت دینے سے سخت تر ہے اور اگر وہ نہیں تو میں نہیں چاہتا کہ کوئی میری وجہ سے بے گناہ مارا جائے جلاء العیون ج ۱ ص ۳۶۹۔

یعنی منہ سے خون آنے کے باعث حضرت حسنؓ کو یہ گمان پیدا ہوا کہ انہیں کسی نے زہر دیا۔اور یہ بھی صرف ایک گمان تھا یقین نہ تھا۔اسی لئے وہ زبان سے کسی کا نام لینے پر تیار نہ تھے کہ بلا ثبوت کسی پر فرد جرم عائد کی جائے۔اور وہ قتل ہو اور ایک بے گناہ کے قتل کا گناہ حضرت حسنؓ یا ان کے چھوٹے بھائی کے ذمہ واقع ہو۔اور جب انہوں نے کسی کا نام نہیں لیا تو صدیوں بعد یہ نام سبائیوں کو کیسے معلوم ہوئے؟ اور اُن کا تو صرف گمان ہی گمان تھا لیکن بعد کے لوگوں نے اسے بالیقین کیسے بیان کر دیا۔

جہاں تک زہر دینے کے سلسلہ میں قتل کا تعلق ہے۔تو اگر اس سے مراد امیر معاویہؓ ہیں۔تو اُن کے قتل پر حضرت حسینؓ تو کجا تمام بنی ہاشم بھی قدرت نہ رکھتے تھے۔اور اگر اس سے مراد جعدہ ہیں۔تو بے شک حضرت ابوبکر صدیقؓ کی بھانجی کو قتل تو کیا جا سکتا تھا۔لیکن اُن کے قصاص میں جو تلوار نکلتی تو مدینہ منورہ میں دوسری جنگ جمل کا نقشہ کھینچ جاتا کیونکہ بنو ہاشم کے خلاف بیک وقت دو خاندانوں کی تلواریں نکل آتیں۔جعدہ کے باپ کا خاندان اور ماں کا خاندان یعنی ام المؤمنین عائشہؓ اور خاندان بنی تیم۔اس سلسلہ میں کون کون سے خاندان کے کتنے افراد کی جانیں جاتیں۔اس کا علم تو اللہ ہی کو ہے۔اسی لئے حضرت حسنؓ نے کسی کا نام نہیں لیا۔اور سبائیوں کو بھی تین سو سال بعد نام لینے کی جرأت ہوئی۔اس کا الہام بھی سب سے پہلے مسعودی المتوفی ۳۴۶ھ کو ہوا۔یہ وہ دور ہے کہ جب بنو بویہ بغداد پر قابض ہو گئے تھے۔اور خلافت ان کے اشاروں پر ناچ رہی تھی۔یہ بنو بویہ کٹر رافضی تھے۔انہوں نے کھلے عام

صحابہ پر تبرا کرایا۔ محرم کے جلوس کی بنیاد انہوں نے رکھی۔ موجودہ مشہد حسین اور مشہد علی انہوں نے ہی تعمیر کرایا۔ انہوں نے مساجد کے دروازوں پر امیر معاویہ اور دیگر صحابہ پر لعنت لکھوائی۔ امیر معاویہؓ اور جعدہ کو بدنام کرنے کے لئے اس سے بہتر موقعہ کون سا فراہم ہو سکتا تھا۔ لہٰذا مسعودی نے جو خود بھی ایک رافضی تھا۔ اس کی بنیاد رکھ دی۔ اور بعد کے مصنفین نے اس پر مزید حاشیہ آرائی شروع کر دی۔ قارئین خود ہی اندازہ کر سکتے ہیں کہ یہ روایات کتنی باہم متضاد ہیں۔ ہم نے صرف ایک کتاب جلاء العیون سے یہ روایات نقل کی ہیں۔ اور اس پر بھی غور کیجئے کہ یہ واقعہ ۴۹ھ یا ۵۰ھ کا ہے۔ جب کہ مسعودی کا انتقال ۳۴۶ھ میں ہے۔ گویا تین سو سال تک کسی کو اس کی خبر نہ تھی کہ حضرت حسنؓ کو زہر دیا گیا۔

اب ملا باقر مجلسی کی زبانی ایک اور روایت بھی ملاحظہ فرما لیجئے۔

روایت کی ہے کہ جب وقت وفات امام حسنؓ مجتبیٰ آیا۔ فرمایا مجھے صحرا میں لے چلو۔ کہ میں اطراف آسمان پر نظر کروں جب آپ کو صحرا میں لے گئے فرمایا۔ خداوندا میں اپنی جان کو کہ عزیز ترین جانوں کی میرے نزدیک ہے۔ اسے میں نے تیری رضا میں دیا۔ اور اپنے قصاص سے تیری رضا کے لئے درگزرا۔ کہ کسی کو میرے لئے قصاص کریں۔

اس سے پہلی حدیث میں یہ فرمانا کہ میں نہیں چاہتا کہ کوئی بے گناہ میری وجہ سے مارا جائے۔ اس کا صاف مطلب پچھلی حدیث میں بیان فرما دیا۔ کہ میں جانتا ہوں قاتل کو مگر رضائے خدا کے لئے قصاص نہیں لیتا۔ اگر وہ چاہے تو ضرور خود میرے خون ناحق کا قصاص لے گا۔ جلاء العیون ج ۱ ص ۳۷۰

شیخ مفید، شیخ طوسی و دیگر علماء نے ابن عباسؓ سے روایت کی ہے کہ معاویہ نے جعدہ سے دو ہزار درہم اور بہت سے مواضعات حلہ و کوفہ کا وعدہ کیا تھا۔ اور اس کے پاس زہر بھیجا کہ امام حسن کے طعام میں ملا دے۔ جب جعدہ ملعونہ طعام امام حسن کے سامنے لائی اور بروایت دیگر بعد تناول فرمانے کے امام حسن نے کہا انا للہ و انا الیہ راجعون

......اے برادر میں نے اپنا جگر طشت میں دیکھا اور جانا کہ کس نے یہ کام کیا ہے۔ اور اصل اس کی کہاں سے ہوئی ہے؟ اگر میں تم سے کہوں تم اس کے ساتھ کیا کرو گے۔ امام حسینؓ نے فرمایا قسم بخدا میں اس کو قتل کروں گا۔ یہ سن کر امام حسنؑ علیہ السلام نے فرمایا میں تم سے وہ خبر نہ کہوں گا۔ یہاں تک کہ میں اپنے نانا رسول خدا سے ملاقات کروں گا۔ جلاء العیون ص۴۲۷ ج۱

یعنی حضرت حسنؓ تو زہر دینے والے کا نام بتانا نہیں چاہتے۔ اور نہ بتایا بلکہ اللہ کی رضا کے لئے اسے معاف کیا۔ کیونکہ وہ صرف گمان پر قصاص لینا یا کسی کا نام لینا پسند نہیں کرتے تھے۔ لیکن شیخ مفید اور شیخ طوسی صاحب نے چھ سو سال بعد یہ حقیقت معلوم کر لی کہ وہ کون افراد تھے۔ اس لئے کہ انہیں علم باطن حاصل تھا۔ کیونکہ طوسی باطنیہ گروہ سے تعلق رکھتا تھا۔ جو تاریخ میں قرامطہ اور فدائین کے لقب سے مشہور ہوا۔ یہ وہ طبقہ ہے جو آج اسمٰعیلیوں کے نام سے مشہور ہے۔ جب ہلاکو خاں نے قرامطہ کے گڑھ کو ختم کیا۔ تو طوسی اس کا مشیر بن گیا اور اسے بغداد پر چڑھا لایا۔ تاریخ میں جو بغداد کی تباہی مشہور ہے اس کے سرغنہ یہی حضرت تھے۔ جو خلافت عباسیہ کے خاتمہ کا سبب بنے۔ یہ لوگ چھٹی صدی کی پیداوار ہیں۔

ان تمام روایات کو پڑھنے کے بعد جو نتائج ہمارے سامنے آتے ہیں۔ ہم اس کا خاکہ قارئین کے سامنے پیش کئے دیتے ہیں۔

۱۔ حضرت حسنؓ کو امیر معاویہؓ کے کہنے سے جعدہ بنت اشعث نے زہر دیا۔ اور سو ہزار درہم اور یزید سے نکاح اس کا معاوضہ قرار پایا لیکن معاویہؓ نے کوئی معاوضہ نہیں دیا۔ یعنی اگر وہ جعدہ کو معاوضہ دیدیتے تو ان سبائیوں کا دل ٹھنڈا ہو جاتا۔ انہیں غم زہر دینے کا نہیں ہے۔ بلکہ معاوضہ نہ ملنے اور یزید سے نکاح نہ ہونے کا ہے۔

۲۔ اس زہر دینے پر صرف دو ہزار اور کچھ سواضعات دینے کا وعدہ کیا گیا تھا۔ یزید سے نکاح کا کوئی معاہدہ نہ تھا۔ یزید سے نکاح کی کہانی صرف ابن ابی الحدید نے نقل کی ہے۔

۳۔عام روایت ہے کہ زہر شربت میں دیا گیا۔طوسی وغیرہ کی روایت ہے کہ کھانے میں دیا گیا۔

۴۔ایک بار زہر دیا گیا۔یا تین بار، یا چھ بار یا تین سو بار۔

۵۔زہر مملکت اسلامیہ میں نہیں پایا جاتا تھا۔لہٰذا قسطنطنیہ سے قیصر روم کے پاس سے درآمد کیا گیا۔

۶۔زہر دینے کی جتنی روایات ہیں اس کے ناقل تیسری صدی کے بعد کے لوگ ہیں۔

۷۔حضرت حسنؓ کا انتقال زہر سے نہیں ہوا۔مرض سل میں ہوا۔اور کئی ماہ بیمار رہے۔

۸۔زہر دینے کے بعد صرف ایک دن بقول بعض دو دن اور بقول بعض چند دن زندہ رہے۔

۹۔حضرت حسنؓ کو اہل عراق سے نفرت تھی۔وہ انہیں بے وفا، غدار، دھوکے باز اور بکاؤ مال تصور کرتے تھے۔

۱۰۔اہل عراق کو حضرت حسنؓ سے نفرت تھی۔کیونکہ انہوں نے امیر معاویہؓ سے صلح کر کے امت میں اتحاد پیدا کیا تھا۔جس کے نتیجہ میں سبائی اور مجوسی سازش ناکام ہو کر رہ گئی۔

۱۱۔حضرت حسنؓ اور اہل عراق کی باہمی نفرت کو دیکھتے ہوئے یہ اندازہ لگانا دشوار نہیں۔کہ اگر حضرت حسنؓ کو زہر دیا گیا تو پھر زہر دینے والے یہی حضرات ہیں۔نہ کہ امیر معاویہؓ اور جعدہ بنت اشعث۔

امیر معاویہؓ کے سلسلہ میں ان کی جانب بدگمانی اسی وقت کی جاسکتی ہے۔جب کہ اس صلح کے بعد حضرت امیر معاویہؓ کے حضرت حسنؓ سے تعلقات انتہا سے زیادہ کشیدہ ہو گئے ہوں۔اور باہمی نفرت وعداوت پیدا ہو چکی ہو۔اگر ایسا ہے تو اس کے اسباب کیا تھے؟ ہم جب اس لحاظ سے اس پر غور کرتے ہیں تو ہمیں تاریخ میں جو کچھ نظر آتا ہے۔وہ ہم اپنے قارئین کے سامنے پیش کئے دیتے ہیں۔لیکن اس سے قبل ابن ابی الحدید شارح نہج البلاغہ کا ایک قول پیش کرنا بہت ضروری ہے کیونکہ اس سے حقیقت حال واضح ہو جائیگی۔ابن ابی الحدید لکھتے

مشہور شیعہ عالم ہیں۔ جنہوں نے نہج البلاغہ کی شرح لکھی ہے۔ وہ لکھتے ہیں :۔

ان اصل الاکاذیب فی احادیث	فضائل کی احادیث میں اصل جھوٹ
الفضائل کان من جھة	شیعوں کی جانب سے شروع ہوا۔
الشیعة فانھم وضعوا فی	کیونکہ انہوں نے ابتدائی دور میں
مبدء الامر احادیث مختلفة	اپنے ساتھی (یعنی حضرت علی) کی
فی صاحبھم حملھم علی وضعھا	فضیلت میں مختلف احادیث وضع
عداوة خصومھم۔ شرح	کیں جس کی وجہ اپنے دشمنوں کی
ابن ابی الحدید ص۴۸۳ ج ۱۔	عداوت تھی (اور دشمنوں کی عداوتیں)

مثل مشہور ہے کہ گھر کا بھیدی لنکا ڈھائے۔ ابن ابی الحدید نے یہ تسلیم کر لیا۔ کہ شیعوں نے امیر معاویہؓ اور دیگر صحابہ کی عداوت میں دل کھول کر جھوٹ بولا۔ اور روایتیں وضع کی ہیں۔ لہٰذا خود ان کے عالم کے بقول ان کی بیان کردہ کسی روایت پر اعتماد نہیں کیا جا سکتا اسی لئے تو ان روایات میں اتنا تضاد پایا جاتا ہے۔

اب آئیے اس موضوع پر کہ امیر معاویہؓ اور حضرات حسنین کے باہمی تعلقات کیسے تھے۔ حافظ ابن کثیر لکھتے ہیں۔

فلما استقرت الخلافة	جب امیر معاویہ کیلئے خلافت قائم
لمعاویة کان الحسین یتردد	ہو گئی۔ تو حضرت حسین اپنے بھائی
الیہ مع اخیہ الحسن	حضرت حسن کے ساتھ امیر معاویہ
فیکرمھما معاویة	کے پاس جاتے اور معاویہ ان کی انتہا
اکراما زائدا ویقول لھما	سے زیادہ تکریم کرتے۔ انہیں مرحبا کہتے
مرحبا واھلا ویعطیھما	اور بڑے بڑے انعامات دیتے حتیٰ
عطاء جزیلاً وقد اطلق لھما یوم	کہ ایک ایک وقت میں انہیں بیس بیس -

واحد مائتی الف - البدایۃ والنہایۃ ج ۲ صفہ ۱۵ | لاکھ پیش کرتے۔

علامہ ابن کثیر نے متعدد جگہ ان گراں قدر وظائف و عطیات کا ذکر کیا ہے جو امیر المومنین معاویہؓ حضرت حسنؓ و حسینؓ اور دیگر بنی ہاشم کو دیا کرتے تھے۔ زید بن الحباب کی روایت ہے۔

تـدم الحسن بن علی علی	حضرت حسنؓ بن علی امیر معاویہؓ کی
معاویۃ فقال لہ لاجیزنك	خدمت میں گئے۔ انہوں نے فرمایا
بجائزۃ لم یجزھا احد کان	میں آج تمہیں اتنا بڑا عطیہ دوں گا کہ پہلے
قبلی فاعطاہ اربعمائۃ الف	کسی نے بھی نہ دیا ہو گا۔ پھر امیر معاویہؓ
الف و وفد الیہ الحسن و	نے اُن کی خدمت میں چالیس لاکھ پیش
الحسین فاجازھما علی الفور	کئے۔ اور جب بھی حضرت حسنؓ اور حضرت
بمائتی الف الف۔	حسینؓ ان کے پاس جاتے وہ ان دونوں
ا البدایۃ والنہایۃ ج ۸ صفہ ۱۳۷	کو بیس بیس لاکھ پیش کرتے۔

حضرت حسنؓ کی وفات کے بعد حضرت حسینؓ بدستور امیر المومنین معاویہ کی خدمت میں ہر سال تشریف لے جاتے اور عطیات حاصل کرتے۔ حافظ ابن کثیر کا بیان ہے۔

ولما توفی الحسن کان	جب حضرت حسنؓ کی وفات ہو گئی
الحسین یفد الی معاویۃ	تو حضرت حسینؓ ہر سال امیر معاویہؓ
فی کل عام فیعطیہ و	کے پاس جاتے۔ وہ ان کے ساتھ عزت سے
یکرمہ۔ البدایۃ والنہایۃ ج ۸ صفہ ۱۵۱	پیش آتے اور مال پیش کرتے۔

ابن ابی الحدید جس کا ذکر پہلے آچکا ہے۔ شرح نہج البلاغہ میں اُن عطایا کا ذکر کیا ہے جو امیر المومنین امیر معاویہؓ حضرات حسنؓ و حسینؓ اور دیگر بنی ہاشم کے اکابر کو دیا کرتے تھے۔

ومعاویۃ اول رجل فی الارض	اور معاویہ روئے زمین پر سب سے

وھب الالف وابنہ یزید	پہلے شخص ہیں جنہوں نے لوگوں کو
اول من ضاعف ذلك كان	دس دس لاکھ عطا کئے ۔ اور ان کے
یجیز الحسن والحسین بن علی	صاحبزادے یزید سب سے پہلے
فی كل عام لكل واحد	وہ شخص ہیں جنہوں نے اس تعداد
منهما بالف الف درهم و	کو دگنا کیا ۔ وہ حضرت حسنؓ ، حضرت
كذلك كان يجيز عبد الله	حسینؓ ، حضرت عبداللہ بن عباسؓ
بن عباس وعبد الله بن	اور حضرت عبداللہ بن جعفرؓ کو ہر سال
جعفر ۔ شرح ابن ابی الحدید ج ۲ ص ۸۲۳	دس دس لاکھ عطا کرتے ۔

اور تو اور ابو مخنف جیسا غالی رافضی جس نے کربلا کی داستانیں وضع کیں ، اس نے بھی اس امر کی تصریح کی ہے کہ حضرت امیر معاویہؓ حضرت حسینؓ کو ہدایا کے علاوہ دس دس لاکھ دینار سالانہ بھیجا کرتے تھے ۔ وہ کہتے ہیں ۔

وكان معاوية يبعث اليه	امیر معاویہ ہر سال حضرت حسین
(الحسين) فی كل سنة	کو دس دس لاکھ دینار بھیجتے ۔ اور اس
الف الف دينار سوى الهدايا	کے علاوہ ہر قسم کے ہدایا بھیجتے رہتے ۔
من كل صنف ۔ مقتل ابی مخنف ص ۔	

ان روایات سے یہ بات ثابت ہوگئی کہ امیر معاویہؓ اور حضرات حسنؓ و حسینؓ کے باہمی تعلقات بہت ہی عمدہ تھے ۔ اور امیر معاویہؓ انہیں سال عطا کرتے ۔ اور ان کے علاوہ ان کے صاحبزادے یزید کا بھی یہی سلوک تھا ۔ حضرت حسنؓ کی وفات کے بعد حضرت حسینؓ ہر سال دمشق جاتے رہے ۔ امیر معاویہؓ انہیں ہدایا کے علاوہ دس دس لاکھ پیش کرتے ۔ امیر المومنین یزید کا بھی یہی دستور تھا اور جس سال حضرت حسینؓ دمشق نہ جاتے تو امیر معاویہؓ ان کی خدمت میں یہ عطیہ مدینہ بھیجتے ۔ امیر المومنین معاویہؓ اور ان کے صاحبزادے یزید کا یہ سلوک

حضرات حسنؓ و حسینؓ کے علاوہ حضرت عبداللہ بن عباسؓ اور حضرت عبداللہ بن جعفرؓ کے ساتھ بھی تھا اور یہ دونوں افراد خاندان بنی ہاشم کے سربرآوردہ افراد تھے۔ ایسی صورت میں یہ دعویٰ کہ امیر معاویہؓ نے حضرت حسنؓ کو زہر دیا۔ ایک کھلے جھوٹ کے علاوہ اور کیا ہو سکتا ہے؟ اور اگر ایسا کوئی واقعہ پیش آیا تھا۔ اور حضرت حسینؓ اور دیگر ہاشمیوں کو اس کا علم تھا تو یہ کیسے امیر معاویہؓ کی خدمت میں حاضریاں دیتے رہے اور کس طرح ان سے وظائف وصول کرتے رہے۔ آخر ان حضرات کی حمیت و غیرت کہاں چلی گئی تھی؟ کیا سبائی ٹولہ یہ ثابت کرنا چاہتا ہے کہ امیر معاویہ تو قاتل تھے ہی۔ لیکن خاندان بنی ہاشم کے یہ تینوں سربرآوردہ افراد اتنے بے غیرت اور لالچی تھے۔ کہ اپنے بھائی کو مروا کر بھی پیسہ حاصل کرتے رہے۔ استغفر اللہ ربی من کل ذنب واتوب الیہ۔

اس قسم کی ذہنیت کسی ایرانی، مجوسی اور یہودی کی تو ہو سکتی ہے۔ لیکن عربوں کے بارے میں یہ سوچنا بھی اُن کی تاریخ کو مسخ کر دینے کے مترادف ہے۔ جن لوگوں میں ایک ایک قتل کے پیچھے صدیوں جنگیں چلی ہوں۔ کیا اس قسم کی فطرت صرف نصف صدی میں مسخ ہو کر رہ جائے گی۔ یہ فطرت اس قوم کی ہو سکتی ہے جو ہزارہا سال تک ساسانی بادشاہوں کے دسترخوان چاٹتی رہی۔ اور جنہوں نے ان بادشاہوں کی خوشنودی کے لئے مانی مذہب اختیار کر لیا جس میں ماں بہنیں بھی حلال تھیں۔ جو آج تک عید غدیر کی شکل میں موجود ہے۔

اب ہم حکیم علی احمد عباسی صاحب کی تحقیق قارئین کے سامنے پیش کرنا چاہتے ہیں۔

حضرت امیر معاویہؓ کی ذات پر سبائیوں کی جانب سے جو اعتراضات کئے جاتے ہیں اُن کا ایک کتابی صورت میں رد تحریر کیا۔ اس کتاب کا نام ہے۔ "امیر معاویہ کی سیاسی زندگی" اس کا مقدمہ مولوی احتشام الحق صاحب مرحوم نے لکھا۔ یہ کتاب ۱۹۶۳ء میں شائع ہوئی۔ لیکن سبائیوں کے اشارے پر چند ہی دن بعد ضبط کر لی گئی۔ اور آج تک ضبط ہے۔ حکیم صاحب ایک محقق عالم ہیں۔ اور تاریخ پر گہری نظر رکھتے ہیں۔ آیئے آپ حضرات بھی اُن کی تحریر

کے مزے لوٹئے۔ حکیم صاحب لکھتے ہیں۔

صحابۂ کرام اور اہل بیت اطہار کی راہ سے ہٹ کر چلنے والوں نے جہاں اور قسم قسم کی باتیں سلف صالحین کے متعلق وضع کی ہیں۔ وہاں ایک یہ بھی ہے کہ آپ کو امیر المؤمنین معاویہؓ کے اشارے سے زہر دیا گیا تھا۔ جس سے آپ نے وفات پائی۔ بعض لوگ اس کو ایک دوسرے رنگ میں پیش کرتے ہیں۔ چنانچہ علامہ سیوطی نے تاریخ الخلفاء میں لکھا ہے۔

توفی الحسن رضی اللہ عنہ	حضرت حسن کی وفات مدینہ میں زہر
بالمدینۃ مسموما سمتہ	سے ہوئی۔ یہ زہر انہیں جعدہ بنت
زوجتہ جعدۃ بنت الاشعث	اشعث بن قیس نے دیا تھا۔ اور
بن قیس دس الیہا یزید	یزید نے اسے یہ بہکایا تھا کہ اگر تو
بن معاویۃ ان تسم	حسن کو زہر دے دیگی تو وہ اس سے
فتیزوجہا ففعلت فلما	نکاح کرلے گا۔ جب حضرت حسن کی
مات الحسن بعثت الی یزید	وفات ہوگئی۔ تو جعدہ نے وفا کا
تسالہ الوفاء بما وعدھا	مطالبہ کیا۔ لیکن یزید نے جواب دیا
فقال لم نرضک بالحسن	ہم تو تیرے حسن کی زوجیت میں رہنے
افنرضک لانفسنا۔	پر راضی نہ تھے۔ تو اپنی ذات کیلئے
تاریخ الخلفاء از مصری ص۱۴۲	تجھے کیسے پسند کرسکتے ہیں۔

اب ان صاحب سے پوچھا جائے کہ اتنی تفصیلات جب انہیں معلوم ہیں تو سیدنا حسین رضی اللہ عنہ کو بھی معلوم ہوں گی۔ بلکہ سیدنا حسنؓ کو بھی اور سب اہل بیت اور صحابہ کرام اس سے واقف ہوں گے کہ آپ کو زہر دیا گیا، فلاں شخص نے دیا ہے اور فلاں مقصد سے دیا ہے۔ چنانچہ اب دو ہی صورتیں ہیں۔ یا تو سیدنا حسن اور اہل بیت کو یہ باتیں معلوم تھیں۔ اور قاتل کو معاف کر دیا گیا تو پھر اس کا تذکرہ کیوں؟ اور اگر معلوم نہیں تھیں

تو بعد کے لوگوں پر یہ راز کیسے کھل گیا؟

تیسری صورت یہ ہو سکتی ہے کہ یہ بات معلوم تھی اور معاف بھی نہیں کی گئی، تو پھر قاتل کے خلاف کیا کاروائی کی گئی؟ کوئی ادنیٰ سے ادنیٰ اور ضعیف سے ضعیف بلکہ کوئی موضوع روایت بھی ایسی نہیں جس سے معلوم ہو کہ سیدنا حسینؓ نے زہر خورانی کا مقدمہ امیر مروان (کیونکہ وہ اس وقت مدینہ کے گورنر تھے یا امیر معاویہؓ) کی عدالت میں پیش کیا تھا۔ اور اس سلسلہ میں یہ کاروائی ہوئی تھی۔ یعنی سیدنا مروان اور اموی خلفاء چونکہ اہل بیت کے ازلی دشمن تھے۔ اس لئے یہ مقدمہ خارج کر دیا گیا۔

اگر ایسی کوئی بات نہیں تو پھر یہ تسلیم کرنا پڑے گا۔ کہ یہ سب بعد کی وضع کی ہوئی باتیں ہیں۔ اہل بیت کو ان میں سے کسی بات کا علم نہ تھا۔ اور انہوں نے سیدنا حسن رضی اللہ عنہ کی وفات کو مکمل طور پر طبعی سمجھا۔ اسی لئے قطعاً کسی قسم کی کوئی کاروائی نہیں ہوئی۔ اور نہ کسی پر انہوں نے زہر خورانی کا شبہ کیا۔

دائرہ معارف اسلامیہ اردو کے مقالہ نگار نے لکھا ہے کہ آپ کی وفات مرض سل میں واقع ہوئی تھی۔ یہ خیال درست معلوم ہوتا ہے۔ سیدنا حسن کے متعلق محقق ہے۔ کہ آپ خوشبو کا استعمال بہت کرتے تھے۔ حتی کہ جدھر سے گزر جاتے تھے۔ مدینہ کی گلیاں مہک اٹھتی تھیں۔ ہو سکتا ہے کہ آپ کو نزلہ ہوا ہو۔ اور احتیاط نہ کرنے سے بگڑ گیا ہو۔ یہ جو روایتوں میں منہ سے خون آنے کا ذکر ہے۔ اس کی یہی وجہ ہو سکتی ہے۔

پھر ہمیں یہ بھی دیکھنا چاہیئے کہ امیر المومنین یزید کے ساتھ اہل بیت کا برتاؤ کیا تھا۔ اگر اس قسم کا کوئی شبہ ان حضرات کو ہوتا تو انہیں سیدنا حسنؓ کی وفات کا قصہ یاد آتا۔ اور ان کی ہمدردیاں اُن سے اٹھ جاتیں۔ لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ یہ حضرات بغاوت اہل مدینہ (واقعہ حرہ) سے محض الگ ہی نہیں رہے۔ بلکہ انہوں نے امیر المومنینؓ کی طرف سے مدافعت کی۔ اور اُن کے کردار پر حرف رکھنے والوں کو جھٹلایا۔ انہیں متبع سنت اور متلاشی خیر باور کرایا۔ اور

دین کی بنیاد پران کے خلاف خروج کو حرام جانا پھران کی وفات کے بعد نہ اُن لوگوں سے واسطہ رکھا جو خون حسینؓ کا نام لے کر کھڑے ہوئے تھے۔ اور نہ حضرت ابن الزبیرؓ کا ساتھ دیا جو اُموی خلافت کے طاقت ور مخالف تھے۔

پھر ہمیں یہ نظر نہیں آتا۔ کہ جو لوگ خون حسینؓ کا بدلہ لینے کھڑے ہوتے تھے۔ انہوں نے امیر المؤمنین یزیدؒ کے فرضی جرائم میں سیدنا حسنؓ کو زہر دینا بھی شامل کیا ہو، اور اپنے پروپیگنڈے میں کسی جگہ اشارۃً بھی اس جرم کو بیان کیا ہو۔ کیسے تعجب کی بات ہے کہ بعد کے مؤرخوں کو اس زہر خورانی کے تمام واقعات اور تفصیلات کا علم ہے لیکن نہ ہم عصر لوگ اس سے واقف تھے۔ اور نہ اُن کے فوراً بعد آنے والے۔ حضرت معاویہ کی سیاسی زندگی ص ۳۵۵

حکیم صاحب کی تحریر نے ہمارے ذہن کو کسی اور جانب متوجہ کر دیا ہے۔ حکیم صاحب نے سیوطی کے حوالے سے جو روایت نقل کی ہے۔ اس کا آخری جملہ انتہا سے زیادہ غور طلب ہے کہ یزید نے یہ جواب دیا کہ ہم تو تجھے حسن کے لئے بھی پسند نہ کرتے تھے تو اپنے لئے کیسے پسند کر سکتے ہیں۔ گویا معاملہ زہر خورانی کا نہیں تھا۔ بلکہ قصہ تو صرف اتنا تھا کہ یزید یہ پسند نہ کرتا تھا کہ جعدہ حضرت حسنؓ کے نکاح میں رہے۔ لہٰذا ہونا تو یہ چاہئے کہ اگر جعدہ اس لائق نہ تھی کہ وہ حضرت حسنؓ کے نکاح میں رہے تو حضرت حسنؓ کو اسے طلاق دینے کا مشورہ دیا جا سکتا تھا۔ جب وہ تین سو عورتوں کو طلاق دے سکتے تھے۔ تو جعدہ کے سلسلہ میں آخر کیا بات پیدا ہوئی تھی کہ وہ اسے اپنے سے جُدا کرنے کے لئے تیار نہ تھے۔ اب ذرا ابن حجر ہیثمی المتوفی ۹۷۲ھ کے خیالات بھی ملاحظہ فرما لیجئے۔ ابن حجر ہیثمی لکھتے ہیں۔

وکان سبب موتہ ان زوجتہ	حضرت حسن کی موت کا سبب یہ ہے
جعدۃ بنت الاشعث بن	کہ جعدہ بنت اشعث بن قیس الکندی
قیس الکندی دس الیھا	نے انہیں زہر دیا۔ اسے یزید نے حکم دیا
یزید ان تسمہ ویتزوجھا	تھا کہ وہ حسن کو زہر دیدیں تو وہ اُن

وبذل طعاماتہ الف درھم	سے نکاح کرے گا اور ایک لاکھ درہم
ففعلت فمرض اربعین	اس کے پاس بھیجے۔ اس نے یزید کے
یوما فلما مات بعثت	کہنے پر عمل کیا۔ حضرت حسنؓ چالیس
الی یزید تسالہ الوفأ	دن بیمار رہے۔ جب ان کا انتقال
بما وعدھا فقال	ہوگیا۔ تو جعدہ نے یزید سے وعدہ
لھا انا لم نوضك للحسن	نباہنے کو کہا۔ اس نے جواب دیا
فنرضا لك لا نفسنا۔ و	ہم تو تجھے حسن ہی کے لئے پسند نہ
بموتہ مسموما شھید	کرتے تھے۔ اب اپنے لئے کیسے پسند
اجزم غیر واحد من	کر سکتے ہیں۔ حضرت حسن کی موت زہر
المتقدمین کقتادۃ و	سے شہید ہوکر ہوئی۔ متقدمین سے
ابی بکر بن حفص والمتاخرین	قتادہ اور ابوبکر بن حفص اور متاخرین میں
کالزین العراقی فی مقدمۃ	سے حافظ عراقی کا قول یہی ہے۔ جیسا
شرح التقریب۔	کہ انہوں نے شرح تقریب کے مقدمہ
	میں لکھا ہے۔

تقریباً یہی بات سیوطی نے لکھی تھی۔ لیکن ہماری سمجھ میں یہ بات نہیں آتی کہ سبائی تو امیر معاویہؓ کا نام لیتے ہیں۔ اور سنی یزید کا۔ حالانکہ یزید اس وقت برسراقتدار نہ تھا۔ اور نہ اسے حضرت حسنؓ سے کوئی خطرہ لاحق ہو سکتا تھا۔ جب ابن الاوندی کی روایت کو من وعن قبول کیا گیا تو اس نام میں ترمیم کی کیا ضرورت پیش آگئی تھی۔

اس روایت سے بھی یہی اندازہ ہوتا ہے کہ معاملہ زہر دینے کا نہیں تھا۔ بلکہ یزید جعدہ کا ان کے نکاح میں رہنا پسند نہ کرتا تھا۔ سوال یہ ہے کہ جب ایک لاکھ جعدہ کو دیا گیا تھا۔ اور حضرت حسنؓ اسے طلاق دینا نہیں چاہتے تھے تو خود خلع طلب کر لیتی اسی طرح

معاملہ صفائی کے ساتھ حل ہو جاتا۔

ابن حجر ہیثمی نے آگے یہ بھی تحریر کیا ہے کہ حضرت حسین رضی اللہ عنہ نے حضرت حسن رضی اللہ عنہ سے بہت اصرار کیا کہ زہر دینے والے کا نام بتایئے۔ لیکن انہوں نے نام بتانے سے انکار کر دیا جب حضرت حسن رضی اللہ عنہ نے انکار کر دیا تو کیا ابن حجر ہیثمی کے پاس کوئی فرشتہ اس کی خبر لے کر آیا تھا کہ یہ یزید اور جعدہ کی حرکت ہے۔ حالانکہ قرآن کا حکم ہے۔

الا من شھد بالحق وھم — مگر جو شخص حق کی شہادت دے اور

یعلمون ○ — وہ جانتے بھی ہوں۔

یہ بغیر علم کے ناحق شہادت کس بل بوتے پر دی جا رہی ہے۔ ہم تو یہ سمجھنے پر مجبور ہیں کہ ان لوگوں کے ذہنوں کو سبائی روایات نے اتنا ماؤف کر دیا ہے کہ ان حضرات کو ہی آنکھ کا شہتیر بھی نظر نہیں آتا۔

پھر ابن حجر کا دعوی یہ ہے کہ متقدمین میں سے اسکے قائل قتادہ ہیں۔ اور متاخرین میں سے حافظ زین الدین عراقی۔ جہاں تک قتادہ کا معاملہ ہے تو اول تو ہماری نظر سے ان کا قول نہیں گزرا۔ کیا خبر وہ بھی بلا سند ہو، دوسرے قتادہ حضرت حسن رضی اللہ عنہ کی وفات کے بہت زمانہ بعد پیدا ہوئے۔ اُن کا انتقال ۱۱۸ھ میں ہے۔ جب تک وہ اس کی سند بیان نہ کریں تو اُن کے قول کی کیا حیثیت ہو سکتی ہے۔ اور قتادہ کے بعد کن حضرات نے اس واقعہ کو نقل کیا۔ ابن حجر ہیثمی نے کسی کا نام نہیں لیا۔ بلکہ سیدھے زین الدین عراقی پر پہنچ گئے۔

جہاں تک حافظ عراقی کا تعلق ہے تو انہوں نے تمام لوگوں کی جانب سے ایک اصول بیان کر دیا ہے۔ وہ فرماتے ہیں۔

ولیعلم الطالب ان السیرا — ما صح وما قد انکرا

(طالب علم کو جان لینا چاہیئے کہ سیرت کی کتابوں میں صحیح و منکر ہر قسم کی روایات جمع کی جاتی ہیں)

لہٰذا دستور یہ رہا ہے کہ سیرت و تاریخ کے معاملہ میں کوئی تحقیق نہیں کی جاتی تصور وار تو ہم ہیں کہ ہم نے ان لغویات کی تحقیق شروع کر دی۔ ہم اس موقعہ پر اُن سنی حضرات کے اسمار گرامی پیش کرنا چاہتے ہیں جنہوں نے یہ واقعہ تحریر کیا۔ یا اس سلسلہ میں ان کا نام لیا گیا۔

۱۔ قتادہ بن اعامہ المتوفی ۱۱۷ھ۔

۲۔ حافظ ابو الفضل زین الدین عبدالرحیم بن الحسین العراقی المتوفی ۸۰۶ھ

۳۔ حافظ شہاب الدین ابو الفضل احمد بن علی المعروف با بن حجر عسقلانی المتوفی ۸۵۲ھ

۴۔ جلال الدین ابو الفضل عبدالرحمان بن الکمال السیوطی المتوفی ۹۱۱ھ

۵۔ ابو العباس شہاب الدین احمد بن محمد بن علی المعروف با بن حجر ہیثمی ۹۷۴ھ

اس خاکہ کو دیکھنے کے بعد یہ نقشہ سامنے آتا ہے۔ کہ قتادہ کے علاوہ بقیہ تمام افراد نویں اور دسویں صدی کے افراد ہیں۔ گویا نویں صدی تک سنی اس کے قائل نہ ہوئے تھے۔ سینوں میں تو یہ کہانی نویں صدی کے بعد مشہور ہوئی۔ اور خاص طور پر اس کی وجہ سیوطی ہیں۔ کیونکہ ہمارے ہندو پاکستان کے تمام علماء یہ سمجھتے ہیں کہ سیوطی کی تاریخ الخلفاء کا مطالعہ کر لینے کے بعد مزید تاریخ کی کسی کتاب کے مطالعہ کی ضرورت نہیں۔ گویا ہماری تاریخ اسلام صرف ایک کتاب پر ختم ہو جاتی ہے۔ جو دسویں صدی میں وجود میں آئی۔

ہیثمی نے یہ دعویٰ کیا ہے کہ حضرت حسنؑ اس زہر کھانے کے بعد چالیس دن علیل رہے۔ ہم اس کی تفصیل اوپر بیان کر چکے ہیں لیکن اُس وقت تک دنیا جس زہر سے روشناس تھی۔ وہ سانپ کا زہر تھا جس سے انسان کی موت چند لمحات میں نہ سہی لیکن چند گھنٹوں میں یقینی تھی۔ آخر یہ سلو پائیزن کہاں سے آ گیا تھا جس کے بعد حضرت حسنؑ چالیس روز تک حیات رہے۔ اور بعض روایات کے مطابق دو ماہ۔ سلو پائیزن کی صورت میں انسان کو زہر کا احساس نہیں ہو سکتا۔ اور تیز زہر کی صورت میں زیادہ سے زیادہ دو چار خون کی الٹیاں ہو جانے کے بعد زندگی ختم ہو جاتی ہے۔ یہ چالیس دن یا دو ماہ تک انسان مرض

رسل ہی میں خون تھوک سکتا ہے۔

اب ذرا منہ کا مزا بدلنے کے لئے حکیم فیض عالم صدیقی شہید کے خیالات بھی ملاحظہ فرمالیں

حضرت حسن رضی اللہ عنہ کے متعلق شیعوں کی تمام کتب اور سنیوں کی اکثر کتب میں یہ واقعہ بڑی اندوہ گیں داستان کے طور پر بیان کیا گیا ہے کہ معاویہؓ اور یزید نے آپ کی زوجہ جعدہ بنت اشعث کے ذریعہ آپ کو زہر دلوایا تھا۔ باقی چھوٹی داستانوں اور من گھڑت روایتوں کی طرح اس داستان پر وہ حاشیہ آرائیاں کی گئی ہیں کہ الاماں۔ اور عجیب بات یہ ہے کہ کسی نے نہیں لکھا کہ یہ روایت چلی کہاں سے ہے۔

ایک بار ابوجعفر منصور عباسی نے محمد مہدی الحسنی (نفس ذکیہ) کے خروج کو فرو کرنے کے بعد ایک مجمع عام میں تقریر کرتے ہوئے کہا تھا کہ علیؓ خلیفہ ہوئے تو اس میں وہ خون سے لت پت ہو گئے۔ پھر ان ہی کے مددگار شیعوں نے اُن پر یورش کی اور انہیں قتل کر دیا۔ اُن کے بعد حضرت حسنؓ خلیفہ ہوئے مگر وہ اس میدان کے مرد ہی نہ تھے۔ انہیں روپیہ پیش کیا گیا تو وہ خلافت سے دستبردار ہو کر عورتوں سے تمتع کرنے میں مصروف ہو گئے۔ (ماخوذ از طبری)

زہر خورانی کی داستان سراسر جھوٹ اور کذب ہے۔ میرے خیال میں ابوجعفر منصور نے جس انداز سے حضرت حسنؓ کا ذکر کیا ہے۔ اس سے بھی تو قلبی بغض اور عناد کی بو آتی ہے۔ (یہ بھی تو ممکن ہے کہ یہ خطبہ طبری کے راویوں نے تیار کیا ہو، یا اُس میں نمک مرچ ملایا ہو) منصور کے بھائی نے مجمع عام میں یہ کہنے سے بھی گریز نہ کیا تھا کہ خلافت ہمارا حق تھا سو ہم کو مل گیا اور غاصبوں کو اللہ تعالیٰ نے رسوا کیا۔

شیعوں نے سیدہ جعدہ پر اس لئے تہمت لگائی کہ وہ حضرت صدیق اکبرؓ کی بھانجی تھیں، "ہمارے عام مقررین اور واعظین" اس لئے اس من گھڑت روایت کو لے اڑے کہ وہ اکثر امور اور نظریات میں شیعوں کے ہم نوا ہیں۔

حضرت حسنؓ جتنا پر امن، صلح کن اور آرام طلب آدمی جس نے خود ہی سب کچھ معاویہؓ کے سپرد کر دیا تھا۔ ایسے آدمی کو زہر دینے کی کسی کو کیا ضرورت تھی؟ حضرت حسنؓ البتہ عورتوں کی صحبت کے دلدادہ تھے۔ مدائنی کہتا ہے کہ آپ نے نوے نکاح کئے۔ ابن سیرین نے ایک دفعہ بیان کیا کہ ایک خاتون سے نکاح کیا تو سو کنیزوں کے ذریعہ اسے روپیہ بھیجا۔ اور ہر کنیز ایک ایک لاکھ روپیہ لے کر گئی۔ تاریخ الخمیس ج ۲ ص ۳۲۴

حضرت معاویہؓ کے ساتھ صلح کے وقت یہ بھی معاہدہ ہوا تھا کہ کوفہ کے بیت المال کی تمام نقدی حضرت حسنؓ کو دیدی جائے۔ چنانچہ وہاں سے پانچ کروڑ نقد ملا۔ بیس لاکھ سالانہ وظیفہ تھا۔ یہ تمام کچھ خرچ کر دیتے بلکہ اکثر قرض لیتے۔ تاریخ الخمیس ج ۲ ص ۳۲۶

ملا باقر مجلسی نے جلاء العیون میں خوب بے پر کی اڑائی ہیں۔ کہ حضرت حسنؓ نے دو سو پچاس عورتوں سے نکاح کیا۔ پھر خود ہی دوسری جگہ تین سو لکھتے ہیں۔ اور یہ تمام نکاح حضرت علیؓ کی حیات میں ہوئے۔ چنانچہ ایک بار حضرت علیؓ نے ممبر پر چڑھ کر فرمایا کہ حسنؓ بہت زیادہ طلاق دیتے ہیں۔ لوگوں نے کہا کہ ہماری لڑکیوں کا ایک رات اُن کے گھر رہنا ہمارے لئے موجب شرف ہے۔ جلاء العیون مطبوعہ تہران ص ۳۰۹

ملا صاحب یہ بھی کہتے ہیں کہ حضرت حسنؓ نے جتنی عورتوں کو طلاقیں دی تھیں۔ وہ سب آپ کے جنازے پر ننگے سر روتی پیٹتی حاضر ہوئیں (یہ عرب عورتیں نہ ہوں گی۔ بلکہ ایرانی النسل ہوں گی)۔ ابن ابی الحدید شارح نہج البلاغہ نے ستر نکاح اور پروفیسر حتی نے سو نکاح بیان کئے ہیں۔

آپ کی موت کے متعلق تاریخ الخمیس میں ہے کہ بیماری سے چالیس دن بستر پر پڑے رہے۔ ج ۲ ص ۳۲۶

دمیری نے مدت علالت دو ماہ بیان کی ہے۔ ذیا بیطس کا عارضہ تھا اور شہد کا شربت پینے سے بڑھ گیا۔

ابن قتیبہ المتوفی ۲۷۶ھ، ابوحنیفہ دینوری ۲۸۱ھ، صاحب الجرالمتوفی ۲۴۵ھ نے زہرخورانی کاکوئی تذکرہ تک نہیں کیا۔ بلکہ ابن جریر طبری المتوفی ۳۱۰ھ جس نے بے حساب موضوعات کو بڑے وثوق اور یقین سے بیان کیاہے۔ اس نے بھی کہیں زہرخورانی کی طرف اشارہ نہیں کیا۔

زہرخورانی سے متعلق سب سے پہلا الہام مسعودی المتوفی ۳۴۶ھ کو ہوا۔ گویا چوتھی صدی کے ربع اول تک حضرت حسنؓ کی زہرخورانی کا تصور تک کسی کے ذہن میں نہ تھا۔

مسعودی نے زہرخورانی کی داستان وضع کرتے وقت بہتیرے ہاتھ پاؤں مارے۔ لیکن کسی کانام نہ مل سکا۔ تو مجبوراً لکھنا پڑا کہ کہا جاتاہے کہ جعدہ نے معاویہؓ کے ایما سے حضرت حسنؓ کو زہر دیا تھا۔ حقیقت مذہب شیعہ ص ۳۰۵

لفظ کہا جاتا بھی غور طلب ہے۔ یہ لفظ ثابت کررہا ہے۔ کہ اس قول کے قائل کا کوئی پتہ نہیں۔ بلکہ یہ بے پرکی گپ ہے۔ پھر بھی اس نے یہ الزام امیر معاویہؓ کے سرتھوپ دیا۔ لیکن بعد کے سنی علما نے سنی ہونے کے ناتے امیر معاویہؓ کے بجائے اسے یزید کی جانب منسوب کردیا۔

یہ مسعودی وہی حضرت ہیں جنہوں نے حضرت عبداللہؓ بن رقیہ یعنی حضور کے نواسے کو شرابی اور زانی قرار دیاہے۔ فلعنۃ اللہ علی الکذبین۔

اس کے بارے میں علی احمد عباسی صاحب لکھتے ہیں۔

اب آتے ہیں وہ اصحاب کذب وافترا جنہوں نے خاص مقاصد کے تحت تصنیف بدیہوف کا پیشہ اختیار کیا۔ مثلاً مسعودی کہ اس شخص کو نہ روایت سے بحث ہے نہ درایت سے بلکہ عدل کے ساتھ وہ کوئی بات خوش دلی سے نہیں کہہ سکتا۔ جن چیزوں کو پوشیدہ رکھنا ممکن نہیں انہیں تو بیان کرنے پر مجبور ہوجاتا ہے۔ لیکن اس کا مقصد تصنیف وتالیف سے محض یہ نظر آتا ہے کہ کسی طرح اخلاف کو اسلاف سے برگشتہ کرکے امت کی تاریخ میں ہر ممکن خلا پیدا کردے۔ پھر بھی عجیب بات یہ ہے کہ اسے کذاب ومفتری سمجھنے کے بجائے لوگوں نے

محقق و مؤرخ سمجھ لیا اور اس کی کتابوں سے استناد کر کے معتبر بننے کی کوشش کی۔ حضرت معاویہؓ کی سیاسی زندگی ص۲۵

اب ذرا قرآن مجید کی روشنی میں اس واقعہ کو دیکھئے۔ قرآن صحابۂ کرام کے بارے میں کہتا ہے۔

اُولٰٓئِكَ كَتَبَ فِي قُلُوبِهِمُ الْاِيْمَانَ	ان لوگوں کے دلوں میں اللہ نے ایمان لکھ دیا ہے۔

نیز ارشاد ہے۔

وَكَرَّهَ اِلَيْكُمُ الْكُفْرَ وَالْفُسُوْقَ وَالْعِصْيَانَ ط اُولٰٓئِكَ هُمُ الرّٰشِدُوْنَ ٥	اور اللہ نے تمہارے لئے کفر فسق وفجور اور معصیت کو مکروہ بنا دیا ہے۔ یہ سب ہدایت یافتہ ہیں۔

ان آیات کی رُو سے تمام صحابہ راشد ہیں اور ان میں سے نہ کوئی عمداً کفر کا ارتکاب کرسکتا ہے۔ نہ فسق و فجور کا اور نہ کوئی صحابی اللہ کی نافرمانی کرسکتا ہے۔ بھول چوک اور خطا ایک علیحدہ شئے ہے۔ جب قرآن کا یہ فیصلہ ہمارے سامنے آگیا تو ایک ایک بچہ جانتا ہے کہ قتل گناہ کبیرہ ہے۔ بلکہ حقوق العباد میں اس سے بڑھ کر کوئی معصیت نہیں۔ ارشاد الٰہی ہے۔

وَمَنْ يَّقْتُلْ مُؤْمِنًا مُّتَعَمِّدًا فَجَزَآؤُهٗ جَهَنَّمُ خٰلِدًا فِيْهَا وَغَضِبَ اللّٰهُ عَلَيْهِ وَلَعَنَهٗ وَاَعَدَّ لَهٗ عَذَابًا عَظِيْمًا ٥	اور جو کسی مؤمن کو جان کر قتل کرے گا۔ اس کی سزا جہنم ہے۔ جس میں وہ ہمیشہ رہے گا۔ اس پر اللہ کا غضب اور اس کی لعنت ہے اور اس نے اس کے لئے عذاب عظیم تیار کیا ہے۔

اگر ان روایات کو قبول کیا جائے [illegible] امیر معاویہؓ نے حضرت حسنؓ [illegible] دیا، اس طرح ایک کبیرہ گناہ کے مرتکب ہوتے اور [illegible] ہار دیا تو عیاذاً باللہ [illegible] نے قرآن میں جو صحابہ

کے بارے میں یہ دعویٰ کیا تھا کہ ہم نے ان کے لئے فسق و فجور اور معصیت کو مکروہ بنا دیا ہے۔ قرآن کا یہ دعوی سراسر جھوٹ پر مبنی قرار پاتا ہے۔ اور کوئی صاحب ایمان حالتِ ایمان میں اس کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔ لہٰذا وہ تمام تاریخی روایات جن سے کسی صحابی کے سلسلہ میں کفر، فسق و فجور اور معصیت الٰہی ظاہر ہوتی ہو۔ وہ سب سبائی کذب و افترا ہے۔ مثلاً حضرت عمرؓو بن العاص کی جانب دھوکہ دہی کی نسبت، حضرت مغیرہؓ بن شعبہ کی اقتدار کی بھوک اور سیاسی رشوت کی داستان یا کسی کی جانب بیت المال میں خیانت وغیرہ اسی قسم کی ہزارہا تاریخی روایات ہیں۔ جو قطعاً خلاف قرآن ہیں۔ ایسی صورت میں تاریخی روایات کو اختیار کرنا اور قرآن کو ترک کرنا۔ یہ کام صرف ایسے ہی اشخاص انجام دے سکتے ہیں جن کا اس قرآن پر ایمان نہ ہو۔ اور جن کا قرآن پانچ سال کا بچہ لے کر غائب ہو گیا ہو۔ یہی تو وہ سبائی ذہنیت ہے جس نے ہمارے دماغوں کو ماؤف کر رکھا ہے۔ اس تحریر کا مقصد بھی یہی ہے کہ تاریخ میں سبائیوں نے کیا کیا فریب کاریاں کی ہیں۔ اور کس کس طرح صحابہ کو بدنام کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس پر سے پردہ اٹھایا جائے تاکہ اہل سنت حضرات اس میٹھے و خوش رنگ زہر کو سمجھیں اور اس سے بچنے کی کوشش کریں۔

قرآن نیزوں پر اُٹھانا

صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کو عام طور پر اور خاص طور پر امیر معاویہؓ اور حضرت عمروؓ بن العاص وغیرہ کو بدنام کرنے کے لئے یہ کہانی بڑی شد و مد سے بیان کی جاتی ہے۔ کہ جب میدانِ صفین میں امیر معاویہؓ کے لشکر کو شکست ہونے لگی۔ تو امیر معاویہؓ نے اپنے لشکریوں کو نیزوں پر قرآن اٹھانے کا حکم دیا۔ اور اس طرح امت کو ایک فریب میں مبتلا کیا۔ یہ قصہ اتنا عام ہے کہ آج ہر ستی کی زبان پر جاری ہے۔ بلکہ پاکستان میں اسلام کے ٹھیکہ دار تو یہاں تک کہہ دیتے ہیں کہ معاویہؓ اور عمروؓ بن العاص نے امت کو فریب میں مبتلا کیا۔ لیکن سوال یہ ہے کہ اُن کے اس عمل سے فریب کا شکار حضرت علیؓ کے ساتھی ہی کیوں بنے۔ اور شامیوں میں اختلاف کیوں نہ تع نہیں ہوا۔

اس سے تو یہ بات نودعیاں ہوتی ہے کہ اہل عراق اور سبائیوں کی یہ صفت خاصہ تھی کہ وہ اپنے امیر کی بھی نہ سنتے تھے۔ ان کے پیش نظر کسی وقت بھی اسلام اور اتحاد نہیں رہا۔ لہٰذا یہ ہر اس موقعہ کی تلاش میں رہتے تھے جس کی بنیاد پر یہ اختلاف کی عمارت کھڑی کر سکیں۔ یہ ہمیشہ دھوکہ دہی، فریب کاری اور غداری کے مرض میں مبتلا رہے۔ جب کہ شامی اس مرض سے پاک رہے۔ جس کی وجہ ظاہر ہے کہ حضرت علیؓ کے ساتھ جتنے افراد تھے۔ یہ سب تخریب کار اور فتنہ انگیز لوگ تھے، جنہوں نے بظاہر اسلام کا لبادہ اوڑھ رکھا تھا۔ اور اس لبادے میں انہوں نے حضرت عثمانؓ، حضرت طلحہؓ اور حضرت زبیرؓ کو شہید کیا۔ ام المؤمنین عائشہؓ اور ام المؤمنین ام حبیبہؓ کی بے حرمتی کی۔ اور پھر مدینہ کی مرکزیت کو ختم کیا۔ تاکہ اسلام کا سیلاب جو بڑی بڑی سلطنتوں پر چھا رہا ہے۔ کسی نہ کسی طرح اُس کو ختم کیا جائے۔

امیر معاویہؓ اور اُن کے ساتھیوں سے انہیں یہ عداوت تھی کہ وہ اِن کی چالبازی اور فتنہ انگیزی کے مقابلہ میں سینہ سپر بن کر کھڑے ہوگئے تھے۔ اور اس طبقہ کا اُن پر داؤ نہ چلتا تھا اور تاریخ شاہد ہے کہ اس طبقہ نے امیر معاویہؓ کے مقابلہ میں شکست ہی کھائی ہے۔

اس واقعہ کو مودودی صاحب اپنی "خلافت وملوکیت" میں بایں الفاظ نقل کرتے ہیں۔

حضرت عمارؓ کی شہادت کے دوسرے روز دس صفر ۳۸ھ کو سخت معرکہ برپا ہوا۔ جس میں حضرت معاویہؓ کی فوج شکست کے قریب پہنچ گئی۔ اس وقت حضرت عمروؓ بن العاص نے حضرت معاویہؓ کو مشورہ دیا کہ اب ہماری فوج نیزوں پر قرآن اٹھالے۔ اور کہے ھذا حکم بیننا و بینکم (یہ ہمارے اور تمہارے درمیان حکم ہے) اس کی مصلحت حضرت عمروؓ نے خود یہ بتائی کہ اس سے علیؓ کے لشکر میں پھوٹ پڑ جائے گی۔ کچھ کہیں گے کہ یہ بات مان لی جائے۔ اور کچھ کہیں گے کہ نہ مانی جائے۔ ہم مجتمع رہیں گے۔ اور ان کے درمیان تفرقہ برپا ہو جائے گا۔ اگر وہ مان گئے تو ہمیں مہلت مل جائے گی...... اس کے صاف معنٰی یہ ہیں کہ یہ محض ایک جنگی چال تھی قرآن کو حکم بنانا سرے سے مقصود نہ تھا۔

اس مشورے کے مطابق لشکر معاویہؓ میں قرآن نیزوں پر اٹھالیا گیا۔ اور اس کا وہی نتیجہ ہوا جس کی حضرت عمروؓ بن العاص کو اُمید تھی۔ حضرت علیؓ نے عراق کے لوگوں کو لاکھ سمجھایا کہ اس چال میں نہ آؤ۔ اور جنگ کو آخری فیصلہ تک پہنچنے دو۔ مگر اُن میں پھوٹ پڑ کر رہی۔ اور آخرکار حضرت علیؓ مجبور ہوگئے کہ جنگ بند کر کے امیر معاویہؓ سے تحکیم کا معاہدہ کریں۔ خلافت وملوکیت ص ۱۳۹

مودودی صاحب مرحوم کو دو امور کا افسوس ہو رہا ہے۔ ایک تو یہ کہ قاتلین عثمانؓ میں اختلاف کیوں واقع ہوا۔ اگر یہ اختلاف واقع نہ ہوتا تو حضرت علیؓ کو فتح حاصل ہوتی۔ اور وہ تمام مملکت اسلامیہ کے امیر المؤمنین ہوتے۔ اور خاندان بنی امیہ کا خاتمہ ہو جاتا۔ دوئم نہ یہ قرآن اٹھایا جاتا۔ نہ حکمین پر فیصلہ چھوڑا جاتا۔ اور نہ حکمین حضرت علیؓ کو خلافت سے معزول کرتے۔ اور نہ

قاتلین عثمانؓ میں پھوٹ پڑتی۔

اتفاق سے ایرانیوں اور سبائیوں کو آج تک اسی کا درد ہو رہا ہے۔ ہمیں افسوس تو یہ ہے کہ جو تکلیف چودہ سو سال سے رافضیوں کو چلی آ رہی تھی۔ وہی تکلیف مودودی صاحب کو کیوں ہو رہی ہے۔ اس کی صرف دو ہی وجوہات ہو سکتی ہیں۔

۱۔ چونکہ وہ حضرت علیؓ کی اولاد سے تعلق رکھتے ہیں اور فرزند ہونے کے ناتے اپنے والد کی وکالت انہوں نے اپنے ذمہ لے لی ہے۔

۲۔ چونکہ وہ تصوف کے سلسلہ سے تعلق رکھتے ہیں۔ اُن کے آباؤ اجداد میں مودود چشتی ایک سجادہ نشین صوفی گزرے ہیں۔ اور صوفیاء کو علم باطن کے سلسلہ سے حضرت علیؓ کے علاوہ کوئی اور نظر نہیں آتا۔ اور علم باطن کے لحاظ سے حق خلافت حضرت علیؓ کو حاصل تھا۔ اسی لئے مودودی صاحب کو حضرت عثمانؓ میں بھی خامیاں نظر آئیں۔ اور دیگر مخالفین صحابہ کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

انہوں نے یہ روایت طبری کے حوالہ سے پیش کی ہے۔ اور ان کا دعویٰ یہ ہے کہ طبری حدیث و تاریخ، تفسیر اور فقہ کے مسلمہ امام ہیں۔ وہ بغیر چھان پھٹک کے کوئی روایت نقل نہیں کرتے۔ لہٰذا ان کی تمام روایات مسلّم ہیں۔ اُن میں کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں۔ رہا راویوں کی تنقید کا مسئلہ تو تاریخ میں اس کی اجازت نہیں دی جا سکتی۔ کیونکہ اسماء الرجال، علم الروایہ، علم الدرایہ، اور علم الجرح والتعدیل جیسے علوم احکامات اور فقہی مسائل کی تحقیق کے لئے وجود میں لائے گئے تھے۔ تاریخی روایات کو ان کسوٹیوں پر پرکھنے کا نتیجہ یہ نکلے گا کہ ہماری تاریخ کے دس حصوں میں سے نو حصہ ضائع ہو جائیں گے۔ اگر آج مودودی صاحب مرحوم حیات ہوتے تو میں ان کے سامنے طبری کی وہ روایات ضرور رکھتا۔ جن میں طبری نے حضرت علیؓ پر تبرا کیا ہے۔ اور پھر اُن سے دریافت کرتا کہ ان روایات کے بارے میں آپ کا کیا نظریہ ہے؟ کاش مودودی صاحب اپنی وفات سے قبل اس کا ازالہ

فرمادیتے ہیں۔ اُن کی اس غلطی کا نتیجہ یہ نکلا کہ اب اُن کی جماعت کلی طور پر شیعوں کی ہم نوا بن گئی۔ اب زبان اُن کی ہوتی ہے۔ اور خیالات شیعوں کے ہوتے ہیں۔ شیعوں کی اس ہم نوائی سے یہ تاثر پیدا ہوا کہ اب اُن جماعتوں کے ساتھ بھی وہ اتحاد کے لئے تیار ہیں جنہیں کل تک وہ کافر کہتے تھے۔ اور جن کے مقابلہ کے لئے چندسال پیشتر علم بلند کیا تھا۔

اب آیئے طبری کی روایت کی جانب۔ ہم سب سے پہلے طبری کی اصل روایت پیش کرنا چاہتے ہیں۔ طبری لکھتے ہیں۔

ابو مخنف کا بیان ہے کہ جب عمروؓ بن العاص نے یہ دیکھا کہ عراقی غالب آتے جا رہے ہیں۔ اور انہیں ہلاکت کا خوف پیدا ہوا۔ تو انہوں نے امیر معاویہؓ سے کہا کہ میں آپ کے سامنے ایک رائے پیش کرتا ہوں جس سے ہم میں اتحاد بڑھ جائیگا اور دشمنوں میں انتشار پیدا ہو جائے گا۔ معاویہؓ نے کہا ہاں بیان کرو۔ عمروؓ بن العاص نے کہا وہ تدبیر یہ ہے کہ ہم قرآن اٹھالیں۔ اور یہ کہیں قرآن جو فیصلہ کرے، وہ فیصلہ ہمیں اور تمہیں منظور ہونا چاہیئے۔ اگر مخالفین میں سے چند لوگوں نے بھی اسے قبول کرنے سے انکار کردیا تو آپ دیکھیں گے کہ ان میں ایک گروہ پیدا ہو جائے گا۔ جو اس فیصلہ کو قبول نہیں کرے گا۔ اس طرح ان میں تفرقہ پیدا ہو جائے گا اور اگر سب نے یہ کہا کہ ہمیں یہ فیصلہ متفقہ طور پر منظور ہے۔ تو ایک مدت تک یہ جنگ ہمارے سروں پر سے دور ہو جائیگی

اس بات پر شامیوں نے قرآن نیزوں پر اٹھالئے اور بولے ہمارے اور تمہارے درمیان یہ کتاب اللہ فیصلہ کن ہے۔ شامیوں کا فیصلہ اہل شام پر واقع ہوگا اور عراقیوں کا فیصلہ تمام اہل عراق پر نافذ ہوگا۔ عراقیوں نے جب یہ دیکھا کہ قرآن اُٹھالئے گئے ہیں تو بولے کہ ہم اللہ عزوجل کی کتاب کو قبول کرتے اور اس کی جانب رجوع کرتے ہیں۔ طبری جلد سوئم ج ۲ صـ۳۵۸ ـ

مودودی صاحب نے یہ دعویٰ فرمایا تھا کہ یہ عمل صرف دھوکہ دہی کے لئے

انجام دیا گیا تھا۔ اور اس چالبازی میں جسے مودودی صاحب نے جنگی چال سے تعبیر کیا۔ عمروؓ بن العاص کامیاب ہوئے اور عراقیوں میں پھوٹ پڑ گئی ...... لیکن طبری یہ دعویٰ کر رہے ہیں کہ عراقیوں نے بھی اس بات کو قبول کر لیا۔

حضرت عمروؓ بن العاص رضی اللہ عنہ نے چالبازی دکھائی یا نہیں لیکن ہم یقین کے ساتھ یہ دعویٰ کر رہے ہیں کہ یہاں مودودی صاحب نے چالبازی سے کام لیا۔ اس روایت میں اختلاف کا کوئی تذکرہ نہ تھا۔ لیکن ایک اور روایت میں موجود تھا۔ وہاں سے اس نتیجہ کو حاصل کر کے اس کے ساتھ جوڑ دیا۔ جس سے لوگ یہ تصور کر بیٹھے کہ یہ پوری ایک روایت ہے۔ اسے اگر علمی بد دیانتی نہ کہئے تو پھر کیا کہئے۔ ہونا تو یہ چاہیئے تھا کہ مودودی صاحب وہ روایت بھی پیش کرتے جس سے اختلاف ثابت ہوتا ہے۔ لیکن وہ ایسا کرنے سے معذور تھے۔ کیونکہ اگر وہ دیگر روایات پیش کر دیتے تو حقیقت کھل کر سامنے آجاتی۔ اور خود حضرت علیؓ بھی کا گروہ موردِ الزام بن جاتا۔ آیئے ہم قارئین کے سامنے وہ روایات پیش کئے دیتے ہیں۔

ابو مخنف نے عبدالرحمان بن جندب کے ذریعہ جندب الازدی سے روایت کیا ہے۔ کہ جس وقت یہ صورت حال رونما ہوئی۔ حضرت علیؓ نے لوگوں سے فرمایا۔

اے اللہ کے بندو تم اپنے حق و صداقت اور اپنے دشمنوں سے جنگ پر قائم رہو، کیونکہ معاویہؓ، عمروؓ بن العاص، عقبہؓ بن ابی معیط، حبیبؓ بن مسلمہ، عبداللہؓ بن ابی سرح اور ضحاکؓ بن قیس دیندار لوگ اور قرآن پر چلنے والے نہیں ہیں۔ میں تم سے زیادہ ان لوگوں سے واقف ہوں، میں تو بچپن میں بھی ان کے ساتھ رہا۔ اور بڑے ہو کر بھی ان کے ساتھ رہا۔ یہ بچپن میں نہایت شریر بچے تھے۔ اور بڑے ہو کر بھی نہایت شریر آدمی نکلے۔ تم پر افسوس انہوں نے وہ شئے نیزوں پر اٹھائی ہے۔ جسے یہ کسی اور وقت ہاتھ بھی نہیں لگاتے۔ اور یہ تک نہیں جانتے کہ اس میں کیا لکھا ہوا ہے۔ انہوں نے صرف تمہیں دھوکہ دینے اور فریب میں مبتلا کرنے کے لئے قرآن اٹھایا ہے۔

طرف داران علیؓ نے جواب دیا یہ کیسے ممکن ہے کہ ہمیں اللہ عزوجل کی کتاب کو قبول کرنے کی دعوت دی جائے۔ اور ہم اسے قبول کرنے سے انکار کر دیں؟

حضرت علیؓ نے فرمایا۔ میں نے ان سے اسی لئے جنگ کی تھی، تاکہ وہ کتاب کے احکام پر عمل پیرا ہوں۔ انہوں نے اللہ عزوجل کے اُن احکامات کی نافرمانی کی۔ جو انہیں دیئے گئے تھے۔ اور انہوں نے اللہ عزوجل سے جو عہد کیا تھا اسے بُھلا دیا۔ اور اس کتاب کو پس پشت ڈال دیا۔

اس پر سعر بن فدکی التیمی اور زید بن حصین الطائی جو بعد میں قاریوں کی ایک جماعت کے ساتھ خارجی بن گئے تھے بولے۔

اے علیؓ جب تجھے کتاب اللہ کی دعوت دی جا رہی ہے تو اسے قبول کر۔ ورنہ ہم تجھے اور تیرے مخصوص ساتھیوں کو ان لوگوں کے ہاتھوں میں دیدیں گے۔ یا جو سلوک ہم نے عفان کے بیٹے کے ساتھ کیا تھا وہی تیرے ساتھ کریں گے۔ (ابن الاثیر میں ہے کہ جس طرح ہم نے عثمانؓ بن عفان کو قتل کیا تھا۔ اسی طرح تجھے بھی قتل کر دیں گے) ہم پر یہ لازم ہے کہ ہم اللہ عزوجل کی کتاب پر عمل پیرا ہوں، اور ہمیں شامیوں کی یہ دعوت قبول ہے۔ اللہ کی قسم یا تو تجھے اس پر ضرور بالضرور عمل کرنا ہوگا۔ یا ہم تیرا بھی ضرور وہی حشر کریں گے (یعنی حضرت عثمانؓ جیسا حشر)

حضرت علیؓ نے فرمایا۔ تم میری اس عدم رضامندی کو دماغ میں محفوظ کر لو۔ اور میری یہ بات یاد رکھو کہ اگر تم میری اطاعت کرتے ہو تو تمہیں جنگ کرنی چاہیئے۔ اور اگر تم میری نافرمانی کرتے ہو تو تم جو بہتر سمجھو کرو۔

ان لوگوں نے جواب دیا یہ ہرگز نہیں ہو سکتا۔ بلکہ آپ آدمی بھیج کر اشتر کو میدان جنگ سے واپس بلا لیجیے۔ طبری سوم ج ۲ ص ۲۵۸

یہ تھی وہ روایت جس سے نتیجہ اخذ کر کے مودودی صاحب نے حضرت عمروؓ بن العاص

پر چال بازی کا الزام قائم کیا تھا۔ اور خود اس روایت کو شیر مادر سمجھ کر پی گئے تھے۔ اس روایت کے خط کشیدہ الفاظ پر غور کیجئے۔ اور ذرا دل سے سوچ کر بتایئے۔

کہ حضرت امیر معاویہؓ، حضرت عمروؓ بن العاص، حضرت عقبہؓ بن ابی معیط، حضرت عبداللہؓ بن ابی سرح، حضرت ضحاکؓ بن قیس اور حضرت حبیبؓ بن مسلمۃ الفہری صحابہ نے کیا واقعتاً قرآن کو چھوڑ دیا تھا؟ کیا یہ لوگ یہ بھی نہ جانتے تھے کہ قرآن میں کیا ہے۔ کیا یہ ہمیشہ شریر رہے تھے۔ کیا حضرت علیؓ نے ان سے جنگ اس لئے کی تھی کہ یہ قرآن کو چھوڑ بیٹھے تھے؟ کیا ان حضرات نے قرآن دھوکہ دہی کے لئے اٹھایا تھا؟ اگر مودودی صاحب اور ان کے ہم نوا تصور کرتے ہیں۔ تو ہم اللہ کی قسم کھا کر کہہ سکتے ہیں کہ اُس دور سے لے کر آج تک اہل سنت والجماعت میں سے کسی کا یہ عقیدہ نہیں رہا ہے۔ بلکہ یہ خالص رافضیوں کا عقیدہ ہے اور یہ روایت خالص تبرا ہے۔ جن لوگوں کو ایسی صورت میں طبری پر اعتماد ہے تو ان کے دین و مذہب کا اللہ ہی حافظ ہے۔ ہم اس قضیہ میں اُن کے ساتھ کسی قسم کا تعاون نہیں کر سکتے اور نہ کسی مسلمان کو کرنا چاہیئے۔

اس روایت سے یہ حقیقت بھی کھل کر سامنے آگئی کہ عراقیوں کے نزدیک حضرت علیؓ کی حیثیت کیا تھی۔ وہ تو اپنی تخریب کاری کے لئے انہیں استعمال کر رہے تھے۔ ان کے پاس نہ قوت فیصلہ تھی، اور نہ وہ اپنی رائے پر عمل کر سکتے تھے۔ اُن کی حیثیت ایک کٹھ پتلی کی تھی۔ عراقی جس طرف چاہتے اُن کا رُخ موڑ دیتے۔ اسی لئے میں یہ کہنے پر مجبور ہوں۔ کہ تاریخ کی سب سے مظلوم ترین ہستی تو حضرت علیؓ ہیں۔ بظاہر اُن کے پاس اقتدار اور لاؤ لشکر ہے لیکن وہ پانچ سال تک ان لشکریوں کے ہاتھ میں بے بس بنے رہے۔

مودودی صاحب کے بقول اس روایت میں کسی شک وشبہ کی گنجائش نہیں کیونکہ یہ مورخ طبری نے چھان پھٹک کر نقل کی ہے۔ اور وہ مسلمہ اہل سنت کے امام ہیں۔ اور اتفاق سے یہ دونوں روایتیں انہوں نے ابو مخنف۔ سے نقل کی ہیں۔ ورنہ تو یہ جاتا تھا

کہ ہم ان روایات پر کوئی تبصرہ نہ کریں۔اور مودودی سے دریافت کریں کہ طبری کی اس روایت کا آپ کے پاس کیا جواب ہے؟ لیکن ہمیں یہ خطرہ ہے کہ اہل سنت حضرات کسی غلط فہمی میں مبتلا نہ ہو جائیں۔اس لئے ہم اس پر زیادہ نہیں صرف مختصر سا تبصرہ کئے دیتے ہیں۔

۱۔اس روایت میں جن صحابہ کے نام آئے ہیں وہ سب حضرات ہم عمر نہ تھے۔ اور ان میں سے ایک شخص بھی حضرت علیؓ کا ہم عمر نہ تھا۔مثلاً حضرت عمروؓ بن العاص حضرت علیؓ سے عمر میں بہت بڑے تھے۔جب کہ حضرت ضحاکؓ بن قیس ان سے بہت چھوٹے تھے۔کیا ان سب حضرات کا ایک ساتھ کھیلنا ممکن تھا۔افسوس کہ بغض معاویہؓ میں مودودی صاحب اتنی معمولی سی بات کی جانب بھی توجہ نہ دے سکے۔

۲۔حضرت عثمانؓ کے زمانہ میں جب قرآن کی مختلف نقلیں تیار ہوئیں تو ان میں سے صرف ایک نقل شام بھیجی گئی تھی۔آخر اس وقت اتنی نقلیں کہاں سے آگئیں جو لاتعداد افراد قرآن نیزوں پر اٹھا کر آگئے۔

۳۔جب ان حضرات صحابہ نے قرآن کو پس پشت ڈال دیا تھا۔اور یہی نہ جانتے تھے کہ قرآن میں کیا ہے۔اور ہمیشہ یہ شریر رہے تھے۔تو ان میں سے حضرت عمروؓ بن العاص کو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی عہدہ عطا فرمایا تھا۔پھر ابوبکرؓ صدیق نے انہیں فلسطین کی جانب امیر بنا کر بھیجا۔پھر حضرت عمرؓ کے زمانہ میں انہوں نے مصر فتح کیا۔اور بعد میں وہاں کے گورنر متعین ہوئے۔امیر معاویہؓ کو حضرت عمرؓ نے حمص کا امیر متعین کیا۔بقیہ حضرات کو حضرت عثمانؓ نے مختلف عہدے دیئے۔اب ہمیں یہ بتایا جائے کہ ابوبکرؓ و عمرؓ اور عثمانؓ اگر ان کی اس حالت سے واقف تھے۔تو انہوں نے ان حضرات کو یہ عہدے کیسے دیئے۔اور اگر ناواقف تھے۔تو اس ناواقفیت کی بھی ایک حد ہوتی ہے جو تجربہ کے بعد دور ہو سکتی تھی۔اور ان حضرات کی حالت سے چوبیس سال تک کوئی صحابی واقف نہ ہو سکا۔فیا للعجب۔

دراصل یہ روایات سبائیوں کی وضع کردہ ہیں طبری نے ان دونوں روایتوں کو

ابومخنف سے نقل کیا ہے۔ یہ حضرت کون ہیں؟ توان کا حال محدثین کی زبانی سنئے۔

ابومخنف۔ اس کا نام لوط بن یحییٰ ہے۔ یہ روئے زمین پر سب سے پہلا شخص ہے جس نے کربلائی داستانیں وضع کیں۔ اور انہیں کتابی شکل دی۔ اُس کی کتاب کا نام "مقتل حسینؓ" ہے۔ یہ کتاب سبائیوں کے نزدیک نہایت متبرک سمجھی جاتی ہے۔ مجالس محرم میں اس کتاب کی کہانیاں ہر مجتہد کی زبان پر ہوتی ہیں۔ فن رجال کے امام عبدالرحمان بن ابی حاتم رازی فرماتے ہیں۔ امام یحییٰ بن معین کا قول ہے کہ یہ ثقہ نہیں ہے۔ میرے والد امام ابوحاتم رازی فرماتے تھے۔ یہ متروک الحدیث ہے۔ الجرح والتعدیل ج ۷ ص۱۸۲

حافظ ابن حجر "لسان المیزان" میں فرماتے ہیں۔ یہ ابومخنف ایک مورخ ہے۔ تاریخ پر اس کی متعدد تالیفات ہیں۔ یہ قابل اعتماد نہیں۔ ابوحاتم وغیرہ اسے متروک قرار دیتے ہیں۔ دارقطنی کہتے ہیں ضعیف ہے۔ یحییٰ ابن معین کہتے ہیں یہ ثقہ نہیں۔ ایک بار فرمایا یہ کچھ نہیں۔ یہ صعق بن زہیر اور جابر جعفی رافضی سے روایات نقل کرتا ہے۔ اس سے مورخ مدائنی وغیرہ روایات نقل کرتے ہیں۔ ۱۷۰ھ سے پہلے اس کا انتقال ہوا۔ ابوعبید الآجری کا بیان ہے کہ میں نے ابوحاتم رازی سے اس کے بارے میں دریافت کیا۔ وہ ہاتھ جھاڑ کر کہنے لگے۔ کہ اس جیسے شخص کے بارے میں بھی کوئی سوال کیا جاتا ہے؟ یعنی یہ تو اس قابل بھی نہیں کہ اس کے بارے میں کوئی سوال کرے۔ عقیلی نے اس کا کتاب الضعفاء میں ذکر کیا ہے۔ ابن عدی کامل میں فرماتے ہیں یہ تو آگ لگانے والا شیعہ ہے۔ اور شیعوں ہی کا مورخ ہے۔ لسان المیزان ج ۲ ص۴۹۲۔ میزان الاعتدال ج ۳ ص۴۱۹۔

گویا اس روایت کا تمام تر دار و مدار ابومخنف لوط بن یحییٰ پر ہے۔ اور وہ خالص شیعہ اور ناقابل اعتبار ہے۔ اور پہلی روایت جو مودودی صاحب نے نقل کی ہے۔ اس میں ابومخنف نے اوپر کے کسی راوی کا نام ذکر نہیں کیا۔ اس کا انتقال ۱۷۰ھ کے قریب ہوا۔ اور واقعہ ۳۵ھ کا بیان کر رہا ہے۔ اُس وقت تک تو اس کے [illegible] ان بھی عالم وجود میں نہ آئے ہوں گے۔

اس لحاظ سے جو روایت مودودی صاحب نے نقل کی ہے۔ اسے تو خالص ابو مخنف کی گپ سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔

پھر طبری نے بھی اس گپ میں کچھ اضافہ ہی کیا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ ہم سے یہ واقعہ ابو مخنف نے بیان کیا۔ حالانکہ طبری ۲۲۴ھ میں پیدا ہوا۔ اور ابو مخنف ۱۷۰ھ سے پہلے مرگیا۔ بالفاظ دیگر طبری یہ دعویٰ کر رہا ہے کہ میں نے یہ کہانی پیدائش سے پچپن سال قبل سنی تھی۔ ایسی روایات کو تو وہی شخص قبول کر سکتا ہے۔ جس کے ذہن کو شیعیت نے ماؤف کر کے رکھ دیا ہو۔ کوئی سمجھ دار انسان ہرگز قبول نہیں کر سکتا۔

اگر مودودی صاحب کا کوئی حامی یہ کہے کہ ہو سکتا ہے کہ طبری نے یہ روایت ابو مخنف کی کسی کتاب سے نقل کی ہو، تو اول تو جناب اوپر کے راوی کہاں ہیں۔ اور اس صورت میں طبری کو اس بات کی وضاحت کرنی چاہیئے تھی کہ ہم نے ابو مخنف کی فلاں کتاب سے نقل کی ہے۔ طبری کا یہ کہنا کہ ہم سے ابو مخنف نے بیان کیا۔ اس سے تو یہ ظاہر ہوتا ہے کہ طبری نے یہ روایت خود ابو مخنف سے سنی ہے۔ جو ایک کھلا جھوٹ ہے۔ اور اس سے طبری کا جھوٹا ہونا اور روایات وضع کرنا ثابت ہوتا ہے۔

طبری کو اگرچہ امت مسلمہ کے بیشتر علماء نے ثقہ اور امام تسلیم کیا ہے۔ لیکن اس امر کو وہ بھی قبول کرتے ہیں کہ حنبلی علماء اس کے سخت مخالف تھے۔ اور جو علماء طبری کے ہم نوا ہیں وہ بھی یہ تسلیم کرتے ہیں کہ ان میں تھوڑا سا تشیع پایا جاتا تھا۔ اگرچہ اکثر علماء نے اُن کی وکالت کی کوشش کی ہے۔ اور مودودی صاحب نے تو وکالت کا پورا پورا حق ادا کیا ہے۔ لیکن بعض علماء یہاں تک کہتے ہیں کہ یہ امامیہ کا امام تھا۔ اور حافظ سلیمانی نے تو یہاں تک فرمایا ہے کہ یہ رافضیوں کے لئے روایات وضع کیا کرتا تھا۔ میزان الاعتدال ج ۳ ص ۴۹۸۔ لسان المیزان۔

ہم اگر ان تمام امور کو نظر انداز کر دیں تو اس سے بڑا جھوٹ کیا ہو گا کہ طبری اس شخص کے

بارے میں جو اس کی پیدائش سے پچپن سال قبل مر چکا یہ دعوی کرتا ہے کہ اس نے مجھ سے یہ روایت بیان کی۔ حالانکہ طبری کے جتنے مداحین ہیں۔ وہ لکھتے ہیں کہ طبری ۲۲۴ھ یا ۲۲۵ھ میں طبرستان میں پیدا ہوئے۔ اور ۲۳۶ھ میں حصولِ علم کے لئے سفر شروع کیا۔ جب کہ ان کی عمر بارہ سال تھی۔ اور ابو مخنف کوفہ کا باشندہ تھا۔ اس سے ملاقات تو اسی وقت ممکن تھی جب یہ کم از کم ۲۳۶ھ تک زندہ رہتا۔ جب کہ یہ حضرات خود ہی یہ دعوی کر رہے ہیں کہ ابو مخنف کو انتقال ۱۸۰ھ سے قبل ہو چکا۔ عقل حیراں ہے کہ اس حماقت کو کیا کہیئے۔

یہ تو پہلی روایت کا حال تھا جو علامہ مودودی نے نقل کی تھی۔ دوسری روایت جسے ہم نے نقل کیا۔ اور جو پہلی روایت کے فوراً بعد ہے۔ اور جسے مودودی صاحب نے عمداً نقل نہیں کیا۔ کیونکہ اس سے حضرت علی کا حال ظاہر ہو رہا تھا۔ اب اس کا حال بھی ملاحظہ فرمایئے۔

طبری نے یہ روایت ابو مخنف سے نقل کی ہے۔ ابو مخنف نے عبدالرحمان بن جندب سے اور عبدالرحمان نے جندب الازدی سے۔ گویا اس روایت کی ابو مخنف نے سند بیان کی ہے۔ لیکن طبری نے تب بھی بے پر کی اڑائی کہ اس روایت کا ابو مخنف سے اپنا سننا بیان کیا۔ راوی درمیان سے تب بھی حذف ہوئے اور اس کے مجرم طبری ہیں۔ رہا ابو مخنف کا یہ دعوی کہ یہ روایت عبدالرحمان بن جندب سے مروی ہے۔ تو حافظ ابن حجر عبدالرحمان بن جندب کے بارے میں لکھتے ہیں۔ یہ مجہول ہے۔ لسان المیزان ج ۳۔ صـ ۴۰۸۔

جہاں تک جندب الازدی کا تعلق ہے۔ تو وہ واقعہ اس وقت کا بیان کر رہا ہے۔ جب قرآن اٹھا لئے گئے اور جنگ بند ہو گئی۔ حالانکہ حافظ ابن حجر ان کے بارے میں لکھتے ہیں۔ ابو عبید کا بیان ہے کہ یہ جنگ صفین میں قتل ہوئے۔ تقریب صـ ۵۷۔

قربان جائے اس داستاں کے کہ طبری سے ابو مخنف یہ روایت اپنی موت کے پچپن

سال بعد آکر بیان کرتا ہے۔اور جندب الازدی اپنے قتل کے چند دن بعد آکر حالات کا مشاہدہ کرتا اور پھر بعد میں اپنے بیٹے عبدالرحمان سے آکر بیان کرتا ہے۔یہ ہے اُن روایات کا حال جو بقول مودودی صاحب طبری نے چھان پھٹک کر نقل کی ہیں۔

آیئے اب ہم طبری کی ایک اور کہانی پیش کئے دیتے ہیں۔جو اسی مضمون سے متعلق ہے۔ اور طبری نے اسے بھی ابومخنف سے سُنا ہے۔اور طبری میں یہ تینوں روایات اسی ترتیب سے موجود ہیں جس ترتیب سے ہم نے انہیں نقل کیا ہے۔

ابومخنف نے فضیل بن خدیج الکندی کے ذریعہ قبیلہ نخع کے ایک شخص سے نقل کیا ہے کہ اس نے دیکھا کہ ابراہیم بن الاشتر مصعب بن زبیر کے پاس گئے۔مصعب نے کہا جس وقت لوگوں نے حضرت علیؓ کو تحکیم پر مجبور کیا۔میں بھی حضرت علیؓ کے پاس تھا۔ان لوگوں نے حضرت علیؓ کو مجبور کیا۔کہ کسی شخص کو بھیج کر اشتر کو میدان سے واپس بلایئے۔مصعب کہتے ہیں کہ حضرت علیؓ نے یزید بن ہانی السبیعی کو اشتر کے پاس روانہ کیا۔اور کہلوایا فوراً میرے پاس آؤ۔ قاصد نے یہ پیغام اشتر کو پہنچا دیا۔اشتر نے جواب دیا کہ میری جانب سے حضرت علیؓ سے کہنا یہ وقت ایسا نہیں ہے جس میں آپ مجھے میری جگہ سے ہٹائیں۔آپ قطعاً جلدی نہ کیجئے۔ کیونکہ مجھے امید ہے کہ میں فتح حاصل کروں گا۔یزید بن ہانی واپس آیا۔اور حضرت علیؓ کو اس جواب سے مطلع کیا۔

اس پر ایک شور و شر بلند ہوا۔اور اشتر کے بارے میں لوگ چیخنے لگے۔اور حضرت علیؓ سے کہا خدا کی قسم ہمیں یقین ہے کہ تو نے ہی اسے جنگ جاری رکھنے کا حکم دیا ہے۔حضرت علیؓ نے فرمایا تمہارے لئے یہ رائے قائم کرلینا مناسب نہیں۔کیا تم نے مجھے اس سے سرگوشیاں کرتے دیکھا ہے۔کیا میں اشتر سے تمہارے سامنے اعلانیہ گفتگو نہیں کرتا؛ کیا جب میں اُس سے باتیں کرتا ہوں تم نہیں سنتے؛ ان لوگوں نے جواب دیا یا تو آپ آدمی بھیج کر اسے فوراً بلوایئے۔ ورنہ اللہ کی قسم ہم تجھے معزول کر دیں گے۔

حضرت علیؓ نے یزید بن ہانی سے کہا اے یزید اشتر سے جاکر کہو کہ فوراً میرے پاس آجائے۔ یہاں فتنہ پیدا ہوچکا ہے۔ یزید نے اشتر کو یہ پیغام پہنچایا۔ اشتر نے سوال کیا کیا قرآن اٹھانے کی وجہ سے فتنہ پیدا ہوا ہے۔ یزید نے جواب دیا ہاں، اشتر نے کہا میں تو پہلے ہی جب قرآن اٹھائے گئے تھے سمجھ گیا تھا۔ کہ عنقریب نیا اختلاف اور نئی فرقہ بندی پیدا ہوگی۔ کیونکہ یہ عاہرہ کے بیٹے کا مشورہ ہے۔ کیا تو ہیں دیکھتا کہ اللہ نے ہمارے لئے کیا غیب سے مدد فرمائی ہے؟ کیا مناسب ہے کہ ایسے وقت میں دشمنوں کو چھوڑ کر میدان سے واپس لوٹ جاؤں۔ یزید نے جواب دیا۔ کیا تو یہ چاہتا ہے کہ یہاں میدان جنگ میں تو کامیابی حاصل کرے۔ اور وہاں امیرالمومنین ایسی منزل پر پہنچ چکے ہیں کہ یا تو اُن کی فوری مدد کی جائے۔ یا انہیں بھی دشمنوں کے سپرد کر دیا جائے۔ اشتر نے جواب دیا اللہ کی قسم یہ ہرگز نہیں ہوسکتا۔ (سبحان اللہ یہ کیسے ممکن ہوسکتا ہے) یزید نے کہا شیعیان علی تو یہ کہہ رہے ہیں کہ یا تو آپ کسی شخص کو بھیج کر اشتر کو فوراً واپس بلا لیجئے۔ ورنہ ہم تجھے بھی اسی طرح قتل کردیں گے۔ جیسے ہم نے ابن عفان کو قتل کیا ہے۔ اشتر یہ سُن کر فوراً واپس ہوا۔ اور ان لوگوں کے پاس پہنچا۔ اشتر نے ان لوگوں سے مخاطب ہوکر کہا۔

اے عراقیو، اے ذلیلو اور بزدلو۔ کیا تم نے قوم کی پشت کو نیچا کر دکھایا۔ کیا تم یہ سمجھتے ہو کہ تم شامیوں کے مقابلے میں زبردست ہو۔ ان لوگوں نے جو قرآن اٹھائے ہیں، اور قرآن کے فیصلہ پر عمل پیرا ہونے کی دعوت دے رہے ہیں تو اللہ کی قسم انہوں نے خود اللہ کے اُن احکام کو چھوڑ رکھا ہے جو اللہ تعالیٰ نے اس کتاب میں نازل فرمائے ہیں۔ یہ اُس سنت کے تارک ہیں جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل کی گئی۔ تم اِن کی اس دعوت کو ہرگز قبول نہ کرو۔ اور کم از کم مجھے اتنی دیر کی مہلت دیدو۔ جتنی دیر میں گھوڑا رک جاتا ہے۔ (ابن اثیر میں ہے جتنی دیر میں اونٹنی کا دودھ دوہا جاتا ہے) کیونکہ مجھے فتح سامنے نظر آرہی ہے۔

اس روایت کے آخر میں ہے (ان لوگوں نے اشتر سے کہا) ہم تیرے نیچے ہیں۔ اور

نہ تیرے امیر کے مطیع ہیں۔ تو ہم سے علیحدہ ہو جا۔ تاریخ طبری جلد سوئم ج ۲ ص ۳۶۲

اس روایت میں بھی وہی اختلاف کی کہانی نقل کی گئی ہے۔ لیکن اس روایت سے یہ بھی ظاہر ہو رہا ہے کہ حضرت علیؓ ان لوگوں میں بے بس ہو کر رہ گئے تھے۔ انہیں قدم قدم پر حضرت عثمانؓ کی طرح قتل کرنے کی دھمکیاں دی جاتی تھیں۔ اُن کا اپنا کوئی فیصلہ نہ تھا۔ فیصلہ وہ ہوتا جو شیعان علیؓ کرتے۔ حتیٰ کہ حضرت علیؓ کسی سے تنہائی میں مشورہ بھی نہیں کر سکتے تھے۔

اس روایت میں اشتر نے حضرت عمروؓ بن العاص پر ایک نیا الزام بھی قائم کیا ہے۔ ان کی والدہ کو عاہرہ (بدکارہ) قرار دیا ہے۔ یعنی حضرت عمروؓ بن العاص ناجائز اولاد ہیں۔ اور پھر یہ خبیث قرآن پر چلنے کا دعویٰ کر رہا ہے۔ حالانکہ از روئے قرآن تو اس پر اس الزام کے جرم میں حد قذف جاری ہونی چاہیئے تھی۔ افسوس تو یہی ہے کہ مودودی صاحب نے شیعہ نوازی میں قرآن اور فقہ سب کو بھلا دیا۔

سب سے زیادہ حیرت تو اس پر ہے کہ اشتر ایک تابعی ہے۔ اور صحابہ کے بارے میں یہ کہہ رہا ہے کہ وہ قرآن پر عمل نہیں کرتے۔ یہ وہ شخص ہے کہ جس نے اہل کوفہ کو حضرت عثمانؓ کے خلاف اکسایا۔ اور ان کی ٹولی لے کر مدینہ پہنچا اور امیر المومنین عثمانؓ کو شہید کرایا۔ عراقیوں اور شیعوں کی اصل طاقت یہی ہے۔

اس روایت کا راوی بھی وہی ابو مخنف ہے۔ یہ روایت بھی طبری نے اس سے سُنی ہے۔ (غالباً کشف قبر کے ذریعہ) ابو مخنف نے اسے فضیل بن خدیج سے نقل کیا ہے۔ جو اسی اشتر کا غلام تھا۔ لیکن یہ مجہول شخص ہے۔ اس کا کچھ حال معلوم نہیں۔ اور یہ قبیلہ نخع کے ایک نامعلوم شخص سے نقل کرتا ہے۔ اور وہ مصعب بن زبیر سے۔ اور وہ اپنا مشاہدہ بیان کر رہے ہیں۔

مصعب بن زبیر حضرت زبیرؓ بن العوام کے صاحبزادے ہیں۔ حضرت زبیرؓ اور اُن

کے بڑے صاحبزادے عبداللہؓ بن زبیر جنگ جمل میں حضرت علیؓ کے مدمقابل تھے۔ ان کی بقیہ اولاد نے ان جنگوں میں کوئی حصہ نہیں لیا۔ یہ میدان صفین میں کیسے پہنچ گئے تھے۔

تاریخ اس کا نام نہیں کہ تاریخ میں سے صرف ایک پہلو کو پیش کر دیا جائے جو لکھنے والے کی منشا کے مطابق ہو اور دیگر واقعات کو نظر انداز کر دیا جائے۔ ایسے شخص کو ہرگز بھی مورخ نہیں کہا جا سکتا۔

پھر مودودی صاحب کو یہ بھی سوچنا چاہیئے تھا کہ جہاں تک صحابۂ کرام کا تعلق ہے تو انہیں صرف تاریخی نقطۂ نگاہ سے دیکھنا اور پھر اس کے مطابق فیصلہ کرنا ایسی حرکت ایک سبائی ہی کر سکتا ہے۔ لیکن اہل سنت تو پہلے انہیں قرآن کی نظر سے دیکھیں گے اور اس لحاظ سے بھی اُن پر نظر ڈالی جائے گی۔ کہ یہ حضرات حضور کی صحبت میں رہنے کی وجہ سے جہاں علم و فضل اور تزکیہ نفس میں اعلیٰ درجہ پر پہنچے ہوئے تھے۔ یہ دین اسلام اور قرآن و سنت کے اصل شاہد بھی ہیں۔ جب ان کی ذات پر حرف آجائے گا تو یہ شہادت باطل ہو جائے گی۔ نہ کتاب اللہ باقی رہے گی اور نہ سنت رسول، پھر یہ حضور کے تربیت یافتہ ہیں۔ جب یہی حضرات قرآن سے جاہل اور دین سے ناواقف ہوں گے تو پھر کتاب اللہ اور سنت رسول کو جاننے والا کون ہوگا؟ اور کیا اس سے یہ ثابت نہ ہوگا کہ حضور کسی شخص کی بھی صحیح طور پر تربیت نہ کر سکے۔

دراصل ان سبائیوں نے صحابۂ کرام کے خلاف طرح طرح کی کہانیاں وضع کیں تاکہ آہستہ آہستہ یہ زہر ذہنوں میں سرایت کر جائے۔ تو پھر قرآن و سنت کے انکار میں کوئی دشواری پیش نہ آئے گی۔ افسوس تو یہی ہے کہ مودودی صاحب جیسی ہستی بھی ان کا شکار بن گئی۔ کاش وہ شیعہ مذہب کی کتابوں کا مطالعہ کر لیتے۔ یا طبری اور دیگر مورخین پر آنکھیں بند کر کے ایمان نہ لاتے۔ اللّٰہم ارنا الحق حقا وارزقنا اتباعہ۔

چلئے ہم [illegible] عمرؓ بن [illegible] نے قرآن [illegible] مرحلہ کیا تھا

اور اُن کے پیش نظر وہی مقصد تھا جو ابو مخنف اور اس کے ہم نوا مودودی صاحب نے بیان کیا۔ لیکن شاید انہیں تو یہ بھی معلوم نہیں۔ کہ اس سے قبل جنگ جمل میں ۳۶ھ میں قرآن اٹھایا گیا۔ اور اس کی ابتدا حضرت علیؓ نے فرمائی تھی۔ اگر یقین نہیں آتا تو اپنے محبوب مؤرخ طبری سے سُن لیجئے۔ طبری لکھتا ہے۔

حضرت علیؓ نے اپنے ساتھیوں سے فرمایا۔ تم میں سے کوئی شخص اپنے آپ کو اس کام کے لئے پیش کرسکتا ہے کہ وہ قرآن اٹھا کر فریقین کے درمیان کھڑا ہوجائے۔ اور انہیں قرآن پر چلنے کی دعوت دے۔ اگر اس کا وہ ہاتھ کاٹ دیا جائے تو دوسرے ہاتھ میں قرآن لے لے۔ اور اگر دوسرا ہاتھ بھی کاٹ دیا جائے تو قرآن دانتوں سے تھام لے۔ ایک نوجوان نے اس کام کے لئے اپنے آپ کو پیش کیا۔ حضرت علیؓ کی خواہش تھی کہ کوئی اور شخص اس کام کو انجام دے۔ اس لئے آپ تمام لشکر میں گھومے اور ہر ایک کے سامنے یہ بات پیش کی۔ لیکن اس نوجوان کے علاوہ کوئی بھی اپنے آپ کو موت کے منہ میں ڈالنے کے لئے تیار نہیں ہوا۔

حضرت علیؓ نے اس نوجوان سے فرمایا یہ قرآن ان کے سامنے پیش کردو اور ان سے کہو کہ قرآن اول سے آخر تک ہمارے اور تمہارے خونوں کا فیصلہ کرے گا۔ لیکن مخالفین کے لشکر نے اس نوجوان پر حملہ کردیا۔ قرآن اسکے ہاتھ میں تھا۔ انہوں نے اس کے دونوں ہاتھ کاٹ ڈالے تو اس نے قرآن دانتوں سے تھام لیا۔ حتیٰ کہ یہ نوجوان شہید کردیا گیا۔

اس پر حضرت علیؓ نے فرمایا اب تمہارے لئے جنگ حلال ہوگئی ہے۔ تم ان سے جنگ کرو۔ اس روز ستر آدمی۔ اونٹ کی مہار (حضرت عائشہؓ کا اونٹ) تھامے ہوئے مارے گئے۔ جب اونٹ کی کونچیں کٹ گئیں اور لوگوں کو شکست ہوئی تو حضرت طلحہؓ کے ایک تیر آکر لگا جس سے وہ شہید ہوگئے۔

[illegible]

کی ہے اس کے بارے میں طبری فرماتے ہیں کہ یہ روایت مجھے سری بن اسمعیل نے لکھ کر بھیجی۔ بے شک ضرور بھیجی ہوگی۔ لیکن عالم غیب سے۔ اس لئے کہ سری۔ امام شعبی کا شاگرد اور اُن کا چچازاد بھائی ہے۔ امام شعبی کا انتقال ۱۰۵ھ میں ہوا۔ اب اگر یہ بھی مان لیا جائے کہ سری امام شعبی کے بعد پچاس سال تک زندہ رہا تب بھی طبری ۲۲۴ھ میں پیدا ہوئے۔ اب یہی صورت ہو سکتی ہے کہ جس طرح امام غائب نے اصول کافی لکھ کر عالم غیب سے روانہ کی تھی۔ اسی طرح سری نے بھی یہ روایات عالم غیب سے لکھ کر۔ طبری کے پاس روانہ کی ہوں۔

ہم سبائیوں اور ان کے ہم نواؤں سے یہ دریافت کرنا چاہتے ہیں، کہ آخر تاریخ سے صرف امیر معاویہؓ والا ہی واقعہ کیوں پیش کیا جاتا ہے، جنگ جمل والا واقعہ کس لئے نظر انداز کیا جاتا ہے۔ اس کی وجہ صاف ظاہر ہے کہ اس واقعہ سے اُن کا کوئی مفاد حاصل نہیں ہوتا جبکہ زیر بحث واقعہ سے امیر معاویہؓ اور اُن کے ساتھیوں کو ہدف بنانے کا موقعہ ملتا ہے۔ اسی لئے "خلافت و ملوکیت" میں صرف اسی واقعہ کو پیش کیا گیا۔ اور اس کی سبائی تفصیل بھی۔ پوری حذف کر دی گئی۔ یہ طریقہ کار صرف اس لئے اختیار کیا گیا تاکہ ایک فریق کا تو گھناؤنا فرضی کردار پیش کر کے لوگوں کی نظروں میں اُن کی حیثیت گرائی جائے۔ اور وہ امور جن سے حضرت علیؓ کی پوزیشن پر حرف آتا تھا۔ انہیں نظر انداز کر دیا جائے۔ ہم تو اس کے قائل ہیں کہ ہر ایسی روایت جس سے کسی صحابی کا کردار مشکوک ہوتا ہو، یا اُن کا فسق و فجور، معصیت الٰہی بد دیانتی، خیانت، ظلم اور اقربا نوازی ثابت ہوتی ہو وہ سب جھوٹ ہیں۔ ان راویوں اور مورخوں کو جھوٹا مان لینا آسان ہے۔ لیکن اُن صحابہ کے کردار پر حرف لانا جن کے مناقب سے قرآن بھرا ہوا ہے۔ بہت دشوار عمل ہے۔ یہ تو ہمارے نزدیک سراسر انکار قرآن ہے۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ قرآن اٹھانے سے اہل عراق میں ہی اختلاف کیوں پیدا ہوا۔ اہل عرب میں کیوں نہ پیدا ہوا جو ام المومنین حضرت عائشہؓ کے ساتھ تھے۔ آخر اس کے پس

پردہ کون سا راز کار فرما ہے۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ عراقیوں کو شکست کا سامنا ہو۔ اور اسے اس داستاں کے پردے میں چھپا یا گیا ہو۔ یا یہ بھی ممکن ہے کہ حضرت علیؓ کے لشکر میں پہلے سے اختلاف پایا جاتا ہو کیونکہ اُن کا لشکر مختلف قسم کے لوگوں پر مشتمل تھا۔ ان کے ساتھ عرب بھی تھے اور عراقی بھی۔ ہو سکتا ہے کہ عراقی اپنی کثرت کے بل بوتے پر عربوں کو اپنا تابع تصور کرتے ہوں۔ کیونکہ اس لشکر سے علیحدہ ہو کر جو ٹولی سامنے آئی۔ اور جو بعد میں خارجی کے لقب سے مشہور ہوئے۔ وہ سب عرب تھے، اُن کے ساتھ کوئی عراقی، ایرانی اور یہودی نہ تھا۔ اور حضرت علیؓ کو بقول مؤرخین اشتر پر زیادہ بھروسہ تھا۔ جیسا کہ گزشتہ روایات سے ظاہر ہوتا ہے۔ یہ کھچڑی اندرون خانہ پہلے سے پک رہی ہو۔ اور اُن کو صرف بہانہ کی ضرورت ہو جو اُن کو اس وقت میسر آگیا۔ ورنہ اس سے قبل جنگ جمل میں حضرت عائشہؓ نے بھی قرآن اٹھوایا تھا۔ لیکن اس وقت کوئی اختلاف پیدا نہیں ہوا۔ خود طبری کا بیان ہے۔

یہ حال دیکھ کر حضرت عائشہؓ نے کعب بن سور کو حکم دیا۔ کہ سواری سے نیچے اترو، اور قرآن اٹھاؤ، اور انہیں کتاب اللہ کی دعوت دو۔ حضرت عائشہؓ نے اپنا قرآن کعب بن سور کو دے دیا۔ کعب قرآن لے کر آگے بڑھے۔ اور مخالفین کے سامنے گئے۔ لیکن لشکر علیؓ میں آگے آگے سبائی تھے۔ انہیں برابر یہ خطرہ لاحق تھا کہ صلح نہ ہو جائے۔ کعب جب قرآن لے کر آگے بڑھے تو یہ کعب کے سامنے آگئے۔ حضرت علیؓ پیچھے لشکر میں تھے۔ وہ یہ سمجھ رہے تھے کہ مخالف جنگ کے علاوہ کسی اور چیز پر تیار نہیں۔ جب کعب نے اُن کے سامنے قرآن پیش کیا۔ تو اِن لوگوں نے انہیں نیزے مار مار کر ختم کر دیا۔ اور حضرت عائشہؓ کے ہودج کو تیروں کا نشانہ بنا لیا۔ طبری جلد سوم ج ۲ ص ۱۹۳۔

اس واقعہ سے چند امور سامنے آتے ہیں۔

۱۔ حضرت عائشہؓ اور حضرت علیؓ دونوں جنگ پسند نہ کرتے تھے۔ اور ہر صورت میں صلح کے خواہاں تھے۔

۲۔ سبائی یہ چاہتے تھے کہ صلح نہ ہو۔

۳۔ سبائیوں نے جنگ جمل میں قرآن کا کوئی احترام نہیں کیا۔ کعب بن سور کو قتل کیا۔ اور حضرت عائشہؓ کے ہودج پر تیر برسائے۔ جس سے جنگ چھڑ گئی۔

۴۔ جنگ جمل میں قرآن اٹھانے سے عراقیوں پر کوئی تاثر پیدا نہیں ہوا۔ اور نہ اُن میں کوئی اختلاف واقع ہوا۔ تو جنگ صفین میں آخر یہ اختلاف کیوں واقع ہوا۔

۵۔ کیا اس کی یہ وجہ تو نہیں کہ جنگ جمل میں انہیں اپنی فتح کا یقین تھا۔ اس لئے کوئی اختلاف واقع نہیں ہوا اور کعب بن سور کو قتل کر دیا گیا لیکن شامیوں نے جب قرآن اٹھائے تو ان میں اتنی قوت ہی نہ تھی کہ انہیں قتل کر سکتے۔ دوسری جانب وہ عربوں کی صلح بھی برداشت نہ کر سکتے تھے۔ لہٰذا سوچی سمجھی اسکیم کے تحت۔ آپس میں اختلاف پیدا کر کے جنگ سے جان چھڑائی۔ اور الزام امیر معاویہؓ اور ان کے ساتھیوں کے سر رکھ دیا۔

اگر واقعتاً یہ ایسے ہی ایماندار اور باوفا ہوتے تو حسنؓ امیر معاویہؓ سے صلح کر کے ان سے اپنی جان کیوں چھڑاتے۔

رہا امیر معاویہؓ کے پیش نظر اس عمل سے وہی مقصد تھا۔ جو حضرت حسنؓ کی صلح سے قبل تھا۔ انہوں نے فرمایا تھا کہ جب اِدھر کے لوگ بھی ختم ہو جائیں گے اور اُدھر کے افراد بھی ختم ہو جائیں گے۔ تو بیواؤں کا معاملہ کس طرح حل ہوگا۔ مقتولین کے چھوڑے ہوئے اموال کا کون بندوبست کرے گا (ص ۲۷۳ بخاری ج ۲) یہی فکر اس وقت بھی دامن گیر ہوگی۔

ہاں ہم مودودی صاحب سے یہ سوال ضرور کریں گے کہ آپ ہمیں ذرا نیزے پر قرآن اٹھا کر تو دکھائیں۔ چلئے آپ ایک نوک دار چھری پر اپنے گھر ہی میں قرآن اٹھانے کی مشق فرمالیں آپ کو حقیقت کا خود اندازہ ہو جائے گا۔ یہ اس وقت تک ممکن نہیں جب تک کہ نیزے کو قرآن پر مار کر اس کے عین درمیان میں داخل نہ کر دیا جائے۔ طبری اور ابو مخنف نے جہاں

اور تماشے دکھائے ہیں۔ وہاں یہ تماشا بھی عجیب ہے۔ کہ جنگ جمل میں تو قرآن ہاتھوں میں اٹھوایا پھر اٹھانے والوں کو شہید کرادیا۔ لیکن جب امیر معاویہؓ کا معاملہ آیا۔ تو قرآن نیزوں پر ...وایا گیا۔ اس لئے کہ عراقی شامیوں کے قتل کی طاقت ہی نہ رکھتے تھے۔ اسی لئے اختلاف ...انہ تلاش کیا گیا۔

ہمارے قارئین ذرا یہ بھی سوچ لیں کہ جنگ جمل کے وقت حضرت علیؓ اور حضرت ...ؓ کو اٹھانے کے لئے صرف ایک قرآن دستیاب ہوا۔ جب کہ امیر معاویہؓ کے بہت سے ... قرآن اٹھائے ہوئے تھے۔ اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ شامیوں میں سے ہر ایک کے پاس ... جود تھا۔ ایسی صورت میں ظاہر ہے کہ شامی سب ہی قرآن کی تلاوت کرتے اور عربی ہونے ... سمجھتے ہوں گے۔ نہ کہ اشتر جیسے تخریب کار۔

ہماری اس تحریر سے جہاں تاریخ کا سیاہ رخ ہمارے سامنے آیا۔ وہاں یہ بات بھی کھل ...آگئی۔ کہ علامہ مودودی نے "خلافت وملوکیت" میں دل و جان سے سبائیوں کی وکالت ... اسی لئے انہوں نے امام ابن العربی، امام ابن تیمیہ، امام ابن حزم، شاہ ولی اللہ، اور ...بدالعزیز کی کسی کتاب سے استفادہ کرنا پسند نہیں کیا۔ کیونکہ بقول مودودی صاحب یہ ...نت اہل سنت کے وکیل صفائی ہیں۔ اور مودودی صاحب نے سبائیوں کی وکالت ... ذمہ لے رکھی تھی۔ اب وہ وکیل صفائی کی بات کیسے برداشت کرتے۔ لیکن ہم تب بھی ان کے شکر گزار ہیں کہ نہ وہ کتاب تحریر فرماتے اور نہ اہل سنت کی آنکھیں کھلتیں۔

سیدۃ النساء کون؟

متقدمین علمائے اہل سنت میں یہ مسئلہ مختلف فیہ رہا ہے کہ اس امت کی عورتوں میں سب سے زیادہ افضلیت کسے حاصل ہے۔ بعض حضرات اس کے قائل ہیں کہ سبقت اسلام اور حضور کے ساتھ مصائب برداشت کرنے کے سبب ام المومنین حضرت خدیجہؓ کو سب پر فضیلت حاصل ہے، بعض حضرات ام المومنین حضرت عائشہؓ کو فضیلت دیتے ہیں۔ اور بعض حضرات اس میں اس طرح تطبیق دیتے کہ سبقت اسلام کے باعث ام المومنین حضرت خدیجہؓ کو، اور بلحاظ علم ام المومنین حضرت عائشہؓ کو فضیلت حاصل ہے۔ تمام ائمہ محدثین اور فقہاء ان تین مسلکوں میں سے ایک نہ ایک مسلک کے قائل ہیں۔ متقدمین میں سے کوئی اس کا قائل نہ تھا کہ حضرت فاطمہؓ کو ان امہات المومنین میں سے کسی پر فضیلت حاصل ہے۔

سبائیوں کا مسلک اس سلسلہ میں ہمیشہ جداگانہ رہا ہے۔ ان کے نزدیک پنج تن اس دنیا کی مٹی سے پیدا ہی نہیں ہوئے۔ بلکہ ان پانچوں کا مادہ نور الٰہی ہے۔ اور حضرت فاطمہؓ جنت کے اس سیب کھانے کے باعث پیدا ہوئی تھیں۔ جو حضور نے معراج میں کھایا تھا۔ اور پھر آکر حضرت خدیجہؓ سے ہم بستر ہوئے جس سے حضرت فاطمہؓ عالم وجود میں آئیں۔ سبائیوں کا دعوی ہے کہ انہیں خاتون جنت اسی لئے کہا جاتا ہے۔ حالانکہ حضرت خدیجہؓ معراج سے قبل انتقال فرما چکی تھیں۔ اب یہ ان ہی سے پوچھئے کہ حضرت فاطمہؓ کس کی اولاد ہیں؟

نیز معراج ہجرت سے ایک سال قبل واقع ہوئی ہے۔ اس کا مقصد یہ ہوا کہ حضرت فاطمہؓ ہجرت سے کچھ روز پیشتر پیدا ہوئیں۔ اور شادی کے وقت اُن کی عمر تین، ساڑھے تین

سال تھی۔ اگر آپ سبائیوں کے اس مفروضہ کو تسلیم نہ کریں گے۔ یا آپ کو اس میں کوئی اشکال واقع ہوا۔ تو یہ آپ حضرات جانیں اور سبائی جانیں، ہاں اس کا نتیجہ یہ ضرور برآمد ہوگا کہ حضرت فاطمہؓ خاتون جنت باقی نہ رہیں گی۔ اور انہیں خاتون جنت باقی رکھنے کے لئے یہ ضروری ہے کہ آپ حضرات اس داستاں پر ایمان لے آئیں۔ کیونکہ سُنی وہی ہوتا ہے جو ہر سُنی سنائی بات پر ایمان لے آئے۔

ہمارے نزدیک اس قسم کی تمام روایات جہاں موضوع ہیں۔ وہاں وہ صرف اس مقصد کے لئے وضع کی گئی ہیں کہ اہل سنت حضرات کو اُن کے صحیح مسلک سے ہٹا کر انہیں داستانوں میں گم کر دیا جائے۔ ورنہ خود ان سبائیوں کے نزدیک سیدہ النساء حضرت فاطمہ بنت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نہیں، بلکہ فاطمہ بنت اسد مراد ہیں۔ اس کی تشریح ہم آخر مضمون میں پیش کریں گے۔

اس وقت ہمارا روئے سخن اہل سنت حضرات کی جانب ہے۔ ایک جانب تو وہ اس کے دعویدار ہیں کہ تمام جہاں میں سب سے افضل حضرت خدیجہؓ اور حضرت عائشہؓ ہیں۔ دوسری جانب وہ حضرت فاطمہؓ کو سیدۃ نساء العالمین اور سیدۃ نساء اہل الجنۃ کے خطابات سے نوازتے ہیں۔ حتیٰ کہ ہمارا کوئی خطبہ اس ذکر سے خالی نہیں ہوتا۔

اس سلسلہ میں اہل سنت تضاد کا شکار ہیں۔ جس کی وجہ اول تو یہ ہے کہ سبائی پروپیگنڈہ مشنری جو چودہ سو سال سے یہ راگ الاپتی آرہی ہے۔ تو اس طویل پروپیگنڈے کے باعث ہم ذہنی طور پر خود سبائی بن چکے ہیں۔ دوسری جانب ہم میں روایت پرستی کا مادہ اتنی گہری جڑ پکڑ چکا ہے کہ ہم کسی روایت پر غور کرنے کے لئے تیار نہیں۔ اور پھر بخاری و مسلم کی ایک روایت نے اس تخیل کو مزید گہرائی عطا کر دی ہے۔ اور ان حضرات نے یہ تصور کر لیا ہے کہ بخاری و مسلم کی کسی روایت میں کسی غلطی کا کوئی امکان نہیں۔ اور یہ تک نہیں سوچتے کہ یہ حضرات انسان تھے خواہ وہ اپنی جانب سے صحت کی کتنی بھی سعی کریں لیکن انسان

ہونے کے سبب غلطی اور بھول سب کچھ ممکن ہے۔

پھران دونوں حضرات نے یہ روایات بہرصورت انسانوں سے نقل کی ہیں اور ان میں سے ہر راوی کے ساتھ غلطی اور بھول کا امکان ہے۔ اور عام طور پر بخاری و مسلم اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے درمیان چار پانچ راوی ہوتے ہیں۔ گویا کہ پانچ احتمالات تو بھول کے پیدا ہوتے۔ اور پانچ احتمالات خطا کے پیدا ہوتے۔ اس طرح کوئی روایت دس احتمالات سے خالی نہیں ہوتی۔ یہ احتمالات تو اس وقت ہیں جب کہ تمام راوی ثقہ ہوں۔ اور کسی راوی کی ثقاہت میں اختلافات پیدا ہو جائے تو مزید احتمالات پیدا ہو جائیں گے۔

کاش ہمارے علماء یہ بھی سوچیں، کہ ہم جب کسی شخص کے بارے میں یہ فیصلہ کرتے ہیں کہ فلاں شخص معتبر ہے۔ زبردست عالم ہے۔ سچا ہے اور قابل اعتماد ہے۔ یا فلاں شخص کذاب ہے اور ناقابل اعتبار ہے۔ یہ بھی ہمارا فیصلہ ظنی ہوتا ہے۔ جو کبھی سنی سنائی باتوں پر مبنی ہوتا ہے۔ اور کبھی تجربات پر۔ لیکن یہ ضروری تو نہیں کہ جس کے بارے میں ہم یہ فیصلہ دے رہے ہیں کہ وہ نہایت سچا اور دیندار انسان ہے۔ اس کا ظاہر و باطن یکساں ہو۔ ہو سکتا ہے کہ یہ سب کچھ ڈھونگ ہو۔ اسی طرح جب کسی کو کذاب کہا جاتا ہے تو یہ کوئی ضروری نہیں کہ اس نے زندگی میں ہر موقعہ اور ہر مقام پر جھوٹ ہی بولا ہو۔ کبھی نہ کبھی تو اس نے سچ بات بھی کہی ہوگی۔ یہ امور اس کا بین ثبوت ہیں کہ جب کسی کتاب یا کسی حدیث کے بارے میں یہ فیصلہ دیا جاتا ہے کہ یہ صحیح ہے تو ہمارا یہ فیصلہ بھی ظنی ہوتا ہے۔ قطعی علم تو صرف اللہ تعالیٰ کو حاصل ہے۔ اسی لئے تمام فقہاء و محدثین اس کے قائل رہے ہیں کہ قطعی شے تو صرف کتاب اللہ ہے۔ اور احادیث جتنی بھی ہیں ظنی ہیں۔ یہ دوسری بات ہے کہ کسی حدیث میں ظن زیادہ پایا جاتا ہے۔ اور کسی میں کم۔ جس حدیث میں ظن کم پایا جائے گا۔ اس کے بارے میں اغلب گمان صحت کا ہوگا۔ اور جس میں زیادہ پایا جائے گا۔ اس میں اغلب گمان ضعف کا

ہو گا۔ دنیاوی امور میں بھی اسی طرح ہوتا ہے۔ بلکہ یہ کاروبار عالم ظنیات پر چل رہا ہے۔

اس امر پر ایک اور طرح غور کیجئے کہ ایک راوی ایسا ہے۔ جس کے بارے میں اختلاف ہے۔ بعض محدثین اسے ثقہ اور معتبر قرار دیتے ہیں اور بعض نامعتبر۔ بعض حضرات کو اس کا تجربہ ہے۔ اور بعض حضرات دوسروں کے فیصلے کو دیکھتے ہوئے ایک فیصلہ دیتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ ان دونوں طبقوں میں سے کسی کو مجرم قرار نہیں دے سکتے۔ لیکن بہر صورت دوسروں کو بھی فیصلے کا حق باقی رہے گا۔

لیکن آج کے دور میں ہمارے علماء اپنی کم علمی کے باعث۔ حدیث، فقہ، تفسیر اور دیگر مضامین کی تمام روایات پر آنکھیں بند کر کے ایمان لے آتے ہیں۔ اور جو شخص بھی کسی روایت پر فن جرح و تعدیل، اسماء الرجال، علم الروایہ اور علم الدرایہ کے ذریعہ بحث کرتا ہے۔ وہ یا تو منکر حدیث قرار دیدیا جاتا ہے۔ یا خارجی۔ حالانکہ یہ تمام فنون محدثین کرام نے اسی لئے وضع کئے تھے کہ روایات کو تنقید کی کسوٹی پر پرکھتے رہو، اور صدیوں اس پر عمل ہوتا رہا ہے۔ اور دیگر ممالک اسلامیہ میں آج بھی اس پر عمل ہو رہا ہے۔ لیکن ہند و پاکستان میں یہ ایک زبردست جرم بن چکا ہے۔ کیونکہ ہمارے علماء ان فنون سے خود ناواقف ہیں اور وہ ہرگز یہ برداشت کرنے کے لئے تیار نہیں کہ ان کی ذات پر لاعلمی کا الزام قائم ہو۔ اس لئے ان حضرات کی لابی نے متفقہ طور پر یہ فیصلہ کر رکھا ہے کہ جہاں بھی کوئی ناک والا نظر آئے، اسے دنیا میں نکو بنا دو۔ جس کے نتیجے میں وہ ہماری جانب انگلی نہ اٹھا سکے۔ اور ہماری دکانداری علی حالہ قائم رہے۔

یہ امور میں اس لئے بیان کرنے پر مجبور ہوا کہ ایک زمانہ میں جب مودودی صاحب کے خلاف کفر کی مشینیں کام کر رہی تھیں، اور ان کے بارے میں مختلف الزامات قائم کئے جا رہے تھے۔ تو میں نے اُن الزامات کو کلی طور پر قبول نہیں کیا۔ تو مجھ پر مودودیت کا فتویٰ چسپاں کیا گیا۔ حالانکہ مودودی جماعت مجھے اپنا سب سے بدترین مخالف تصور کرتی تھی۔ جب میں نے پیر کالونی میں درس قرآن کا سلسلہ شروع کیا تو چونکہ وہ ایک اہل حدیث کے گھر

میں ہوتا تھا۔اس لئے مجھ پر ایک بہت بڑے شیخ الحدیث نے جواب مرحوم ہو چکے ہیں۔ غیر مقلد ہونے کا فتویٰ جاری کیا۔حالانکہ اُسی دور میں غیر مقلدین اور غربائے اہل حدیث نے میری تقاریر سُن کر مجھے وکیل ابی حنیفہ کا خطاب دیا۔

موجودہ دور میں بعض حضرات نے صرف اس بناء پر کہ میں نے بعض داستانوں اور روایات پر جرح کی ہے مجھے منکر حدیث قرار دیا۔اور ایک اور شیخ الحدیث نے فرمایا کہ حبیب الرحمان کا فلاں شخص سے دوستانہ ہے اور وہ خارجی ہے۔لہٰذا حبیب الرحمان بھی خارجی ہے حالانکہ اس خارجیت کے مسئلہ میں میری ان حضرات سے کافی تیز گفتگو ہو چکی تھی جن پر خارجیت کا الزام ہے۔اب میں نہیں جانتا کہ میں کیا ہوں ؟اس کا فیصلہ تو قارئین کرام ہی کر سکیں گے کہ میں واقعتاً کیا ہوں۔ہاں یہ بتانا ضروری سمجھتا ہوں کہ میں کسی صحابی کی شان میں گستاخی برداشت نہیں کر سکتا اور نہ کسی ایسی روایت کو قبول کرنے کے لئے تیار ہوں کہ جن میں صحابہ کرام کی جانب ایسی باتیں منسوب کی گئی ہوں کہ جن سے اُن کی اُس عظمت پر فرق آتا ہو جو قرآن نے اُن کے متعلق بیان کی ہے۔میں صحابہ کو تاریخ یا روایات کے آئینہ میں دیکھنے کے لئے تیار نہیں۔میں تو انہیں قرآن کے آئینہ میں دیکھتا ہوں جو اُن کے فضائل سے معمور ہے۔

موجودہ علماء کا علمی مقام یہ ہے کہ ایک صاحب نے میرے سامنے موضوعات کبیر کو موضوعات شریف سے تعبیر کیا۔اور فرمانے لگے یہ روایت موضوعات شریف میں پائی جاتی ہے۔حالانکہ موضوعات کبیر ملا علی قاری کی وہ تصنیف ہے جس میں انہوں نے مشہور عام روایات کو نقل کر کے اُن کا جھوٹا اور موضوع ہونا ثابت کیا ہے۔غالباً ان حضرت نے اس کتاب کا صرف نام ہی سنا تھا۔کبھی زیارت شریف نصیب نہیں ہوئی تھی۔

اکثر بڑے بڑے علماء جو شیخ الحدیث کے منصب پر فائز ہوتے ہیں۔وہ متعدد جگہ حوالوں میں لکھتے ہیں کہ اس حدیث کو ابن ابی عدی نے روایت کیا ہے۔حالانکہ وہ اپنی کتاب میں صرف وہی روایات نقل کرتے ہیں جنہیں وہ قابل اعتماد تصور نہیں کرتے۔جو بھی روایت وہ پیش

کرتے ہیں۔ وہ ان کے نزدیک قطعاً صحیح نہیں ہوتی۔ بلکہ وہ اس روایت کو پیش کرکے ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ فلاں راوی ہمارے نزدیک ضعیف ہے۔ اور اس کی وجہ یہ منکر روایت ہے۔

جب علماء کی لاعلمیت کا یہ حال ہو تو عوام بے چاروں کا کیا حشر ہوگا! اسی وجہ سے میں عوام کو قابلِ مواخذہ تصور نہیں کرتا۔ اصل مجرم تو ہمارے نام نہاد علماء ہیں۔

اب آیئے۔ اُس اصل حدیث کی جانب جس کے باعث ہمارے علماء کو مغالطہ واقع ہوا۔ اور جس کی وجہ سے حضرت فاطمہؓ کو سیدۃ النساء اہل الجنۃ قرار دیا گیا۔ یہ حدیث بخاری و مسلم میں پائی جاتی ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ ام المؤمنین حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی جب علالت شروع ہوئی۔ تو ازواج مطہرات ہر وقت آپ کے پاس رہتیں۔ اور ایک لمحہ کے لئے بھی آپ سے جدا نہ ہوتیں۔

ایک دن آپ کو دیکھنے کے لئے فاطمہؓ آئیں۔ فاطمہؓ کی چال ڈھال بالکل نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے مشابہ تھی۔ آپ نے جب انہیں دیکھا تو مرحبا کہہ کر اُن کا استقبال کیا۔ اور ان کو دائیں یا بائیں جانب بٹھا لیا۔ پھر اُن سے کچھ سرگوشی فرماتے رہے جس پر حضرت فاطمہؓ رونے لگیں۔ آپ نے پھر دوبارہ سرگوشی فرمائی تو فاطمہؓ ہنسنے لگیں۔ میں نے اپنے دل میں خیال کیا کہ آج آپ نے اپنی ازواج کو چھوڑ کر بیٹی سے ایسی کیا خاص بات کی ہے۔ جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کھڑے ہو گئے۔ تو میں نے فاطمہؓ سے سوال کیا۔ تمہاری حضور سے کیا راز و نیاز کی باتیں ہوئیں۔ انہوں نے جواب دیا میں حضور کا راز افشا نہیں کر سکتی۔

جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات ہو گئی، تو میں نے فاطمہؓ سے کہا کہ میرا تم پر حق ہے (یعنی ماں ہونے کا) لہٰذا تم سے حضور نے جو گفتگو کی تھی، وہ بیان کرو۔ انہوں نے فرمایا اب کوئی حرج کی بات نہیں۔ حضور نے مجھ سے پہلی بار فرمایا تھا کہ جبرئیل مجھ سے ہر سال ایک بار قرآن کا ورد کرواتے، اور اس سال مجھ سے دو بار قرآن کا ورد کروایا ہے۔ لہٰذا میں سمجھتا

ہوں کہ میری موت قریب آگئی ہے۔ تو اب تو اللہ سے ڈر اور صبر کر۔ میں اس پر رونے لگی۔ جب آپ نے میری یہ حالت دیکھی، تو آپ نے مجھ سے دوبارہ سرگوشی فرمائی۔ اور فرمایا

اما ترضی ان تکون سیدۃ	کیا تو اس پر راضی نہیں کہ تو مؤمنین
نساء المؤمنین او سیدۃ نساء	کی عورتوں کی سردار ہو۔ یا اس امت
ھذہ الامۃ۔	کی عورتوں کی سردار ہو۔

میں اس بات پر ہنسنے لگی۔ مسلم ج ۲ صفحہ ۲۹۰

بخاری میں آخری الفاظ یہ ہیں۔

اما ترضین ان تکونی سیدۃ	کیا تو اس پر راضی نہیں کہ تو جنتی عورتوں
نساء اھل الجنۃ او نساء	کی سردار ہو یا مؤمنین عورتوں کی۔
المؤمنین۔ بخاری ج ۱ صفحہ ۵۱۲۔	

یہ ہے۔ وہ اصل حدیث جسے پیش نظر رکھتے ہوئے ہمارے علماء نے حضرت فاطمہؓ کو سیدۃ نساء اہل الجنہ کے خطاب سے نوازا۔ حالانکہ راوی اول تو خود شبہ میں مبتلا ہے کہ آپ کے الفاظ کیا تھے۔ پھر بخاری کے الفاظ جداگانہ ہیں۔ اور مسلم کے جداگانہ۔ بہرصورت ان تین خطابات میں سے، یعنی سیدۃ نساء اہل الجنہ، سیدۃ نساء المؤمنین اور سیدۃ نساء ہذہ الامہ، صرف ایک خطاب تھا جو راویوں کو یاد نہیں رہا۔ اور جب راویوں کو خود ہی شک ہو رہا ہے۔ تو کسی ایک خطاب کو صحیح ماننے کی کیا دلیل ہے؟

صحیح بخاری اور صحیح مسلم میں حضرت ابوہریرہؓ سے مروی ہے کہ حضرت جبرائیل ہر سال جتنا قرآن نازل ہو چکا ہوتا۔ اس کا رمضان میں حضور سے ایک بار ورد کرواتے۔ لیکن آخر سال جس میں آپ کی وفات ہوئی دو بار ورد فرمایا۔ صحیح بخاری ج ۲ صفحہ ۷۴۸

گویا یہ کوئی ایسی بات نہ تھی جو کسی سے مخفی ہو۔ بلکہ اسے ہر کوئی جانتا تھا۔ اور حضور متعدد مواقع پر اس کا اظہار فرما چکے تھے کہ اب میں اللہ تعالیٰ سے ملاقی ہونے والا ہوں۔

حجۃ الوداع کے موقعہ پر بھی آپ نے اس کا اظہار فرمایا۔ لہٰذا یہ کوئی راز کی بات نہیں رہی تھی۔ اور آخری رمضان میں جہاں آپ نے دو بار ورد فرمایا تھا۔ وہاں آپ نے بیس دن کا اعتکاف بھی فرمایا تھا اور تراویح کی ابتدا بھی کی تھی۔ لہٰذا ایسی بات نہ تھی جو حضرت فاطمہؓ سے مخفی رہی ہو۔

رہ گیا خطابات کا مسئلہ، تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے متعدد صحابہ کے مناقب بیان فرمائے، اور ان کی دنیوی یا اخروی فضیلت کا اظہار فرمایا۔ انہیں رضائے الٰہی اور جنت کی بشارت دی۔ لیکن ان حضرات کے سلسلہ میں کسی موقعہ پر بھی آپ نے اخفا سے کام نہیں لیا۔ آخر حضرت فاطمہؓ کی فضیلت بیان کرنے میں ایسی کون سی رکاوٹ پیش آ رہی تھی۔ جو آپ نے خلاف معمول اخفا سے کام لیا؟ اور اس میں ایسی کیا خاص بات تھی جو وفات رسول تک ظاہر نہیں کی جا سکتی تھی؟ یہ کوئی علم باطن کا مسئلہ نہ تھا، جسے ظاہر نہیں کیا جا سکتا تھا۔ اور حضرت فاطمہؓ جھوٹ بھی نہ بول سکتی تھیں، جس کے کھل جانے کا احتمال ہو۔

جہاں تک اس کے راویوں کا تعلق ہے تو اس واقعہ کو ام المومنین حضرت عائشہؓ سے مسروق نقل کر رہے ہیں۔ اور مسروق سے اسے شعبی نے نقل کیا ہے۔ یہ دونوں حضرات تابعی ہیں، ان حضرات کی ذات پر کسی نے کلام نہیں کیا۔ اور حقیقت بھی یہ ہے کہ ان حضرات کی ذات شک و شبہ سے بالا ہے۔ لیکن شعبی سے اس واقعہ کو نقل کرنے والا فراس بن یحییٰ ہے۔

فراس بن یحییٰ۔ یہ ہمدان کا باشندہ ہے۔ کوفہ میں سکونت اختیار کر لی تھی۔ ذہبی لکھتے ہیں۔ کہ اسے متعدد ائمہ حدیث نے ثقہ قرار دیا ہے۔ لیکن امام یحییٰ بن سعید القطان نے اس کی ایک حدیث کو منکر قرار دیا۔ میزان ج ۳ ص ۳۴۳

حافظ ابن حجر فرماتے ہیں یہ صدوق (سچا) ہے۔ لیکن اسے وہم ہوتا ہے۔ تقریب ص ۲۷۴

اصول حدیث جاننے والے اس بات سے خوب واقف ہیں کہ جب کسی راوی کو معتبر قرار دیا جاتا ہے تو اس کے لئے درجات کے لحاظ سے مختلف الفاظ کا استعمال کیا جاتا ہے۔ مثلاً حافظ، حجۃ، ثبت، ثقہ، ثقہ ثقہ دو بار۔ ثقہ ایک بار اور صدوق وغیرہ۔ ان میں سب سے کم درجہ

کا لفظ صدوق ہے۔ ابن حجر نے فراس کے لیے یہی لفظ استعمال کیا ہے۔ یہ ایسے راوی پر بولا جاتا ہے جس کے ناقابل اعتبار ہونے کا کوئی ثبوت موجود نہ ہو۔ لیکن اُس پر اطمینان بھی نہ ہو۔ ایسے شخص کی روایت شہادت کے طور پر تو قبول کر لی جاتی ہے لیکن اسے ہرگز حجت تصور نہیں کیا جا سکتا۔ اس فراس کا انتقال ۱۲۹ھ میں ہوا۔

فراس تک اس روایت کا ہر راوی ہر زمانہ میں ایک ایک شخص رہا ہے۔ یعنی ام المومنین سے مسروق کے علاوہ اسے کوئی روایت نہیں کرتا۔ مسروق سے شعبی کے علاوہ کوئی روایت نہیں کرتا۔ اور شعبی سے فراس کے علاوہ کوئی روایت نہیں کرتا۔ اور یہ ایرانی النسل ہے۔ گویا دوسری صدی کی ابتدا تک اس روایت کو ایک ایک شخص کے علاوہ کوئی نہ جانتا تھا۔ ہاں فراس سے اسے دو شخص نقل کر رہے ہیں۔ زکریا بن ابی زائدہ۔ اور ابو عوانہ۔

زکریا بن ابی زائدہ: ان کا شمار کوفہ کے اہل سنت علماء میں ہوتا ہے۔ حافظ ابن حجر فرماتے ہیں۔ یہ ثقہ ہیں حافظ الحدیث ہیں۔ لیکن ان میں تدلیس کا مرض ہے۔ تقریب ص۱۰۷

امام ذہبی فرماتے ہیں۔ یہ صدوق ہیں۔ مشہور ہیں اور حافظ ہیں۔ امام شعبہ امام یحیٰی القطان اور ابو نعیم نے اس سے احادیث روایت کی ہیں۔ امام احمد فرماتے ہیں یہ ثقہ ہے۔ اس کی حدیث شیریں ہوتی ہے۔ یحیٰی بن معین کا قول ہے کہ یہ صالح ہے (یہ بھی صدوق کے ہم پلہ ہے) ابو زرعہ کہتے ہیں کچھ کچھ اچھا ہے۔ لیکن شعبی کی روایات میں اکثر تدلیس سے کام لیتا ہے۔ ابو حاتم کا قول ہے کہ اس کی حدیث میں کمزوری ہوتی ہے۔ ابو داؤد کہتے ہیں ثقہ ہے۔ لیکن تدلیس سے کام لیتا ہے۔ میزان ج ۲ ص۷۳۔ ۱۴۹ھ میں اس کا انتقال ہوا۔

عبدالرحمان بن ابی حاتم لکھتے ہیں۔ زکریا بن ابی زائدہ ہمدان کا باشندہ ہے۔ ابو یحیٰی اعمیٰ کا غلام تھا۔ یہ شعبی اور ابو اسحاق الہمدانی سے روایت کرتا ہے۔ یحیٰی بن سعید القطان فرماتے ہیں۔ اس میں کوئی برائی تو نہیں۔ لیکن یہ اسماعیل بن خالد جیسا نہیں ہے امام احمد

کا قول ہے کہ یہ ابواسحاق سے جو روایات نقل کرتا ہے۔ وہ کمزور ہوتی ہیں۔ امام ابوحاتم رازی فرماتے تھے اس کی حدیث کمزور ہوتی ہے۔ کیونکہ یہ تدلیس سے کام لیتا ہے۔ ابوزرعہ کہتے ہیں۔ یہ بہت تدلیس کرتا ہے۔ الجرح والتعدیل ج ۳ صـ ۵۹۴

تدلیس : تدلیس کے معنی ہیں عیب چھپانا۔ یہ محدثین کی ایک اصطلاح ہے۔ اور اس سے مراد یہ ہوتی ہے کہ درمیان سے راوی گرا کر روایت کو اُس سے اوپر کے راوی کی جانب منسوب کر دیا جائے۔ اور ایسے الفاظ میں روایت کو بیان کیا جائے کہ دوسرے کو یہ احساس نہ ہو کہ درمیان سے راوی گر گیا ہے۔ اس عیب کا نام تدلیس ہے۔ اور جو شخص یہ حرکت کرتا ہے اسے مدلس کہتے ہیں۔ جو افراد اس مرض میں مبتلا ہوتے ہیں وہ درمیان سے ضعیف راوی کو گرا دیتے ہیں۔ اور اس طرح اس کے ضعف کو چھپاتے ہیں۔ یہ عیب زکریا میں بے پناہ پایا جاتا ہے۔

گویا اس روایت کے دو راوی ایسے ہوئے جن پر کلی اعتماد نہیں کیا جا سکتا۔ ایک فراس بن یحیٰی جو وہم کا شکار ہے۔ اور دوسرا زکریا۔ جو تدلیس کے مرض میں مبتلا ہے۔

زکریا سے اس روایت کو نقل کرنے والا فضل بن دکین ہے۔

فضل بن دکین : اس کی کنیت ابونعیم ہے۔ اور یہ کنیت ہی سے مشہور رہے۔ حافظ ذہبی فرماتے ہیں۔ یہ حافظ الحدیث ہے حجت ہے۔ لیکن شیعہ تھا۔ اگرچہ غالی شیعہ نہ تھا۔ اور صحابہ کو گالیاں نہ دیتا تھا۔ امام یحیٰی بن معین فرماتے ہیں۔ جب یہ ابونعیم کسی شخص کی تعریف کرے اور کہے کہ یہ ایسا اور ویسا ہے اور بہت اچھا آدمی ہے تو سمجھ لو کہ وہ ضرور شیعہ ہے۔ اور جب کسی کی برائی کرے کہ فلاں شخص مرجیٔ ہے۔ تو وہ ضرور اہل سنت ہے۔ اس کا انتقال ۲۱۹ھ ہوا۔ میزان ج ۳ صـ ۳۵۸

مرجیہ : [illegible] اس کا قائل تھا کہ ایمان لانے کے بعد کسی عمل کی کوئی ضرورت نہیں۔ اللہ کی رحمت سے

سب بخشے جائیں گے۔ متقدمین علماء نے اس فرقہ کو گمراہ قرار دیا تھا جس کا نتیجہ یہ برآمد ہوا کہ جسے بدنام کرنا ہوتا اسے مرجئ کہہ دیا جاتا۔ جیسے عبدالقادر جیلانی نے غنیۃ الطالبین میں مرجیہ کو گمراہ قرار دیتے ہوئے لکھا ہے کہ ابوحنیفہ بھی مرجئ تھے۔

لیکن سبائی مرجئ اس شخص کو کہتے ہیں جو تمام صحابہ کو حق پر سمجھتا ہو۔ اور حضرت علیؓ کے مخالفین کو باغی اور گمراہ قرار نہ دیتا ہو۔ اس لحاظ سے امام ابوحنیفہ اور بڑے بڑے ائمہ پر مرجئ ہونے کا الزام لگایا گیا۔ بعد کے علماء سبائیوں کی اس چال کو نہ سمجھ سکے۔ اور انہوں نے یہ کہا مرجئ صرف وہی شخص ہے جو اعمال کا منکر ہو۔ حالانکہ امام یحیٰ بن معین نے شیعوں کے مقابلہ میں اہل سنت کو مرجئ قرار دیا ہے۔

آمدم برسر مطلب۔ بخاری میں یہ روایت ان ہی راویوں کے ذریعہ مروی ہے اور سیدۃ نساء اہل الجنۃ کے الفاظ اسی روایت میں پائے جاتے ہیں اور مسلم کی روایت میں نہیں پائے جاتے۔ کیونکہ اس میں کوئی شیعہ راوی نہیں۔ اور بخاری کا استاد فضل بن دکین شیعہ ہے۔ گویا یہ ساری کرم فرمائی اسی ابونعیم کی ہے۔

اب رہ گیا مسلم کی روایت کا مسئلہ۔ مسلم میں یہ روایت فراس سے ابوعوانہ کے ذریعہ مروی ہے۔

ابوعوانہ : اس کا نام وضاح بن عبداللہ الواسطی ہے۔ یہ اپنی کنیت سے مشہور ہے۔ حافظ ابن حجر فرماتے ہیں۔ ثقہ ہے ثبت ہے۔ تقریب ص ۳۶۹۔

ذہبی لکھتے ہیں اس کے ثقہ ہونے پر سب کا اتفاق ہے کہ اس کی لکھی ہوئی روایات بہت عمدہ ہوتی تھیں۔ ہاں ابوحاتم رازی فرماتے ہیں جب یہ اپنے حافظہ سے روایات بیان کرتا ہے تو غلطیاں کرتا ہے۔ میزان ج ۴ ص ۳۳۴

گویا ابوعوانہ، زکریا بن ابی زائدہ سے کہیں بہتر و اعلیٰ ہے جو بخاری کا راوی ہے۔

اب رہا ابوکامل کا مسئلہ۔

ابوکامل الجحدری : اس کا نام فضیل بن حسین ہے۔ ابن حجر کہتے ہیں یہ حافظ الحدیث ہے ثقہ ہے۔ ۲۳۷ھ میں اس کا انتقال ہوا۔ تقریب ص۲۷۶۔

عبدالرحمان بن ابی حاتم رازی لکھتے ہیں۔ کہ امام احمد کا قول ہے کہ ابوکامل حدیث پر گہری نظر رکھتا ہے۔ اور نہایت قابل اعتماد ہے۔ زبردست عقل کا مالک ہے۔ جب تک کوئی اُس سے سوال نہیں کرتا۔ کلام نہیں کرتا۔ علی بن المدینی فرماتے ہیں۔ ابوکامل ثقہ ہے۔ الجرح والتعدیل ج ۷ ص۷۱

ہم نے قارئین کے روبرو بخاری و مسلم کے تمام راویوں کا حال پیش کر دیا ہے۔ اُن میں سے ہر ایک کے بارے میں محدثین کی جو آرا تھیں وہ بھی قارئین کے روبرو پیش کر دیں۔ اب قارئین خود فیصلہ فرمالیں کہ اس حدیث میں بخاری کے راوی زیادہ معتبر ہیں یا مسلم کے راوی۔ محدثین کے اقوال سے تو یہی ظاہر ہو رہا ہے کہ مسلم کے راوی اس حدیث میں زیادہ معتبر ہیں۔ اور بخاری کی روایت کسی صورت میں اس مقام پر مسلم کی روایت کے مقابلہ میں صحیح قرار نہیں دی جاسکتی۔ اور مسلم کی روایت میں سیدۃ نساء اہل الجنۃ کا خطاب موجود نہیں۔ یہ الفاظ ابونعیم فضل بن دکین نے روایت کئے ہیں اور وہ شیعہ ہے۔ لہٰذا اُس نے یہ الفاظ بڑھا کر اپنے مسلک کا پرچار کیا ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ اصل واقعہ کے آخری حصہ میں فراس بن یحیٰ الہمدانی نے تحریف کر کے واقعہ کی نوعیت کو تبدیل کر دیا۔ اور فراس ایسا راوی ہے جو دونوں کتابوں کی سند میں پایا جاتا ہے۔ اور بقول حافظ ابن حجر یہ کام چلاؤ انسان ہے۔ اور وہم کا شکار ہے۔ دراصل محدثین نے اسی وہم کے باعث کہ یہ وہم کا شکار ہے اس پر کوئی خاص جرح نہیں کی۔ لیکن ہم یہ سمجھتے ہیں کہ اسے کوئی وہم نہیں تھا۔ بلکہ احادیث میں تحریف کر کے اسے وہم کے پردے میں چھپاتا تھا۔ اور چونکہ نسلاً یہ ایرانی تھا۔ اس لئے یہ بھی ممکن تھا کہ ذہنی تخریب کاری کے مرض میں مبتلا نہ ہو۔ اور اس کا ثبوت خود بخاری و مسلم

ام المومنینؓ فرماتی ہیں۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت فاطمہؓ کو بلوایا اور اُن سے کچھ رازداری کے ساتھ گفتگو کی جس پر فاطمہؓ رونے لگیں پھر آپ نے کچھ گفتگو کی تو فاطمہؓ ہنسنے لگیں ام المومنین فرماتی ہیں میں نے فاطمہؓ سے سوال کیا۔ کہ ایسی رازداری کی کیا خاص بات تھی ؟ کہ پہلے تم روئیں، پھر ہنسیں۔ انہوں نے جواب دیا حضور نے جب پہلی بار سرگوشی فرمائی تھی، تو آپ نے مجھے اپنی موت کی خبر دی تھی۔ جس پر میں رونے لگی۔ آپ نے دوبارہ سرگوشی کی اور فرمایا۔ تو میرے گھر والوں میں سب سے پہلے مجھ سے ملے گی۔ جس پر میں ہنسنے لگی۔ بخاری ج ۱ ص ۵۳۲۔ ج ۲ ص ۶۳۸۔ مسلم ج ۲ ص ۲۹۰

یہ حدیث پہلی حدیث کے قطعاً خلاف ہے۔ اس کے آخری جزئیہ میں خوش ہونے کی وجہ یہ بیان کی گئی ہے کہ میرے گھر والوں میں تو سب سے پہلے مجھ سے ملے گی۔ گویا خوش ہونے اور ہنسنے کی وجہ خطابات نہیں۔ بلکہ یہ وجہ ہے کہ والد سے جو جدائی ہے وہ بہت مختصر ہے اور ملاقات کے لئے طویل عرصہ انتظار کی ضرورت پیش نہیں آئے گی۔ اور اس روایت کی سند میں کوئی قابل اعتراض راوی بھی نہیں ہے۔

اس صورت میں صرف دو ہی فیصلے ممکن ہیں کہ یا تو پہلی حدیث کو قبول کرتے ہوئے اس کا رد کیا جائے۔ یا اسے قبول کرتے ہوئے پہلی کا رد کیا جائے۔ دونوں کو قبول کرنا ہرگز ممکن نہیں۔ اور اس حدیث کے رواۃ پہلی حدیث سے زیادہ معتبر ہیں۔ اور اس کی سند میں نہ کوئی شیعہ ہے اور نہ کوئی مدلس۔ بلکہ پہلی حدیث کے تین راوی ایرانی النسل ہیں۔ دو اگرچہ عربی النسل ہیں لیکن کوفہ کے باشندہ ہیں۔ جب کہ اس حدیث کے اکثر راوی مدنی ہیں۔ اسے ام المومنینؓ سے نقل کرنے والے عروہ ہیں جو حضرت زبیرؓ بن العوام کے صاحبزادے اور ام المومنینؓ کے بھانجے ہیں۔ پہلی حدیث میں مسروق اور شعبی قابل اعتراض نہیں۔ لہٰذا یہ ساری حرکت فراس بن یحییٰ کی ہے۔

عروہ کے واقعہ کی تائید ایک اور حدیث سے بھی ہوتی ہے جو عائشہؓ بنت طلحہ بن عبیداللہ

نے ام المؤمنین سے نقل کی ہے۔ ام المؤمنین فرماتی ہیں کہ جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم علالت میں مبتلا ہوئے تو فاطمہؓ آئیں، اور حضور سے لپٹ گئیں۔ حضور کا پیار لیا۔ اور جب سر اٹھایا تو رو رہی تھیں۔ پھر دوبارہ حضور کو چپٹ گئیں۔ تو دوبارہ جب سر اٹھایا تو ہنس رہی تھیں۔ جب حضور کی وفات ہو گئی۔ تو میں نے فاطمہؓ سے اس کی وجہ پوچھی تو انہوں نے فرمایا۔

اخبرنی انہ میت بوجعہ	آپ نے بتایا تھا کہ میری اس مرض
ھذا فبکیت ثم اخبرنی	میں موت واقع ہو گی تو میں رونے لگی۔
انی اسرع اھلہ لحوقا بہ	دوبارہ آپ نے بتایا کہ تو مجھ سے سب
ترمذی ج ۲ ص ۲۵	سے پہلے ملے گی۔ میں اس پر خوش ہوئی۔

اتفاق سے یہ واقعہ مؤرخ بلاذری نے اشراف الانساب میں ابن عباسؓ سے بھی اسی صورت میں نقل کیا ہے۔ گویا جو واقعہ عروہ نے بیان کیا ہے اس کی دو شہادتیں موجود ہیں۔ اور پہلے واقعہ کی کوئی شہادت موجود نہیں۔ اور اس روایت میں کچھ ایسے امور پائے جاتے ہیں جو قطعاً خلاف عقل و نقل ہیں۔

۱۔ باپ کے مرنے کا غم خطابات سے ہرگز دور نہیں ہوتا۔ جس پر انسان خوش ہو۔ ان کا باہمی کوئی تعلق نہیں۔ یہ بات انسانی فطرت کے قطعاً خلاف ہے۔

۲۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی علالت حضرت میمونہؓ کے گھر سے شروع ہوئی اور آپ ازواج مطہرات کی باری پوری کرتے رہے۔ لیکن ہر جگہ یہی دریافت کرتے رہے کہ میں کل کہاں گزاروں گا۔ جس سے ازواج مطہرات یہ سمجھیں کہ حضور زندگی کے بقیہ ایام ام المؤمنین حضرت عائشہؓ کے یہاں گزارنا چاہتے ہیں۔ انہوں نے حضور کو اس کی اجازت دی۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم حضرت اسامہؓ بن زید اور حضرت فضلؓ بن عباس کے سہارے ام المؤمنین کے گھر پہنچے۔ گویا ام المؤمنین کے یہاں آنے کے بعد حضور کی ایسی حالت نہیں رہی تھی کہ خود سے چل سکیں اور فراس کی روایت یہ ظاہر کر رہی ہے کہ حضور کھڑے ہو گئے۔ یہ واقعہ قطعاً خلاف عقل و

نقل ہے۔ جب کہ عائشہ بنت طلحہ کا بیان یہ ہے کہ فاطمہؓ آتے ہی حضور کو چپٹ گئیں۔ یہ بات عین فطرت انسانی کے مطابق ہے۔ اور واقعہ بھی یہی ہے کہ حضور اُس وقت کھڑے ہونے کے لائق نہ تھے۔

۳۔ عائشہ بنت طلحہ، ابن عباسؓ اور عروہ کی روایت میں یہ کہیں موجود نہیں کہ ام المومنین نے حضرت فاطمہؓ سے اسی وقت وجہ دریافت کی ہو۔ اور موقعہ و محل کے لحاظ سے اسی وقت یہ سوالات قطعاً مناسب بھی نہ تھے۔ جب کہ فراس کی روایت میں یہ سوال بھی ہے اور پھر انکار بھی ہے۔

۴۔ فراس کی روایت میں ام المومنینؓ کی جانب یہ الفاظ منسوب کئے گئے ہیں کہ آج آپ نے اپنی ازواج کو چھوڑ کر بیٹی سے کیسی سرگوشی کی" یہ الفاظ انتہائی لغو ہیں۔ اس لئے کہ ہر انسان بیوی سے جداگانہ نوعیت کی گفتگو کرتا ہے۔ اور بیٹی سے جداگانہ نوعیت کی۔ کوئی یہ سوکن کا مسئلہ نہ تھا جو یہ الفاظ ام المومنینؓ کی جانب منسوب کئے گئے۔

۵۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی چار صاحبزادیاں تھیں۔ حضرت زینبؓ، حضرت رقیہؓ، حضرت ام کلثومؓ اور حضرت فاطمہؓ۔ لیکن بقیہ صاحبزادیوں کو اس طرح نظر انداز کیا گیا۔ گویا وہ حضور کی اولاد ہی نہ تھیں۔ جب کہ حضرت زینبؓ اور حضرت رقیہؓ نے اسلام کی خاطر ہزار ہا مصائب برداشت کئے۔ حتیٰ کہ حضرت رقیہؓ نے اسلام کی خاطر حبشہ ہجرت کی۔ لیکن انہیں کوئی خطاب نہیں دیا گیا۔ اور نہ انہیں سیدۃ النساءؓ بنایا گیا۔ یہی تو ایک سبائی حربہ ہے کہ اہل سنت کی توجہ کو حضور کی بقیہ اولاد سے ہٹا کر صرف حضرت فاطمہؓ کی جانب مبذول کر دیا جائے۔ تاکہ آل رسول کے معاملہ میں کوئی دوسرا شریک سامنے نہ آسکے۔ اور جب وہ خود نگاہوں سے اوجھل ہو جائیں گی تو اُن کی اولاد کا مسئلہ بھی باقی نہ رہے گا۔

یہ تمام بحث تو محدثانہ نقطۂ نگاہ سے کی گئی تھی۔ اور اس کا مقصود صرف اتنا تھا کہ حضرت فاطمہؓ سیدۃ النساء نہیں۔ لیکن اب ہمیں دیکھنا یہ ہے کہ پھر سیدۃ النساء کون ہیں۔ اس سلسلہ

میں ہم سب سے اول قرآن پر غور کرنا چاہتے ہیں۔ پھر احادیث کی جانب رجوع کریں گے۔ ارشادِ الٰہی ہے۔

وَمَنْ يَّقْنُتْ مِنْكُنَّ لِلّٰهِ وَ	اور تم میں سے جو اللہ اور رسول کی تابعدار
رَسُوْلِهٖ وَتَعْمَلْ صَالِحًا	رہے گی۔ اور نیک عمل کرتی رہے گی ہم
نُّؤْتِهَآ اَجْرَهَا مَرَّتَيْنِ	اسے دہرا اجر دیں گے۔ اور ہم نے
وَاَعْتَدْنَا لَهَا رِزْقًا كَرِيْمًا	ان ازواج مطہرات کے لئے عمدہ
٥ - الاحزاب -	رزق تیار کر رکھا ہے۔

اس آیت کریمہ میں ازواج مطہرات کے لئے ایک خصوصی اعلان تو یہ کیا گیا ہے، کہ ہم نے اُن کے لئے عمدہ رزق تیار کر رکھا ہے۔ ظاہر ہے کہ رزق کریم تو اسی وقت حاصل ہوگا۔ جب اُس سے قبل مغفرت حاصل ہوگی، اور جنت ملے گی۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے ان ہر دو امور کا تذکرہ اس لئے نہیں فرمایا۔ اس لئے کہ ہر دو امور رزق کریم کا لازمہ ہیں۔ اور ملزوم بغیر لازم کے حاصل نہیں ہوتا۔ لہٰذا لازم کو ترک کر کے ملزوم کو ذکر کیا کہ ہم نے ان کے لئے عمدہ رزق تیار کر رکھا ہے" یعنی یہ لوازمات کہ اُن کی مغفرت کر دی گئی۔ اور ان کو جنت اور رضائے الٰہی بھی حاصل ہے۔ یہ تو انہیں خود بخود حاصل ہیں۔ اسی لئے صرف آخری جزیہ کا تذکرہ کیا۔

پھر اس امر کے اعلان کے لئے۔ مضارع کے بجائے ماضی کا صیغہ استعمال کیا یعنی جس چیز کا ذکر کیا جا رہا ہے۔ وہ اس حد تک یقینی ہے۔ گویا کہ انہیں وہ پہلے ہی حاصل ہو چکی ہے۔ لہٰذا یہ تصور کہ کسی وقت اُن سے یہ مقام چھینا بھی جا سکتا ہے۔ جیسا کہ سبائیوں کا عقیدہ ہے۔ اس امکان کو بھی ماضی کا صیغہ لا کر ناممکن بنا دیا۔

جب ہم اس رنگ میں سورۂ احزاب کی ان آیات پر غور کرتے ہیں۔ تو اللہ تعالیٰ نے متعدد بار، ازواج مطہرات کو یا نساء النبی کہہ کر خطاب کیا۔ لیکن پورے قرآن میں کسی مقام پر بھی یا بنات النبی کہہ کر حضور کی صاحبزادیوں کو کسی مقام پر نہ مخاطب کیا گیا۔ اور نہ کسی جگہ اُن کی فضیلت کا ذکر

کیا گیا۔ یہ امر خود اس کی دلیل ہے کہ اس امت کی عورتوں میں ذکر کے قابل صرف ازواج مطہرات تھیں۔ اور اگر کوئی اور عورت اس مقام کو پہنچتی تو اس کا ذکر بھی ضرور کیا جاتا حالانکہ سابقہ امتوں میں سے مریم بنت عمران اور آسیہ امرأۃ فرعون کا ذکر کیا گیا۔ ازواج مطہرات کی فضیلت کے لئے صرف یہی ایک دلیل کافی ہے۔

اس طرز تخاطب سے یہ بات خود بخود ثابت ہو گئی کہ ازواج مطہرات کے بارے میں یہ دعویٰ کہ وہ جنتی ہیں یقینی ہو گیا۔ بلکہ اس کا منکر قرآن کا منکر اور کافر ہوگا۔

قاعدہ اور اصول یہ ہے کہ جب اللہ تعالیٰ انسانی معاشرہ میں کسی کو بلند مقام پر سرفراز فرماتا، اور ایسے اشخاص کو لوگوں کی راہنمائی پر مامور فرماتا ہے۔ تو چونکہ دنیا بھلائی اور برائی میں اُن کی اقتدا کرتی ہے۔ اُن کی برائی صرف ان ہی کی ذات تک محدود نہیں رہتی۔ اسی طرح اُن کی نیکی صرف اُن کی ذات تک محدود نہیں ہوتی۔ بلکہ اُن کا ہر قول و عمل قوم کے بنانے اور بگاڑنے کا سبب بھی بنتا ہے۔ اسی لئے جب وہ برائی کا ارتکاب کرتے ہیں تو انہیں اپنی سزا کے علاوہ دوسروں کے بگاڑ کی بھی سزا ملتی ہے۔ اور اچھے اعمال پر دوسروں کی نیکیوں کا بھی اجر ملتا ہے۔ اس طرح اُن کے عذاب میں بھی اضافہ ہوتا ہے اور اجر میں بھی۔ سورۃ بنی اسرائیل میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو مخاطب کر کے فرمایا جاتا ہے۔

وَلَوْلَآ اَنْ ثَبَّتْنٰكَ لَقَدْ كِدْتَّ تَرْكَنُ اِلَيْهِمْ شَيْـًٔا قَلِيْلًا ۝ اِذًا لَّاَذَقْنٰكَ ضِعْفَ الْحَيٰوةِ وَضِعْفَ الْمَمَاتِ ثُمَّ لَا تَجِدُ لَكَ عَلَيْنَا نَصِيْرًا ۝	اگر ہم آپ کو ثابت قدم نہ رکھتے تو آپ بھی کچھ نہ کچھ جھک جاتے۔ تو اُس صورت میں ہم آپ کو دنیا میں دوگنا مزا چکھاتے اور مرنے کے بعد بھی۔ پھر آپ ہمارے مقابلہ میں کوئی مددگار نہ پاتے۔

جس طرح اس مقام پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے اس اصول کو بیان کیا گیا ہے۔

اسی طرح ازواج مطہرات کے لئے بھی اسی اُصول کی وضاحت کی گئی۔ ارشاد ہوا۔

وَمَنْ يَّقْنُتْ مِنْكُنَّ لِلّٰهِ وَ	اور تم میں سے جو اللہ اور اس کے
رَسُوْلِهٖ وَتَعْمَلْ صَالِحًا	رسول کی تابعدار رہے گی۔ اور نیک
نُّؤْتِهَآ اَجْرَهَا مَرَّتَيْنِ وَ	عمل کرتی رہے گی۔ ہم اسکو دگنا اجر
اَعْتَدْنَا لَهَا رِزْقًا	دیں گے۔ اور ہم نے ان ازواج کے
كَرِيْمًاہ	لئے عمدہ رزق تیار کر رکھا ہے۔

اس آیت نے یہ ثابت کیا کہ جس طرح نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو امت کے مقابلہ میں ہر عمل پر دُہرا اجر ملتا ہے۔ اسی طرح ازواج مطہرات کو بھی تمام امت کے مقابلہ میں دُہرا اجر عطا ہوگا۔ جب کہ تمام صحابہ کرام اور تمام صحابیات میں سے کسی کے لئے بھی کسی مقام پر اس اصول کا تذکرہ نہیں کیا گیا۔ اس طرح ازواج مطہرات کے ساتھ اس اصول کو بیان کر کے اللہ تعالیٰ نے ازواجِ مطہرات کو بقیہ تمام امت سے نہ صرف ممتاز کر دیا بلکہ یہ بھی ثابت کر دیا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد ازواج مطہرات تمام امت کی راہنما ہیں۔ اور انُ کی اقتدا امت پر لازم ہے۔

اس سے یہ امر بھی ظاہر ہو گیا کہ کوئی امتی خواہ کتنا بھی عمل کرے۔ اور خواہ وہ کتنا ہی بلند مقام کیوں نہ حاصل کرلے۔ وہ ہرگز ہرگز بھی ازواج کے مقام کو نہیں پا سکتا۔ اس لئے کہ جو عمل ابوبکرؓ و عمرؓ، یا فاطمہؓ و رقیہؓ انجام دیں گی تو انہیں اکہرا اجر ملتا ہے۔ اور وہی عمل اگر عائشہؓ اور ام حبیبہؓ انجام دیں تو انہیں دہرا اجر ملتا ہے۔ اس لحاظ سے ان دونوں طبقوں کے اجر میں دگنے کا فرق ہو گا۔ جس کا نتیجہ یہ خود بخود ظاہر ہو جاتا ہے کہ کوئی امتی ازواج مطہرات کے مقام کو حاصل نہیں کر سکتا۔ خواہ وہ امامت و ولایت کے عہدے پر کیوں نہ سرفراز ہو۔

اس طرح اسی ایک آیت میں اللہ تعالیٰ نے ازواجِ مطہرات کو امت پر دو قسم کی فضیلتیں عطا فرما دیں۔

یہ بھی ایک تسلیم شدہ امر ہے کہ اگر ایک شخص کو ایک سال عمل صالح کی توفیق حاصل ہوتی ہے۔ اور دوسرے کو دو سال تو ہرگز یہ دونوں نہ دنیاوی قانون کی نگاہ میں مساوی ہو سکتے ہیں اور نہ اخروی قانون میں۔ اسی وجہ سے جو حضرات فتح مکہ کے بعد ایمان لائے وہ سابقین اولین کے مقام کو حاصل نہیں کر سکتے۔ اب اگر دو شخص ایک ساتھ اسلام لائے اور حضور کی حیات میں ہر کار خیر میں برابر کے شریک رہے۔ لیکن ایک فرد واحد حضور کی وفات کے چھ ماہ بعد انتقال کرتا ہے۔ اور دوسرا سینتالیس سال بعد۔ اس صورت میں ظاہر ہے کہ دوسرے فرد کے سینتالیس سال کے اعمال پہلے فرد سے کہیں زیادہ ہوں گے۔ حضرت عائشہؓ اور حضرت فاطمہؓ دونوں ہم عمر ہیں۔ لیکن حضرت فاطمہؓ نے حضور کی وفات کے چھ ماہ بعد انتقال فرمایا۔ یعنی سنہ ۱۱ھ کے آخر میں۔ جب کہ ام المؤمنین حضرت عائشہؓ کی وفات رمضان ۵۸ھ میں ہے۔ تو یہ دونوں کس طرح مساوی ہوں گی۔

جب یہ حقیقت تسلیم کر لی گئی کہ ازواج مطہرات کے لئے ہر عمل پر دگنا اجر ہے تو اُن کو راہبری اور راہنمائی کا مقام خود بخود حاصل ہو گیا۔ اور راہبر اور راہنما کا مقام پیروکار اور مقتدی سے بلند ہوتا ہے۔ مقتدی اور پیروکار خواہ کتنا ہی بلند مقام پر کیوں نہ فائز ہو جائے۔ وہ اس فضیلت کو حاصل نہیں کر سکتا جو مقتدا کو حاصل ہوتی ہے۔ کیونکہ اسے جہاں اپنے عمل کا اجر ملے گا۔ وہاں اسے مقتدی کے اعمال کا بھی اجر ملے گا۔ اور اُس کے مقام کا کیا کہنا جو پوری امت کا مقتدا ہو۔ جو شخص کسی مقتدی کو مقتدا پر فضیلت دیتا ہے وہ نہ صرف شریعت کا مذاق اُڑاتا ہے۔ بلکہ دنیاوی اصولوں کو بھی پامال کرتا ہے۔ قاعدہ ہے الفضل للمتقدم۔ فضیلت تو پہل کرنے والے کو حاصل ہوتی ہے۔

اللہ تعالیٰ نے یہ اصول بیان کرنے کے بعد اس سے جو نتیجہ برآمد کیا ہے۔ اس کی خود ہی اپنے کلام میں وضاحت فرمائی ہے۔ ارشاد ہوا۔

یٰنِسَآءَ النَّبِیِّ لَسْتُنَّ کَاَحَدٍ — اے نبی کی بیویو تم دنیا کی کسی عورت

مِّنَ النِّسَآءِ اِنِ اتَّقَيْتُنَّ کی طرح نہیں ہو بشرطیکہ تقویٰ اختیار کرو
جب حضور کی کوئی زوجہ محترمہ دنیا کی کسی عورت کے مثل نہیں ہوسکتی۔ تو دنیا کی کوئی عورت بھی اُن کے مثل نہیں ہوسکتی۔ خواہ وہ عورت بذات خود کتنے ہی اعلیٰ مقام پر کیوں نہ فائز ہو۔ کیونکہ جس طرح کوئی پیروکار مقتدا کے مساوی نہیں ہوسکتا۔ اسی طرح کوئی راہنما پیروکار کے مساوی نہیں ہوسکتا کیونکہ ہر دوصورت میں مقتدا کے مقام پر حرف آتا ہے۔ لہٰذا یہ دونوں ہرگز مساوی نہیں ہوسکتے۔ کجا کہ مقتدی اور پیروکار کو راہبر اور مقتدا پر فضیلت دیدی جائے۔ ایسے شخص کو دنیا پاگل کہے گی۔ اس امر کو کہ ازواج مطہرات کو اقتدا اور راہبری کا مقام حاصل ہے۔ حضرت ابوموسیٰ اشعری ان الفاظ میں واضح فرماتے ہیں۔

ما اشکل علینا اصحاب	جب بھی صحابہ کرام پر کسی مسئلہ میں
رسول اللہ صلی اللہ علیہ	کوئی دشواری پیش آتی تو ہم حضرت
وسلم حدیث قط نسالنا	عائشہ سے دریافت کرتے۔ اور ان
عائشۃ الا وجدنا عندہا علما	کے پاس اس مسئلہ کا علم موجود ہوتا۔

ترمذی ج ۲ ص ۲۵۱۔

یعنی صحابہ کرام کو جب بھی کسی مسئلہ میں دشواری پیش آتی تو یہ حضرات ام المؤمنین حضرت عائشہؓ کی خدمت میں حاضر ہوتے اور ان سے دریافت کرتے۔ اور کوئی مسئلہ ایسا نہ ہوتا جس کا علم انہیں حاصل نہ ہو۔

اب اگر کوئی شخص یہ دعویٰ کرتا ہے کہ سابقہ امتوں میں سے مریم بنت عمران، آسیہ امرأۃ فرعون اور اس امت میں سے حضرت فاطمہؓ کو حضرت عائشہؓ یا امہات المؤمنین میں سے کسی پر فضیلت حاصل ہے۔ وہ دوسرے الفاظ میں قرآن کا انکار کر رہا ہے۔ جب کہ قرآن یہ دعویٰ کر رہا ہے کہ اے نبی کی بیویو تم دنیا کی کسی عورت کے مثل نہیں ہوسکتیں، تو دنیا کی ایک بھی عورت ان کے مثل قرار دینا گناہ عظیم ہے۔ کجا کہ اُن پر فوقیت دینا۔ اس کا تو تصور

بھی محال ہے۔

ہماری اس تحریر سے ہرگز یہ نتیجہ اخذ نہ کیا جائے کہ میں حضرت فاطمہؓ کی فضیلت کا منکر ہوں۔ حاشا وکلا۔ میں تو ہر اُس عورت کی فضیلت کا بھی قائل ہوں۔ کہ جسے زندگی میں صرف ایک بار دیدارِ رسول حاصل ہوا ہو۔ کجا کہ حضور کی صاحبزادیاں، جو حضور کے جسم کا ایک حصّہ ہیں۔ اُن کی فضیلت کے انکار کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ کیونکہ مسئلہ یہ نہیں ہے کہ حضرت فاطمہؓ کو کسی قسم کی فضیلت حاصل ہے یا نہیں۔ اگر مسئلہ یہ ہوتا تو ہم سب سے اول حضرت فاطمہؓ کے دفاع میں قلم اٹھاتے۔ بلکہ مسئلہ صرف آنا ہے کہ سب سے افضل عورتیں کون ہیں۔ اور سیدۃ نساء اہل الجنۃ یا سیدۃ نساء المؤمنین بننے کی کون مستحق ہیں؟ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے۔

کمل من الرجال کثیر ولم	مردوں میں تو بہت کامل گزرے
یکمل من النساء غیر مریم	ہیں لیکن عورتوں میں مریم بنت عمران
بنت عمران وآسیۃ امراۃ	اور آسیہ امرأۃ فرعون کے علاوہ
فرعون وان فضل عائشۃ	کوئی کامل نہیں گزری۔ اور عائشہ کو
علی سائر النساء کفضل	تمام عورتوں پر ایسی ہی فضیلت حاصل
الثرید علی سائر الطعام	ہے۔ جیسے ثرید کو تمام کھانوں پر۔

بخاری ج ا ص۵۳۲۔ مسلم ج ۲ ص۲۸۴

نسائی ج ۲ ص۷۷۔

اس حدیث میں نبی کریم صلی اللہ علیہ [illegible] کی نفی فرمائی۔ [illegible] عورتوں میں دو عورتوں یعنی مریم بنت عمران اور آسیہ [illegible] کے علاوہ کوئی کامل نہیں ہوئی اس فرمان سے تمام عورتیں خارج ہو گئیں [illegible] علیہ وسلم نے تمام عورتوں سے حضرت عائشہؓ کو مستثنیٰ کر کے انہیں تمام عورتوں [illegible] عورتوں

کے کمال کا ذکر کرکے پھر حضرت عائشہؓ کو مستثنیٰ قرار دینا۔ اور پھر انہیں جہاں کی عورتوں پر فضیلت دینا خود اس امر کا بین ثبوت ہے۔ کہ اصل مقام فضیلت تو حضرت عائشہؓ کو حاصل ہے۔ یہ مقام کسی کو حاصل نہیں ہو سکتا۔ اب بقیہ عورتوں کے لئے دو ہی مقام ہیں۔ یا تو وہ مریم بنت عمران اور آسیہ کے درجہ میں ہوں گی۔ یا اُن سے کچھ کم ہوں گی۔ کیونکہ کمال کے درجات بھی مختلف ہوتے ہیں۔ لیکن مریم اور آسیہ کوئی قوم کی راہنما اور راہبر نہیں۔ اور نہ اُن کے بارے میں قرآن نے یہ دعویٰ کیا کہ انہیں اُن کے اعمال پر دُگنا اجر دیا جائے گا نہ انہیں کسی نبی کی زوجیت کا فخر حاصل ہے۔ اور نہ انہیں کوئی علمی فخر حاصل ہے۔ لہٰذا ان امور میں تمام ازواج مطہرات اُن پر فضیلت رکھتی ہیں۔

اسی طرح مریم اور آسیہ کو کسی نبی کی اولاد ہونے کا فخر حاصل نہیں۔ جب کہ حضور کی صاحبزادیوں کو یہ فخر حاصل ہے۔ یا دوسرے الفاظ میں یہ کہہ سکتے ہیں کہ ایک فضیلت کلی ہوتی ہے۔ وہ تو اوّل اُم المومنین عائشہؓ اور اُنکے بعد ازواج مطہرات کو حاصل ہے۔ اور ایک فضیلت جزئی ہوتی ہے۔ اُمیں متعدد عورتیں شریک ہیں۔ ایک لحاظ سے کوئی افضل ہے اور ایک لحاظ سے دوسری۔

اللہ تعالیٰ نے سابقہ آیت میں یہ اصول بیان فرمانے کے بعد کہ تم دنیا کی کسی عورت کی مثل نہیں ہو۔ کیونکہ تمہاری حیثیت ایک مقتدا، اور راہبر کی ہے۔ تو ایک راہ نما میں جو خوبیاں ہونی چاہئیں اُن کی ازواج مطہرات کو تلقین کرتا ہے۔ کہ تقویٰ اختیار کرو۔ کسی سے چاپلوسی سے بات نہ کرو، جب بھی کوئی بات کرو تو بھلی بات کرو، زمانۂ جاہلیت کی طرح باہر بازاروں میں اتراتی اور گھومتی نہ پھرو، اپنے گھروں میں جم کر بیٹھو، نماز قائم کرو، زکوٰۃ دو، اور اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرو۔ اس لئے کہ

انما یرید اللہ لیذھب عنکم الرجس اھل البیت ویطھرکم تطھیرا

یقیناً اللہ یہ ارادہ رکھتا ہے کہ اے اہل بیت تم سے ہر قسم کی گندگی دور کر دے۔ اور تمہیں پورے پورے طور پر پاک کر دے۔

یعنی اے اہل بیت اللہ تعالیٰ تمہیں پورے طور پر پاک کرنا چاہتا ہے۔ اور یہ چاہتا ہے کہ تم سے ہر قسم کی جسمانی و روحانی گندگی دور ہو جائے۔

یہ تمام مضمون ازواج مطہرات کے سلسلہ میں چل رہا ہے۔ سبائیوں کا جب کچھ اور بس نہ چلا تو روایات وضع کر کے لوگوں کے ذہنوں میں یہ بات بٹھانے کی کوشش کی کہ یہاں اہل بیت سے مراد حضرت علیؓ، حضرت فاطمہؓ اور ان کی اولاد ہے۔ جس کے نتیجہ میں ہمارے علماء بھی اس پروپیگنڈے سے متاثر ہوئے۔ اور یہ بھی نہ سوچا کہ اہل بیت کے وہی معنی ہیں جو ہماری زبان میں اہلیہ اور اہل خانہ کے ہیں۔ اور بیٹی، داماد اور نواسے اہلیہ نہیں ہوا کرتے۔ اور مرد تو اہلیہ بن ہی نہیں سکتے۔

ہمارے علماء نے یہ بھی نہ سوچا کہ یہ ایک طویل آیت کا آخری ٹکڑا ہے۔ اور اس آیت میں خطاب ازواج مطہرات کو کیا گیا ہے۔ تو اس کا دوسروں سے کیا تعلق ہو سکتا ہے۔ اور ابھی مضمون پورا بھی نہیں ہوا۔ اسی لئے آگے ارشاد فرماتے ہیں۔

وَاذْكُرْنَ مَا يُتْلٰى فِيْ	تمہارے گھروں میں جو اللہ کی آیات
بُيُوْتِكُنَّ مِنْ اٰيٰتِ اللّٰهِ	تلاوت کی جاتیں اور حکمت کی باتیں
وَالْحِكْمَةِ ۔	کی جاتی ہیں۔ اُن کا ذکر کرتی رہا کرو۔

یعنی ایک مقتدا ہونے کی حیثیت سے تمہارا کام کتاب اللہ کی تلاوت اور خیر کی باتیں ہونی چاہئیں۔

یہاں بیت کی جمع۔ بیوت کا لفظ ذکر کیا۔ اس سے قبل کی آیت میں بھی جمع کا لفظ ذکر کیا تھا۔

وَقَرْنَ فِيْ بُيُوْتِكُنَّ ۔	اور اپنے گھروں میں جم کر بیٹھی رہو۔

یہ اس امر کا ثبوت [illegible] عورتوں کا ذکر [illegible] وہ متعدد گھروں میں رہتی تھیں۔ نہ کہ ایک گھر میں۔ اور حضرت علیؓ [illegible] ان کی زوجہ محترمہ یعنی حضرت فاطمہؓ کا صرف ایک

ہی گھر تھا۔ جب کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ہر زوجہ اپنے اپنے گھروں میں جداگانہ رہتی تھیں۔ اوران سب کو یا نساء النبی کے الفاظ سے مخاطب کرکے سب کو اہل بیت النبی قرار دیا۔ ہماری سمجھ میں یہ بات نہیں آتی کہ تمام مفسرین اس پر تو متفق ہیں کہ اس آیت کا مصداق ازواج مطہرات ہیں لیکن پھر بھی منبر پر چڑھ کر روایات کے ذریعہ سبائی پروپگنڈے میں منہمک رہتے ہیں۔ اس کام کے لئے یہ حضرات ایک حدیث کساء (یعنی چادر والی روایت) پیش کرتے اور اس کے ذریعہ قرآن کی تاویلات کرتے ہیں۔ ان کی نظر میں قرآن ثانوی درجہ رکھتا ہے جو تاویل کا محتاج ہے۔ لیکن داستاں اور کہانی خواہ کسی طرح بھی اُن تک پہنچے یہ اُس پر فوراً ایمان لے آتے، اور اس کا چرچا شروع کردیتے ہیں۔ غالباً اسی لئے امام مسلم نے اپنی صحیح کو اس حدیث سے شروع کیا۔

کفی بالمرء کذبا ان	آدمی کے جھوٹا ہونے کی دلیل کے
یحدث بکل ما	طور پر یہی کافی ہے کہ وہ ہر سنی ہوئی
سمع۔	بات بیان کرے۔

ان کی صورت حال وہی ہے جو اللہ تعالیٰ نے یہودیوں کی بیان کی ہے۔ ارشاد ہے۔

وَمِنْهُمْ اُمِّيُّوْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ	اِن میں کچھ لوگ ان پڑھ ہیں۔ وہ نہیں
الْكِتٰبَ اِلَّآ اَمَانِيَّ وَاِنْ	جانتے کہ کتاب میں کیا ہے۔ یہ لوگ
هُمْ اِلَّا يَظُنُّوْنَ ○	تو صرف خیالات کی پیروی کرتے ہیں۔

حالانکہ وہ حدیث کساء ایک منکر روایت ہے۔ انشاء اللہ ہم پھر کسی موقعہ پر اس پر تفصیلی گفتگو کریں گے۔

یہاں مسئلہ زیر بحث، یہ ہے کہ سیدۃ النساء کون ہیں۔ اس جگہ ہم قارئین کے سامنے ایک اور آیت پیش کرنا چاہتے ہیں۔ ارشاد الٰہی ہے۔

وَمَا كَانَ لَكُمْ اَنْ	اور تمہارے لئے یہ مناسب نہیں کہ تم

تُؤْذُوْا رَسُوْلَ اللّٰہِ وَلَآ اَنْ	رسول اللہؐ کو ایذا دو، اور نہ ان کی ازواج
تَنْكِحُوْٓا اَزْوَاجَهٗ مِنْۢ بَعْدِهٖٓ	سے ان کے بعد کبھی نکاح کرو۔ کیونکہ
اَبَدًا ؕ اِنَّ ذٰلِكُمْ كَانَ عِنْدَ	اللہ کے نزدیک یہ بہت بڑی
اللّٰهِ عَظِيْمًا ۝	بات ہے۔

اس آیت میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد ازواج مطہرات سے شادی کرنے کی ممانعت کی گئی۔ اور اس کی وجہ یہ بیان فرمائی گئی کہ نکاح ثانی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اذیت کا سبب ہوگا۔ لیکن حضور کی صاحبزادیوں کے لئے اللہ تعالیٰ نے ایسا کوئی قانون بیان نہیں فرمایا۔ اور نہ صاحبزادیوں سے نکاح میں اذیت رسول ہے۔ بلکہ اگر اُن سے نکاح میں اذیت رسول ہوتی تو حضور اُن کا کبھی زندگی میں نکاح نہ فرماتے۔

اب حضور کا اپنی صاحبزادیوں کا خود دوسروں سے نکاح کرنا۔ اور اللہ تعالیٰ کا لوگوں کو منع کرنا کہ آپ کی ازواج سے نکاح نہ کیا جائے اس امر کا ثبوت ہے۔ کہ ازواج مطہرات، صاحبزادیوں کے مقابلہ میں ایک ممتاز حیثیت رکھتی ہیں۔ کیونکہ یہ نکاح ایذاء رسول کا سبب ہے۔ اس سے یہ امر خود بخود ثابت ہوگیا کہ ازواج مطہرات کی شان میں گستاخی، اُن کی ہتک عزت اور اُن کے مقام کو گرانا ایذاء رسول کا سبب ہے۔ اور وہ ہر شے حرام ہے جو ایذاء رسول کا سبب ہو کیونکہ ارشاد الٰہی ہے۔

اِنَّ الَّذِيْنَ يُؤْذُوْنَ اللّٰهَ وَ	یقیناً وہ لوگ جو اللہ اور اس کے رسول
رَسُوْلَهٗ لَعَنَهُمُ اللّٰهُ فِي الدُّنْيَا	کو ایذا پہنچاتے ہیں تو ان پر اللہ دنیا
وَالْاٰخِرَةِ وَاَعَدَّ لَهُمْ عَذَابًا	اور آخرت میں لعنت بھیجتا ہے۔ اور
عَظِيْمًا ۝	ان کے لئے عذاب عظیم تیار کر رکھا ہے۔

لیکن نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور ازواج مطہرات کو چھوڑ کر اگر کوئی شخص کسی اور کو اذیت پہنچائے تو بےشک وہ گناہگار ضرور ہوتا ہے۔ لیکن اس پر اللہ کی لعنت نازل نہیں ہوتی

اسی لئے آگے ارشاد ہے :-

وَالَّذِيْنَ يُؤْذُوْنَ الْمُؤْمِنِيْنَ	اور وہ لوگ جو مومن مردوں اور عورتوں
وَالْمُؤْمِنٰتِ بِغَيْرِ مَا اكْتَسَبُوْا	کو بغیر کسی برائی کے ایذا پہنچائیں۔ تو
فَقَدِ احْتَمَلُوْا بُهْتَانًا	انہوں نے بہت بڑا بہتان اور کھلا جھوٹ
وَّاِثْمًا مُّبِيْنًا	اٹھایا ہے۔

مومنین و مومنات کے سلسلہ میں اللہ تعالیٰ نے نہ تو لعنت کا ذکر فرمایا۔ اور نہ اس امر کا اظہار فرمایا کہ اُن کے لئے عذاب عظیم ہے۔ یہ اس امر کا ثبوت ہے کہ ازواج مطہرات کا مقام تمام مومنین و مومنات سے بلند و بالا ہے۔

اب اگر کوئی شخص اس فرق کو ختم کرنا چاہے یا اُن پر کسی اور کو فضیلت دے تو وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ایذا پہنچا رہا ہے۔ اور وہ اللہ کی نظروں میں ملعون ہے۔ اور اس سے بڑھکر ایذا کیا ہوگی کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں ایک مقام بلند عطا فرمایا تھا اور ان کے لئے آیہ تطہیر نازل کی گئی تھی اب اگر کوئی شخص یہ دعویٰ کرتا ہے کہ آیہ تطہیر میں ازواج مطہرات داخل نہیں، یا داخل تو ہیں۔ لیکن اور بھی اس مقام میں ان کے ساتھ شریک ہیں۔ وہ شخص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی اذیت پہنچاتا ہے۔ اور ازواج مطہرات کو بھی۔ اور اللہ کی نظروں میں ایسا شخص ملعون ہے۔

اب ازواج مطہرات کی ایک اور فضیلت بھی ملاحظہ ہو ارشادِ الٰہی ہے۔

اَلنَّبِيُّ اَوْلٰى بِالْمُؤْمِنِيْنَ	نبی مومنین کی جانوں کے ان سے بھی
مِنْ اَنْفُسِهِمْ وَاَزْوَاجُهٗٓ	زیادہ حقدار ہیں۔ اور نبی کی بیویاں اُن
اُمَّهٰتُهُمْ ؕ	کی مائیں ہیں۔

یعنی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا مسلمانوں سے اور مسلمانوں کا جو حضور سے تعلق ہے۔ وہ تمام دیگر تعلقات سے ایک بالاتر اور جداگانہ حیثیت رکھتا ہے۔ دنیا کا کوئی تعلق اور کوئی رشتہ

اس تعلق سے مناسبت نہیں رکھتا جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلمانوں کے درمیان ہے۔ آپ مسلمانوں کے لئے اُن کے والدین سے بڑھ کر شفیق و رحیم اور اُن کی ذات سے بھی بڑھ کر اُن کے خیر خواہ ہیں۔ ان کے بیوی، بچے، اور ماں باپ انہیں نقصان پہنچا سکتے ہیں۔ انہیں دین سے بے راہ کر سکتے ہیں۔ اور ان کے ساتھ خود غرضی برت سکتے ہیں۔ مگر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ان کے حق میں صرف وہی بات کریں گے۔ جس میں اُن کی دین و دنیا کی فلاح ہو، اور جب صورت حال یہ ہے تو مسلمانوں پر یہ لازم ہے کہ اپنی جان و مال، والدین، اولاد اور تمام دنیا سے زیادہ آپ کو محبوب رکھیں۔

جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو امت پر یہ مرتبہ حاصل ہوا۔ تو آپ کی ازواج کو بھی یہ مرتبہ دیا گیا کہ انہیں پوری اُمت کی مائیں بنا دیا۔ اس طرح نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اُمت کے باپ اور ازواج مطہرات اُمت کی مائیں قرار پائیں۔ اس طرح ازواج مطہرات کی اطاعت فرمانبرداری، محبت اور تعظیم و تکریم قیامت تک تمام مسلمانوں پر فرض کر دی گئی۔ اور ان کے ساتھ نکاح ماؤں کی طرح حرام کر دیا گیا۔ مسلمانوں پر ان کے سلسلہ میں وہ تمام حقوق لازم ہو گئے جو اولاد پر ماں کے ہوتے ہیں۔

اس طرح تمام صحابہ اور تمام صحابیات امہات المؤمنین کی اولاد ہوئے اور اولاد پر ماں کی تعظیم و تکریم، اطاعت و فرمانبرداری اور ان کے حق میں دعائے خیر لازم ہوتی ہے۔ ماں پر اولاد کے لئے یہ امور فرض نہیں ہوتے۔ لہٰذا حضرت فاطمہؓ، حضرت علیؓ اور تمام صحابہ پر از روئے قرآن امہات المؤمنین کی تعظیم و تکریم اور اطاعت فرض ہوئی۔ لیکن امہات المؤمنین پر یہ فرض عائد نہیں ہوتا۔ اور ماں کا درجہ اولاد سے بڑھ کر ہوتا ہے۔ کیونکہ کوئی بیٹی یا کوئی بیٹا ماں کے برابر نہیں ہو سکتا۔ لہٰذا امہات المؤمنین کے مقابلہ میں یہ دعویٰ کہ حضرت فاطمہؓ سیدۃ النساء اہل الجنۃ ہیں۔ جہاں قرآن کا صریح تمسخر ہے۔ وہاں اس دعویٰ سے وہ تمام اصول بھی ختم ہو جاتے ہیں جو اولاد اور ماں کے سلسلہ میں قائم کئے گئے ہیں۔ اسی طرح حدیث کساء کو پیش کر کے اولاد

کو ماؤں کے برابر درجہ دینا۔ یہ سب ازواج مطہرات کی صریح توہین ہے۔

اس کے پس پردہ وہ بغض کارفرما ہے، جو سبائیوں کو ام المؤمنین حضرت عائشہؓ سے ہے۔ کیونکہ حضرت عثمانؓ کی شہادت کے بعد انہوں نے سب سے قبل قصاص عثمانؓ کا دعویٰ کیا۔ اگر وہ یہ دعویٰ نہ فرماتیں تو قصاص عثمانؓ کا مسئلہ ہمیشہ کے لئے ختم ہو جاتا۔ اور سبائیوں کی سازش کارگر ہو جاتی۔ اور ہمیشہ کے لئے اہل عرب ان ایرانی اور مجوسی سازشوں کی غلامی میں چلے جاتے۔ ام المؤمنینؓ نے اس کے آگے بند باندھنے کی کوشش کی اور ان ہی کی کوششوں کا نتیجہ تھا۔ کہ اُن کے بعد امیر معاویہؓ ان سازشیوں کے مدمقابل آگئے۔ اور پوری ایک صدی تک امت ان کی غلامی سے محفوظ رہی۔ لہٰذا یہ طبقہ ام المؤمنینؓ پر تبرا کو ایک لازمہ دین تصور کرتا ہے۔ اس مسئلہ میں اُن کے کیا عقائد ہیں۔ اُس کا ایک خاکہ ابو منصورؒ احمد بن ابی طالب طبرسی کے الفاظ میں ملاحظہ ہو جو اس نے کتاب الاحتجاج میں لکھا ہے۔ اور شیعوں کے مشہور ترجمۂ قرآن جو ترجمۂ مقبول دہلوی سے مشہور ہے اُس میں بھی پایا جاتا ہے۔ طبرسی کا بیان کہ ہے کہ حضور نے حضرت علیؓ سے فرمایا۔

یا ابا الحسن ان ھٰذا الشرف	اے ابوالحسن یہ شرف تو ہمارے لئے
باق ما رمنا علی طاعۃ	اسی وقت تک قائم رہے گا۔ جب تک
اللہ تعالیٰ فایتھن عصت	اللہ کی اطاعت کرتے رہیں۔ تو میری
اللہ تعالیٰ بالخروج علیك	جو بیوی تیرے خلاف بغاوت کرکے
فطلقھا من الازواج واسقطھا	اللہ کی نافرمانی کرے۔ اسے تو طلاق
من شرف امھات	دیدینا۔ اور اسے اس شرف سے محروم
المؤمنین۔	کردینا۔

ایک معمولی سے معمولی، اور گھٹیا سے گھٹیا انسان سے بھی یہ توقع نہیں کی جا سکتی۔ وہ اپنی وفات کے بعد بھی وہ اپنی بیوی کو طلاق دینے کی فکر کرے گا۔ اور دنیا سے رخصت ہونے

وقت اپنے داماد کو یہ اختیار دے جائے گا کہ اگر کبھی تیرا اس کے ساتھ جھگڑا ہو، اور وہ تیری مدمقابل بن کر کھڑی ہو جائے تو تو اسے طلاق دیدینا اور اسے ام المومنین رضی کے شرف سے محروم کر دینا۔

اُن کا عقیدہ یہ ہے کہ جب اُن کے مفروضہ مہدی عالم وجود میں آئیں گے تو وہ ام المومنین حضرت عائشہ رضی کو زندہ کریں گے۔ اور اُن پر زنا کی حد قائم کریں گے۔ گویا کہ انہیں یہ بھی قبول نہیں کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں اس الزام سے کیسے بری کر دیا۔ اور چونکہ حضرت علی رضی نے حضور کو یہ رائے دی تھی کہ آپ عائشہ رضی کو طلاق دیدیں، اور وہ حضور نے قبول نہیں فرمائی تھی۔ لہٰذا ان سبائیوں نے طلاق کا اختیار حضرت علی رضی کے سپرد کر دیا۔ اور چونکہ حضرت علی رضی اتنی طاقت نہ رکھتے تھے کہ وہ لاکھوں بیٹوں کی موجودگی میں ام المومنین رضی پر حد جاری کر سکیں۔ لہٰذا اس کام کے لئے ایک مفروضہ مہدی تراشا گیا۔ اور اسے اُس وقت تک کے لئے غائب کر دیا گیا جب تک حالات اُن کے لئے سازگار نہ ہو جائیں۔ ہماری نظر میں خمینی حالات کو سازگار بنانے اور عربوں کو مٹانے کی فکر میں مبتلا ہیں اور اسی لئے وہ خود کو نائب امام غائب بھی کہتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ تو یہ اعلان فرما رہا ہے کہ ازواج مطہرات کو امہات المومنین قرار دیا گیا۔ اور حضور کی وفات کے بعد اُن سے جو نکاح کو حرام قرار دیا گیا اس کی اہم وجہ یہ ہے کہ اس میں ایذائے رسول ہے۔ اور حضور کو اذیت پہنچانے والا ملعون ہے۔ اور اس کے لئے عذاب عظیم تیار ہے۔

کوئی ان سبائیوں سے دریافت کرے کہ بعد میں جب ام المومنین رضی کو طلاق دی جائے گی۔ تو کیا اُس سے اذیت رسول واقع نہ ہوگی۔ اور حضرت علی رضی نے ام المومنین رضی کو طلاق کب دی تھی؟ کس کے روبرو دی تھی اور پھر اس کا کیا ردعمل ہوا تھا؟ ذرا ان باتوں کا ثبوت بھی پیش کر دیجئے۔ اگر ہم ان کی اس منطق کو قبول بھی کر لیں تو اس سے تو یہ ثابت ہوگا کہ یہ جو اہل بیت کی محبت کا ڈھونگ رچاتے پھرتے ہیں، اُن کے دلوں میں گھر کے مالک کی عزت وناموس کا کچھ بھی پاس نہیں، یہ محبت کے پردے میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی بغض رکھتے ہیں۔

اور قرآن سے تو بغض ان کا اظہر من الشمس ہے۔ ان کا تمام مذہب، بغض عمرؓ، بغض عائشہؓ اور بغض معاویہؓ کے ارد گرد گھومتا ہے۔ یہ ہر اُس شخص سے بغض رکھتے ہیں جو ان حضرات کی محبت میں مبتلا ہو .... ہمارے نزدیک انہیں تو ایرانی ہونے کے ناتے، اسلام، قرآن اور تمام اہل عرب سے بغض ہے۔

قربان جائیے اُس اصل مولیٰ کے۔ جس نے ان دشمنانِ اسلام کا جواب بھی قرآن میں پیش کر دیا۔ اسی سورہ احزاب میں ارشاد ہے۔

لَا يَحِلُّ لَكَ النِّسَآءُ مِنْ	ان ازواج کے بعد تیرے لئے کوئی
بَعْدُ وَلَآ اَنْ تَبَدَّلَ	اور عورت حلال نہیں۔ اور نہ آپ
بِهِنَّ مِنْ اَزْوَاجٍ وَّ	ان ازواج میں سے کسی کو تبدیل کر سکتے
لَوْ اَعْجَبَكَ حُسْنُهُنَّ۔	ہیں۔ خواہ کسی کا حسن آپ کو تعجب
	میں ڈال دے۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو ایک مرد اور خاوند ہونے کے لحاظ سے یہ حق حاصل تھا کہ آپ اپنی کسی زوجہ کو طلاق دے کر اس کی جگہ دوسری عورت سے نکاح کر لیں، لیکن اللہ تعالیٰ کو ان ازواج مطہرات کی ادا ایسی پسند آئی کہ آپ کو مزید نکاح کی ممانعت بھی کر دی گئی۔ اور آپ سے طلاق کا حق بھی سلب کر لیا گیا۔ کہ آپ انہیں تبدیل بھی نہیں کر سکتے۔ جب آپ ہی کو طلاق دینے کا حق باقی نہ رہا۔ تو آپ نے حضرت علیؓ کو یہ حق کیسے دے دیا؟ انسان کسی کو وہی چیز عطا کرتا ہے جو اس کے اختیار میں ہو، اور جو چیز انسان کے اختیار ہی میں نہ ہو اسے دینے والا اور لینے والا دونوں ہی احمق تصور کئے جاتے ہیں۔ طبرسی وغیرہ نے یہ روایت وضع کر کے یہ ثابت کیا ہے۔ کہ اس کی نظروں میں نہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی کوئی حیثیت ہے، اور نہ حضرت علیؓ کی۔ ان لوگوں کو حضرت علیؓ یا اُن کی اولاد سے کوئی محبت ہے بھی نہیں۔ یہ لوگ تو ان حضرات کو آلہ کار کے طور پر استعمال کرتے ہیں۔

اس موقعہ پر اہانت رسول کے لئے ایک اور کہانی بھی وضع کی گئی۔ کہ فتح مکہ کے بعد نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ام ہانی رض کو پیغام نکاح دیا۔ اور انہوں نے بچوں کی موجودگی کا بہانہ کر کے انکار کر دیا۔ اگر واقعتہً ایسا ہوا تھا تو اس سے بڑھ کر ام ہانی رض کی بدقسمتی کوئی اور نہیں ہو سکتی۔ حالانکہ یہ داستاں صرف اس لئے وضع کی گئی ہے کہ آپؐ نے عالم شباب میں ام ہانی رض کے لئے ابو طالب کو پیغام نکاح دیا تھا۔ اور اس نے حضور کو محتاجی کا طعنہ دے کر انکار کر دیا تھا۔ اس کی لیپا پوتی کے لئے جہاں معراج کی داستاں تیار کی گئی۔ وہاں یہ داستاں بھی وضع ہوئی۔ حالانکہ آپ اوپر قرآن کی آیت کا مطالعہ کر چکے ہیں کہ آپ کو مزید نکاح کی اجازت نہیں رہی تھی۔ اور یہ ممانعت عمرۃ القضاء کے بعد جب آپ نے حضرت میمونہ رض سے نکاح فرمایا تھا نازل ہوئی تھی اور عمرۃ القضاء ۷ھ میں واقع ہوا۔ گویا یہ روایت وضع کر کے یہ ثابت کیا جا رہا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم بھی قرآن پر عمل نہ فرماتے تھے۔ اور اس سے قبل جب آپ کو مزید نکاح کی اجازت حاصل تھی تو وہ بھی ایک شرط کے ساتھ مشروط تھی اور وہ شرط یہ تھی۔

اِلَّا هَاجَرْنَ مَعَكَ — مگر وہ عورت آپ کے ساتھ ہجرت کرے

کہ اُس عورت نے ہجرت کی ہو اور فتح مکہ کے بعد ہجرت باقی نہیں رہی تھی۔ اور ام ہانی رض فتح مکہ کے بعد اسلام لائیں۔ ایسی صورت میں آپ قرآن کی خلاف ورزی کرتے ہوئے انہیں پیغام نکاح کیسے دے سکتے تھے؟

یہ ممکن ہے کہ ایسا ہوا ہو کہ ام ہانی رض نے آپ سے درخواست کی ہو، اور آپ نے اُس سے انکار فرما دیا ہو۔ جس سے ظاہر ہے کہ سبائیوں کو تکلیف پہنچنا یقینی ہے۔ امام ترمذی نے اس کہانی کو نقل کر کے لکھا ہے۔

هذا حديث غريب لا نعرفه الا من هذا الوجه۔ — یہ حدیث غریب ہے۔ ہم اس کے علاوہ اس کی کوئی اور سند نہیں جانتے

امام قرطبی اپنی تفسیر میں فرماتے ہیں کہ امام ابن العربی کا قول ہے کہ یہ روایت انتہا سے زیادہ ضعیف ہے۔ تفسیر قرطبی ج ۷، ص۵۲۸۸۔ اس کا راوی سدی ہے جو مشہور کذاب اور سبائی ہے۔ تو جب تک آپ کے لئے نکاح حلال تھے۔ اس وقت بھی عورت کا مہاجرہ ہونا شرط تھا۔ اور ام ہانی رضی تو کجا بنو ہاشم خاندان کی کوئی عورت بھی مہاجرہ نہ تھی۔ یہی وجہ ہے کہ آپ کی زوجیت میں کوئی ہاشمیہ عورت نہ آسکی۔ غور فرمایئے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ اقدس پر کن کن لطیف پیرایوں میں تبرا کیا جاتا ہے۔ اور کس طرح اس پر سونے کے ورق چڑھائے جاتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اس قسم کے تبرا کو سمجھنا ہمارے علماء کے لئے ممکن بھی نہیں۔ یہ تو اسی صورت میں ممکن ہے کہ پہلے تو وہ روایت پرستی کے مرض سے نجات حاصل کریں قرآن، رجال، اصولِ حدیث، جرح و تعدیل اور مذہب شیعہ کا گہری نظر سے مطالعہ کریں۔ جب تک وہ ان امور کو نہیں اپنائیں گے۔ اُس وقت تک وہ قدم قدم پر سبائیت کے جال میں پھنستے رہیں گے۔

یہ تو وہ آیات کریمہ تھیں، جن سے تمام ازواج مطہرات کا مقام ظاہر ہوتا تھا۔ اور جن کی رُو سے یہ ثابت ہوتا تھا کہ تمام ازواج مطہرات سیدات النساء ہوں گی۔ لیکن ان تمام میں بھی آخر کسی نہ کسی کو خصوصی مقام حاصل ہوگا۔ درمیان مضمون میں ہم پہلے یہ بیان کر چکے ہیں کہ ام المومنین حضرت عائشہ رضی کو تمام جہاں کی عورتوں پر فضیلت حاصل ہے۔ اور اس سلسلہ میں ایک حدیث بھی پیش کر چکے ہیں۔

لیکن ام المومنین حضرت عائشہ رضی کا سب سے بڑا مقام یہ ہے کہ جب ان پر تہمت لگائی گئی۔ اور مشورہ دینے والوں نے طلاق کے مشورے دیئے تو ان کی برات میں سورۂ نور کی ابتدائی آیات نازل ہوئیں۔ جو ان کے رتبہ اور فضیلت کا ذکر ہر مومن کی زبان پر جاری رہے گا۔

یہ ام المومنین ہی کی ذاتِ بابرکت ہے۔ کہ جن کی وجہ سے امت پر تیمم کی آسانی پیدا ہوئی۔

زنا کی حد نافذ ہوئی ۔حد قذف کا حکم نازل ہوا جن لوگوں نے آپ پر تہمت لگائی تھی قرآن نے انہیں جھوٹا قرار دیا ۔اور یہ حکم دیا کہ کبھی ان کی شہادت قبول نہ کی جائے ۔اور یہ لوگ فاسق ہیں ۔اس سے یہ اصول سامنے آیا کہ جو شخص ام المومنین کی ذات اقدس پر حرف گیری کرتا ہو۔ وہ مردود الشہادت ہے ۔اور از روئے قرآن کاذب اور فاسق ہے ۔سبائی اس آئینہ میں اپنا چہرہ دیکھ لیں ۔لیکن دیکھ کیسے لیں گے انہیں تو سورۂ نور کے نام سے بھی چڑ ہے ۔ وہ تو اہرمن کے پجاری ہیں ۔ اُن کا نور سے کیا واسطہ ۔اسی لئے محدثین کسی رافضی کی روایت قبول نہیں کرتے ۔کیونکہ روایت حدیث بھی ایک شہادت ہے اور وہ از روئے قرآن مردود الشہادت ہیں۔

اللہ تعالیٰ ام المومنین حضرت عائشہؓ کی برارت ظاہر کرتے ہوئے مضمون کے آخر میں ارشاد فرماتے ہیں۔

اَلطَّيِّبٰتُ لِلطَّيِّبِيْنَ وَالطَّيِّبُوْنَ	پاک عورتیں پاک مردوں کے لئے
لِلطَّيِّبٰتِ ۚ اُولٰٓئِكَ مُبَرَّءُوْنَ	اور پاک مرد پاک عورتوں کے لئے
مِمَّا يَقُوْلُوْنَ ۭ لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ	یہ لوگ عوام کے افترا سے بیزار ہیں۔
وَّرِزْقٌ كَرِيْمٌ ۝	ان کے لئے مغفرت اور عمدہ رزق ہے۔

چونکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم روئے زمین پر سب سے پاکیزہ تر ہستی ہیں ۔اسی لئے اللہ تعالیٰ نے آپ کی زوجیت کے لئے ایک پاکیزہ ہستی کو منتخب فرمایا۔ اور یہ بھی اشارتاً بیان کیا کہ پاکدامن مردوں کے لئے پاک دامن عورت ہونی چاہیئے ۔اسی طرح پاک دامن عورت کے لئے پاک دامن مرد۔ آخر میں ارشاد فرماتے ہیں ۔لوگ جو بہتان تراشی کر رہے ہیں۔ اُس سے حضور اور آپ کی زوجہ کی ذات پاک ہے ۔ان حضرات کے لئے مغفرت اور رزق کریم ہے۔

اگرچہ یہ افترا ام المومنین حضرت عائشہؓ کے لئے تھا ۔لیکن ظاہر ہے کہ اس سے نبی کریم

صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات پر حرف آتا تھا اور آپ کی ذات پر حرف آنے کا مطلب یہ تھا کہ شانِ رسالت ہی ختم ہو کر رہ جاتی۔ اسی لئے آج تک سبائی ام المؤمنین پر یہ الزام لگاتے ہیں تاکہ شانِ رسالت ختم ہو، اگرچہ اپنی تقاریر میں اس کا کھل کر اظہار نہیں کرتے۔ لیکن اس سلسلہ میں اُن کا جو عقیدہ ہے وہ ہم پہلے بیان کر چکے ہیں۔

اس آیت میں جہاں افترا پردازی کا رد کیا گیا۔ وہاں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو طیب اور ام المؤمنین حضرت عائشہؓ کو طیبہ قرار دیا گیا۔ پھر اُن کے لئے مغفرت اور رزق کریم کا اعلان کیا گیا۔

ام المؤمنین حضرت عائشہؓ کے علاوہ کوئی صحابیہ ایسی نہیں جس کی وجہ سے قرآن میں آیات نازل ہوئی ہوں۔ دنیا کی تمام عورتوں میں سے صرف دو عورتیں ایسی ہیں جن کی قرآن نے برات ظاہر کی۔ ایک حضرت مریم۔ اور ایک حضرت عائشہؓ اور دونوں کو قرآن نے صدیقہ ثابت کیا۔ دونوں پر یہودیوں نے الزام قائم کئے۔ اور آج تک دونوں کے معاملہ میں دو فریق روئے زمیں پر موجود ہیں۔

تمام یہودی حضرت مریم پر اتہام لگاتے ہیں اسی طرح یہودیوں کی روحانی نسل یعنی مجوسی اور رافضی ام المؤمنین پر الزام لگاتے ہیں۔ اس طرح دونوں میں یکسانیت پائی جاتی ہے۔ لیکن حضرت مریم کی برات ظاہر کرنے کے لئے اللہ تعالیٰ نے صرف ایک جملہ پر اکتفا فرمایا۔

وَاُمُّهٗ صِدِّيْقَةٌ۔ اور ان کی والدہ سچی ہیں

جب کہ ام المؤمنین کی برات میں پورے چار رکوع نازل فرمائے۔

متقدمین علماء اہل سنت کو اس سے انکار نہیں کہ تمام ازواج مطہرات میں سب سے افضل مقام ام المؤمنین حضرت عائشہؓ کو حاصل ہے۔ اور امہات المؤمنین تمام امت پر فضیلت رکھتی ہیں۔ انہیں چھوڑ کر کسی اور کو سیدۃ النساء وغیرہ کہنے کا مطلب صاف طور

پر یہ ہے کہ منافقین ان کو اُن کے مقام سے گرانا چاہتے ہیں۔ ہمارے علماء اگر قرآن پر غور کریں تو انہیں واضح طور پر یہ نظر آئے گا کہ متعدد ازواج مطہرات کی موجودگی میں لفظ اہل جو واحد کا صیغہ ہے استعمال کر کے ام المومنین ؓ کی جانب اشارہ کیا گیا۔ مثلاً ارشاد ہے۔

وَاِذْ غَدَوْتَ مِنْ اَهْلِكَ	اور جب آپ اپنی بیوی کے پاس سے
تُبَوِّئُ الْمُؤْمِنِيْنَ مَقَاعِدَ	صبح صبح نکلے۔ اور مسلمانوں کو مورچوں
لِلْقِتَالِ۔	پر بٹھا رہے تھے۔

تمام مفسرین متفق ہیں کہ یہاں اہل سے مراد ام المومنین حضرت عائشہ ؓ ہیں۔ اسی طرح ایک اور جگہ ارشاد ہے۔

وَاْمُرْ اَهْلَكَ بِالصَّلٰوةِ	اور آپ اپنی بیوی کو نماز کا حکم دیجئے
وَاصْطَبِرْ عَلَيْهَا ط۔	اور خود بھی اس پر ثابت قدم رہئے

یہ طریقہ صرف اس لئے اختیار کیا گیا۔ تاکہ حضرت عائشہ ؓ کی فضیلت اور فوقیت ظاہر کی جائے۔ جس طرح قرآن میں جگہ جگہ حضور کو مخاطب کیا جاتا ہے۔ اور مراد امت ہوتی ہے۔ اسی طرح اس آیت میں ذکر حضرت عائشہ ؓ کا کیا گیا۔ اور مراد تمام ازواج ہوئیں۔

ہم جب کتب احادیث کو دیکھتے ہیں تو کوئی کتاب ایسی نظر نہیں آتی جو ام المومنین کے فضائل سے خالی ہو۔ اُن میں سے چند روایات ہم قارئین کی خدمت میں پیش کر رہے ہیں۔ تاکہ جو لوگ روایت پرستی کے مرض میں مبتلا ہیں کچھ ان کی تسکین کا سامان بھی مہیا ہو سکے۔

حضرت ابو موسیٰ اشعری ؓ کا بیان ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔ مردوں میں تو بہت کامل گزرے ہیں۔ لیکن عورتوں میں دو ہی کامل گزری ہیں۔ مریم بنت عمران۔ اور آسیہ امرأۃ فرعون۔ اور عائشہ ؓ کو تمام عورتوں پر اسی طرح فضیلت حاصل ہے۔ جس طرح ثرید کو تمام کھانوں پر۔ بخاری ج ۱ ص ۵۳۲۔ مسلم ج ۲ ص ۲۸۴۔ نسائی ج ۲ ص ۱

اس حدیث سے یہ بات ثابت ہوگئی کہ اصل کامل عورتیں تین ہیں اور اُن میں سب سے بڑا مقام حضرت عائشہؓ کا ہے۔

حضرت انسؓ فرماتے ہیں میں نے خود حضور کو فرماتے سُنا ہے کہ عائشہؓ کو تمام عورتوں پر ایسی فضیلت حاصل ہے۔ جیسے ثرید کو تمام کھانوں پر۔ مسلم ج ۲ ص ۲۸۷۔ بخاری ج ۱ ص ۵۳۲۔ نسائی ج ۲ ص ۷۷۔ ترمذی ج ۲ ص ۲۵۱۔

عروۃ بن الزبیر کا بیان ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم مرض الموت میں بھی مختلف ازواج کے پاس اُن کی باری کے لحاظ سے جاتے تھے۔ لیکن ہر جگہ یہی سوال فرماتے ہیں کہ میں کل کہاں گزاروں گا۔ کل کہاں گزاروں گا کیونکہ آپ حضرت عائشہؓ کے گھر جانا چاہتے تھے۔ حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں جب میری باری کا دن آیا تو حضور کو سکون و اطمینان حاصل ہوگیا۔ بخاری ج ۱ ص ۵۳۳۔ ج ۲ ص ۶۴۰۔

حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہر زوجہ کے یہاں یہی فرماتے کہ میں کل کہاں گزاروں گا تاکہ میری باری جلدی آجائے۔ جب میری باری آئی تو اللہ تعالیٰ نے میرے سینے اور میرے گلے کے درمیان آپ کی روح قبض فرمائی۔ مسلم ج ۲ ص ۲۸۶ بخاری ج ۲ ص ۶۴۰۔

گویا اللہ تعالیٰ کی رضا یہ تھی کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اپنے آخری ایام ام المؤمنین کے پاس گزاریں۔ اسی لئے آپ کی وفات ام المؤمنین کی باری کے دن، ان کے گھر میں۔ اور اُن کے سینہ سے لگ کر ہوئی۔ اور ان کے حجرۂ مبارک میں دفن ہوئے۔ یہ ام المؤمنین کی ایسی صفت ہے جو قیامت تک قائم رہے گی۔ آج دنیا جسے گنبد خضرا سے تعبیر کرتی ہے۔ وہ دراصل حجرۂ عائشہؓ ہے۔

حضرت عائشہؓ کا بیان ہے کہ وفات کے وقت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم میرے سینہ سے ٹیک لگائے ہوتے تھے۔ اور میں آپ کو چپٹائے ہوئے تھی اور آپ فرما رہے تھے۔

اللھم فی الرفیق الاعلی   اے اللہ رفیق اعلیٰ مجھے بلا لیجئے

ام المؤمنین کا یہ بھی بیان ہے کہ صحابہ کرام حضور کی خدمت میں تحائف بھیجتے جب حضور میرے یہاں مقیم ہوتے۔ اور اس سے اُن کی غرض حضور کی خوشنودی ہوتی تھی۔ مسلم ج ۲ ص ۲۸۵ حتیٰ کہ ایک بار بقیہ ازواج مطہرات کو اس کی شکایت پیدا ہوئی۔ انہوں نے حضرت فاطمہؓ کو اپنا وکیل بنا کر حضور کی خدمت میں روانہ کیا۔ ام المؤمنین فرماتی ہیں میں اس وقت حضور کے ساتھ ایک چادر میں لیٹی ہوئی تھی۔ فاطمہؓ آئیں، اور اجازت طلب کی۔ آپ نے انہیں اجازت دی۔ انہوں نے عرض کیا یا رسول اللہ مجھے آپ کی ازواج نے بھیجا ہے۔ وہ آپ سے ابو قحافہؓ (ام المؤمنین کے دادا) کی بیٹی کے سلسلہ میں آپ سے عدل کی طالب ہیں۔ آپ نے اُن سے فرمایا۔

الست تحبین   کیا تو اُس سے محبت نہیں کرتی جس
ما احب۔   سے میں محبت کرتا ہوں۔

انہوں نے عرض کیا کیوں نہیں۔ آپ نے ارشاد فرمایا۔

فاحبنی ھذہ۔   تو تو اس سے محبت کر

انہوں نے واپس جا کر ازواج مطہرات کی خدمت میں تمام کیفیت بیان کی انہوں نے اصرار کر کے حضرت فاطمہؓ کو دوبارہ بھیجنا چاہا تو انہوں نے جواب دیا۔

وَاللہ لا اکلمہ فیھا ابدا۔   اللہ کی قسم میں تو اُن کے سلسلہ میں
مسلم ج ۲ ص ۲۸۵۔ نسائی ج ۲ ص ۷۶   کبھی آپ سے کلام نہ کروں گی۔

ازواج مطہرات نے ام المؤمنین ام سلمہؓ کو آگے کیا۔ اور انہیں حضور کے خدمت میں بھیجا۔ انہوں نے جب حضور کے روبرو یہ دعویٰ پیش کیا تو آپ نے ارشاد فرمایا۔

یا ام سلمۃ لا تؤذینی فی   اے ام سلمہ مجھے عائشہؓ کے بارے
عائشۃ فانہ واللہ ما   میں اذیت نہ پہنچا۔ کیونکہ اللہ کی قسم

اتانی الوحی فی لحاف امرأۃ	تم میں سے عائشہؓ کے علاوہ کسی کے
منکن الاھی۔ نسائی ج ۲ ص	لحاف میں میرے پاس وحی نہیں آتی

ترمذی ج ۲ ص۲۲۵

اسی لئے ام المؤمنین حضور کی محبوبہ کہلاتی تھیں۔ اور اسی لحاظ سے اُن کا لقب حب رسول اللہ ہے۔ لیکن اس حدیث سے چند امور نئے ثابت ہوئے۔

۱۔ اگر حضور کسی زوجہ کے پاس لیٹے ہوتے تو وحی نہ آتی تھی لیکن جب حضرت عائشہؓ کے پاس لیٹے ہوتے تب بھی جبرائیلؑ وحی لے کر آتے۔ یعنی وہ صرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی کو محبوب نہ تھیں، بلکہ اللہ کو بھی محبوب تھیں۔

۲۔ ام المؤمنین کے سلسلہ میں کسی قسم کی گفتگو بھی حضور کی ایذا کا سبب تھی۔

۳۔ حضور نے حضرت فاطمہؓ کو ام المؤمنین سے محبت کا حکم دیا۔ لیکن جو گروہ حب فاطمہؓ کے نعرے لگاتا پھرتا ہے اور بغض عائشہؓ میں مبتلا ہے اس لحاظ سے اسے حضرت فاطمہؓ سے بھی بغض ہے۔ اور حضور سے بھی بغض ہے۔ کیونکہ جسے حضور اور حضرت فاطمہؓ سے محبت ہوگی اسے یقیناً حضرت عائشہؓ سے بھی محبت ہونی چاہیئے۔

حضرت عائشہؓ کا بیان ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک دن مجھ سے فرمایا۔ یہ جبرئیل موجود ہیں اور تمہیں سلام کہہ رہے ہیں۔ ام المؤمنین نے جواب دیا۔ وعلیہ السلام ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔ یا رسول اللہ آپ وہ چیزیں دیکھتے ہیں جو میں نہیں دیکھ سکتی۔ بخاری ج ۱ ص۵۳۲ مسلم ج ۲ ص۲۸۵۔ ترمذی ج ۲ ص۲۲۵۔

حضرت عمروؓ بن العاص کا بیان ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے غزوۃ ذات السلاسل کا امیر بنا کر بھیجا۔ جب میں اس غزوہ سے فتح پا کر واپس آیا۔ تو میں نے آپ سے دریافت کیا کہ آپ کو لوگوں میں سب سے زیادہ محبوب کون ہے؟ آپ نے فرمایا عائشہؓ۔ میں نے عرض کیا میری مراد مردوں سے ہے۔ آپ نے فرمایا عائشہؓ کا باپ ترمذی ج ۲ ص۲۲۵

اس کی تائید میں ترمذی نے حضرت انس کی ایک اور حدیث پیش کی ہے۔ جس کے الفاظ ہیں کہ حضور سے دریافت کیا گیا کہ یارسول اللہ آپ کو سب سے زیادہ محبوب کون ہے؟ آپ نے فرمایا عائشہؓ۔ لوگوں نے سوال کیا کہ مردوں میں سب سے زیادہ محبوب کون ہے۔ آپ نے فرمایا اس کا باپ۔ ترمذی ج ۲ ص ۲۵۱۔

جب ہم ام المومنین کی علمیت پر نظر ڈالتے ہیں تو کتب احادیث اور کتب تاریخ سے یہ حقیقت کھل کر سامنے آتی ہے کہ ام المومنین فقہ، حدیث، تفسیر، ادب، لغت، تاریخ زمانہ جاہلیت، علم الانساب اور فن خطابت کی اتنی زبردست ماہرہ تھیں کہ دنیا کی عورتوں میں ان کی نظیر پیش کرنا محال ہے۔ بلکہ چند صحابہ کو چھوڑ کر وہ تمام صحابہ سے بھی زیادہ علمیت رکھتی تھیں۔ امور خانہ سے متعلق تمام مسائل ان ہی کی ذات پر ختم ہوتے ہیں۔ حدیث و فقہ کے بنیادی اصول انہوں نے وضع کئے۔ اور عربی ادب پر ایسے نکات بیان کرتیں کہ بڑے بڑے عرب انگشت بدنداں رہ جاتے۔

حتیٰ کہ حضرت طلحہؓ بن عبید اللہ کے صاحبزادے موسیٰ کا بیان ہے کہ میں نے ام المومنینؓ سے زیادہ فصیح گفتگو کرنے والا کوئی نہیں دیکھا۔ ترمذی ج ۲ ص ۲۵۱

یہ ان کے فن خطابت ہی کا نتیجہ تھا کہ قصاص عثمانؓ کے سلسلہ میں تمام اہل مکہ ان کے ساتھ ہو گئے۔ اور جب بصرہ پہنچیں تو ایک ہی تقریر پر تمام اہل بصرہ ان کے ساتھ ہو گئے تھے۔ اگر آج کل کے سیاست دانوں کی طرح وہ کوئی سیاسی دورہ کر لیتیں تو شاید ہماری تاریخ کا کچھ اور ہی رخ ہوتا۔

ام المومنین کے فضائل کے سلسلہ میں اگر تمام احادیث اور تمام تاریخی واقعات پیش کئے جائیں تو اس کے لئے ایک ضخیم جلد درکار ہوگی۔ لہٰذا ہم صرف ان چند احادیث ہی پر اکتفا کرتے ہیں۔

ہم نے اس مضمون کی ابتداء میں دعویٰ کیا تھا کہ سبائی اور مجوسی جو حضرت فاطمہؓ کے

فضائل بیان کرتے، اور انہیں سیدۃ النساء اہل الجنہ یا سیدۃ النساء المؤمنین قرار دیتے ہیں۔ یہ صرف ایک دھوکہ اور فریب ہے۔ اس سے مراد اُنکی فاطمہؓ بنت محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہرگز نہیں۔ بلکہ فاطمہؓ بنت اسد مراد ہیں۔ جو حضرت علیؓ کی والدہ ہیں۔ اگر ہمارے سنی بھائیوں کو اس کا یقین نہ آئے تو ملا باقر مجلسی کے الفاظ میں اُن کے خیالات ملاحظہ فرمایئے۔ وہ حضرت علیؓ کی ولادت کا حال بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

عباس و یزید بن قعنب کہتے ہیں کہ جب فاطمہؓ دعا سے فارغ ہوئیں کہ ہم نے دیکھا کہ دیوار خانہ کعبہ شگافتہ ہوئی۔ اور فاطمہؓ داخل خانہ کعبہ ہوئیں۔ اور ہماری آنکھوں سے غائب ہو گئیں۔ اس کے بعد دیوار جیسی تھی بحکم خدا ویسی ہو گئی۔ ہم نے چاہا دروازہ خانہ کعبہ کھولیں۔ بہت زور کیا۔ مگر دروازۂ خانہ کعبہ نہ کھلا۔ معلوم ہوا کہ یہ راز خدائی ہے۔ پس فاطمہ تین روز کعبہ میں رہیں۔ اہل مکہ اس واقعہ کو کوچہ و بازار میں نقل اور عورتیں گھروں میں اس کا تذکرہ اور چرچا کرتی تھیں۔

جب چوتھا دن ہوا۔ جس جگہ سے دیوار خانہ کعبہ شق ہو گئی تھی۔ اس جگہ سے پھر شق ہو گئی اور فاطمہؓ بنت اسد باہر چلی آئیں۔ اسد اللہ الغالب علیؓ بن ابی طالب کو گود میں لئے ہوئے تھیں۔ پس کہا۔

اے گروہ مردم۔ حق تعالیٰ نے اپنی خلق سے مجھے برگزیدہ کیا۔ اور زنان برگزیدہ پر جو مجھ سے پہلے ہو چکی ہیں مجھے فضیلت دی۔ اس لئے کہ حق تعالیٰ نے آسیہ دختر مزاحم کو برگزیدہ کیا۔ اور آسیہ عبادت پوشیدہ حق تعالیٰ اس جگہ جہاں عبادت سزاوار نہ تھی۔ مگر درحالت ضرورت یعنی فرعون کے گھر میں کیا کرتی تھیں۔ اور مریم بنت عمران کو حق تعالیٰ نے برگزیدہ کیا۔ اور ولادت عیسیٰ کو اُن پر آسان کیا۔ اور جنگل میں درخت خشک کو حرکت دی۔ اور رطب تازہ مریم کے لئے درخت سے گرائے۔

[illegible] حق تعالیٰ نے ان دونوں عورتوں سے برگزیدہ کیا۔ اور زنان برگزیدہ [illegible]

جو مجھ سے پہلے ہو چکی ہیں مجھے فضیلت دی ..... اس لئے کہ مجھ سے خانۂ کعبہ برگزیدہ حق تعالیٰ میں فرزند پیدا ہوا۔ اور میں تین روز اس خانۂ محترم میں رہی۔ طعام و میوہ ہائے بہشت کھاتے۔ اور جس وقت میں نے چاہا باہر آؤں، جب کہ اپنے فرزند کو ہاتھوں میں لئے ہوئے تھی۔ ایک ہاتف غیب نے عالم غیب سے مجھے آواز دی۔

کہ اے فاطمہؓ ایسے فرزند بزرگوار کا نام علی رکھنا کیونکہ میں خداوند علی اعلیٰ ہوں۔ اور علی کو میں نے اپنی قدرت و عزت و جلال سے پیدا کیا۔ اور اپنی عدالت سے اسے حصہ کامل بخشا ہے اور اُس کا نام میں نے اپنے نام سے مشتق کیا ہے۔ اس کو اپنے آداب حسنہ میں سے تادیب کی ہے۔ اور اپنے امور اس کو تفویض کئے ہیں۔ اور میں نے اس کو اپنے علوم مخفی پر مطلع کیا ہے۔ وہ میرے خانۂ محترم میں پیدا ہوا ہے۔ جلاء العیون ج ۱ ص۲۴۸

اس کہانی کی رو سے فاطمہ بنت اسد تمام جہاں کی عورتوں پر فضیلت رکھتی تھیں۔ بعثتِ رسول سے قبل ان کے پاس وحی آئی۔ اور اللہ تعالیٰ اُن سے بلا واسطہ ہم کلام ہوا۔ ہمارے نزدیک یہ شرف دنیا کی کسی عورت کو حاصل نہیں۔ اور چونکہ خود اُن پر وحی آتی رہی لہٰذا انہیں حضور پر ایمان لانے کی بھی کوئی ضرورت نہ تھی، لیکن مجبور ہو کر فتح مکہ کے بعد اسلام لائیں۔ اور یہ سب مراتب اس لئے حاصل ہوئے کہ اُنکے یہاں بچہ خانہ کعبہ میں پیدا ہوا۔ گویا فضیلت و مراتب کا دار و مدار کعبہ میں پیدا ہونے اور پیدا کرنے پر موقوف ہے۔ نہ کہ ایمان اور اعمال صالحہ پر۔

علی اعلیٰ یعنی اللہ تعالیٰ نے حضرت علیؓ کو اپنی قدرت کاملہ سے پیدا کر کے۔ انہیں علوم مخفی (علم باطن) پر مطلع کیا۔ اور انہیں اپنے تمام امور تفویض کر کے خود گوشہ نشیں ہو گیا۔ اب دنیا میں جتنے بھی کام انجام پا رہے ہیں وہ حضرت علیؓ انجام دے رہے ہیں۔ غالباً اسی لئے انہیں مولیٰ کا خطاب دیا گیا۔ اور اسی لئے مولیٰ علی مدد کے نعرے لگائے جاتے ہیں۔ اور چونکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو رسالت حضرت علیؓ کی تخلیق کے بعد حاصل ہوئی۔ اس لحاظ

سے آپؐ کو نبوت عطا کرنے والے بھی علی ہیں۔ اور حضرت علی نے علم باطن نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے حاصل نہیں کیا۔ بلکہ وہ تو حضور کی بعثت سے قبل ہی علوم باطن براہ راست اللہ تعالیٰ سے حاصل کر چکے تھے۔ حضور سے اُن کا جو تعلق ظاہر کیا جاتا ہے۔ وہ تو بطور تقیہ ہے۔ ورنہ ان کے عقیدہ میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو رسول بنانے والے بھی علیؓ ہیں۔

جب کعبہ کی پیدائش سے یہ تمام کمالات حاصل ہوتے ہیں۔ تو یہ کمالات حضرت حکیمؓ بن حزام کو بھی حاصل ہونے چاہئیں جو حضرت علیؓ کی پیدائش سے چالیس سال قبل فی الحقیقت کعبہ میں پیدا ہوئے تھے۔ لیکن ان کا قصور صرف یہ تھا کہ وہ عرب کی برگزیدہ ترین ہستی کی اولاد نہ تھے۔ اور سبائیوں کے نزدیک عرب کی برگزیدہ ترین ہستی ہاشم بن عبد مناف تھے۔ اہل سنت نے زبردستی حضور کو بنا دیا۔ اور ہاشم برگزیدہ ہستی اس لئے تھے۔ کہ حضرت علیؓ کا پدری نسب نامہ اُن سے ملتا تھا اور ان کی ماں فاطمہؓ بنت اسد بھی ہاشم کی اولاد تھیں۔ جب کہ حضور کی والدہ کا ہاشم سے کوئی تعلق نہ تھا۔ اس کی جانب ہم کچھ اشارات شہربانو کی کہانی میں کر چکے ہیں۔ گویا یہ سارا کھیل اس پر موقوف ہے۔ کہ باپ اور ماں دونوں جانب سے ہاشم سے تعلق پیدا ہو، اور اس طرح خاندانیت کا وہ چکر وجود میں آجائے جو ایرانیوں میں ہمیشہ سے چلا آرہا تھا۔ کہ اگر ساسانی خاندان کا کوئی بادشاہ مر جاتا اور شاہی خاندان کا کوئی مرد باقی نہ بچتا تو حکومت عورت کو دی جاتی۔ اور اگر وہ بھی کوئی موجود نہ ہوتی تو یہ تلاش کیا جاتا کہ مملکت ایران میں کوئی شخص ایسا موجود ہے جو پدری یا مادری سلسلہ سے اس کا تعلق ساسانی خاندان سے جا کر ملتا ہو، تو اسے بادشاہت مل جاتی۔ حتیٰ کہ اسلام کے ایک ہزار سال بعد جب عباس صفوی نے یہ دعویٰ کیا کہ وہ ساسانی نسل سے تعلق رکھتا ہے تو وہ گذر یئے سے بادشاہ بن گیا۔ موجودہ دور کے بادشاہ کا بھی یہی دعویٰ تھا کہ وہ ساسانی النسل ہے۔ موجودہ انقلاب کے پس پردہ کہیں یہ ساسانی خاندان کا جھگڑا تو نہیں۔ کہ صفوی خاندان کے بارے میں یہ ثابت ہو گیا ہو کہ وہ ساسانی النسل نہیں۔ اور خمینی کا رشتہ ساسانی

خاندان سے ملتا ہو؟

جس طرح ساسانی خاندان ان کے یہاں قابل فخر ہے۔ اسی طرح خالص ہاشمیت بھی قابل فخر ہے۔ بشرطیکہ وہ ابو طالب اور فاطمہؓ بنت اسد کی اولاد ہو۔ یعنی دراصل وہی خاندانیت کا چکر ہے جسے اب اسلام کا لبادہ اوڑھا کر کبھی تشیع کے پیرایہ میں پیش کیا جاتا ہے۔ اور کبھی اسے پیری مریدی اور تصوف کا لبادہ اوڑھا دیا جاتا ہے۔ حالانکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حجۃ الوداع کے خطبہ میں ارشاد فرمایا تھا۔

لا فخر لبنی ھاشم علی غیر بنی ھاشم — بنو ہاشم کو غیر بنی ہاشم پر کوئی فخر حاصل نہیں

چونکہ اس وقت زیر بحث یہ مضمون نہیں۔ لہٰذا ہم اسی پر اکتفا کرتے ہیں۔ اور آخر میں ام المؤمنین حضرت عائشہؓ کے سلسلہ میں مضطر مجراتی کی ایک نظم پیش کر کے اس پر مضمون ختم کرتے ہیں۔

سلام اے خانہ آرائے رسولِ دو جہاں تجھ پر
سلام اے جلوہ افروز حریم جاودان تجھ پر

ابد تک مل گئی تجھ کو سیادت صنف نسواں کی
کہ جنت میں بھی تو ہو گی حرم محبوب یزداں کی

فلاح و خیر کی رشد و ہدایت کی امیں تو ہے
دلیل اس کی یہی کافی ہے ام المؤمنین تو ہے

کلام اللہ کی رو سے ہے صدیقہ لقب تیرا
فقط فرشی نہیں، عرشی بھی کرتے ہیں ادب تیرا

تری پاکیزگی پر نطق فطرت نے شہادت دی
تجھے عظمت عطا کی، عافیت بخشی فضیلت دی

اگر تیری سحر پرور ردا پر داغ آجاتا
خدا کا انتخابی فیصلہ مخدوش کہلاتا

لبِ الہام سے پایا حمیرا کا لقب تو نے
زبانِ حق سے انعامِ جلیلہ پائے ہیں تو نے

خدائے لم یزل کا بارہا تجھ کو سلام آیا
مبارک ہیں وہ لب جن پر ادب سے تیرا نام آیا

ترا جوہر تھا حق گوئی۔ ترا شیوہ تھا حق بینی
تری فطرت حیا پرور، تیری خو صبر آگینی

ترا ہر اجتہاد افضل تیری ہر بات تابندہ
تری سیرت ہے قدسی تیری توقیر پائندہ

شرف تیرے دوپٹے نے یہ جنگِ بدر میں پایا
اسے پرچم بنا کر مخبرِ صادق نے لہرایا

بناتِ ملتِ بیضا نے سیکھا علمِ دیں تجھ سے
خدا راضی تھا، اور راضی تھے ختم المرسلیں تجھ سے

ترا حجرہ امینِ خاص ہے ذاتِ رسالت کا
بساطِ ارض پر ٹکڑا یہی ہے باغِ جنت کا

اسی حجرے میں اکثر وحی اتری فخرِ عالم پر
ترا حجرہ نہیں، احساں ہے تاریخِ آدمیت پر

اسی میں رحمۃ اللعالمین رہتے تھے، رہتے ہیں
یہی حجرہ ہے، جس کو گنبدِ خضرا بھی کہتے ہیں

یہیں سے حشر کے دن سرورِ کونین اٹھیں گے
مگر تنہا نہیں اٹھیں گے، مع شیخین اٹھیں گے

وہی شیخین جن سے ارتقائے دین اکرام ہے
کہ ایک صدیق اکبر ہے تو ایک فاروق اعظم ہے

شفاعت کی اسی رحمت کدے سے ابتدا ہوگی
اسی پرِ استوں کی مغفرت کی انتہا ہوگی!

تکلف برطرف، ملت کی سچی محسنہ تو ہے
ہمیشہ حق پر جو قائم رہی۔ وہ مومنہ تو ہے

ادب آموز انساں تھا۔ ہر اندازِ متیں تیرا
مسلّم تھا صحابہ میں بھی فہم و فکر دیں تیرا

تری فکرِ رسا شرعی مسائل میں مُسلّم تھی
نہ استنباط میں کم تھی۔ نہ استخراج میں کم تھی

کسے معلوم تو نے مبداِ فطرت سے کیا پایا
نگاہِ پاک، قلبِ مطمئن، ذہن رسا پایا۔

تری عظمت کا اندازہ یہ دنیا کر نہیں سکتی
کہ ادراک حقیقت عقل تنہا کر نہیں سکتی

چمن ہے دیں کا قائم تو رنگ و بو بھی باقی ہے
کتاب اللہ جبتک ہے، جہاں میں تو بھی باقی ہے

تیری قبرِ منوّر پر سلام آثارِ قدرت کے
تیری روح مقدس پر درود انوار جنت کے

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العلمین۔

جنّت کے نوجوان

ہو سکتا ہے ہمارے قارئین کرام یہ سوچنے پر مجبور ہوں کہ جنت میں کیا بچے بھی ہونگے اور بوڑھے بھی۔ تو ہمارا جواب یہ ہے کہ جی ہاں جوان بھی ہوں گے اور بوڑھے بھی ہوں گے لیکن بچوں کی تلاش آپ کے ذمہ ہے۔

اگرچہ آپ حضرات کی طرح ہم بھی یہ پڑھتے اور سنتے آئے تھے کہ قیامت کے دن سب حضرات بغیر داڑھی مونچھ کے نوجوانوں کی صورت میں اٹھیں گے یعنی حافظ شیرازی اور شیخ سعدی کے محبوبوں کی صورت میں کتابی حد تک تو یہ سب باتیں درست ہیں لیکن کہنے کی باتیں کچھ اور ہوتی ہیں اور کرنے کی کچھ اور اور فضائل کے سلسلہ میں ہم لکڑ ہضم اور پتھر ہضم پر عمل کرتے ہیں جو کچھ ملا کہتا ہے اسے ہم بلا کم و کاست قبول کر لیتے ہیں کیونکہ ہم سنی ہیں بنکر ایمان لانا ہماری صفت خاص ہے حتیٰ کہ اب ہم اس منزل پہ پہنچ گئے ہیں کہ اب ہمارے ذہن و دماغ سب سن ہو کر رہ گئے ہیں۔

پھر ہم میں ایک خاص مرض یہ بھی ہے کہ ہم حضرت علی اور ان کی اولاد کے سلسلے میں کافی وسیع القلب واقع ہوئے ہیں۔ ان حضرات کے بارے میں ہم رافضیت اور سبائیت کے دلدادہ ہیں حتیٰ کہ اگر کوئی صحیح روایت نظر نہیں آتی تو ہم سپید جھوٹ کو بھی سینے سے لگانے کے لئے تیار ہیں اور اگر وہ گپ حضوؐر کی جانب منسوب ہو جائے تو پھر ہم عقل کو بھی طاق کی زینت بنا دیتے ہیں کیونکہ حضوؐر کی نسبت سے گپ بازی ہمارا جزِ ایمان اور کارِ ثواب بن چکا ہے اگر یہ کتب حدیث میں ہو تو کیا کہنے۔ پھر اگر اللہ نہ کرے صحاح ستہ میں سے کسی کتاب میں آجئے تو پھر تو اگر آسمان سے فرشتہ بھی اتر کر اس کی تردید کریگا تو ہم اسے بھی جھٹلا دیں گے کیونکہ ان کتابوں کے بارے میں شک کرنا کفر ہے اگر ان کی صحت میں شک کیا جائے گا تو ہمارے علمائے دین اور بزرگان امت معصوم کیسے ثابت ہوں گے؟ اور چونکہ ہم تشیع اور تصوف کے بھی پروردہ ہیں اس لئے یہ بھی ضروری ہے کہ ان کے آئمہ معصومین کی طرح ہمارے یہاں بھی معصومین کی ایک فوج ہونی چاہیے امامیہ نے بارہ کے عدد پہ اس لئے اکتفا کی کہ وہ قلیل تعداد میں ہیں اور ہم تو ماشاءاللہ

ونیا پر چھائے ہوئے ہیں۔ اس لئے ہمارے یہاں ان کی تعداد کم از کم بارہ لاکھ ہونی چاہیئے
ہے اب ذرا تماشہ دیکھئے کہ جنت میں جوان اور بوڑھے کیسے بنتے ہیں

روایت یہ کی جاتی ہے کہ حضرت ابو سعید خدری کا بیان ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ حسن وحسین جوانان اہل جنت کے سردار ہوں گے۔ ترمذی نے یہ روایت بیان کرکے اسے حسن صحیح کہا ہے۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ ہمارا مولوی پختہ عقیدت کے ساتھ برسر ممبر ہر جمعہ کو اس کی تلاوت کرتا رہتا ہے کہ ہر ستی بچے کو یہ کلمہ کی طرح یاد ہو جائے۔

اگر فی الواقع یہ درست ہے تو ہم یہ کہنے پر مجبور ہوں گے کہ حضور کے صاحبزادے ابراہیم جو ۱۶ ماہ کی عمر میں انتقال فرما گئے تھے وہ جنت میں دودھ پیتے بچوں کے سردار ہوں گے۔ ایئوں کا انتظام ہمارے ملاؤں کے ذمے . . . . دیکھیں اس سلسلہ میں کب تک روایات وجود میں آتی ہیں۔ آمدم برسر مطلب۔ ترمذی کی اس حدیث کے سلسلہ میں ہمیں چند اشکالات ہیں کاش کوئی انہیں رفع کر سکے۔

۱۔ جس وقت حضورؐ نے یہ ارشاد فرمایا کیا یہ دونوں حضرات نوجوان تھے؟ حالانکہ مشہور تاریخ کی رو سے ان حضرات کی عمر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی رحلت کے وقت چھ سات سال تھی اور ہماری تحقیق کی رو سے دو تین سال تھی۔ کیا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ایسی لایعنی بات فرما سکتے تھے؟

۲۔ کیا آپ کو اس کا بھی علم نہ تھا کہ بچہ کسے کہتے ہیں اور جوان کسے کہتے ہیں۔

۳۔ یا ہمارے علماء کے نزدیک پانچ سال کی عمر میں بچہ بالغ ہو جاتا ہے جیسے لڑکی ۹ سال کی عمر میں

۴۔ ہمارے علماء کے بقول سبھی نوجوان ہوں گے۔ ان میں حضرات حسنینؓ کے والد محترم حضرت علیؓ، چچا حضرت جعفرؓ اور حضرت ابوبکرؓ و عمرؓ بھی ہوں گے۔ کیا یہ دونوں بچے ان حضرات کے بھی سردار ہوں گے۔ سوچ کر جواب دیجئے۔

کیونکہ اگر آپ یہ جواب دیتے ہیں کہ نہیں یہ حضرات ان کی ماتحتی سے خارج ہوں گے تو اس روایت میں کوئی لفظ ایسا نہیں پایا جاتا جس سے وہ مستثنیٰ قرار پائیں۔

۵۔ انبیائے کرام علیہم السلام بھی نوجوان ہوں گے اس روایت کی رو سے حضرات حسنینؓ کو انبیا

کا بھی سردار ہونا چاہیئے۔

شاید اہل سنت حضرات اس سے واقف نہ ہوں کہ سبائیوں کے نزدیک امام کا مقام انبیاء سے بڑھ کر ہوتا ہے۔ اسی لئے امام کے ساتھ علیہ السلام لکھا جاتا ہے۔ ان کے نقطۂ نگاہ سے یہ روایت بالکل درست ہے اور ان کی کتابوں میں پائی جاتی ہے کہیں ایسا تو نہیں کہ یہ سبائیوں کی اختراع ہو۔ اور ہم نے راویوں پر اندھا اعتماد کر کے اسے قبول کر لیا ہو؟

ترمذی نے اس روایت کو دو سندات سے نقل کیا ہے لیکن دونوں سندات میں یزید بن ابی زیاد الکوفی شیعہ موجود ہے۔ حقیقتاً یہ وہ شخص ہے جس نے سیاہ جھنڈوں والی روایت وضع کر کے حضرت عبداللہ بن مسعودؓ اور ان کے شاگردوں کی جانب منسوب کی۔ یہ روایت ہماری کتاب "ظہور مہدی" میں ملاحظہ فرمائیے۔

ذہبی لکھتے ہیں کہ کوفہ کے مشہور علماء میں اس کا شمار ہوتا ہے حافظہ اس کا اگرچہ خراب تھا ترمذی مسلم ابوداؤد، نسائی اور ابن ماجہ نے اس سے روایات لی ہیں۔

یحیٰی بن معین کہتے ہیں۔ یہ قوی نہیں اس کی روایت حجت نہیں شعبہ نے اگرچہ اسے ثقہ قرار دیا ہے لیکن امام ابن المبارک فرماتے ہیں اس کی روایت زمین پر دے مارو۔

امام وکیع فرماتے ہیں اس نے ابراہیم کے واسطہ سے حضرت عبداللہ بن مسعود سے جھنڈوں والی روایت نقل کی ہے کہ مشرق کی جانب سے سیاہ جھنڈے ظاہر ہوں گے۔ ان کے ساتھ امام مہدی ہوں گے۔

امام احمد فرماتے ہیں اس کی حدیث ردی ہوتی ہے اور سیاہ جھنڈوں والی روایت بالکل ردی ہے۔

ابواسامہ کہتے ہیں کہ اگر یہ پچاس قسمیں بھی کھائے گا تب بھی میں اسے سچا نہ مانوں گا۔ میزان

ابن ابی حاتم نے امام احمد کا قول نقل کیا ہے۔ اس کی حدیث کچھ نہیں۔ اس کا حافظہ خراب ہے یحیٰی بن معین کہتے ہیں۔ اس کی روایت حجت نہیں۔ ابوحاتم کہتے ہیں یہ قوی نہیں۔ ابوزرعہ کہتے ہیں یہ کوفہ کا باشندہ ہے کمزور ہے۔ اس کی حدیث حجت نہیں ۱۳۶ میں اس کا انتقال ہوا الجرح والتعدیل ج ۹ ص ۲۶۵

ہمارے نزدیک حافظہ کی خرابی ایک غلط فہمی ہے بلکہ یہ ایک ماہر تقیہ باز انسان تھا کیونکہ یہ خالص رافضی تھا جس کا اندازہ قارئین کو آئندہ صفحات میں ہو گا۔

اسی مضمون کی ایک روایت ابن ماجہ میں ابن عمرؓ سے مروی ہے کہ حضرات حسنین نوجوانان جنت کے سردار ہوں گے۔ اور ان کے والدان سے بہتر ہوں گے۔ ابن ماجہ مترجم ج ا ص۶؎

لیکن اس روایت کا راوی مُعلّیٰ بن عبدالرحمٰن ہے۔ حافظ ذہبی نے اس کا جو خاکہ کھینچا ہے ہم وہ قارئین کرام کے سامنے پیش کئے دیتے ہیں۔

مُعلّیٰ بن عبدالرحمٰن الواسطی۔ اس کی روایات ابن ماجہ میں پائی جاتی ہیں۔ دارقطنی کہتے ہیں ضعیف ہے کذاب ہے۔ ابوحاتم کہتے ہیں۔ متروک الحدیث۔ علی بن المدینی کہتے ہیں۔ یہ احادیث وضع کرتا تھا عقیلی نے امام ابوداؤد سجستانی سے نقل کیا ہے کہ یحییٰ بن معین سے اس بارے میں سوال کیا گیا۔ فرمانے لگے۔ اس کی سب سے بہتر حالت تو موت کے وقت تھی جب اس سے یہ کہا گیا کہ تو اللہ سے استغفار کیوں نہیں کرتا؟ تو جواب میں کہنے لگا مجھے اللہ سے مغفرت کی امید نہیں کیونکہ میں نے حضرت علیؓ کی فضیلت میں نوے احادیث وضع کی ہیں۔ میزان ج ۴ ص۱۴۹

ابن ابی حاتم لکھتے ہیں کہ میں نے اپنے والد سے اس کے بارے میں دریافت کیا۔ فرمایا ضعیف الحدیث ہے۔ اس کی روایت کی کوئی اصل نہیں ہوتی۔ اور ایک بار فرمایا متروک الحدیث ہے۔ الجرح والتعدیل۔ ج ۸ ص۳۳۴

قارئین کرام خود فیصلہ کرلیں کہ ایک شخص خود اقرار کررہا ہے۔ کہ میں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات پر جھوٹ بولا ہے اور نوے احادیث وضع کرکے میں نے حضورؐ کی جانب منسوب کی ہیں جن میں سے ایک "یہ سید الشباب اہل الجنۃ" والی کہانی ہے پھر بھی ہمارا مولوی ہر جمعہ اس کی تلاوت ضروری سمجھتا ہے۔ کیونکہ اہل سنت والجماعت میں جتنا تشیع پھیلا ہے وہ سب پیروں اور ملاؤں کے ذریعہ ہی پھیلا ہے۔ انھوں نے شیعوں کے لئے ہراول دستہ کا کام انجام دیا ہے یہی وجہ ہے کہ آج ہم بلحاظ فقہ تو سنی ہیں لیکن بلحاظ عقیدہ بڑی حد تک شیعہ ہیں۔ اللہ تعالےٰ ہمیں ہر بلا سے محفوظ رکھے۔

اس مضمون کی ایک روایت ذہبی نے میزان میں ابوہریرہؓ سے نقل کرکے اسے منکر قرار دیا ہے کیونکہ اس کا ایک راوی محمد بن مروان الذہلی مجہول ہے۔

جنّت میں بوڑھے بھی ہونگے

جب جنّت میں جوان موجود ہوں گے تو عقل کا تقاضا یہی ہے کہ وہاں بوڑھے بھی ہونے چاہئیں۔ خواہ شریعت پکار پکار کر کہے کہ جنت میں سب نوجوان بن کر داخل ہوں گے۔ لیکن یہ کیسے ممکن ہے کہ ہم جان بوجھ کر چشم پوشی کریں۔ اور ویسے بھی یہ بات خلاف عقل معلوم ہوتی ہے کیونکہ ہم بہت سے کا یا پلٹ نسخوں کا تجربہ کر چکے ہیں۔ لیکن بوڑھا بوڑھا ہی ہوتا ہے۔ لہٰذا ہمارے کرم فرماؤں نے جنت میں بوڑھے بھی مہیا کر دیئے ہیں۔ بلکہ ان کی سیادت و قیادت کا فیصلہ بھی کر لیا گیا ہے اور یہ سب روایت و حدیث کے پردے میں کیا گیا ہے۔ آئیے امام ترمذی کی زبانی یہ داستان سنیئے۔

عن علی بن ابی طالب قال کنت مع رسول صلی اللہ علیہ وسلم اذ طلع ابوبکر و عمر۔ فقال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ھذان سید اکھول اھل الجنۃ من الاولین والاٰخرین الا النبیین والمرسلین لا تخبرھما یا علی۔ ترمذی ج ۲ ص ۲۲۹

"حضرت علیؓ فرماتے ہیں۔ میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تھا کہ سامنے سے ابوبکرؓ و عمرؓ آگئے۔ آپؐ نے فرمایا یہ دونوں جنت میں تمام اولین و آخرین میں جتنے بوڑھے گزرے ہیں۔ سب کے سردار ہوں گے، بجز انبیا و رسل کے۔"

یہ بھی خوب ہے کہ ابوبکرؓ و عمرؓ کی ذات کا مسئلہ سامنے آیا تو انبیا و رسل خارج کر دیئے گئے۔ اور جب حسنینؓ کا معاملہ آیا تو یہ بات گول کر دی گئی۔ . . . کچھ نہ سمجھے خدا کرے کوئی۔

پھر ہر دو روایات سے یہ قطعیؔ معلوم نہیں ہوتا کہ حضرت علیؓ جوانوں کی صف میں داخل ہوں گے یا بوڑھوں کی صف میں۔ ابوبکرؓ و عمرؓ کی قیادت قبول کریں گے یا اپنے صاحبزادگان کی۔ اس کا فیصلہ موجودہ شیوخ الحدیث کے ذمّے ہے۔

اس میں ایک لطیفہ یہ بھی ہے کہ حضورؐ نے حضرت علیؓ کو یہ نصیحت فرمائی تھی کہ ان دونوں

و مطلع نہ کرنا۔ اس کی درجہ کا علم تو علم سینہ بسینہ کے ماہرین ہی کو ہوگا لیکن ان ہی کے پوتے زین العابدین نے یہ راز ہر پھر افشا کر دیا جس کی ہمیں بھی اطلاع مل گئی۔ ورنہ ہم اس علم سے محروم ہو جاتے۔ اور حضرت علیؓ نے یہ مخفی راز اپنے پوتے زین العابدین کے کان میں ان کی پیدائش سے قبل ہی پھونک دیا تھا کیونکہ ہم از روئے تاریخ صرف اتنی بات جانتے ہیں کہ جس سال حضرت علیؓ کی شہادت ہوئی۔ اسی سال زین العابدین پیدا ہوئے لیکن شاید وہ پیدائشی ولی ہوں۔

یہ بھی غنیمت ہے کہ امام ترمذی نے خود ہی ضعیف کہدیا۔ اور فرمایا اس کا ایک راوی ولید بن محمد المعقری ضعیف ہے لیکن یہ روایت اور سند سے بھی مروی ہے۔ حضرت انسؓ اور حضرت ابن عباسؓ سے بھی یہ روایت مروی ہے۔ پھر امام ترمذی نے دوسری سند پیش کر کے اس پر خاموشی اختیار کی اور حضرت انسؓ کی حدیث پیش کر کے اسے حسن فرمایا۔

بالفاظ دیگر امام ترمذی یہ ظاہر کرنا چاہتے ہیں کہ اگر اس روایت کی ایک سند ضعیف ہے تو دوسری تو قابل قبول ہے۔ اور پھر حضرت انسؓ کی حدیث ہے جو حسن ہے وہ بھی اس کی تائید کر رہی ہے لہٰذا یہ روایت قابل قبول ہے۔ بہر صورت جنت میں بوڑھے پیدا کرنے ہی ہوں گے۔ آخر ان کا بھرم کیسے پورا کیا جائے گا لیکن ہم نے جب اوپر سے نیچے تک ان روایات کا مطالعہ کیا تو چند عقدے کھل کر سامنے آئے۔

۱۔ جس روایت پر ترمذی نے خاموشی اختیار کی۔ اس میں ایک مشہور کذاب اور رافضی موجود ہے

۲۔ جس روایت کو حسن قرار دیا ہے ماہرین رجال نے مردود قرار دیا ہے۔ اسی لئے ذہبی میزان میں جگہ جگہ لکھتے ہیں کہ ترمذی جس روایت کو حسن کہیں ہرگز دھوکہ نہ کھاؤ۔ اس کی کوئی حیثیت نہیں ہوتی۔

۳۔ ہر سہ روایات میں یہ گفت و شنید حضرت علیؓ سے ہو رہی ہے اور ان میں یا علی کہہ کر خطاب کیا جا رہا ہے جو خطرے کی ایک گھنٹی ہے۔ ملا علی قاری موضوعات کبیر میں لکھتے ہیں۔

وقد قال بعض المحققون ان وصايا علی المصدرة بيا علی كلها موضوعة غير قوله عليه الصلوٰة والسلام يا علی انت منی بمنزلة هارون من موسٰی الا انه لا نبی بعدی موضوعات

کبیر ترجمہ ص۴۴۳ بعض محققین کا دعویٰ ہے کہ وہ تمام وصیتیں جن میں یا علی کہہ کر خطاب کیا گیا ہو سب موضوع ہیں۔ بجز ایک روایت یا علی انت منی بمنزلۃ ھارون من موسیٰ الا انہ لا نبی بعدی کے۔ اے علیؓ تو میری جگہ ایسا ہی قائم مقام ہے جیسے ہارون موسیٰ کی جگہ مگر میرے بعد کوئی نبی نہیں۔ اس لحاظ سے اس روایت کی کتنی بھی سندات پیش کر دیں لیکن یہ روایت موضوع قرار پائے گی۔

اس روایت کی پہلی سند کو خود ترمذی نے ضعیف کہا ہے۔ کیونکہ اس میں ولید بن محمد المغفری موجود ہے جو محدثین کے نزدیک ضعیف ہے۔ ۔ ۔ ۔ بلکہ نسائی اور یحییٰ بن معین کے نزدیک کذاب ہے۔ ۔ ۔ اور سند بھی منقطع ہے جس پر ترمذی نے کوئی کلام نہیں کیا۔

اب آیئے حضرت انسؓ کی حدیث پر جسے ترمذی نے حسن قرار دیا ہے۔ اس کی سند محمد کثیر المصیصی ہے۔ حافظ ذہبی میزان میں لکھتے ہیں۔

محمد بن کثیر سے ابوداؤد ترمذی اور نسائی نے روایات لی ہیں۔ اس کی کنیت ابو یوسف ہے۔ اس کا تعلق قبیلہ ثقیف سے تھا۔ یہ شامی صنعانی اور مصیصی کہلاتا تھا کیونکہ اس نے مصیصہ میں سکونت اختیار کر لی تھی۔ معمر اور اوزاعی سے روایات نقل کرتا ہے۔

یحییٰ بن معین کہتے ہیں سچا ہے۔ لیکن امام احمد فرماتے ہیں ضعیف ہے۔ نسائی کہتے ہیں قوی نہیں۔ ۲۱۶ھ میں اس کی وفات ہوئی۔

عبداللہ بن احمد کہتے ہیں میرے والد نے محمد بن کثیر کا تذکرہ کیا۔ اور اسے انتہائی ضعیف قرار دیا۔ اور فرمایا یہ منکر روایات بیان کرتا ہے جس کی کوئی بنیاد تک نہیں ہوتی۔

ابوحاتم کہتے ہیں اس کی روایات منکر ہوتی ہیں میرے نزدیک یہ ثقہ نہیں ہے۔

صالح جزرہ کہتے ہیں آدمی تو سچا ہے لیکن غلطیاں بہت کرتا ہے۔ بخاری کہتے ہیں بہت ہی ضعیف ہے۔ ابوداؤد کہتے ہیں یہ تو حدیث کا مفہوم بھی نہیں سمجھ سکتا۔

یونس بن حبیب کا بیان ہے کہ میں نے امام علی بن المدینی کے سامنے اس محمد بن کثیر کا تذکرہ کیا اور اس کی یہ روایت ان کے سامنے پیش کی۔ سن کر فرمانے لگے میں بہت دن سے اس سے ملاقات کا متمنی تھا۔ لیکن یہ روایت سننے کے بعد تو میں اس کی صورت بھی دیکھنا نہیں چاہتا۔

ابن عدی نے اس کی چار روایات نقل کرکے انھیں منکر قرار دیا۔ جن میں سے ایک یہ مذکورہ روایت ہے

ترمذی نے پہلی روایت حضرت علیؓ کی جانب منسوب کرکے اس کو ضعیف قرار دیا تھا۔ لیکن اس کی ایک اور بھی سند پیش کی تھی جس پر سکوت اختیار کر لیا تھا۔ ۔ ۔ ۔ اس دوسری سند میں حضرت علیؓ کا مشہور ساتھی حارث بن عبداللہ الاعور موجود ہے۔

حارث الاعور۔ یہ کوفہ کا باشندہ ہے۔ حضرت علیؓ اور حضرت عبداللہ بن مسعود سے احادیث روایت کرتا ہے۔ اس کا شمار اصحاب علیؓ میں ہے۔

امام شعبی کہتے ہیں میں گواہی دیتا ہوں کہ حارث کذاب ہے۔ ابراہیم نخعی کا قول ہے کہ لوگ اسے جھوٹا کہتے ہیں ابو اسحاق سبیعی بھی اسے جھوٹا سمجھتے ہیں۔ قاری ابوبکر بن عیاش کہتے ہیں یہ کوئی پسندیدہ آدمی نہیں تھا۔

عبدالرحمٰن بن مہدی نے اس کی روایات قبول نہیں کیں کسی نے یحییٰ بن معین سے کہا کہ یہ حضرت علیؓ کا شاگرد ہے فرمایا ضعیف ہے۔ ابن عیینہ کہتے ہیں کذاب ہے۔ ابو حاتم فرماتے ہیں یہ قوی نہیں، ضعیف الحدیث ہے۔ اس کی روایت حجت نہیں ہو سکتی۔ الجرح والتعدیل ۳ ص۷۹

ذہبی لکھتے ہیں یہ حارث ہمدان کا باشندہ تھا۔ کوفہ میں سکونت اختیار کی تھی۔ اس کا شمار بڑے درجہ کے تابعین میں ہے لیکن ضعیف ہے۔

مغیرہ کا بیان ہے کہ حضرت علیؓ کا اگر کوئی شاگرد ان سے روایت نقل کرتا ہے تو اسے سچا نہیں سمجھا جاتا۔ ابن المدینی کہتے ہیں کذاب ہے جریر بن عبدالحمید کا قول ہے کہ یہ ایک ذلیل انسان ہے۔ نسائی اور دارقطنی کہتے ہیں ضعیف ہے۔

ابن عدی کہتے ہیں اس کی عام روایات درست نہیں ہوتیں۔

امام شعبی فرماتے ہیں اس امت میں جتنا جھوٹ حضرت علیؓ کے نام سے بولا گیا ہے اتنا کسی کے نام سے نہیں بولا گیا۔ ابن سیرین کہتے ہیں حضرت علی کے نام سے جتنی بھی روایات مروی ہیں سب جھوٹ ہیں۔

بندار کا بیان ہے کہ عبدالرحمٰن بن مہدی اور یحییٰ بن سعید کے سامنے حارث کی چالیس ۔ ۔ ۔ انھوں نے سب پر قلم پھیر دیا

حمزہ الزیات کا بیان ہے کہ مرۃ الہمدانی نے حارث سے کوئی رفض کی بات سنی تو وہ اٹھ کر گھر میں گئے۔ اور تلوار اٹھا لائے لیکن یہ خطرہ محسوس کر کے بھاگ گیا۔

ابن حبان کہتے ہیں یہ غالی درجہ کا شیعہ تھا۔ حدیث میں ردی تھا۔ تمام علماء کا اس کے ضعف پر اتفاق ہے۔ ۶۵ھ میں اس کا انتقال ہوا۔ اس کی روایت ترمذی، ابو داؤد، نسائی اور ابن ماجہ میں پائی جاتی ہے۔ میزان ج ۱ ص ۴۳۵ مقدمہ مسلم ج ۱ ص ۱۹

بخاری نے کتاب الضعفاء میں اسے متہم کہا ہے۔ الضعفاء الصغیر للبخاری ص ۲۸

نسائی لکھتے ہیں یہ قوی نہیں۔ کتاب الضعفاء للنسائی ص ۲۹

مغیرہ کا بیان ہے کہ جب تک حضرت علیؓ سے حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کے شاگرد حدیث روایت نہ کریں اس وقت تک روایت کو قبول نہ کرو۔ خدا ان اصحاب علیؓ کو قتل کرے کہ انھوں نے بڑے علم کو اپنے جھوٹ سے تباہ کیا۔ مقدمہ مسلم ص ۲۸

حضرت معاویہؓ کیلئے بددعا

قارئین کرام۔۔۔ ہم نے سطور بالا میں آپ حضرات سے وعدہ کیا تھا کہ ہم یزید بن ابی زیاد کی ایک اور کہانی آپ کو سنائیں گے جس سے آپ حضرات کو یہ اندازہ ہو جائے گا کہ یہ کون ذات شریف ہیں۔۔۔ ماشاء اللہ یہ پورے حضرت ہیں۔ اور ماہر تقیہ ہیں۔ آپ بھی وہ روایت سن لیجئے کیونکہ نقل کفر کفر نہ باشد۔ ہاں یہ بات ذہن میں رہے کہ سبائیوں کو چونکہ یزیدؒ سے بہت پیار تھا اس لئے یہ حضرت اپنے آپ کو یزید سے موسوم کیا کرتے تھے۔

روایت کچھ اس طرح ہے کہ حضرت ابو برزہؓ اسلمی فرماتے ہیں کہ ایک بار حضرت معاویہؓ اور حضرت عمرو بن العاصؓ گانا گا رہے تھے۔ حضورؐ نے جو ان کی آواز سنی تو فرمایا۔ اے اللہ تو ان دونوں کو خوب اچھی طرح فتنہ میں مبتلا کر۔ اور انھیں اچھی طرح آگ میں جھونک (عیاذاً باللہ)

یہ روایت امام ذہبی نے اس یزید کی پول کھولتے ہوئے ذکر کی ہے اور اس روایت کو منکر قرار دیا ہے۔ اس روایت کو یزید نے سلیمان بن عمرو سے نقل کیا ہے۔ یہ سلیمان بن عمرو کون حضرت ہیں

ان کا خاکہ بھی ذرا ملاحظہ فرمالیں۔

سلیمان بن عمرو النخعی۔ اس کی کنیت ابوداؤد ہے یہ اپنے دور کا مشہور کذاب ہے امام احمد بن حنبل فرماتے ہیں میں اس کے پاس گیا تو مجھ سے حدیث بیان کرنے لگا کہ مجھ سے یزید بن ابی حبیب نے بیان کی میں نے سوال کیا آپ کی اس سے کہاں ملاقات ہوئی تھی (کیونکہ سلیمان کوفہ کا باشندہ اور یزید بن ابی حبیب مصر کے باشندہ تھے) بولا اے احمق میں بات کہنے سے قبل اس کا جواب تیار کرلیتا ہوں۔ میری اس سے ملاقات باب الابواب پر ہوئی تھی یعنی آبنائے ہرمز پر۔

امام احمد فرماتے یہ احادیث وضع کیا کرتا تھا۔ یحییٰ کا قول ہے کہ یہ وضع حدیث میں مشہور زمانہ ہے بلکہ اس سے بڑھ کر کوئی کذاب نہیں گزرا۔

بخاری کہتے ہیں متروک الحدیث ہے قتیبہ اور اسحاق کہتے ہیں کذاب ہے۔ یزید بن ہارون کا قول ہے کہ اس کی روایت بیان کرنا حلال نہیں۔

ابن عدی کہتے ہیں اس پر سب کا اتفاق ہے کہ حدیث وضع کیا کرتا تھا۔

ابن حبان لکھتے ہیں کہ یہ بغداد کا باشندہ تھا ظاہر میں بہت نیک تھا لیکن برملا احادیث وضع کرتا تھا۔ دراصل یہ ایک پہنچا ہوا صوفی تھا سلوک کی منزلیں طے کر رہا تھا اس لئے ہر جھوٹ حلال تھا منکر تقدیر تھا۔

ابوالحسین الرہاوی کا بیان ہے کہ میں نے عبدالجبار بن محمد سے اس کے بارے میں سوال کیا فرمانے لگے رات کو لمبی لمبی نمازیں پڑھتا۔ اور دن میں اکثر روزے رکھتا۔

بخاری کتاب الضعفاء میں لکھتے ہیں کہ یہ مشہور کذاب ہے قتیبہ اور اسحاق بھی اسے کذاب کہتے ہیں۔ حاکم لکھتے ہیں یہ اپنے زہد و عبادت کے باوجود احادیث وضع کیا کرتا تھا حتیٰ کہ شریک بن عبداللہ النخعی جو کوفہ کا ایک شیعہ ہے وہ بھی یہ تسلیم کرتا ہے کہ یہ ہمارے چچا کا بیٹا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر جھوٹ بولتا ہے۔ میزان ج ۲ ص ۲۱۶

ابوزرعہ رازی فرماتے ہیں یہ سلیمان تو اللہ کا ایک عذاب ہے الجرح والتعدیل ج ۴ ص ۱۳۲

خوب۔ ایک راوی شیعہ اور دوسرا صوفی۔ یہ تو یزید بن ابی زیاد کا اس روایت میں استاد کے شاگرد کا بھی کچھ حال سن لیجئے کیونکہ یہ جہنمی روایت یزید سے اس نے نقل کی ہے

ان حضرت کا اسم گرامی محمد بن فضیل بن غزوان ہے

محمد بن فضیل بن غزوان بہت مشہور ہستی ہیں۔ امام احمد اور اسحاق بن راہویہ ان کے شاگردوں میں داخل ہیں۔ تمام کتب صحاح میں ان کی روایات موجود ہیں بقول ذہبی حدیث کی اچھی معرفت رکھتے تھے۔

یحییٰ بن معین کہتے ہیں ثقہ ہے۔ احمد کہتے ہیں اس کی حدیث اچھی ہوتی ہے لیکن شیعہ ہے ابوداؤد کہتے ہیں یہ تو آگ لگانے والا شیعہ ہے۔ ابن سعد کہتے ہیں بعض محدثین اسے حجت نہیں سمجھتے نسائی کہتے ہیں اس کی روایت میں کوئی حرج نہیں۔ میزان ج ۳ ص ۹

ابوزرعہ رازی فرماتے ہیں سچا ہے اہل علم میں سے ہے۔

حاصل کلام یہ کہ اس روایت کے دو راوی شیعہ اور ایک کذاب زمانہ۔ اس پر تمام اہلسنت کا اتفاق ہے کہ روایت موضوع ہے اور اغلب گمان یہ ہے کہ سلیمان بن عمرو نے وضع کی ہوگی لیکن یہ بھی تو ممکن ہے کہ بعد کے ان سبائیوں نے وضع کر کے اس بے چارے سُنی کی جانب منسوب کر دی ہو لیکن ابن عدی اور ذہبی کی تحریر سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ انھوں نے اس کا مجرم یزید بن ابی زیاد کو قرار دیا ہے کیونکہ اس کے ترجمہ میں اس روایت کا ذکر کیا ہے۔

خواہ کچھ بھی ہو ہمارے مولوی کے لئے اتنا ہی کافی ہے کہ یزید بن ابی زیاد رافضی ہے۔ مسلم، ابوداؤد، ترمذی، نسائی۔ ابن ماجہ اور احمد نے روایات لی ہیں لہٰذا اب وہ ہمارے سر کا تاج ہے۔ اور اس کی ہر بکواس ہمارا ایمان ہے۔

افسوس اس گھر کو آگ لگ گئی گھر کے چراغ سے

اللّٰھم ارنا الحق حقا وارزقنا اتباعہ۔ وارنا الباطل باطلا وارزقنا اجتنابہ

حبیب الرحمٰن کاندھلوی